
WWW.PAKSOCIETY.COM
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اپریل 2015
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
خلا شناس: اس عہد کے ایک بڑے سائنسداں کا زندگی نامہ
چار روحوں والا: ایک بہت بڑے مصور کی زندگی کے انوکھے واقعات
ضدی: ایک ایسے ضدی بھائی کی سچ بیانی جس نے قدم قدم پر بڑے بھائی کو زک پہنچائی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 25 ✿ شمارہ 04 ✿ اپریل 2015ء

ماہنامہ کرن کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شفیع خان	0333-2256789
نمایندہ کراچی	محمد عثمان خان	0333-2168391
	ماہ جبیں	0323-2895528
نمایندہ لاہور	فرخ حلیل شیخ	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ✿ زرسالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: [illegible]

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

اس میں شاید ہی کسی کو شک ہو کہ برصغیر کے مسلمانوں کو عین شب قدر میں جو انمول تحفہ عطا ہوا تو اغیار کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ رحمانی عمل کے مقابل شیطانی عمل بھی سر اٹھا لیتا ہے۔ رحمٰن کریم کا بخشا ہوا یہ تحفہ ہمیں عطا ہوا تو شیطان کے پجاری بھی کمر کس کر میدان میں آ گئے۔ آزادی کے اتنے برسوں بعد بھی ریشہ دوانیاں کم نہ ہوئیں بلکہ فزوں تر ہوئیں۔ جب سازشوں کا جال بہت زیادہ پھیلتا نظر آیا تو محافظین سرحد کو چوکسی دکھانا پڑی، ضرب عضب کی ضرورت شدید تر ہوگئی مگر ضرب عضب کا دائرہ کار مزید وسیع کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ یہ آلۂ کار مذہبی، مسلکی، لسانی یا کسی بھی شکل میں کیوں نہ ہوں ان کا مقصد صرف اور صرف استحکام وطن کی بنیاد پر ضرب لگانا ہے اس لیے ان پر ضرب عضب لگانا ضروری ہے کیونکہ نفرت کی آبیاری دہشت گردی سے زیادہ خطرناک ہے اس لیے کہ بقول اسرار الحق مجاز

کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب اس طرف دیکھا تو ہے

معراج رسول

خوب آدمی

سرگزشت

سلطنت ہند مغلوں کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے دہلی تک محدود ہوتی نظر آرہی تھی۔ ہر طرف افراتفری کا راج تھا۔ مغلیہ فرماں روا کے احکام کوئی ماننے پر تیار ہی نہ تھا۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور چھا گاؤں سے پشاور تک پھیلے ہند کے ٹکڑے ہوتے جارہے تھے۔ شوریدہ سر جرنیلوں، سپاہ سالاروں نے اپنی اپنی حکومت قائم کرلی تھی۔ اسی وجہ سے مغل حکومت دہلی تک سمٹ گئی تھی۔ ایسے وقت میں نام کو قائم افواج مغل کے ایک سپاہی محمد رمضان کے ہاں 1789ء میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس گھر کے در و دیوار سے عسرت جھانکتی تھی گویا غربت آنگن میں بال کھولے کھڑی تھی مگر بیٹے کی پیدائش کا سن کر شیخ محمد رمضان خوش ہوا تھا۔ اس نے پاس پڑوس میں شیرینی تقسیم کرائی۔ گھر والے بھی خوشی سے نہال تھے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اس گھر کی قسمت بدل سکتا ہے۔ نامور سپاہی یا سپاہ سالار بھی بن سکتا ہے۔ اسی خیال سے اس بچے کی پرورش ہونے لگی۔ جب اس بچے نے ہوش سنبھالا تو دہلی کے امراء کی دیکھا دیکھی محمد رمضان نے بھی اپنے بچے کو نزدیکی مسجد کے صحن میں قائم مدرسے بھیجنا شروع کردیا۔ بچے کو یہ تبدیلی زیادہ پسند آئی اور اس نے دیگر ہم جماعت بچوں کی طرح کھیل کود میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ابجد میں زیادہ دلچسپی دکھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہم جماعت بچوں سے آگے نکلتا چلا گیا۔ پھر اسے حافظ غلام رسول کے مدرسے میں داخل کرادیا گیا۔ جب اس نے عمر کی مزید منزلیں طے کرلیں، مسیں بھیگنے لگیں تو اسے بھی سپاہ گری کے لیے بھیجا جانے لگا۔ وہ اسلحہ خانہ جاتا، پابندی سے ورزش کرتا، تلوار بازی اور گھڑ سواری کے اسرار و رموز بھی سیکھتا مگر اس کی اصل دلچسپی تعلیم میں تھی۔ وہ شعر و شاعری میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ فارسی میں تو شعر کہتا ہی تھا اُردو جس کے گیسو ابھی سنوارے جارہے تھے اس زبان میں بھی شاعری کرنے لگا تھا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی کی ایک وجہ اس کے استاد حافظ غلام رسول بھی تھے جو اس دور کے لحاظ سے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ انہی کے اتباع میں شیخ محمد ابراہیم نے شاعری شروع کی تھی اور اپنا کلام انہی کو دکھاتے تھے پھر جب کلام میں ندرت آگئی تو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس دور کے نامور شاعر شاہ نصیر کی شاگردی منظور کرلی۔ شاہ نصیر ولی عہد، بہادر شاہ ظفر کے کلام پر بھی اصلاح دیتے تھے اس لیے دہلی میں ان کا خوب شہرہ تھا۔ وہ صرف انہی شعراء کے کلام پر اصلاح دیتے تھے جن کے کلام میں ندرت پاتے۔ شیخ محمد ابراہیم کے کلام میں بھی ندرت و کمال جا بجا نظر آتا۔ کچھ شیخ محمد ابراہیم کی دلچسپی اور کچھ خداداد صلاحیت، وہ دیکھتے ہی دیکھتے مثل آفتاب دہلی پر چھا گئے۔ لوگ ان کے اشعار سن کر سر دھنتے۔ بچے بچے کی زبان پر ان کا کلام مچل رہا تھا۔ ہر کوئی ان کے اشعار کی تعریف کرتا۔ شاہ نصیر دہلی سے ترک وطن کر کے دکن چلے گئے تو شہزادوں کے کلام پر اصلاح کے لیے میر کاظم حسین بے قرار کو رکھ لیا گیا مگر کچھ ہی دنوں میں میر کاظم حسین بھی دہلی چھوڑ گئے۔ ان کے ترک وطن کے بعد شہزادوں کے کلام کی اصلاح شیخ محمد ابراہیم کو سونپ دی گئی۔ جب کہ مرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خان معروف بھی محمد ابراہیم کے شاگرد تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس وقت ابراہیم کی عمر صرف 20 سال تھی۔ اس کم عمری میں ابراہیم کا طوطی دہلی میں بول رہا تھا۔ انہی دنوں شاہ نصیر دکن سے لوٹ آئے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ دہلی لوٹے تو یہاں ابراہیم کی شاعری کا سکہ چلتے دیکھا۔ محمد ابراہیم ان کا شاگرد تھا اس لیے اس شہرت نے انہیں بھی فخر بخشا مگر کچھ ہی دنوں میں انہیں احساس ہو گیا کہ ان کا شاگرد ان سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ بس اسی بات نے معرکہ آرائی کی بنیاد ڈال دی۔ اکبر شاہ ثانی نے ابراہیم کو "خاقانی ہند" کا خطاب دے رکھا تھا۔ قلعہ سے نصف صد روپے بطور تنخواہ ملتی تھی جو اس دور میں بہت بڑی رقم تھی لیکن جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے تو تنخواہ یک صد روپے ہو گئی۔ اب ابراہیم کا شمار ہند کے بڑے شعراء میں ہونے لگا تھا۔ شاہ نصیر سے معرکہ آرائی نے ان کی شہرت دور دور تک پھیلا دی تھی۔ دکن کے وزیر اعظم راجا چندو لال شاداں نے انہیں حیدرآباد بلانے کی کوشش کی مگر ابراہیم نے صاف انکار کردیا۔ ہر صنف سخن میں کمال دکھانے والے شیخ محمد ابراہیم کو دنیا ذوق دہلوی کے نام سے پہچانتی ہے۔ 1854ء میں انتقال سے صرف دو گھنٹے پہلے ایک معرکۃ الآرا شعر کہا

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شہرِ خیال



☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے۔ ”مارچ کا شمارہ ہاتھوں میں ہے، سب سے پہلے اداریے پر پہنچا اور انکل کی غور طلب باتوں کو بغور پڑھا۔ انکل آپ نے پانی کے حوالے سے بفرزون کی بات کی یہ صرف ایک علاقے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پورا کراچی ہی اس مسئلے سے دوچار ہے۔ لوگ میٹھے پانی کی بوندوں کو ترس گئے ہیں۔ گندے اور کھارے پانی نے گھر گھر بیماریوں کے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ ہر شخص بیمار، کمزور، لاچار نظر آتا ہے۔ بچے ذہنی مریض بنتے جارہے ہیں۔ بے ہنگم ٹریفک کا نظام بھی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ حادثات معمول بنتے جارہے ہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ہم تو خود ہونٹوں پر قفل ڈالے اس دن کی آس لگائے بیٹھے ہیں کہ ”جب روٹی ہوگی سستی اور مہنگی ہوگی جان وہ دن بھی آئے گا جب ایسا ہوگا پاکستان“۔ ”شہرِ خیال“ میں شوکت رحمن خٹک کا تعزیت بھرا خط پڑھا۔ ماضی کے جھروکوں سے جھانکتی یادوں کو شیئر کرتے ہوئے شوکت بھائی نے ہمیں بھی گزرے وقتوں میں پہنچادیا۔ سید انور عباس بھائی آپ نے درست لکھا کہ بشریٰ افضل بے وجہ ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئی ہیں۔ عزیز ہے ’سرگزشت‘ سے ہمیں بھی اتنی ہی محبت ہے کہ جتنی آپ کو ہے۔ اویس شیخ کیا ہمارے سیاستداں اتنے قابل ہیں کہ ان سے کوئی اچھی اُمید وابستہ کی جاسکے۔ طاہرہ باجی کا لمبا چوڑا خط اچھا لگا۔ ناصر حسین، وحید ریاست بھٹی، اویس بھائی۔ دیکھیے جی آپ نے یاد کیا اور ہم حاضر ہوگئے۔ شکریہ بھائیو، سب ہی کے تبصرے بھرپور تھے۔ ابتدائی صفحات پر اردو ادب کا ایک بڑا نام چھایا رہا۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب، بہت اچھے۔ شیر از خان نے شہر حکمراں میں دنیا بھر کے بدنام شہروں کا ذکر کیا۔ خاص کر پشاور کا‘ کاش کہ اچھے شہروں کی فہرست میں کہیں ہمارا اپنا شہر بھی شامل ہوتا۔ ”خزانہ“ پڑھ کر حیران رہ گئے۔ خزانوں کی ایک طویل فہرست تھی لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ سارے کے سارے خزانے غائب کہاں ہوگئے کہ ڈھونڈنے والے ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ ابن کبیر کی زبانی پُراسرار تحریریں پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس بار شمس العلماء میں ایسا گوہر نایاب ڈھونڈ کر لائے کہ جو فخرِ پاکستان بھی بنا اور وطنِ عزیز کی شان بھی ٹھہرا۔ تقدیر نے کیسا حیران کیا کہ چھوٹی سی جھونپڑی میں جنم لینے والے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات پر امر کردیا۔ انکل علی سفیان آفاقی مرحوم کا آخری شاہکار بہت سے لوگوں کی بہت ساری داستانیں خود میں سموئے ہوئے تھا کہ پڑھ کر آنکھیں اشکبار اور دل دکھ سے بھر گیا‘ اتنی شاندار اور خوب صورت یادوں پرمبنی قلم اب بھی سرگزشت کے صفحات پر رونقیں نہیں بکھیر سکے گا۔ انکل 1990ء میں سرگزشت سے وابستہ ہوئے ہم نے تو فقط تین سال سے ”فلمی الف لیلہ“ پڑھنا شروع کیا ابھی تو آفاقی انکل سے بہت ساری فرمائشیں کرنی تھیں۔ ہم تو اب بھی لیلہ کو اکثر لیلی ہی لکھ جاتے ہیں لیکن یہ سلسلہ اب ٹوٹ گیا۔ انکل تو چلے گئے لیکن ان کی یادیں اور ان کی باتیں ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ اتنے ڈھیر سارے اعزازات حاصل کرنے والے کے لفظوں میں بھی غرور کی جھلک تک نظر نہیں آئی۔ شوکت رحمن نے ان پر بہت خوب لکھا کہ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ پہلی سچ بیانی نے دل چھولیا۔ نازی صاحبہ کو خدا نے بہت بڑی مصیبتوں سے بچایا اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ محترمہ نے مصیبت میں اپنے رب کو پکارا اور پکارنے والے نے بھی ان کی پکار کو رد نہیں کیا اور ظالم کی ہوس سے محفوظ رکھا۔ ”طعنے“ میں بخت خان کے ساتھ بڑا ظلم ہوا چلتی زبان کے کاٹ دار جملوں نے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ ”پشیمان“ پریشانیوں سے بھری رہی۔ ”برے پھنسے“ اور ”تحفے“ ہنستی مسکراتی تحریریں لکھنے والوں کو مشورہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔“

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے رقم طراز ہیں۔ ”علی سفیان آفاقی کے سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کی افسوس ناک خبر موبائل میسج کے ذریعے پہنچ گئی تھی۔ ہم کیا کچھ کھو چکے ہیں۔ یہ کمی کب اور کیسے پوری ہوگی کسی کو بھی احساس نہیں ہے جب ہمیں احساسِ زیاں ہوگا تو وہ لمحہ یادگار ہوگا۔ آفاقی بھائی سے کم و بیش 25 سال کا ساتھ تھا۔ یہ عمر کا ایک حصہ ہے۔ چند گھنٹے ساتھ سفر کرنے والے مسافر سے بھی، نوعیت ہو جاتی

ہے اور جدا ہوتے وقت عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ ان کے ہنر سے ہم کتنے مستفید ہوئے معلومات میں اضافہ ہوا اور ذہنی و قلبی تسکین ہوئی بس اب ان کی یادیں ہیں جو دل بہلانے کا سبب بنی رہیں گی۔ دیکھنا ہے کہ ادارہ اس خلا کو کیسے پُر کرتا ہے لیکن وہ محفل جمنے کا ماحول نہ بن سکے گا۔ اب جیسے تیسے گزارہ چلانا ہوگا۔ "الوداع" میں ہر ماہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ "بچھڑنے والا" نے سوچ کے کئی در کھول دیے ہیں اگر اللہ کو پورے یقین اور خلوص سے پکارا جائے تو وہ ذات تحفظ دینے میں دیر نہیں لگاتی۔ یہاں نازی کے برباد ہونے میں محض چند سیکنڈ کا وقفہ تھا لیکن ایسا معجزہ ہوا کہ عقل محو تماشا بن کر رہ گئی۔ "کشمکش" میں مرینہ نے اپنی فطرت کے مطابق ڈیوٹی نبھائی لیکن قصور آسیہ کا ہے جو بہکاوے میں آ گئی۔ "تمنا" لکھ کر شاید ہمارے جذبۂ حب الوطنی اور احساس ذمہ داری کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ "پشیمان" پڑھتے ہوئے آخری صفحے پر آنکھیں نم ہو گئیں۔ معصوم بچے والدین کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ان پر ظلم و زیادتی ہوتا دیکھ کر دل کڑھتا ہے پھر ایسے لوگ جو ہمارے زیردست ہیں یا کسی حوالے سے ہمارے محتاج ہیں ان کی تذلیل اور جبر کرنے سے اللہ کی ذات ناراض رہتی ہے لیکن ہر فیصلہ کرتے ہوئے عقل کنٹرول میں رہے تو پریشانی سے سامنا نہیں ہوتا۔ "تحفے" واقعی نفسیاتی مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ اس گورکھ دھندے میں الجھ کر قوت فیصلہ ختم ہو جاتی ہے۔ "طعنے" میں کیسے لوگوں نے ایک بے بس انسان کو موت کی آغوش میں ڈال دیا' ہم کچھ اور نہ کر سکیں لیکن مشورے دینے اور تبصرہ کرنے سے نہیں رہ سکتے اور اس احساس کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ اس سے دوسرا کس آزار میں مبتلا ہو رہا ہے اور وہ کس قیامت سے گزر رہا ہے۔ اگر ہم دوسروں کے درد کا احساس کرنا شروع کر دیں تو بے شمار لوگ سکھ کا سانس لے سکیں گے۔"

☆ فقیر غلام حسین ضیاء نے بکھر سے لکھا ہے۔ "ماہنامہ سرگزشت ادبی کشکول ہے۔ قارئین کے لیے ادبی مواد کا بہترین ذخیرہ ہر ماہ آپ کی انتھک محنت کا ثمر ہے۔"

☆ سید انور عباس شاہ کا دریا خان بھکر سے تبصرہ "نہ جانے یہ دردناک خبر ہم نے کیسے برداشت کر لی کہ محترم علی سفیان آفاقی اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جانا تو ہم سب کو بھی ہے لیکن بعض انسان اس دنیا سے رخصت ہو کر بھی دلوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ مدتوں بھلائے نہیں جا سکتے۔ آفاقی صاحب بھی ان میں سے ایک تھے۔ سرگزشت کی مقبولیت کے ایک بڑے حصے کا کریڈٹ "فلمی الف لیلہ" کو جاتا تھا اور فلمی الف لیلہ آفاقی صاحب کے دم سے تھی۔ اب وہ نہ رہے تو نہ جانے ہم جیسے فلمی الف لیلہ کو شوق سے پڑھنے والوں کا اب کیا ہوگا۔ بہرحال خداوند کریم سے گزارش ہے کہ وہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ محترم بزرگ جناب شوکت رحمن خٹک کا تعزیت سے بھرپور خط ہم نے پوری یکسوئی سے پڑھا کیونکہ اس میں آفاقی صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ خٹک صاحب آپ سے اپیل ہے کہ اگر ہو سکے تو آفاقی صاحب پر کچھ مختصر سا مضمون ضرور تحریر کریں تا کہ ان کے مداحوں کی تشنگی دور ہو سکے۔ انجم فاروق ساحلی خدا کرے "فلمی الف لیلہ" سے کوئی ملتا جلتا سلسلہ شروع ہو جائے۔ ڈاکٹر قرۃ العین پشاور والے واقعے سے متاثر ہونے پر ہم بھی آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ خداوند کریم آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ باجی طاہرہ گلزار کا خط تعزیت بھرا دکھ بھرا تھا' اور حرف بہ حرف سچ پر مبنی تھا۔ واقعی ہم بہت بے وفا اور بے حس لوگ ہیں کیوں کہ ہم اپنے محسنوں کو جلد بھول جاتے ہیں۔ ویسے باجی گل پچھلے دو ماہ سے آپ کہاں تھیں ہم تو پریشان ہو گئے تھے۔ خداوند کریم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ محمد احمد رضا انصاری اویس شیخ اور وحید ریاست بھٹی کی "عکس خیال" میں پیاری پیاری باتیں پڑھنے کو ملیں۔ بشریٰ افضل خداوند کریم آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ عبدالقیوم آپ مختصر خط میں پرانے دور کے کراچی کا ذکر کر رہے تھے جو کہ بہت ہی بھلا لگا۔ میرا بچپن بھی کراچی میں گزرا ہے۔ میں نے اپنی تعلیم کا آغاز کراچی ہی سے کیا تھا۔ اشفاق احمد صاحب خداوند کریم آپ کے بہنوئی کو بھی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ سدرہ بانو ناگوری، منشی محمد عزیز سے، ناصر حسین رند اور مجید احمد جائی اپنے شاندار خطوط کے ساتھ "عکس خیال" کی زینت بنے۔ قابل احترام اور معزز ہستی جناب شاہد جہانگیر شاہد اپنے دکھ بھرے خط کے ساتھ حاضر تھے جو باتیں ہم دل میں محسوس کرتے ہیں وہ زبان پر یا تحریر میں نہیں لا سکتے۔ وہ تمام باتیں یہ خود ہی بیان کر دیتے ہیں۔ خداوند کریم ان کو بھی اپنے حفظ و امان میں رکھے اور طویل عمر عطا فرمائے، آمین۔ بلکہ ہماری تو یہ بھی خواہش ہے کہ جناب شوکت رحمن خٹک اور آپ یعنی شاہد جہانگیر شاہد صاحب "فلمی الف لیلہ" جیسا کوئی سلسلہ شروع کریں۔ قیصر خان اس مرتبہ غیر حاضر تھے خدا کرے خیریت سے ہوں۔ سچ پوچھیں تو اس دفعہ کا شمارہ پڑھ کر ہمیں خاص مزہ نہیں آیا۔ آفاقی صاحب کی اچانک رحلت کی خبر اور شہر خیال کے بعض بہن بھائیوں کے عزیزوں کے انتقال پر دل بہت افسردہ سا ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر ہم تمام مرحومین اور ان کے لواحقین کے لیے صدق دل سے دعاگو ہیں۔ اسرار نام کی طرح ایک پُراسرار تحریر تھی جس کو مصنف نے بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ "برے پھنسے" بھی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ واقعی ہمارے ہاں ایسا ہو رہا ہے۔ پاکستانی پولیس غریب عوام کے ساتھ جو کچھ بھی کرتی رہے۔ انہیں کھلی چھوٹ ہے کوئی پوچھنے والا نہیں اگر کوئی بات میڈیا کے ذریعے اعلیٰ حکام تک پہنچ بھی جائے تو یہ کہہ کر ٹرخا دیا جاتا ہے کہ تحقیقات جاری ہیں۔ جرم ثابت ہونے پر مجرموں کو سزا دی جائے گی اور اس کے بعد خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خزانہ بھی کسی خزانہ سے کم نہ تھی۔ بے حد دلچسپ اور معلومات

سے بھرپور یہ تحریر دل کو بہت بھائی مصنف کا بے حد شکریہ۔ آہ "ظلمی الف لیلہ......" باقی رسالہ فی الحال چھوڑ دیا ہے۔"

☆ قیصر خان کی تشریف آوری بھکر سے" اداریہ میں انکل معراج نے بہت اچھا نکتہ بیان کیا ہے۔ یہ ہمارے پیارے پاکستان میں یہود و نصاریٰ کی سازش کے علاوہ کچھ کالی بھیڑیں بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے کوئی بھی ٹھیک سمت نہیں جارہا ہے اور انجام کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شوکت رحمٰن انکل کو مبارک باد صدارت کے بہت جاندار تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے اور ڈاکٹر صاحبہ آپا باجی طاہر گلزار بھکر سے شاہ جی، وحید صاحب، بشریٰ افضل آپا، آپا سدرہ بانو ناگوری، منشی عزیز، شاہد جہانگیر، ناصر صاحب بہت اچھے تبصروں سے حاضر تھے بس ڈاک خانہ والوں کی وجہ سے یا کچھ اور وجہ سے ہم نہیں تھے۔ اس بار رسالہ نہ پڑھ سکا بہت معروف تھا بس ایک دو کہانیاں پڑھی ہیں۔ شہر خیال اور ادار یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ شامل ہو جاؤں۔ "بچانے والا" بہت اچھی کہانی تھی اس سے یہ سبق ملتا ہے اللہ تعالیٰ کو ہر مصیبت میں پکارنے والا اور اس کی نافرمانی نہ کرنے والے کے ساتھ اس کی خاص رحمت اور شفقت ہوتی ہے وہ غیب سے امداد کرتا ہے اپنے نیک بندوں کی۔ "تشنگی" سمجھ نہیں آئی محبوب کی ہر خواہش کا احترام کرے۔ عاشق یا محبوب کو برباد کرے۔ آس صاحب اگر راز کا ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو شاید کچھ نہیں کہا جاسکتا اور آپ اچانک گھر نہ جاتیں تو اس کے مہمان کی بکواس نہ سن سکتیں اور مرینہ صاحبہ نفسیاتی عارضہ میں لاحق ہیں۔ "تمنا" ایک خوب صورت ملک میں درندگی کا منہ بولتا ثبوت جو اللہ کے نام پر سب شیطان کے کام اور خوش کررہے ہیں۔ "پشیمان" جو احرام ہے اور قتل بھی۔ اب کچھ نہیں کہہ سکتے سمجھ سے باہر ہے۔"

☆ نزابت افشاں، مسہورہ تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک سے لکھتے ہیں۔ "سانحہ پشاور پر اچھی تحریر تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں اگر "بلیک ڈے لسٹ" دیکھی جائے تو غالباً یہ حادثہ سرفہرست آئے گا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ "شہر خیال" میں رانا محمد شاہد صاحب کی والدہ محترمہ کے انتقال کی خبر پڑھی۔ اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ شاہد بھائی! اگر آپ نے ماں کی خدمت کرلی تو سمجھیں ایک قیمتی سعادت آپ نے پالی۔ بہرحال ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ عمران جونانی، قیصر خان، رانا محمد شاہد، ناصرہ احمد محمود تبصرے تھے آپ سب کے۔ باجی بشریٰ افضل اگر کوئی آپ سے جلتا ہے تو پھر بھی آپ ہمیشہ خوش رہا کریں تاکہ وہ لوگ اپنے حسد میں خود ہی جلیں اور آپ ضرور لکھا کریں آپ کا یہ چھوٹا بھائی آپ کی تحریر بہت شوق سے پڑھتا ہے اور باجی طاہرہ گلزار، آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ آپ کی تحریریں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ آپی آج اس دور میں ہم مسلمان خود ایک دوسرے کی عزتیں لوٹ رہے ہیں سو ہم میں کوئی محمد بن قاسم، طارق بن زیاد، محمود غزنوی، صلاح الدین ایوبی اور سلطان ٹیپو جیسے جیالے کہاں سے آئیں۔ جنوری میں آپ کی رائے کی وجہ سے میں نے شہاب نامہ پڑھا۔ تاریخی حقائق پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے۔ خصوصاً اس کا اینڈ بہت اچھا ہے۔ میری ذاتی لائبریری میں 2500 سے زائد کتابیں ہیں آپ کی وجہ سے ایک اور اہم کتاب کا اضافہ ہو گیا۔"

☆ چودھری عامر شہزاد، شورکوٹ سٹی سے لکھتے ہیں۔ "محترم آفاقی صاحب کی وفات کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ ایک بڑا نام جس نے اپنے دامن کو آلودگی سے پاک رکھا۔ اس تربیت کار نے پرانی یادیں تازہ کریں۔ مسند صدارت پر شوکت رحمٰن خٹک کو براجمان پایا۔ ناگوری صاحب کا خط اچھا تھا۔ اویس شیخ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، سانحہ شکار پور کا ہم سب کو بے حد افسوس ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ آئی ایس آئی اور منسلک ادارے کس مرض کی دوا ہیں۔ تو جناب ایل او سی کے نزدیکی علاقوں، ریڈ زون، وی آئی پیز، کینٹ ایریاز، ایمونیشن ڈپو، بندرگاہیں، ائرپورٹ، فاٹا ایریاز وغیرہ وغیرہ۔ لکھنے بیٹھوں تو صفحے کے صفحے بھر جائیں۔ ان علاقوں کی سیکیورٹی سنبھالیں یا پھر 20 آدمیوں کے جلسے میں اپنے 20 بندے بھیجیں۔ کس کس جگہ جائیں۔ آپ لوگ بھی پاکستانی شہری ہونے کا حق ادا کریں۔ اپنے اردگرد مشکوک جگہوں، چیزوں اور آدمیوں پر نظر رکھیں۔ اس ملک کو بچانے کے لیے سب کو ایک ہونا پڑے گا۔ ہم اپنی ذمہ داری سے انکار نہیں کرتے مگر ہم اپنی عوام کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے۔ آؤ گھروں سے نکلو اور کہو "پاک فوج قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں" تم نہیں کہو گے۔ تم تو صرف سیاسی جلسوں میں ہی نعرہ لگا سکتے ہو۔ جب پاک فوج کا کوئی جوان شہید ہوتا ہے تو کوئی فاتحہ نہیں پڑھتا اور اگر سیاسی تنظیم کا بندہ طبعی موت بھی مر جائے تو دھرنے دیے جاتے ہیں، دکانیں جلائی جاتی ہیں، پاک فوج کا ایک جوان عوام کے ٹیکسوں سے ٹریننگ کرتا ہے۔ تنخواہ لیتا ہے اس کی لمبی عمر کے لیے دعا گو رہو۔ یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔ دوران جنگ میں کوئی سیاسی لیڈر بارڈر پر نہیں ہوگا صرف پاک آرمی لڑے گی۔ معافی چاہتا ہوں میرا قلم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ بہرحال خزانہ، بچانے والا، تشنگی، تمنا، اسرار اچھی کاوشیں تھیں۔ ہماری دعا ہے کہ سرگزشت دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے، آمین۔"

☆ محمد سلیم قیصر نے نیو سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔ "ٹیم سرگزشت اور پیارے قارئین کرام کی خدمت میں آداب اور السلام علیکم! شمارہ مارچ کا دیدار ابھی تک نصیب نہیں ہوا۔ انتظار تو کروں مگر خدشہ ہے کہ میری تحریر تاخیر کا شکار ہو جائے گی۔ ماہ فروری کا دلفریب سرگزشت اس وقت بھی سامنے موجود ہے۔ پہلے دن جب مجھے میری تحریر کہیں نہیں ملی تھی تو دل چھوٹا کر بیٹھا تھا۔ پھر خود کو سہارا دے کر بہلا لیا تھا۔ آپ کو پتا نہیں سکتا کہ کس قدر خاص وابستگی رکھتا ہوں۔ قارئین کرام اور سرگزشت سے۔ حلقہ سرور میں بہت مشکور ہوں۔ جناب رانا محمد سجاد، جناب عمران جونانی، جناب قیصر

خان، جناب سید انوار عباس شاہ، جناب احمد خان تو حیدی اور قابلِ احترام بہن بشریٰ افضل کا جنھوں نے جذبۂ خاص میں مجھے یاد کیا۔ ہمیشہ سلامت رہو۔ میرے چند بھائیوں نے میرے اس جگہ ہونے کی وجوہات پوچھی ہیں انشاء اللہ ضرور بتاؤں گا۔ بہن بشریٰ افضل ہم قارئین کرام ایک خاص رشتے سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ میں ہمیشہ Positive رہتا ہوں۔ مجھے قارئین سرگزشت سے بہت محبت ہے۔ ماہِ فروری میں محترمہ طاہرہ گلزار، محترمہ ڈاکٹر قرۃ العین کی غیر حاضری اچھی نہیں لگی۔ میری ایک اور بہن عظمیٰ شکور ابھی تک غائب ہیں۔ اُمید ہے خیریت سے ہوں گی۔ سرزمین اولیائے کرام میں اس وقت موسم بہت دلکش منظر پیش کررہا ہے کاش وہ مارچ کا سرگزشت میرے کمزور ہاتھوں کا حصہ ہوتا۔"

☆ غلام حسین ضیاء کا مکتوب بھکر سے۔ "برادرم عزیز آپ نے قارئین کرام کے نام مارچ کے شمارہ سرگزشت میں جو دل کی بھڑاس والا خط تحریر کیا ہے ہم بے حس لوگوں کو آپ سے 100 فیصد اتفاق ہے۔ یہ اخلاقی بیماریاں جو ہماری زندگی اور آیندہ نسل کو تباہ و برباد کررہی ہیں یہ اس اسلامی معاشرہ کا شعار رہیں۔ ہمارے پڑوسی ملک انڈیا سے تو دہشت گردی کی بھی خبر نہیں آتی (یہ خام خیال ہے۔ یہ بھتا خوری، اغوا برائے تاوان کا مرض وہاں سے فلموں کے ذریعے آیا) یہ صرف ہمارے اعمال ہی کا نتیجہ ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔ ہمارا ملک ایک آزاد ملک ہے مگر ہم تو آزاد نہیں ہم تو ان وڈیروں اور جاگیرداروں کے غلام ہیں جو ہر الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں جرائم پیشہ لوگ ان ہی کے پالتو کتے ہیں جو غریب کو جینے نہیں دیتے۔ آئے روز مہنگائی بڑھتی جارہی ہے۔ اس مہنگائی کی وجہ سے بھتا خوری کے ریٹ بھی بہت چڑھ گئے ہیں۔ پہلے بھتا ریٹ لاکھوں میں تھا اب کروڑوں میں پہنچ گیا ہے جو نہ دے سکے یا رعایت مانگے اس کا گھر جلا دیا جاتا ہے بلکہ سب کچھ ختم کردیا جاتا ہے۔ قومی محافظ بے چارے کیا کیا کریں، پتا نہیں لوگ ان سے مدد کیوں نہیں لیتے۔ معراج صاحب ہمیں انگریزوں کی 100 سالہ غلامی پر فخر ہے ہمارا رہن سہن کیا یہ سب اسلامی شعار پر چلتی ہے۔ بارک حسین اوباما امریکا سے ہندوستان دورے پر آیا۔ نریندر مودی کس لباس میں اسے ملا؟ اب اپنے گریبان میں جھانکو۔ غلامی اور آزادی کا کوئی فرق آپ کو نظر آیا؟ ضرور نظر آیا ہوگا مگر آپ مصلحتاً خاموش رہے۔ بھائی معراج ہم بھی اپنی مصلحتوں کا شکار ہیں۔ ہم بے غیرتی کے عادی مجرم ہیں۔"

☆ خیام پیرزادہ پاک پتن شریف سے لکھتے ہیں۔ "جناب والا اگر سرگزشت میں "شہر خیال" پر نظر دوڑائیں تو لگتا ہے کہ دنیا کا عظیم ترین بحران یہ ہے کہ سرگزشت کے سلور جوبلی نمبر کی تجویز کس نے دی تھی۔ اک ریس لگی ہوئی ہے اس چیز کا کریڈٹ لینے کے لیے۔ لگتا ہے جلد ہی دھواں دھار جنگ میں تبدیل ہوا چاہتی ہے۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے لاہور سے لکھا ہے۔ "پچیس سالہ رفاقت کے بعد علی سفیان آفاقی صاحب ہمیں داغِ مفارقت دے کر عالمِ جاودانی میں جا بسے۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔ مارچ کا شمارہ اور "معمہ خیال" آفاقی صاحب کی یادوں سے مزین تھے۔ ہر ساتھی اداس اور غمگین تھا اور سرگزشت کی انتظامیہ نے بھی انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان سے محبت کا حق ادا کردیا۔ "قلمی الف لیلہ" کو الوداع کہنے کا دکھ بھی اتنا ہی ہے جتنا آفاقی صاحب کو الوداع کہہ کر ہوا۔ معراج رسول صاحب نے نعرہ بیہودہ ہنود کی جو تشریح کی ہے اس نے ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کردیا جہاں سوائے ندامت اور شرمندگی کے کچھ نہ تھا۔ سچ ہے کہ جب تک ہم لوگ انفرادی طور پر سدھرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بحیثیت قوم عزت و مرتبہ نہیں پاسکیں گے۔ تربیت کار کا تربیت یافتہ پاکستانی تاریخ کا نیک نام ثابت ہوا۔ طبیعت خوشگوار ہوگئی۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحبؒ کے والد گرامی کا تذکرہ پڑھ کر۔ استادِ ادب کا ادب کرتے ہوئے ہم اتنے مودّب ہیں کہ بغیر تفصیل سے پڑھے کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے۔ جناب ابواللیث صدیقی صاحب کے ادب پر اتنے احسان ہیں کہ حقِ ادب ادا کرتے ہوئے بہت ایماندار رہنا پڑے گا۔ درسی کتابوں میں شمس العلماء پڑھتے رہے ہیں۔ ابنِ کبیر نے سیر حاصل تفصیل سے سیراب کرکے بہت احسان کیا ہے۔ ادب میں مرزا فتح بیگ کا نام ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ ایک بیوروکریٹ وہ بھی انگریز دور میں اور انگریزوں کے ہاتھوں کمال کی اوج کو پہنچا۔ پُراثر قلم کار شہر ستم گراں، نئی دنیا مناسب اور الوداع حسبِ معمول شاندار بلکہ بہت ہی شاندار تھی۔ حسن رزاقی کے اندازِ بیان نے ہمیں ان کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ منظر امام کی خزانہ معلومات کا خزانہ تھی جسے پڑھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے۔ "سراب" کا نپوست ہوگیا ہے۔"

☆ منشی محمد عزیز میئے لڈن وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ "سرورق کے اوپر والے ایک کونے میں استادِ ادب ابواللیث صدیقی تشریف فرما تھے۔ سرورق والی خاتون چوکھٹ کی اوٹ سے کیسے تک رہی ہیں۔ ویسے محترمہ کا ہاتھ بلکہ انگلیاں چہرے سے میچ نہیں کررہی تھیں اور ناخن تو گویا بالکل تھے ہی نہیں جو کہ انجانی غیر معمولی بات ہے۔ (لڈن میں آئی اسپیشلسٹ نہیں یا وہاڑی جانا پڑتا ہے؟) اشتہارات سے بیو پار کرتے ہوئے انگلی کے اداریے تک جا پہنچے۔ "معمہ خیال" کی ابتداء شوکت رحمٰن خٹک کے تعزیت نامے سے ہوئی۔ ڈاکٹر قرۃ العین! اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے کزن کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔ اور ان شہید بچوں کو ہمارے لیے بھی وسیلۂ نجات بنائے، آمین۔ طاہرہ گلزار! الجی وہ عکس تو میں نے آپ کے لیے بھیجا تھا، ملا نہیں؟ سید انور عباس شاہ اور ناصر حسین رند صاحبان! اخط کی پسندیدگی پر مشکور ہوں۔

اویس شیخ! ڈیئر بیٹا نا جیا نمبر میرے پاس محفوظ ہے مگر آپ تک پہنچاؤں کیسے؟ آپ پرویز بھائی سے میرا رابطہ نمبر لے لیں اور میرے ساتھ رابطہ کرلیں۔ بشریٰ افضل! اللہ تعالیٰ آپ اور دیگر لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ سدرہ بانو نا گوری! کافی دنوں بعد لفظی دیدار کروایا۔ خیریت، مجید احمد بھائی! میری دعوت پر سرگزشت کی محفل میں آنے پر بہت شکریہ۔ بھیا جی! یہاں سے آپ کو خلوص بھی ملے گا اور بے لوث محبت کرنے والے دوست بھی۔ بس اب یہ رشتہ قائم رکھنا۔ استاد ادب ڈاکٹر ساجد امجد کا ایک اور شاہکار تھا لیکن محترم ابن کبیر بھی مرزا فصیح بیگ پر بہت خوب صورت اور بھرپور مضمون کے ساتھ حاضر تھے اور ان کی یہ تلاش سرگزشت کے قارئین کے لیے کسی تحفے سے کم نہیں۔ پُراسرار قلم کار کی موت بھی اس کی کہانیوں کی طرح پُراسرار تھی۔ شیراز خان شہر ستم گراں کے عنوان سے اچھے اور برے دونوں اقسام کی خصوصیات کے حامل شہروں کا مختصر مگر مفصل جائزے کے ساتھ حاضر تھے۔ آپ تلاش جیسی پُراسرار کہانیاں ڈھونڈ کر لائیں ناں۔ بڑے مزے کی کہانی تھی۔ ''قلمی الف لیلہ'' کی آخری قسط میں آفاق انکل ہم سب کے لیے بہت سے سوال چھوڑ گئے۔ جن کے جواب تلاش کرنے سے ہر چھوٹا بڑا خوف زدہ ہے۔'' طارق عزیز خان نئی دنیا کی تلاش کے حوالے سے مختصر مگر بھرپور مضمون ڈھونڈ کے لائے تھے جسے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''الوداع'' کو الوداع کہتے ہوئے محترم منظر امام کے ''خزانہ'' تک جا پہنچے۔ یہ تحریر بلاشبہ اسم با مسمیٰ تھی۔ منظر امام صاحب دنیا کے گمشدہ خزانوں کے متعلق بھرپور اور نایاب قسم کا مضمون تلاش کر کے لائے تھے۔ انتہائی آسان قیمت میں یہ بہت بڑا خزانہ ملنے کے مترادف ہے اسکی تحریر کا ملنا۔ سرورق کی کہانی ''بچانے والا'' پڑھ کر ایمان پختہ ہوگیا۔ بے شک مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ بس ایمان مضبوط ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر ممتاز عمر کی ''تمنا'' پڑھ کر دل ایک بار پھر ڈوب گیا۔ ایک گل فراز کیا، بیسیوں والدین کی نہ جانے کتنی تمنائیں کتنے سپنے ادھورے رہ گئے۔ احسن سلیم کی ''تحفے'' منفرد قسم کی کہانی تھی۔ کمال ہے کوئی ضروری ہے کہ ٹیکے کے بدلے میں کار تحفتاً دی جائے۔ شاید اس طرح سے ڈورو مانیا جیسی مرض سے چھٹکارا مل جائے۔ ''ڈیزھ سیانا'' شاہنواز کی آپ بیتی میں محترم نے لکھا ہے کہ میں ملائیشیا چلا آیا جب کہ خط میں شہر اور ملک کا نام ٹورنٹو کینیڈا درج تھا؟ (جہاں سے تحریر ارسال کی جاتی ہے وہیں کا پتہ دیا جاتا ہے) آخری کہانی اسرار کے آخر میں بھی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ بلا تھی کیا؟ ''بیت بازی'' میں سندس جمال، انیس امام قمر الحسن اور سمعیہ تحریم کا انتخاب پسند آیا۔''

☆ اویس شیخ کا اظہاریہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''معراج صاحب آپ نے ایک بار پھر رلا دینے والا اداریہ لکھا۔ روز و شب ایک ہی رلا دینے والا جملہ سنتے ہیں۔ پاکستان ہے سب چلتا ہے۔ افسوس اسی کا ہے کہ ملک نہیں چلتا۔ معین خان کا کیسینو جانے کا معاملہ ہمارے مجموعی قومی روپ کی عکاسی کر رہا تھا۔ سچ، نہیں تو اپنے آپ کو مسلمان کہتے بھی شرم آتی ہے۔ بے حسی یہ بھی ہے کہ ہمیں کوئی شرمندگی بھی محسوس نہیں ہوتی۔ ترتیب کار میں خاص شخصیت کا تعارف بہت اچھا لگا۔ ''شہر خیال'' میں شوکت رحمان کا محبت بھرا خط لائق تحسین تھا جس طرح انہوں نے آفاق صاحب کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا، قابل رشک تھا۔ ڈاکٹر قرۃ العین سے اظہار تعزیت بھی کرتا ہوں۔ طاہرہ گلزار اسحریٰ اچھی لگی۔ سدرہ بانو کا خط میں لکھا خوب صورت شعر دلوں کے تار چھیڑ دینے والا تھا۔ استاد ادب کا تذکرہ ٹھیک لگا۔ ابن کبیر کی تحریر کا بھی کوئی جواب نہ تھا یہ تو سندھی ادب کا بانی شخص۔ یقیناً ایسی تحریریں سرگزشت کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ مریم کے خان صاحب اپنی طرۂ امتیاز تحریر کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ ''شہر ستم گراں'' تحریر مجھے کچھ خاص نہیں لگی۔ ''قلمی الف لیلہ'' اس مرتبہ معلومات سے بھرپور تھی۔ پارچہ جات میں، میں نے جو اقوال بھیجے تھے ان کو شائع کرنے کا بے حد شکریہ۔ سچ بتاؤں میں تو پوسٹ کر کے بھول گیا تھا۔ آپ نے حوصلہ دیا اب آئندہ وقتاً فوقتاً بھجواتا رہوں گا۔'' ''نئی دنیا'' کے تعارف کا سہرا بہت خوب صورت بندھن میں بندھا ہوا نظر آیا۔ حسن رزاقی صاحب کا سفر نامہ کافی دلچسپ تھا۔ طعنے نامی سچ بیانی نے آبدیدہ کر دیا۔ خودکشی دکھوں کا مداوا نہیں ہوتی۔ اگر طعنوں سے اتنا ہی تنگ تھا تو شہر میں رہ لیتا یا کسی دوسرے مقام پر چلا جاتا گھر میں روپے پیسے کی بھی کمی نہیں تھی۔ ''ڈیزھ سیانا'' بھی اچھی تھی۔ شاہنواز کا اپنا بدلہ خود لینا یہ تو ٹھیک تھا مگر یوں رسوا کر کے اپنی دلی تسکین کی خاطر یہ اچھی بات نہیں تھی۔ ''برے پھنسے'' سچ بیانی پر تبصرہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیوں کہ ہمارے اس محکمے کے عظیم الشان کارناموں سے بچہ بچہ واقف ہے۔ اسرار واقعتاً ایک پُراسرار کہانی تھی۔ علاقہ کے باسیوں کو اللہ نے اپنی اس مخلوق کا نظارہ کروایا۔''

☆ احمد خان توحیدی کا تحفہ کراچی سے۔ ''سرگزشت 3 مارچ کو ملا۔ برادر معراج رسول صاحب آپ چند الفاظ میں سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ اسلام کے ازلی دشمن یہود و ہنود کی اب کیا ضرورت ہے؟ بغلوں میں پھن پھیلائے کالے ناگ تو موجود ہیں۔ ترتیب کار میں حضرت مودودی کے والد محترم کے تفصیلی حالات کا شکریہ۔ ''شہر خیال'' میں بھائی شوکت خٹک کا طویل آفاقی صاحب کے بارے تبصرہ پسند آیا۔ آپ خوش قسمت ہیں 19 سال 9 ماہ تک اجنبی منزلوں سے باخبر کرنے والے عظیم رائٹر سے ذاتی طور پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آفاقی صاحب آخری تحریر میں بھی کتنے عظیم لوگوں کے بارے میں تفصیل سے لکھ کر خود اجنبی منزل پر چلے گئے۔ ''قلمی الف لیلہ'' واحد تحریر جس پر ہم نے ذائقہ بدلنے کا نہ کہا۔ بے بی گڑیا طاہرہ گلزار واقعی ہم نے اتفاق نہ کیا تو رسوائی ہمارا مقدر ہوگی۔ بھائی انور عباس دوسروں کے لیے دعا کرنے سے ہی اپنی خیر ہوتی ہے۔ مجید جانی ملتان، ڈاکٹر قرۃ العین، وحید ریاست بھٹی، بشیٰ عزیز مئے اچھے تبصرے، کے ساتھ حاضر تھے۔ مسٹرز

بشریٰ افضل، بہاولپور۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کو جوارِ رحمت میں جگہ دیں۔ میں تلاوت روزانہ کرتی ہوں۔ ڈاکٹر ساجد صاحب کی ”استادِ ادب“ ابواللیث صدیقی دلچسپ حالاتِ زندگی بمعہ اشعار بچوں نے بہت پسند کی۔ جناب ابنِ کبیر صاحب آپ سے بھی التجا ہے کہ شمس العلماء جیسے برصغیر کے رہنماؤں کے حالاتِ زندگی ہمیں اور نئی نسل کو مستقل سناتے رہیں۔ شیراز خان کی ”معیرِ ستم گراں“ کثیر شہروں کا خوب صورت حوالہ۔ ہمارے مقدر میں تو کراچی کی دھواں چھوڑتی گاڑیاں اور ٹریفک جام ہی ہے۔ طارق عزیز کی نئی دنیا، ہم نے تو کولمبس کو ہی نئی دنیا دریافت کرنے کا بانی سمجھ رکھا ہے۔ ”الوداع“ بمعہ اشعار ہوتی قتل اسٹوری تھی۔ مریم کے خان نے پُراسرار قمر کار کی کہانی اچھی لکھی لیکن اردو کہانیوں میں چاشنی زیادہ ہوتی ہے منظرامام صاحب کے خزانوں کی تلاش، لالچ بری بلا ہے۔ ہمیں تلاش کا شوق نہیں ہے۔ ”سراب“ اچھی تحریر مگر اب منہ کا ذائقہ بدل دیں کاشف زبیر جی۔ ”بیت بازی“ میں خوش بخت، حبیب الرحمٰن، نازش سحر، آصف جتول، جمیل احمد کے اشعار اچھے لگے۔ سچ بیانیاں میں ”بچانے والا“ میں نازی کا یہ کہ وہ ہر جگہ موجود سب کی سنتا ہے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے پسند آیا۔ ”تشنگی“ ہم واقعی مصنوعی زندگی کے سانس لے رہے ہیں۔ ”تمنا“ اف ہائے، زخم پھر تازہ ہو گئے۔ کتنے کیپٹن، کرنل و جنرل بننے والے ابدی نیند میں قوم کو اتفاق کا درس دے گئے۔ لیڈران احساس کریں۔ حسن سلیم کی اسٹوری تحفہ ہنسی سے لوٹ پوٹ کر گئی۔ ”طعنے“ جنس کی تبدیلی عام بات ہے۔ ہمارے بچپن میں کتنی لڑکیاں لڑکا بن کر دادا نانا کی پوسٹ پر ہیں۔ جب کہ اسکول ٹیچر لڑکا جس کی شادی کی تیاری تھی۔ لڑکی بن کر دادی، نانی کے روپ میں اب بھی موجود ہے۔ صغراں کی کم ظرفی پر ماتم۔ بخت خان کی موت کا باعث بنا۔ ”ڈیڑھ سیانا“ انہوں کی بی جی صرف نوٹوں پر، ورنہ خون سفید ہو گیا۔ شاہنواز کو بالکل طلاق نہیں دینی چاہیے۔ حلالہ کی نیت سے شادی کر کے طلاق دینا گناہِ کبیرہ ہے۔ یہ اتفاقیہ ہو سکتا ہے۔ ”برے پھنسے“ فریب کے لیے ہر تھانے میں یہی حال ہوتا ہے۔ ”تمنا“ اور ”بچانے والا“ اچھی کہانیاں ہیں۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ”جیسے ہی سرورق پر نظر پڑی تو انکل آفاق کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ دیکھ کے دل تڑپ اٹھا اور آنسوؤں کی لڑی آنکھوں سے جاری ہو گئی۔ موت کتنی ظالم شے ہے آج وہ عجب آزاد مرد جو کہ بہت نفیس شائستہ اور دردمند دل رکھنے والے تھے۔ فلم انڈسٹری کی جان علی سفیان آفاقی انکل چل بسے۔ دنیا کا نظام تو اسی طرح ہی چل رہا ہے مرنا تو سب کو ہے لیکن کچھ عظیم لوگ یاد رہ جاتے ہیں۔ تین بندوں کی موت سے شاک لگا ہے۔ پہلے ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے وقت پھر بے نظیر بھٹو کی شہادت کے وقت اور اب انکل آفاقی کی موت پر۔ اللہ سے دعا ہے کہ تینوں کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے، آمین۔ تمام قاری، انکل آفاقی کے لیے تین بار سورہ اخلاص، ایک بار آیۃ الکرسی، ایک بار سورۂ یٰس ایک بار سورہ فاتحہ اور تین بار درود شریف پڑھ کر دل سے ان کو بخشیں۔ انکل معراج کی حقیقت پسندی کی باتیں ہر بار پڑھ کے دل ودرد سے کانپ اٹھتا ہے کہ آخر ہم کیوں ایسے ہوتے جا رہے ہیں۔ کیا ہم امتِ محمدی نہیں رہے۔ انکل نے سچ ہی تو کہا ہے کہ کالے کالے ناگ تو ہمارے اندر ہے ہیں۔ ہمیں پرایوں سے زیادہ اپنوں نے ڈسا ہے۔ کاش ان ناگوں کے خلاف ہمیں کوئی تریاق مل جائے اور ہمارے اندر کا زہر نکل جائے۔ امید پر دنیا قائم ہے کیا معلوم اگلا روشن اور انصاف پسند لمحہ ہمیں بھی مل جائے۔ یک تی پر سید احمد حسن کے بارے میں مختصر اور جامع تحریر پڑھنے کو ملی۔ سچ معنوں میں سمندر کوزے میں بند کیا ہے۔ ایک بار پھر سرگزشت والوں نے میرے خط سے کہانیوں پر تبصرہ اچھی کالی اور بے حس قینچی سے کاٹ بھی اور مختصر لکھنے کا طعنہ بھی دیا۔ انکل میرے خط بہت سوں سے مختصر ہوتا ہے۔ آپ نے مجھ غریب کو نشانہ کیوں بنایا۔ انکل میرا دکھ سے دل بھر آیا آخر ہم پٹھانوں کے ساتھ ہر جگہ زیادتی کیوں کی جاتی ہے۔ ہماری محبت کو کیوں نہیں سمجھا جاتا، کیوں کیوں آخر کیوں؟ (آپ سراب پڑھتی ہیں؟ ہر ماہ 42-40 صفحے پر محیط ہوتی ہے۔ 96 ماہ سے ہر مہینے لوگ پڑھتے ہیں اس ایک کہانی کو اور بور نہیں ہوتے۔ جب کہ کوئی نیا رائٹر صرف 8 صفحے کی کہانی لکھ دے اور اس کی سطروں میں دلچسپی کا سامان نہ ہو تو لوگ بور ہو جائیں گے۔ اصل چیز ہے الفاظ کا استعمال) کہانیوں میں کم از کم ”سراب“ کی تعریف کو تو نہ کاٹا کریں۔ کاشف زبیر بھائی مجھ سے خفا ہو جائیں گے کہ میں ان کی تعریف نہیں کرتی۔ میرا دل تو زدیا سرگزشت والوں نے۔ پلیز میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے سرگزشت کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ اب تھوڑا خطوط پر تبصرہ، بہت عرصے بعد پہلے نمبر پر میرے شہر پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک صاحب حاضر تھے۔ بہت طویل اور معلوماتی تبصرہ تھا، ویلڈن۔ انجم فاروقی صاحب، اقلیم علیم صاحب نے ایک سال پہلے میرے ساتھ بھی یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ موت کے سوداگر جیسی شاہکار لکھیں گے لیکن ہائے وہ وعدہ کیا جو ایفا بھی ہو جائے؟ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ اللہ آپ کے کزن کے بیٹے کو جنت میں اعلیٰ مقام دے، آمین۔ انور عباس شاہ میں تو ہمیشہ چھ سے سات تاریخ تک تبصرہ رجسٹری کر دیتی ہوں۔ اویس شیخ کا تبصرہ بہت جاندار تھا۔ وحید ریاست بھٹی صاحب کو بھی کچھ گلے شکوے والا تبصرہ تھا۔ بشریٰ افضل جی اللہ آپ کی بہن کو جنت عطا کرے، آمین ثم آمین۔ سدرہ جی موسٹ ویلکم۔ اس بار کا تبصرہ بھی دلچسپ رہا۔ غنی عزیز میمن صاحب میں تینوں ڈائجسٹ کے لیے خط رجسٹری کرتی ہوں۔ ناصر حسین رند بھائی کا کچھ شکایتی سا تبصرہ پسند آیا۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب اس بار بہت مختصر سے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ آخری خط مجید احمد جائی کا تھا۔ مختصر سا تبصرہ اچھا لگا۔ اب غیر حاضر بھائیوں اور بہنوں سے التماس ہے کہ وہ آیا کریں یہ سرگزشت ہمارا گھر ہے اور ہم اس کے برابری کی سطح پر ایک خاندان کی طرح فرد ہیں۔ جاوید سرکانی بھائی آپ کہاں ہیں۔ جلد انٹری دیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس بہن آپ کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ اب کہانیوں سے تھوڑا سا تبصرہ حسبِ عادت پہلے اپنے

فیورٹ رائٹر The king of action کاشف زبیر کی تحریر "سراب" پہ۔ سوئی ایک بار پھر قسمہ ہو گیا۔ مجھے بھارت کے بارے میں کاشف کے یہ الفاظ جو صفحہ نمبر 172 پر ہیں "بھارتیوں سے خیال آیا..... خوف اس کا ہے کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔ بہت پسند آئے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور بھی کیا۔ کاشف اس بار شہباز کو افغانستان کی سیر کرالایا۔ کاشی بھائی مجھے افغانستان کے لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ شہباز ایک بار پھر ڈیوڈ شاہ کے ہاتھ لگا اور پھر وادی کا چکر شروع۔ حسب عادت سچی کہانیوں پر تبصرہ جو ہر بار شائع نہیں ہو پاتا اس بار کی پہلی سچی کہانی "بچانے والا" واقعی جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اب تو مظفر اور فیصل جیسے لوگ قدم قدم پر ہوتے ہیں۔ دوسری کہانی "تشنگی" واقعی آج کل لوگ مصنوعی زندگی کے اتنے غلام بن گئے ہیں کہ دل کا سکون تباہ ہو کے رہ گیا ہے۔ مریندا اپنی گھٹیا سوچ کے ذریعے آپ کی زندگی خراب کر رہی تھی لیکن اللہ نے اس کو بچایا۔ فراز جیسا شوہر تو خوش نصیب بیویوں کو ملتا ہے۔ اچھا لگا کہ جلد آسیہ کو عقل آگئی۔ تیسری کہانی "تمنا" ڈاکٹر ممتاز عمر نے شاہ زیب کی یاد دلا کر پھر رلا دیا۔ 16 دسمبر کا واقعہ تو کافر کو بھی رلا دیتا ہے۔ چوتھی کہانی "پشیمان" ہمارے اس منافقت سے بھرے معاشرے کی عکاسی کرنے والی کہانی آج بھی تو بہن، بیٹی کی زندگی اپنے مطلب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پانچویں کہانی "تحفے" ہنس ہنس کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چھٹی کہانی "طعنے" اف ہمارے معاشرے کا ایک اور ناسور ہر بات میں طعنہ دینا ہم اپنا حق سمجھتے ہیں اور قدرت کے کاموں کو انسان کی غلطی سمجھ کے ان کی زندگی بخت خان جیسی بنا دیتے ہیں۔ ساتویں کہانی "ڈیڑھ سیانا" میں شاہنواز نے بہت اچھا کیا۔ ان مردوں نے اسلام کو کھلونا سمجھا ہوا ہے جس طرح چاہیں گے چابی دیکھ کے استعمال کریں گے۔ آٹھویں کہانی "برے پھنسے" کا ایک لفظ بھی غلط نہیں لگا۔ ہماری پولیس کیا معلوم نہیں ہے کہ کیسی ہے۔ نویں کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی تھی۔ پڑھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ کوئی پارر موی دیکھ رہی ہوں۔ مظہر امام کی انوکھی اور سنسنی خیز تحریر "خزانہ" بہت اچھی اور مختصر تحریر تھی۔ طارق عزیز خان کی مختصر تحریر "نئی دنیا" بھی اچھی تھی۔ آفاقی انکل کی آخری تحریر "فلمی الف لیلہ" نے پڑھتے وقت رلا دیا۔ ان کی بہت یاد آئی اور دل سے ان کی مغفرت کے لیے دعا نکلی۔ باقی سرگزشت مصروفیت کی وجہ سے بعد میں پڑھوں گی۔ آخر میں تمام غیر حاضر تبصرہ نگاروں کو واپس آنے کی التجا۔"

☆ شگفتہ مشتاق کی تشریف آوری لاہور سے۔ "مارچ کا شمارہ خود خرید کر گھر لائی۔ بڑے شوق سے "شہر خیال" کا جائزہ لیا لیکن یہ کیا؟ میرا خط ندارد! بلیک لسٹ میں بھی نام نہیں تھا۔ میں سرگزشت کی بیس سالہ پرانی قاریہ ہوں میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟ (اگر وقت پر خط آ جائے تو ضرور لگے گا) اداریہ بے حد فکر انگیز تھا۔ اویس شیخ بھائی آپ "بچانا بچا" مجھ سے منگوا سکتے ہیں۔ میں نے سرگزشت کے بہت سے شمارے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ آج کل میں بہت مشکل حالات سے دوچار ہوں۔ شہر خیال کے ساتھیوں سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں۔"

☆ شہزاد احمد خان نے پنجاب سے لکھا ہے۔ "سرگزشت گزشتہ سات برس سے باقاعدگی سے زیر مطالعہ رہا ہے۔ پہلی بار قلم اٹھایا ہے۔ علی سفیان آفاقی کی رحلت کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ ان کی تحریر "فلمی الف لیلہ" معلومات کا ایک خزانہ تھی جو ان کی رحلت کے ساتھ اختتام پذیر ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ مارچ کا سرگزشت نیم کو ملا۔ سرورق جاذب نظر تھا۔ ملکی صورت حال کا ایسا سادہ اور جامع تجزیہ معراج صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ یہ سازش اپنوں کی ہے دھوکا فراڈ فریب مسلمانوں نے اس طرح اپنایا ہے جیسے نئی نسل نے نئے فیشن۔ یک کی میں سید احمد حسن کا مختصر تذکرہ۔ بے حد معلوماتی رہا۔ سب سے پہلے "سراب" پڑھی۔ شہباز پھر ڈیوڈ شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ عجیب بات ہے جب سے کہانی شروع ہوئی ہے شہباز مچھلی کی طرح کبھی پکڑ میں آ جاتا کبھی پھسل کے نکل جاتا ہے۔ عجیب گورکھ دھندا ہے۔ سچ بیانیوں میں "بچانے والا" نمبر ون رہی۔ "اسرار" عجیب رموز کی کہانی تھی۔ "طعنے" اور "تحفے" مزہ دے گئے۔ "فلمی الف لیلہ" کا انجام۔ "خزانہ" بھی معلوماتی تحریر تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

☆ انجم فاروق ساحلی کا خط لاہور سے۔ "آفاقی صاحب چلے گئے اور اپنی یادیں چھوڑ گئے پر چاہ ان کی یادوں سے جگمگا رہا تھا۔ "فلمی الف لیلہ" کے مقابل صفحہ پر "آہ علی سفیان آفاقی" کے عنوان سے انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ تحریر خوب تھی۔ معلوماتی اور تحقیقی مضامین تقریباً سبھی اچھے تھے۔ "خزانہ" خوب صورت تصاویر سے مزین تھی۔ "سراب" اپنے روایتی ولولے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ "بیت بازی" میں اشعار کا انتخاب بھی لائق توجہ تھا۔ تشنگی، تحفے اور برے پھنسے آپ بیتیاں اچھی ہیں۔ "بچانے والا" اور "اسرار" میں تمہیدی گفتگو زیادہ اور واقعہ نگاری کم ہے۔ استاد ادب ابھی زیر مطالعہ ہے۔ شیکسپیئر کی تصویر ایک بڑے فنکار کی عکاسی کرتی ہوئی جاذب نظر تھی۔ شیکسپیئر کے بارے میں آفاقی صاحب کی گفتگو دلچسپ تھی مگر مسئلہ یہ ہے کہ جاسوسی ناول نگار کے مقابل خالص ادبی شخصیات کو زیادہ بڑا مقام دیا جاتا ہے۔ (مشرق و مغرب دونوں میں) شیکسپیئر اور جیمس ہیڈلے چیز میں ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں ہی انسانی جذبات اور نفسیات کے ماہر ہیں۔ جیمس ہیڈلے چیز انسانی نفسیات کے متنوع پہلو اپنے کرداروں کے رویوں سے عیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ جاسوسی کہانیاں پڑھنے والے ادبی قارئین کی نسبت زیادہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں لیکن اپنے ماحول میں بھی دیکھیں تو ابن صفی بہت مشہور و مقبول ہوئے، بڑی تعداد میں فروخت بھی ہوئے لیکن منٹو کو بڑا مقام دیا جاتا ہے۔ غالب اور اقبال کے بعد سب سے زیادہ کام ہند و پاک میں منٹو پر ہی ہوا ہے۔ ہمارے ایک افسانہ نگار دوست پرویز انجم منٹو پر تحقیق کے ماہر ہیں۔ ان کی ایک کتاب منٹو غالب کا پرستار فیصل آباد سے چھپ چکی ہے۔ سکیل نگاری کے زمانے میں مدیر سرگزشت اپنے

فرائض محنت لگن سے انجام دیتے ہیں اور عرق ریزی سے آپ بیتیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے اظہارِ خیال کے بعد الفاظ کے استعمال میں احتیاط کی جا رہی ہے۔ آپ کا شمار بھی اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے جن الفاظ سے نوازا اب مجھے مزید بہتر سے بہتر کی کوشش کرنا ہوگی۔ لباس کا ارتقا اور خطرناک مجرم انگلستان کے جریدے رو برو پر پیش آنے والا سچا واقعہ جلدی بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے بعد شکاریات کی ایک تحریر بھی مکمل ہو جائے گی۔"

☆ فیروز علی عاجز گل آباد بنگی ضلع چارسدہ سے لکھتے ہیں۔ "میں تقریباً دو سال سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں اور پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مارچ کا شمارہ دو تاریخ کو فیض نیوز ایجنسی سے ملا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ کیا بتاؤں کتنے انتظار کے بعد ملا ہے۔ انکل علی سفیان آفاقی کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ سب سے پہلے استادِ ادب پڑھی۔ دوسرے نمبر پر اپنی پسندیدہ سلسلے وار کہانی "سراب" پڑھی۔ "پُراسرار قلم کار" پڑھی۔ سچ بیانی میں پہلے "بچانے والا" پڑھی۔ سچ ہے مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ سانحہ پشاور یعنی "تمنا" پڑھ کر دل بہت دکھی ہوا۔ ایسے لوگوں کو اللہ بالکل معاف نہیں کرے گا۔ "طعنے" میں لڑکی سے لڑ کا بننا کوئی جرم نہیں تھا لیکن سب اس کے پیچھے پڑ گئے۔ "ذرہ سیانا" میں حق نواز نے چھوٹے بھائی کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا تھا۔"

☆ محمد حمزہ غلام حسن کا خلوص نامہ حیدر آباد سے۔ "مارچ کا شمارہ پڑھا حسبِ سابق بے حد معلوماتی تھا۔ محترم ڈاکٹر ساجد امجد کا توشۂ خاص ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بے حد متاثر کیا۔ ہمیں وہ علی گڑھ کی فضاؤں میں لے گئے۔ ایک بے حد علمی شخصیت کا تعارف جوان کے استاد بھی تھے بے حد متاثر کن تھی۔ اللہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ دیگر تحریریں بھی خوب رہیں۔ علی سفیان آفاقی کا آخری شاہکار کے بعد اب کون سی شخصیت اس موضوع پر قلم اٹھائے گی؟"

☆ سہیل احمد عباسی بنو عاقل سے رقم طراز ہیں۔ "اس دفعہ زیادہ تر خطوط میں مرحوم علی سفیان آفاقی کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے جس میں سب سے زیادہ شوکت رحمٰن والا صدارتی خط قابلِ تذکرہ ہے جس میں انہوں نے اپنی پرانی یادوں کا ذکر کیا ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! مردوں کو چار شادیوں کی اجازت شریعت نے عطا کی ہے ہم آپ سے صرف یہی کہنا چاہتے ہیں کہ جو چیزیں شریعت نے حلال کیں اور اجازت دی ہے ان کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے اور کسی بھی طرح اپنی ناآسودہ زندگی کا بہانہ بنا کر شرعی مسلمات پر تبصرہ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کی جسارتوں سے تو ہمیں اب ڈر لگنے لگا ہے۔ ناصر حسین رند صاحب! اتنی بے تکلفی سے یاد کرنے کا ایک مرتبہ پھر شکریہ۔ اپنے دل کو خاطر جمع رکھیے۔ سرگزشت اور آپ سے ان شاء اللہ آگے بھی تعلق برقرار رہے گا۔ منشی محمد عزیز! واقعی ہمایوں دین چوہدری صاحب کہاں ہیں، سرگزشت میں کوئی نہیں بتاتا ان کے بہترین سالانہ تجزیے اپنی ایک منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ مجھے یاد کرنے والے قدردانوں سید انور عباس شاہ، سدرہ بانو ناگوری، مجید احمد کا خصوصی طور پر شکریہ۔ جب کہ شاہد جہانگیر شاہد، وحید ریاست بھٹی، اویس شیخ، انجم فاروق ساحلی، ڈاکٹر قرۃ العین، بشریٰ افضل صاحبہ کے خطوط بھی بہترین تھے۔ اردو زبان وادب کے محسن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کا زندگی نامہ، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا ایک اور بہترین مقالہ تھا۔ سندھی زبان کے بہترین ادیب اور اس کے محسن شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کے بارے میں ابنِ کبیر کا مضمون اس دفعہ سرگزشت کی سب سے بہترین تحریر جسے پڑھ کر اپنائیت بھرا احساس ہوا۔ ایڈگر ایلن پو جیسے ادیب کے ساتھ یہ ہوا تھا ہم پڑھ کر حیران ہیں۔ سرگزشت ایسی ہی نادر و نایاب تحریروں کے لیے پہچانا جاتا ہے۔"

اریاز خان کا خط پشاور سے۔ "معبر خیال کی ہردلعزیز شخصیت اور سرگزشت کے مقبول لکھاری، شاہد جہانگیر شاہد کا گزشتہ دنوں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ تمام دوستوں سے دعا کی اپیل ہے۔"

☆ محمد عارف قریشی نے بھکر سے لکھا ہے۔ "شمس العلماء کے نام سے سندھ کی ایک معروف شخصیت مرزا قلیچ بیگ کے بارے میں مضمون بہت معلوماتی ہے اور اس میں ان کی شخصیت کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ تاہم ایک اہم بات اس میں درج ہونے سے رہ گئی کہ مرزا قلیچ بیگ کی عوامی خدمات کے پیشِ نظر کراچی کی ایک سڑک کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ سڑک ایم اے جناح روڈ (بندر روڈ) سے سولجر بازار کو بیج کرتی ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے (کیوں کہ یہ کئی سال پہلے کی بات ہے) میں نے اسی روڈ یعنی مرزا قلیچ بیگ روڈ پر ایک پرانے بنگلے پر ان کے نام کی تختی بھی لگی ہوئی دیکھی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کی رہائش اسی روڈ پر تھی۔ کیا مضمون نگار (ابنِ کبیر) اس حوالے سے میری تصدیق یا تردید فرمائیں گے؟ دریا خان ضلع بھکر کے سید انور عباس شاہ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ کتاب "مشاہیر میانوالی" بھکر مارکیٹ میں آ چکی ہے اور دریا خان میں یہ عوامی کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ وہ چاہیں تو وہاں سے یہ کتاب حاصل کر سکتے ہیں۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

ارشد عباس، جاذب علی، فرحت ہمایوں، زرینہ جوجو (کراچی)، آفاق بٹ، عشرت عثمانی، ممتاز ملک (لاہور)، اریاز خان (پشاور)، نقی کاظمی (کوئٹہ)، اشرف علی خان (سوئی بلوچستان)، حیدر علی (ساہیوال)، نادر حیات (جہلم)، آرزو علی (گجرات)، عشرت بھٹی (خانیوال)، وزیر علی (فیصل آباد)، نادر عباس (سیالکوٹ)، حیدر علی خان (سرگودھا)۔

خلاشناس

ڈاکٹر ساجد امجد

بچپن میں اسے غبی، کند ذہن اور احمق سمجھا جاتا تھا۔ اساتذہ اس سے نالاں رہتے تھے مگر جب اس نے اپنے ذہن کی پرواز کا پرتو دکھایا تو دنیا اسے علم سائنس کا درخشندہ ستارہ قرار دینے پر مجبور ہو گئی کیوں کہ اس نے تحقیق کے ذریعے سائنس کو صحیح راہ پر ڈالا۔ یونانیوں کی پھیلائی بے سروپا باتیں، نظریے، تصوّر کو مسترد کردیا۔ اس نے نیا کلیہ فراہم کیا تو سب چونک گئے۔ یورپ و امریکا میں تہلکہ مچ گیا۔ پرانے کلیہ کو صحیح ماننے والے سائنسدانوں نے اسے غلط ٹھہرانے کی کوشش کی تو اس نے تجربے کی کسوٹی سے ان ہی کو غلط ٹھہرا دیا۔ آج بھی اسے صدی کا سب سے بڑا سائنسداں مانا جاتا ہے

دنیائے سائنس کے ایک بڑے سائنسداں کا زندگی نامہ

وہ ایک چھوٹا سا زمیندار تھا۔ اپنی زمین تھی مگر بس اتنی کہ گزر اوقات ہو سکے۔ اس زمین پر اس نے ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا جس میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ کچھ مویشی پال لیے تھے جن کی دیکھ بھال کے لیے چند ملازم رکھ لیے تھے لیکن یہ ملازم اس کے پاس کم ہی ٹکتے تھے۔ وہ وحشی اور مغرور سمجھا جاتا تھا۔ اس میں حقیقت بھی تھی۔ ملازموں سے بات بات پر الجھ جاتا تھا اور نتیجے میں وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ پڑھا لکھا بالکل نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اپنے دستخط تک نہیں کرسکتا تھا۔ ایک اس پر ہی منحصر نہیں۔ بلکہ قصبے میں کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں تھا حالانکہ یہ قصبہ لندن جیسے بڑے شہر سے شمال کی طرف جانے والی شاہراہ پر صرف ایک میل کی دوری پر واقع تھا۔ یہاں کے لوگ بھیڑیں پالتے تھے اور ان کا اون فروخت کرتے تھے اسی لیے اس قصبے کا نام وولز تھورپ رکھ دیا گیا تھا جس کے معنی تھے بھیڑیں پالنا اور ان سے اون وغیرہ حاصل کرنا۔

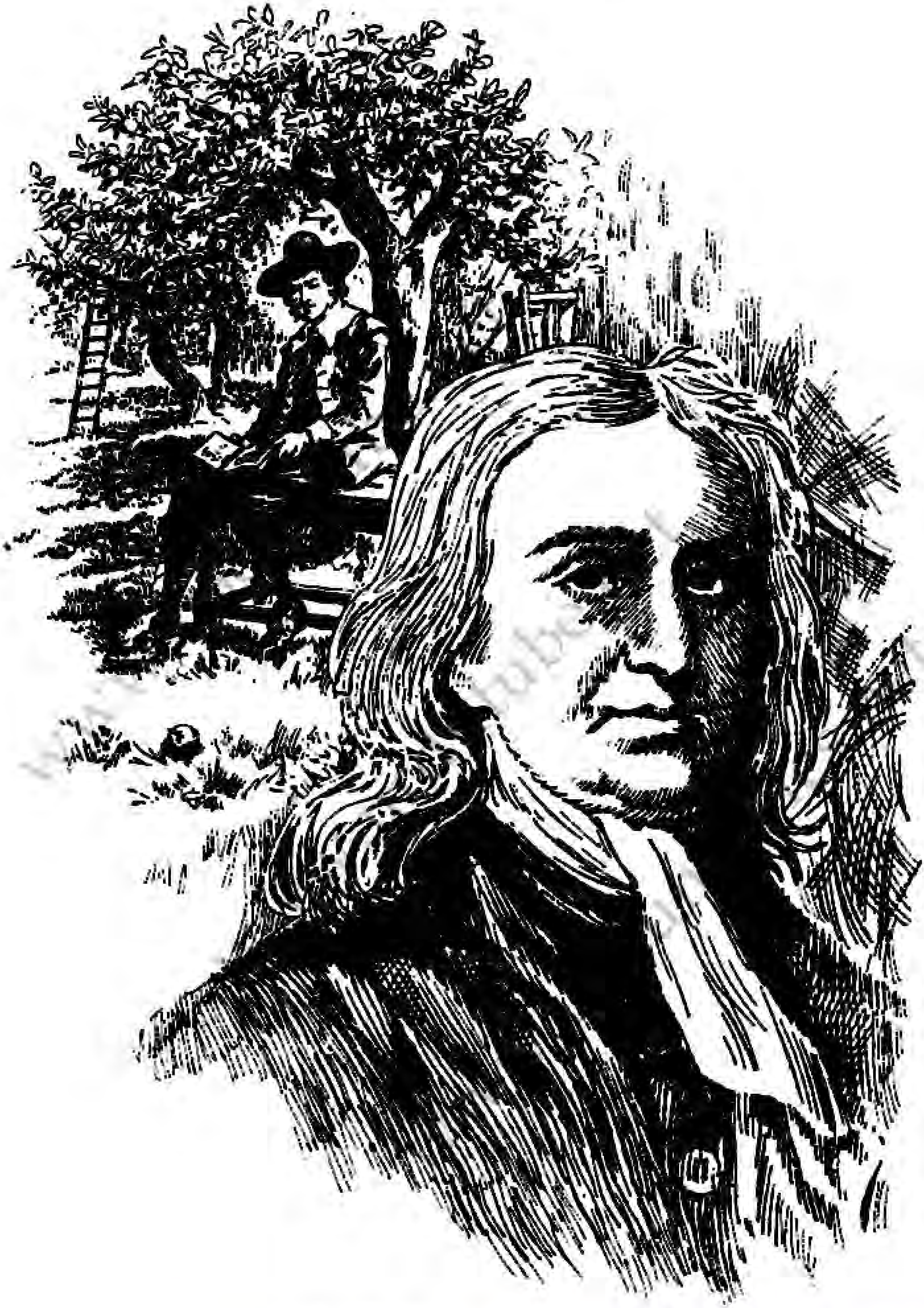
ایسے اجڈ آدمی کا دوست کون ہو سکتا تھا۔ اس کا بھی کوئی دوست نہیں تھا، اگر اس سے کوئی ملتا بھی تھا تو اس مصلحت سے کہ ایسے آدمی سے بنا کر رکھنا ہی دانش مندی ہے۔

ولیم ازکیو ایک روز اپنے گھوڑے پر سوار اس کی زمین کے قریب سے گزر رہا تھا کہ اس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ولیم اس خوف سے رک گیا کہ اگر نہ رکا تو وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔

''میں نے سنا ہے تم کچھ پڑھ لکھ لیتے ہو؟'' اس نے ولیم سے پوچھا۔

''ہاں، ہمارے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا رواج ہے۔ میں نے بھی کچھ پڑھ لیا ہے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ظاہر ہے کوئی ایسا کام ہوگا جو کوئی پڑھا لکھا ہی کر سکتا ہے۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں روکنے کی اور پھر تم میری زمین سے گزر رہے تھے، میرا حق تھا تمہیں روکنا۔''



''اچھا، اچھا بتاؤ کیا کام ہے مجھ سے۔''

''ابھی تو کوئی کام نہیں لیکن یہ وعدہ کرو کہ اگر کبھی کوئی خط وغیرہ پڑھوانا ہوا تو تم میرے کام آؤ گے۔''

''آتزک تم بھی کمال کرتے ہو۔ ہم دونوں ایک ہی قصبے میں رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام نہ آئے تو پھر فائدہ کیا۔''

''یہ ہوئی نا مردوں والی بات۔'' اس نے ولیم کے شانے پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا مگر تم تو اچھے آدمی ہو۔''

''مجھے بھی تم اچھے معلوم ہوئے۔'' ولیم نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آج سے ہماری تمہاری دوستی ہوئی۔''

''یہ آتزک اور ولیم کی دوستی کا آغاز تھا۔ اس دن کے بعد سے ولیم بھی کبھار اس سے ملنے آنے لگا تھا۔ جیسے جیسے یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں ولیم پر یہ عقدہ کھلتا گیا کہ آتزک زبان کا سخت ہے لیکن دل کا برا نہیں بلکہ بہت سے شائستہ لوگوں سے بہتر ہے۔''

بہت جلد یہ دوستی یک طرفہ نہ رہ سکی۔ آتزک کے دل میں بھی اتنی ہی جگہ پیدا ہو گئی جتنا ولیم اس سے متاثر ہوا تھا۔ ایک دن آتزک اس سے ملنے اس کے گھر گیا۔

وہ دونوں ایک کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی کمرے میں آئی۔

''یہ میری بہن ہانہ ہے، ہانہ از کیو۔'' ولیم نے اپنی بہن کا تعارف کرایا۔

آتزک نے اپنی عادت کے مطابق شرما کے گردن جھکا لی۔ اس نے یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ یہ لڑکی دیکھنے میں کیسی لگتی ہے۔ ہانہ کو اس کی یہ ادا اسی بھائی کہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

''آپ کے یہ دوست تو بالکل لڑکیوں کی طرح شرماتے ہیں۔'' ہانہ نے کہا۔

''شرفا کا قاعدہ یہی ہے اور اب تم جاؤ یہاں سے۔''

بھائی کے کہنے سے وہ چلی تو گئی لیکن یہ مہمان اس کے دل میں اتر گیا۔ وہاں سے ہٹنے کے بعد بھی وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ وہ اس سے کم از کم بیس سال بڑا تھا لیکن اس کا صحت مند جسم اور شرمیلی ہنسی اسے بہت اچھی لگی تھی۔ ابھی وہ اس پسندیدگی کو کوئی نام نہیں دے سکی تھی لیکن وہ جب بھی آتا تھا وہ کسی نہ کسی بہانے وہاں پہنچ ضرور جاتی تھی جہاں وہ بیٹھا ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان باتیں بھی ہونے لگی تھیں۔ یہ باتیں زیادہ تر جانوروں اور زمین کے بارے میں ہوتی تھیں۔ آتزک کے لیے اس کی یہ خوبی مرعوب کن تھی کہ وہ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتی تھی۔ قصبے کی دوسری ان پڑھ گنوار لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔

جب آتزک کا آنا جانا بڑھ گیا تو باتوں کی نوعیت بدل گئی۔ آتزک کو بھی احساس ہونے لگا کہ ہانہ صرف اس سے ملتی نہیں ہے بلکہ اسے پسند بھی کرنے لگی ہے۔ اب وہ بھی کوشش کرتا تھا کہ وہ اس وقت اس کے گھر جائے جب ولیم گھر پر نہ ہو۔ اس کی حیثیت اب گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گئی تھی۔ ہانہ کی ماں بھی گھنٹوں بیٹھ کر اس کے ساتھ باتیں کرتی رہتی تھی۔ ہانہ کو یہ اجازت بھی مل گئی تھی کہ اگر وہ چاہے تو آتزک کے ساتھ گھومنے جا سکتی ہے۔

یہ خوشگوار ماحول اس وقت تلخی میں بدل گیا جب ہانہ نے اپنی ماں کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور آتزک سے شادی کے لیے اصرار کیا تو اس کی ماں بھڑک اٹھی۔

''لڑکی، تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کا اور تیرا کوئی جوڑ ہے وہ کچھ نہیں تو 35 سال کا ہوگا اور تو ابھی صرف سولہ کی ہوئی ہے۔ خاندان کے اعتبار سے بھی ہم اس سے بہت بہتر ہیں۔ وہ پڑھا لکھا بھی نہیں۔ تیرے بھائی سے دوستی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسے اپنا داماد بھی بنا لیں۔''

اس نے ماں کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد بھائی سے ذکر کیا۔ اعتراض اسے بھی تھا لیکن جلد ہی مان بھی گیا۔ اب مسئلہ ماں کو منانے کا تھا۔ وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھیں لیکن انہیں بھی بالآخر گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ ولیم از کیو کی کوششوں سے یہ شادی ممکن ہو سکی۔ اس کے لیے آتزک ہمیشہ ولیم کا شکر گزار رہا ہے۔

ہانہ اپنے ساتھ جہیز کے طور پر کچھ زرعی زمین لائی جس سے 50 پاؤنڈ ماہانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ آتزک کی اپنی زمین بھی تھی۔ دونوں سے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ آتزک اچانک دولت مند ہو گیا۔

ہانہ کے لیے یہ شادی بچپن کی ضد تھی۔ ناکام بھی ہو سکتی تھی۔ آتزک کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ اس لیے یہ اُمید اور بھی زیادہ تھی لیکن شادی ہوتے ہی آتزک یکسر تبدیل ہو گیا۔ قدرت کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ شادی کے پہلے ہی سال میں اس کی بیوی یعنی ہانہ حاملہ ہو گئی۔ اس نے

یہ خوش خبری جب آئزک کو سنائی تو وہ خوشی سے ناچنے لگا۔
"ہانہ، اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ میں قصبے کے لوگوں کی طرح اسے جاہل نہیں رہنے دوں گا۔ اسے خوب پڑھاؤں گا تا کہ خط لکھوانے کے لیے مجھے تمہارا یا تمہارے بھائی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔"
"اسے دنیا میں آنے تو دو۔ ابھی آیا ہے نہیں اور اس کے پیچھے پڑ گئے۔"
"دیکھنا تو وہ قصبے کا سب سے امیر آدمی ہوگا۔"
"اگر بیٹی ہوئی؟"
"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس مرتبہ بیٹی ہوئی تو اگلے سال بیٹا ہو جائے گا۔"
یہ اور اس جیسی باتیں اس گھر میں روز ہی ہوتی تھیں اور بے چینی سے اس دن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔
ہانہ کو چھٹا مہینہ لگ گیا تھا کہ آئزک نے یہ مثل سچ کر دکھائی کہ آدمی صدمے ہی سے نہیں مرتا بلکہ کبھی خوشی سے بھی مر جاتا ہے۔ غالباً اتنی بڑی خوشی وہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ ایک دن اس کا دل دھڑکنا بھول گیا اور اسے یہ یاد نہیں رہا کہ اسے بیٹے کی ولادت تک زندہ رہنا ہے۔ وہ کھیتوں پر جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ ہارٹ فیل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں میں آ گیا۔
ہانہ نے کس شوق سے اس سے شادی کی تھی۔ کتنے اچھے دن گزر رہے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شوہر کی وفات کے بعد وہ بھی بستر سے لگ کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگتی لیکن اب کی بات اور تھی۔ اس کی ماں اسے سمجھا رہی تھی کہ کسی کے مرنے سے زندگی رک نہیں جاتی۔ تجھے ایک زندگی پیدا کرنے کے لیے خود بھی زندہ رہنا ہوگا۔ ہانہ نے ماں کی نصیحت کو گرہ سے باندھ لیا۔ چند روز شوہر کی وفات کا غم منانے کے بعد بستر سے اٹھ گئی اور ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔ آئزک کی وفات کے بعد شوہر کی تمام جائیداد ہانہ کو مل گئی تھی۔ گھر، جھونپڑے، کھیت، اناج، بھیڑیں اور بہت سامال واسباب۔ اب اسی کو تمام کام سنبھالنا تھا۔ زرعی زمین کی حفاظت بھی اور ملازمین سے کام لینا بھی۔
تین مہینے اور گزر گئے۔ پیدائش کا وقت نزدیک آ گیا تھا۔ ہانہ کو اپنے میکے میں جا کر رہنا پڑا تا کہ اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے۔ پہلا بچہ تھا، شوہر سر پر نہیں تھا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ بالآخر بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا۔ ہانہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ بیٹا پیدا ہو تا کہ بڑا ہو کر اس کا ہاتھ بٹائے اور اپنے باپ کی جائیداد کی حفاظت کر سکے۔
قصبے کی واحد دائی آ گئی تھی۔ خاندان کی چند عورتیں بھی جمع ہو گئی تھیں تا کہ سب مل جل کر پیدائش کے عمل میں ہاتھ بٹا سکیں۔ گھر میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ گھر کے ملازم انعام کی آس لگائے بیٹھے تھے۔
بچہ پیدا ہوا۔ ہانہ کی دعاؤں کے مطابق لڑکا ہی تھا لیکن اتنا چھوٹا اور کمزور تھا جیسے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا ہو۔ پورے ہاتھ کی بجائے چٹکی سے پکڑ کر اِدھر سے اُدھر رکھ دو۔ عورتوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔
"اسے تو بستر کی بجائے شراب کے گلاس میں ڈال دو۔ یہ آسانی آ جائے گا۔" ایک عورت نے دوسری سے سرگوشی کی۔ یہ مبالغہ سہی لیکن وہ واقعی ایسا ہی تھا۔ ہانہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دھچکا اسے اس وقت لگا تھا جب اس کے شوہر کی وفات ہوئی تھی۔ ایک دھچکا اب لگا جب اس نے بچے کو دیکھا۔ یہ بھی بہت جلد اپنے باپ کے پاس چلا جائے گا۔
اس کے بچنے کی اُمید واقعی کم تھی۔ گوشت کا لوتھڑا کتنے دن سانسیں لے گا؟ یہ بات چھپنے والی نہیں تھی۔ کمرے سے نکلی اور صحن میں پہنچی۔ ملازم اپنے اپنے کاموں کے لیے گھر سے باہر نکل گئے کہ جب بچے کو مر ہی جانا ہے تو انعام کون دے گا۔
ہانہ نے یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ بچے کا کوئی نام رکھے۔ کیونکہ جب مر ہی جانا ہے تو نام رکھنے کا فائدہ؟
اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ ہر دن یہی احساس ہوتا تھا کہ بس یہ دن گزر گیا۔ وہ ایسا سخت جان نکلا کہ دن پر دن گزرتے گئے اور وہ زندہ رہا۔
جب چند دن اطمینان سے گزر گئے تو ہانہ نے بچے کا نام اس کے باپ کے نام پر آئزک نیوٹن رکھا۔
اب اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔ ابھی تک وہ اسے بپتسمہ کرانے کے لیے گرجا گھر نہیں لے گئی تھی لیکن اب لے جانا ضروری تھی۔ وہ اسے وولز تھورپ کے چھوٹے سے گرجا گھر میں لے گئی۔
بچہ (نیوٹن) ایک سال کا ہو گیا تھا لیکن کمزوری کی وجہ سے اس کی گردن ایک جگہ ٹکتی نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر لڑھکتی رہتی تھی۔ گردن کو مناسب مقام پر روکنے کے لیے ایک چھوٹا سا کالر بنوایا گیا۔

اب ہانہ اس طرف سے تو مطمئن ہوگئی تھی کہ وہ زندہ رہے گا لیکن یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ کیا زندگی بھر یہ اتنا ہی کمزور رہے گا کہ کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکے گا۔

☆......☆

قصبہ نارتھ ووہم کا پادری برنیس اسمتھ گرجا کی عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس کی شادی کی باتیں نکل آئی تھیں۔ پادری کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ نئی بیوی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس وقت بھی باتیں چھڑ گئی تھیں۔ ایک دوست نے اسے ہانہ کے بارے میں بتایا۔

"برنیس، آپ کو معلوم ہے میرے کچھ رشتے دار قصبہ وولز تھورپ میں رہتے ہیں۔ انھی کی زبانی ہانہ ازکیو نامی ایک لڑکی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے۔ وہ بیوہ ہوئی تھی۔ اس کا ایک بچہ ہے۔ وہ بیوہ ضرور ہے لیکن کم عمر ہے۔ زیادہ سے زیادہ اٹھارہ بیس سال عمر ہوگی۔ پڑھی لکھی ہے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ آپ کہیں تو اپنے رشتے داروں کے ذریعے بات کروں۔"

"لڑکی دیکھنے میں کیسی ہے؟"

"آپ کو دکھا بھی دی جائے گی۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ خوب صورت کہی جا سکتی ہے۔"

"بات کرلو۔ دیکھو وہ لوگ کیا کہتے ہیں۔"

پادری کا رشتہ ہانہ کے گھر پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر ہانہ کے گھر والے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہر پہلو سے غور کیا گیا۔ یہ ایک معزز پادری کا رشتہ تھا جو قدرے امیر بھی تھا۔ عمر ذرا زیادہ تھی لیکن اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ ہانہ کا سابق شوہر بھی عمر میں اس سے بہت بڑا تھا۔ اب تو وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ یہ رشتہ ہر طرح سے مناسب سمجھا گیا۔ ہانہ سے ذکر کیا گیا تو اسے بھی کوئی برائی نظر نہ آئی۔ اس نے بھی ہاں کر دی۔ اب پادری اسمتھ کو بلایا گیا تاکہ ضروری باتیں طے کرلی جائیں۔

پادری ہر بات پر تیار تھا لیکن ایک مسئلے پر آ کر سوئی اٹک گئی۔

وہ ہانہ کے بچے کو اپنے ساتھ رکھنے کو کسی طرح تیار نہیں۔ "اسے اپنی نانی کے گھر رہنا ہوگا۔ ہانہ میرے ساتھ اکیلی نارتھ ووہم منتقل ہوگی۔"

آئزک نیوٹن اس وقت صرف تین سال کا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ بہ مشکل ایک سال کا لگتا تھا۔ کمزور و ناتواں اس حالت میں ہانہ اسے تنہا کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ کون اس کی دیکھ بھال کرتا۔ دوسری طرف ہانہ کی ماں کو یہ فکر تھی کہ ہانہ کب تک بیوگی کے دن کاٹے گی۔ اس کے بعد نہ جانے ایسا رشتہ ہاتھ آئے یا نہ آئے۔ انھوں نے ننھے نیوٹن کی دیکھ بھال کا ذمہ خود اٹھانے کا عہد کرلیا اور ہانہ کو مجبور کیا کہ وہ شادی کرلے۔

"نیوٹن ہمیشہ تو چھوٹا نہیں رہے گا اور پھر نارتھ ووہم کا قصبہ چند میل کے فاصلے پر ہی تو ہے۔ جب چاہو اسے دیکھنے آ سکتی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ دنوں بعد پادری صاحب نیوٹن کو ساتھ رکھنے پر رضامند بھی ہو جائیں۔"

نیوٹن اس وقت تین سال کا تھا جب ہانہ اسے اکیلا چھوڑ کر نارتھ ووہم روانہ ہوئی۔

نیوٹن کم سن ضرور تھا لیکن ذہین بھی تھا اور حساس بھی۔ ماں اسے چھوڑ کر جانے لگی تو اس نے خود کو بہت بے سہارا محسوس کیا حالانکہ گھر میں دوسرے لوگ موجود تھے جو اس سے لاڈ پیار کر رہے تھے۔ اس روز اس نے خود کو ایک کمرے میں بند کر کے دعا کے لیے یا یہ کہیے بددعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"خداوندا! جس گھر میں میری ماں شادی کر کے گئی ہے وہاں ایسی آگ لگے کہ ماں سمیت جتنے مکین ہوں سب جل کر راکھ ہو جائیں۔"

اس کے بعد بھی وہ اور نہ جانے کیا دعا مانگتا کہ اس کی نانی وہاں آ گئیں اور اسے کمرے سے باہر نکالا۔

اس کی نفسیات پر دوسرا اثر یہ ہوا کہ شاید محبت پر سے اس کا ایمان ہی اٹھ گیا۔ نانا نانی اسے پال رہے تھے لیکن زندگی بھر اس کے دل میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ بن سکی۔ دل کے کسی گوشے میں ان کے لیے محبت کا کوئی جذبہ بیدار نہ ہو سکا۔ احتجاج کرنے کی اس میں طاقت ہی نہیں تھی یا مزاج ہی نہیں تھا۔ ایک مستقل افسردگی اس پر طاری ہوگئی۔ تنہائی پسندی اس کی فطرت بن گئی۔ دن بھر کمرا بند کیے بیٹھا رہتا۔ کبھی باہر نکلتا بھی تو اس کی پتلی پتلی ٹانگیں اور چھوٹا قد دیکھ کر اس کے ہم جولی اس کا مذاق اڑاتے۔ آہستہ آہستہ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا بالکل ہی بند کر دیا۔

اس کے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا رواج تھا لہٰذا اسے بھی ایک مقامی اسکول میں بھیج دیا گیا۔ وولز تھورپ کے والدین صرف اس ارادے سے اپنے بچوں کو مقامی اسکول میں بھیجتے تھے کہ وہ انجیل مقدس کی تلاوت کر سکیں اور

اچھے عیسائی بن سکیں۔ وہ بھی ایک اچھا عیسائی بننے کے لیے اسکول جانے لگا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر بچے اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن وہ اسکول جاتا رہا۔

وہ پابندی سے اسکول جارہا تھا کہ ایک روز ہانہ، وولز تھورپ آگئی۔ اس کے ساتھ تین اجنبی بچے بھی تھے۔ تین لڑکیاں جو نیوٹن کی سوتیلی بہنیں تھیں نیوٹن کو جلد ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کے سوتیلے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اور اب اس کی ماں اس کے ساتھ ہی رہے گی۔ یہ خیال خوش آیند تھا لیکن ماں کے ساتھ تین بچوں کو دیکھ کر وہ مایوس بھی ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تھوڑی دیر کے لیے جو چمک آئی تھی وہ بجھ گئی۔ بعد کے دنوں میں یہ احساس مزید شدت اختیار کرگیا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ماں کی توجہ کئی حصوں میں بٹ گئی ہے۔ وہ اپنا وقت اب دوسرے بچوں کو بھی دیتی ہے۔

ہانہ اپنے دوسرے شوہر کی وفات کے بعد اس کی لائبریری سے تقریباً ساری کتب ریڑھیوں پر لاد کر اپنے ساتھ لے آئی تھی جن میں ایک سے ایک بڑھ کر نادر و نایاب کتاب تھی۔ اس دور میں کتابوں کو چمڑے کے پارچوں میں محفوظ کیا جاتا تھا۔ قصبے کے دوسرے گھروں میں ایسی کتب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نیوٹن نے ان کتابوں کو غور سے دیکھا تھا اور اسے ایسی خوشی ہوئی تھی جیسے بچوں کو کھلونے دیکھ کر ہوتی ہے۔ یہ خوشی کیوں ہوئی یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ کتابیں اس وقت اس کے کسی کام کی نہیں تھیں۔ عمر ایسی نہیں تھی کہ ان کتابوں کے مطالعہ میں فوری غرق ہوسکے لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ ایسا بیش بہا خزانہ تھا جسے بعد میں اس نے کھنگالا ضرور ہوگا۔

ہانہ جب مستقل طور پر وولز تھورپ میں آکر رہی اور نیوٹن کو قصبے کے معمولی اسکول میں جاتے ہوئے دیکھا تو اسے کسی طرح بھی اطمینان نہ ہوا۔ وہ اس کی تعلیم کی طرف سے فکرمند رہنے لگی۔ وہ اب ایک امیر خاتون بن چکی تھی۔ اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اسے کسی بڑے اسکول میں تعلیم دلوا سکتی تھی۔ اسے کنگز اسکول کا خیال آیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یہ اسکول چھ میل دور ایک بڑے قصبے گرانٹ ہم میں واقع تھا۔ ذرائع آمدورفت موجود نہیں تھے اور نیوٹن اتنی دور پیدل جا نہیں سکتا تھا۔ ہانہ کے سامنے یہ مشکل آئی تو اسے دور پار کے ایک جاننے والے کا خیال آیا۔ یہ صاحب دوا ساز تھے اور مسٹر کلارک ان کا نام تھا۔ دو منزلہ مکان تھا۔ نچلی منزل میں ان کی دکان تھی اور اوپر کی منزل میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔

نیوٹن ایک مرتبہ پھر ماں سے جدا ہوگیا اور اسے مسٹر کلارک کے گھر جاکر رہنا پڑا۔

اس دور کا گرانٹ ہم جہاں نیوٹن کا اسکول تھا ایک شہر نما قصبہ تھا مگر وہاں کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ علمی نوعیت کے پیچیدہ سوالات میں تو ہرگز نہ پڑتے تھے۔ زیادہ تر کے پاس وقت جاننے کے لیے گھڑیاں ہی نہیں تھیں۔ وہ محض آسمان پر رینگتا ہوا سورج دیکھ کر اندازہ کرلیتے تھے کہ وقت کیا ہوا ہوگا۔

نیوٹن کے لیے یہ سب باتیں نئی نہیں تھیں۔ وہ اس سے بھی چھوٹے قصبے سے یہاں آیا تھا لیکن وہ یہ سوچ ضرور رہا تھا کہ جب انہی مشکلوں میں رہنا تھا تو وہ یہاں کیوں بھیجا گیا۔ اس سے بھی زیادہ تلخ تجربہ اسے اس وقت ہوا جب وہ پہلے دن اسکول گیا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اپنی پیدائش کی طرح اب بھی وہ اپنی عمر کے لڑکوں کے مقابلے میں چھوٹا اور کمزور نظر آتا تھا اور تضحیک کا نشانہ بنتا تھا۔ اس نئے اسکول میں بھی یہی ہوا۔ پہلے ہی دن لڑکوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ طرح طرح کے ریمارکس پاس کرنے لگے۔ ایک تو نئی جگہ اور پھر نیا اسکول، وہ خاموشی سے مذاق کا نشانہ بنتا رہا اور کسی نہ کسی طرح ان لڑکوں سے بچ کر کلاس روم میں آگیا۔ وہ چند دن تو خاموشی سے سب کی سنتا رہا مگر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے اس کے پیٹ میں ایسی لات ماری کہ وہ گھومتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ وہ اب خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اس لڑکے کو میدان میں بلایا اور اس پر گھونسوں کی بارش کردی۔ اس کی حمایت میں ایک دوسرا لڑکا آیا۔ اس کی بھی ایسی پٹائی کی کہ وہ ادھ موا ہوگیا۔

اس دن کے بعد سے لڑکوں کو اندازہ ہوگیا کہ کمزور نظر آنے والا لڑکا اتنا کمزور نہیں۔ وہ اس سے ڈرنے لگے لیکن اس کی طرف سے دل میں چھپی ہوئی نفرت کم نہ ہوئی۔ کسی نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا گوارا نہیں کیا۔ اسے بھی ان دوستیوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بھی سب کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا اور اپنی سرشت کے مطابق تنہائی کی طرف لوٹ آیا مگر اس کی سرشت میں یہ بات بھی تھی کہ وہ وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس

نے اس تنہائی کو استعمال کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے سوچا وہ کیا کرسکتا ہے اور پھر سوچا وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ پھر بھی اسے پہلے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے تصویریں بنانی شروع کردیں۔ جنگلی درندوں کی تصویریں، پسندیدہ شخصیات کی تصویریں۔ یہ تصویریں اس نے یہ سوچے بغیر دیواروں پر چسپاں کردیں کہ گھر کا مالک اس پر اعتراض تو نہیں کرے گا۔ اس نے یہ تصویریں مسز کلارک کو بھی دکھائیں۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ مسز کلارک نے اس حرکت کا قطعی برا نہیں مانا تھا بلکہ ان تصویروں کی تعریف کی تھی۔

اس حوصلہ افزائی سے اسے بڑی تقویت ملی اور یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ وہ ایک باصلاحیت لڑکا ہے۔ اپنے اندر چھپی ہوئی فنکارانہ صلاحیتوں کو باہر نکالنا چاہیے۔ اس نے ایک ایسی گھڑی بنائی جو کسی طرح پانی کے دباؤ سے چلتی تھی۔ وہ گھڑی اس نے کلارک کے گھر میں ٹانگ دی۔

وہ ایک دن بہت تھک گیا تھا۔ تھکن دور کرنے کے لیے وہ بالائی منزل سے نیچے آیا اور کلارک کی دکان میں پہنچ گیا اور بڑے غور سے کیمیاوی محلول بنتے دیکھتا رہا۔ بیچ بیچ میں سوالات بھی کرتا جاتا تھا۔ اسے ایک مشغلہ سا ہاتھ آگیا اور چند ہی روز میں مختلف قسم کی دوائیں بنانے میں کلارک کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کلارک کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا تھا کہ وہ یہ کام کسی ماہر کاریگر کی طرح کررہا ہے۔ اسے اتنی معلومات ہوگئی ہیں جو لوگوں کو برسوں میں بھی نہیں ہوتیں۔ کلارک کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ تعلیم میں دلچسپی لے رہا ہے یا نہیں اسے تو یہ خوشی تھی کہ مفت کا کاریگر ہاتھ لگ گیا ہے۔

وہ بڑی پابندی سے کلارک کے پاس بیٹھ رہا تھا لیکن پھر اچانک ایک تبدیلی آئی اور وہ کمرے میں بند ہوگیا۔ چند روز کی تنہائی یاترا کے بعد اس نے کلارک کی بیٹی اور اس کی سہیلیوں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ یہ لڑکیاں اس کے کمرے کو سجا ہوا دیکھ کر حیران رہ گئیں چند دن پہلے تو اس کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا اور اب ننھے منے میز، الماریاں اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

”نیوٹن یہ کھلونے کہاں سے آگئے۔“

”یہ کھلونے نہیں ہیں۔ میں نے یہ فرنیچر تمہاری گڑیوں کے لیے بنایا ہے۔ یہ الماری ہے تم اس میں اپنی گڑیوں کے کپڑے رکھنا۔ یہ میز ہے۔ تم اس پر اپنی گڑیاں سجا سکتی ہو اور یہ دو کرسیاں بھی ہیں۔ خبردار تم اس پر نہ بیٹھنا۔ یہ صرف گڑیوں کا وزن اٹھا سکتی ہیں۔“

”یہ تو بالکل اصل معلوم ہوتی ہیں۔“

”یہ اصلی ہی تو ہیں۔ میرے پاس اگر لکڑی اور اوزار ہوں تو میں گھر کے استعمال کے لیے بھی ایسی چیزیں بنا سکتا ہوں۔“

”ارے واہ! تم تو بڑے ذہین ہو۔“

”یہ تمہیں آج معلوم ہوا ہے۔ دیکھنا میں ایسی ایسی چیزیں بناؤں گا کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔ انگلستان والے تو بالکل جاہل ہیں کچھ جانتے ہی نہیں۔“

”یہ تم نے کیا کہہ دیا۔ جاہل کیوں ہونے لگے انگلستان والے۔ کم از کم گرانٹ ہم والے تو بہت عقل مند ہیں۔ تم نے ہوائی چکی نہیں دیکھی؟ کیسے مزے سے چلتی ہے۔ ہوا کی رفتار اور رخ بتاتی ہے۔ کیا یہ بھی جاہل لوگوں کا کارنامہ ہے؟“

”میں ایسی چکی بنا سکتا ہوں کہ ہوا کے بغیر ہی چلے گی۔“

”کہیں بنا ہی نہ لینا۔“

”جب بنالوں گا تو آکر دیکھ لینا۔“

”ویسے تم ہو ذہین۔ کچھ بھی بنا سکتے ہو۔“ کلارک کی بیٹی نے شوخی سے کہا اور نیوٹن یوں خوش ہوگیا جیسے وہ یہی سننا چاہتا تھا۔ ان لڑکیوں کے رخصت ہوتے ہی وہ ہوائی چکی دیکھنے گیا۔ اس کا اچھی طرح بغور مطالعہ کیا۔ چند باتیں اپنی نوٹ بک میں تحریر کرلیں اور گھر چلا آیا۔ اب وہ اس دھن میں رہنے لگا تھا کہ کسی طرح اس ہوائی چکی کا چھوٹا سا نمونہ بنالے۔ چند دن کی کوشش کے بعد وہ ایک ایسا نمونہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اب اسے چلانے کا مسئلہ تھا۔ اس مرتبہ تو اس نے حد ہی کردی۔ اس نے ایک چوہا پکڑا اور اس کے اندر بند کردیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق چوہے نے پریشان ہوکر دوڑنا شروع کیا اور پنکھا گھومنے لگا۔ جسے نہیں معلوم تھا کہ اندر چوہا بند ہے وہ حیران ہوتا تھا کہ پنکھا خود بخود کیسے گھوم رہا ہے۔

وہ دست کاری کے مختلف نمونے بنا رہا تھا اور لوگوں کو حیران کررہا تھا لیکن پڑھائی کے معاملے میں اس کا کردار یکسر مختلف تھا۔ اسکول میں اسے غبی لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ ایک ایسا لڑکا جو اگر ذہین ہے بھی تو پڑھائی میں بالکل دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ نہ جانے کس اچھی گھڑی میں خود اس پر بھی انکشاف ہوگیا کہ وہ بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔ اس نے عزم کرلیا کہ وہ اتنی محنت کرے گا کہ تعلیمی

لحاظ سے سب سے آگے نکل جائے گا۔ اب وہ ممکن الحصول ہر چیز سیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس نے لاطینی زبان میں مہارت حاصل کرلی۔ یہ ایک ایسی زبان تھی جو اس وقت تمام یورپ کے اہل علم حلقوں میں لکھی بھی اور بولی جاتی تھی۔ اس نے یونانی بھی سیکھی تاکہ وہ ارسطو، افلاطون کے نظریات کو سمجھ سکے۔

سائنس کی کتابیں پڑھتے ہوئے اسے ریاضی کی اہمیت کا احساس ہوا لیکن مصیبت یہ تھی کہ کنگز اسکول میں ریاضی کو ایک غیر ضروری مضمون سمجھا جاتا تھا۔ اسے صرف کاروباری طبقے کے لوگ پڑھتے تھے۔ یہ کنگز اسکول کے نصاب کا حصہ نہ تھا۔ اس نے اپنی اس مشکل کا اظہار اپنے ہیڈ ماسٹر سے کیا جو اسے بہت عزیز رکھنے لگے تھے۔ انہوں نے حساب پڑھانے کے لیے الگ سے ٹیوشن کا وعدہ کرلیا۔ وہ کوئی ماہر ریاضی داں نہیں تھے۔ تھوڑا بہت جو خود جانتے تھے اسے بھی پڑھا دیا۔ الجبرا اور جیومیٹری سے بھی کچھ آشنا کردیا۔ بعد میں جو کچھ سیکھا نیوٹن نے اپنی کوشش سے سیکھا۔

چھوٹے چھوٹے تجربے کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اسے وہ سب باتیں قدرت نے پہلے ہی سکھا دی تھیں جو ایک کامیاب سائنس داں کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ تجربات میں صرف دیکھنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ توجہ سے دیکھنا اور پھر تجربات کے نتائج کو ریکارڈ کر کے ان سے مزید معلومات اخذ کرنا شامل ہوتا ہے۔ وہ یہ راز جان گیا تھا اور ہر چیز کو ایسے ہی غور سے دیکھتا تھا۔ وہ کئی دن سے دیکھ رہا تھا کہ سورج کی کرنیں مختلف زاویے سے اس کے گھر کی دیوار پر پڑتی ہیں۔ پھر اسے تجربہ کرنے کی سوجھی۔ اس نے ہر روز ہر گھنٹے کے بعد اس دیوار پر کیلوں کی مدد سے کرنوں کی جگہ نشان زد کرنا شروع کردیا۔ ہفتوں تک یہی کرتا رہا۔ خط استوا سے کافی شمال میں واقع ہونے کی وجہ سے انگلستان کے بعض موسموں میں دن لمبے ہوتے ہیں اور بعض میں انتہائی چھوٹے۔ نیوٹن کی دیوار پر اس طرز کا ریکارڈ بنتا چلا گیا۔ وہ دیوار ایک بہترین شمسی کیلنڈر اور گھڑی بن چکی تھی جس میں سال کے کسی بھی دن نشانات اور کرنوں کے حساب سے صحیح وقت معلوم ہوسکتا تھا۔

اس روز وہ اسکول پہنچا ہی تھا کہ تیز آندھی نے اسکول کو گھیر لیا۔ آندھی کیا تھی ہوا کا طوفان تھا۔ دوسرے لڑکوں کے لیے اس طوفان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ تو یہ سوچنے لگے تھے کہ اگر یہ طوفان کم نہ ہوا تو وہ گھر کیسے جائیں گے لیکن نیوٹن کو تجربہ کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ وہ وقت ضائع کیے بغیر تیزی سے باہر کی طرف بھاگا۔ اس نے ہوا کے رخ پر اور پھر اس کی مخالف سمت میں یکے بعد دیگرے متعدد چھلانگیں لگائیں۔ ان چھلانگوں میں جہاں جہاں اس کے قدم زمین پر پڑتے اس جگہ نشان لگا دیتا۔ دوسرے لڑکے اس کی ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کے سوا اور کیا کرسکتے تھے کہ نیوٹن کا دماغ چل گیا ہے۔ جب طوفان ختم ہوگیا تو اس نے ایک مرتبہ پھر چھلانگیں لگائیں۔ ان تجربوں سے وہ ہوا کی طاقت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ اس نے ان دونوں چھلانگوں کو ناپا۔ اس نے حساب لگایا۔ ہوا کی شدت سے اس کی چھلانگوں کی لمبائی میں ایک فٹ کا فرق آیا تھا۔ وہ یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا تجربہ کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ ان تجربات میں مصروف تھا کہ اس کی ماں کو ایک اور تجربے کی سوجھی۔ اس نے سوچا کہ اسے واپس بلا کر زرعی زمینوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری اسے سونپ دی جائے۔ اس نے اتنا تو پڑھ لکھ ہی لیا ہوگا کہ ایک اچھا زمیندار بن جائے۔ وہ اب تعلیم کی طرف سے سنجیدہ ہوگیا تھا اور کنگز اسکول چھوڑ کر ہرگز واپس آنا نہیں چاہتا تھا لیکن ماں نے اسے واپس بلوا لیا۔

"تم اب سمجھ دار ہوگئے ہو اور پڑھ لکھ بھی گئے ہو۔ میں اب کام کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ ساری ذمے داریاں تمہیں اٹھانی ہوں گی اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تم ایک اچھے چرواہے بن جاؤ تاکہ آیندہ ملازموں سے ٹھیک طرح کام لے سکو۔ بھیڑوں کا ریوڑ جنگل لے کر جاؤ اور انہیں چرا کر واپس لاؤ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ ان میں سے ایک بھی کم نہ ہو۔"

وہ ماں کے سامنے یہ تک نہ کہہ سکا کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں۔ اس کا دماغ تو کہیں اور ہی الجھا رہتا ہے۔ وہ یہ کام کیا کرے گا۔ ماں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس نے ریوڑ کو ساتھ لیا اور جنگل کی طرف روانہ ہوگیا لیکن چند کتابیں لے جانا نہ بھولا۔ جنگل میں پہنچتے ہی فطری مناظر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ بھول ہی گیا کہ ریوڑ اس کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے خودرو جھاڑیوں کے درمیان ایک مناسب جگہ دیکھی اور ایک کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ ریوڑ کا جس طرف منہ اٹھا چل دیا۔ جس وقت اسے بھیڑوں کو ہنکاتے چراتے ہنہاتے ہونا چاہیے تھا وہ مطالعے میں

معروف تھا۔ شام ہوئی اور گھر لوٹنے کا وقت آیا تو اسے احساس ہوا کہ اسے کتاب پڑھنے کی بجائے ریوڑ پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ بھیڑیں کسی نگراں کو نہ دیکھتے ہوئے دور چلی گئی تھیں بلکہ اِدھر اُدھر ہو کر ایک دوسرے سے بچھڑ گئی تھیں۔ انہیں سمیٹنے اور یک جا کرنے میں اچھی خاصی دیر ہوگئی۔ گنتی کرنے پر پتا چلا کہ ایک اب بھی کم ہے۔ اب اندھیرا ہونے لگا تھا۔ اس نے بھیڑ کو وہیں چھوڑا اور گھر چلا آیا۔ ماں نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ ایک بھیڑ کا کم ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

''بھیڑوں کو اچھی طرح گن لیا کرو۔ ایک بھیڑ روز گم کرو گے تو کبھی اچھے چرواہے نہیں بن سکو گے۔ پہلا دن ہے اس لیے معاف کر رہی ہوں۔ آئندہ خیال رکھنا۔''

اس نے کسی سعادت مند بچے کی طرح سر جھکا لیا۔

وولز تھورپ کے تقریباً تمام ہی لڑکے کاشت کاری کرتے تھے۔ بھیڑوں کو گنتے تھے، ان کے لیے چارا بناتے تھے لیکن نیوٹن سمجھتا تھا کہ وہ ان لڑکوں سے مختلف ہے۔ وہ اس کام کے لیے نہیں بنا ہے۔

دو چار دن نہیں گزرے تھے کہ ایک بھیڑ اور گم ہوگئی۔ ملازموں نے بتا بھی دیا کہ وہ سارے وقت کتابیں پڑھتا رہتا ہے اور وہ کبھی اچھا چرواہا نہیں بن سکتا۔

ہانہ نے مزید نقصان سے بچنے کے لیے اسے ریوڑ لے جانے سے منع کر دیا۔ وہ پڑھا لکھا ہے یہ کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ ہانہ نے سوچا اور اسے ملازموں کے ہمراہ گرانٹ ہم بھیج دیا تاکہ وہاں کے بڑے بازاروں سے بعض زرعی سامان کی خریداری کر سکے۔ وہ ملازموں کے ساتھ چلا ضرور گیا لیکن اسے خریداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ملازموں کو بازار میں چھوڑا اور خود کلارک کے گھر چلا گیا یعنی اپنے پرانے گھر۔ دن بھر دوستوں سے ملتا رہا۔ اسکول گیا ہیڈ ماسٹر کے پاس بیٹھا رہا۔ یہ شکایتیں بھی کرتا رہا کہ اسے اس کی والدہ نے کس کام میں پھنسا دیا ہے۔

''یہ تو تمہارے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی تم تو پڑھنے لکھنے والے لڑکے تھے۔''

''اب بھی ہوں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہر وقت کتابیں پڑھتا رہوں۔''

''تم تو اتنے لائق ہو کہ ذرا سی تیاری کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لو۔''

''کیا ہی اچھا ہو لیکن میری والدہ تو مجھے زمیندار بنانا چاہتی ہیں۔ میں کیا زندگی بھر بھیڑیں گنتا رہوں گا۔''

''ہرگز نہیں۔ میں عنقریب وولز تھورپ آؤں گا اور تمہاری والدہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

نیوٹن، گرانٹ ہم سے واپس آیا تو ہانہ کے علم میں آیا کہ وہ تو سامان کی خریداری کے لیے بازار گیا ہی نہیں۔ تمام خریداری ملازموں نے کی ہے۔ اس کی یہ حرکت ہانہ کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس پر برس پڑی۔

''میں نے تمہیں ملازموں کے ساتھ کس لیے بھیجا تھا؟''

''میں چلا تو گیا تھا اس سے کیا فرق پڑتا ہے بازار گیا تھا یا نہیں۔''

''فرق یہ پڑتا ہے کہ تمہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کون سی چیز کس بھاؤ آئی۔ ایک زمیندار کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کس چیز کی قیمت کیا ہے اگر ہر چیز ملازموں پر چھوڑ دو گے تو وہ تمہیں لوٹنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ تم نے تو بعد میں بھی نہیں پوچھا ہوگا کہ کس چیز کی قیمت کیا ہے؟''

''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''نیوٹن، تم سدا کے بے وقوف ہو۔ اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کرو گے۔''

''میں بے وقوف نہیں ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں ان کاموں کے لیے نہیں بنا ہوں۔ آپ نے مجھے خوامخواہ اسکول سے واپس بلا لیا۔''

''تمہارے ساتھ کے سب لڑکے کھیتی باڑی میں لگے ہوئے ہیں۔ تم ان سے انوکھے نہیں ہو۔''

''آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ میں ان سے مختلف ہی تو ہوں۔''

یہ بحثیں اپنی جگہ لیکن ہانہ اسی اُمید میں دن گزارتی رہی کہ ایک دن اس کے بیٹے کو عقل ضرور آجائے گی۔ نیوٹن کا حال یہ کہ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا کہ ہانہ تنگ آکر اسے زمینداری کے کام سے اٹھالے۔

ہانہ کا بھائی ولیم ازکیو اس کش مکش کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور اس نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ نیوٹن ان کاموں کے لیے نہیں بنا جو کام اس سے لیے جا رہے ہیں۔ اس نے پہلے تو بہن کو خود سمجھانے کی کوشش کی اور پھر کنگز اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ملاقات کر کے انہیں رضامند کر لیا کہ وہ وولز تھورپ آئیں اور ہانہ کو سمجھائیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے دوٹوک الفاظ میں ہانہ کو بتا دیا۔

"نیوٹن علم و تعلیم کے لیے بنا ہے۔ بس ذرا سی توجہ اور تیاری کی ضرورت ہے اور پھر نیوٹن کیمبرج یونیورسٹی میں داخلے کا اہل قرار پائے گا اور اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ یہ بچہ آپ پر بوجھ بن رہا ہے تو میں اس کی فیس معاف کرنے کو تیار ہوں۔ وہاں یہ میری نگرانی میں پڑھے گا۔ میں اسے تیاری کراؤں گا۔"

ولیم نے بھی ان کی تائید کی اور یوں ہانہ کو ان دونوں اشخاص کی بات ماننی پڑی۔ نیوٹن ایک مرتبہ پھر کنگز اسکول میں آگیا جہاں مسٹر کلارک کے گھر کی بالائی منزل کا وہی کمرا اس کا منتظر تھا جہاں وہ پہلے رہتا تھا۔

اس نے یہاں مزید ایک سال گزارا۔ اس ایک سال نے اس کی زندگی میں ایک نیا رنگ گھول دیا۔ وہ مسٹر کلارک کی بڑی بیٹی کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ بوکھلا سا گیا۔ وہ یہاں پہلے بھی رہ چکا تھا۔ وہ اسے پسند بھی تھی لیکن ایسے جذبات اس نے کبھی محسوس نہیں کیے تھے۔ وہ اس مرتبہ آیا اور اس لڑکی نے اس کا کمرا صاف کرانے میں اس کی مدد کی تو اس دن بھر کی تنہائی اس کے دل میں اتر گئی۔

اب وہ فرصت کے لمحات اس کے ساتھ گزار رہا تھا۔ مسٹر کلارک کو بھی اس پر اتنا بھروسا تھا کہ نگراں آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ دونوں اب ہر تفریحی مقام پر دیکھے جارہے تھے۔ کمرے میں بھی جب وہ دستکاری کے چھوٹے چھوٹے نمونے بنا رہا ہوتا تھا، وہ لڑکی اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔

نیوٹن یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ یہاں صرف ایک سال کے لیے ہے پھر وہ کیمبرج چلا جائے گا۔ کبھی خیال آتا بھی تھا تو یہ سوچ کر دل کو اطمینان دلا دیتا تھا کہ کیمبرج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اس سے شادی کرلے گا۔ اس نے اس لڑکی سے بہت سے وعدے کرلیے تھے۔

اس کا ماموں ولیم ازکیو گرانٹ ہم کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ وہ ہیڈ ماسٹر اور خود نیوٹن کو اس بات پر رضا مند کر رہا تھا اسے کیمبرج یونیورسٹی کے اسی کالج میں جانا چاہیے جہاں کسی زمانے میں وہ خود بھی پڑھتا رہا تھا۔ ٹرینٹی کالج۔

یہ ولیم ازکیو کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ کیمبرج جانے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ ورنہ محبت میں گرفتار ہونے کے بعد یہ بھی ممکن تھا کہ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی کرلیتا اور گرانٹ ہم ہی میں رہ جاتا۔ اس لڑکی کو اس کا مستقبل عزیز تھا لیکن اپنے مستقبل کو بھی دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگی تھی۔ نیوٹن اسے برابر سمجھا رہا تھا۔

"میں کیمبرج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک شاندار مستقبل کے ساتھ تمہارے پاس آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔"

ہیڈ ماسٹر مسٹر اسٹوکس نے نیوٹن کو ہر اس چیز کی تیاری کروا دی جس کے بعد نیوٹن کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں داخلے کا امتحان پاس کرسکتا تھا۔ بالآخر وہ دن آگیا جب اسے گرانٹ ہم کو خیر باد کہہ کر پہلے وولز تھورپ جانا تھا اور اس کے بعد ساٹھ میل دور کیمبرج روانہ ہوجانا تھا۔

اس نے ایک بار پھر "اس لڑکی" سے دوبارہ آنے کا عہد کیا یہ الگ بات کہ وہ پھر بھی گرانٹ ہم نہ آسکا وہ لڑکی کسی اور کی ہوگئی۔

وہ گرانٹ ہم سے رخصت ہوکر وولز تھورپ پہنچا تو موسم گرما کا آغاز ہوچکا تھا۔ فصل کی کٹائی کا وقت تھا۔ ہانہ اپنے اٹھارہ سالہ نوجوان بیٹے کو حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ یہی تو وہ وقت ہے جب مجھے نیوٹن کی ضرورت ہوسکتی تھی اور یہ مجھے چھوڑ کر کیمبرج جارہا ہے وہاں سے تعلیم مکمل کرکے میرے پاس آ بھی گیا تو میرے کسی کام کا نہیں رہے گا۔ وہ اس کی تعلیم پر پیسے خرچ کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ نیوٹن جب گرانٹ ہم کے اسکول واپس جارہا تھا اس وقت بھی وہ محض اس لیے تیار ہوگئی تھی کہ اس کی فیس معاف کردی گئی تھی۔ کیمبرج میں تو فیس معاف نہیں ہوسکتی تھی اور وہ زیادہ پیسے دینے کو تیار نہیں تھی۔ وہ ایک مالدار خاتون بن چکی تھی لیکن بیٹے کی تعلیم پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اسے زراعت اور گلہ بانی میں رکھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے بار بار دل شکنی کررہی تھی لیکن ولیم ازکیو بضد تھا کہ نیوٹن کیمبرج جائے۔ ہانہ ازکیو مجبور تو ہوگئی لیکن وہ زیادہ رقم دینے کو تیار نہیں تھی۔ وہ نیوٹن کو باور کرانا چاہتی تھی کہ اگر اسے پڑھنا ہے تو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑے گا۔ اس سے کوئی اُمید نہ رکھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ یہ سوچ رہی ہو کہ مالی مشکلات سے تنگ آکر وہ تعلیم چھوڑ بیٹھے گا اور واپس چلا جائے گا۔

ٹرینٹی کالج میں طبقاتی نظام رائج تھا۔ امیر طلبہ کا درجہ سب سے بلند تھا۔ انہیں "جنٹل مین" کہا جاتا تھا۔ یہ طبقہ ان طلبہ پر مشتمل تھا جو امیر گھرانوں کے چشم و چراغ ہوتے تھے۔ دوسرا طبقہ "پنشنز" کہلاتا تھا۔ ان کو ایک لگا بندھا خرچا ملتا تھا جس کے اندر انہیں اپنی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ یہ طلبہ چھوٹے موٹے کاروباری خاندانوں یا گرجوں کے پادریوں کے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور

یونیورسٹی کی فیس کا کچھ حصہ ہی ادا کر پاتے تھے۔ اس طبقاتی نظام میں سب سے نچلا درجہ "سائزر" کا تھا۔ یہ وہ طلبہ تھے جو اپنی فیس ادا نہیں کر پاتے تھے مگر تعلیمی میرٹ پر پورے اترتے تھے۔ ان کی حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ انہیں کیمبرج میں پڑھنے، کھانے اور رہائش کے لیے اساتذہ اور امیر طلبہ کی چاکری کرنی پڑتی تھی اور ایسے ایسے شرم ناک کام کرنے پڑتے تھے کہ دوسرے طلبہ ویسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بہ یک وقت طلبہ بھی تھے اور مزدور بھی۔

نیوٹن ایک مالدار ماں کا بیٹا ہونے کے باوجود نہایت قلیل رقم لے کر "سائزر" کے طور پر انتہائی شرمناک انداز میں "ٹرینیٹی کالج" میں داخل ہوا۔

"سائزر" کے طور پر مختلف خدمات انجام دینے کے بعد اسے لیکچروں میں شرکت کی اجازت مل سکتی تھی۔ وہ کسی استاد کے ساتھ مل کر پڑھائی کر سکتا تھا اور دوسرے کسی سائزر کے ساتھ رہائشی کمرے کا حصہ دار بن سکتا تھا مگر یونیورسٹی کی اہم اور دلچسپ تقریبات میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی اہم شخصیت دورے پر کالج آتی تو صرف امیر طلبہ ہی اس سے ملاقات کر سکتے تھے۔

☆.....☆

وہ کیمبرج جانے کے لیے وولز تھورپ سے نکلا تو معمولی سے سامان کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ ساٹھ میل کا مختصر لیکن اس دور کے وسائل کے لحاظ سے طویل سفر اس کے سامنے تھا۔ یہ سفر اس نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر تین دن میں طے کیا۔ وولز تھورپ پیچھے رہ گیا۔ گرانٹ ہم اسکول کا تصور دھندلا ہوتا چلا گیا اور وہ چلتا رہا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی لیکن جب وہ کیمبرج شہر میں پہنچا تو یہ لڑکی بھی دور کہیں پیچھے رہ گئی۔ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھرپور ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کہنی سے کہنی چھل رہی تھی۔ ان لوگوں میں شہر کے باسی بھی تھے اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ بھی۔ مقامی لوگوں اور یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والوں کو بہ آسانی پہچانا جا سکتا تھا۔ یہ پہچان ان کے وہ مخصوص چغے تھے جو ان کے طالب علم ہونے کی ترجمانی کرتے تھے۔

ایک وہ وقت تھا کہ وولز تھورپ میں اس کے ذاتی ملازم ہوا کرتے تھے۔ کیمبرج میں آنے کے بعد بطور سائزر اسے نوکروں کی طرح کام کرنا پڑا۔ امیر طلبہ کی چاکری کرتے ہوئے انہیں بالائی منزلوں میں بہترین ناشتا پہنچانے سے بہت پہلے اسے بیدار ہو کر ٹھنڈی ڈبل روٹی اپنے حلق سے اتارنی پڑتی تھی۔ شام کے وقت ان امیر طلبہ کے لیے کھانا لگایا کرتا تھا۔ جب تک امیر طلبہ کھانا کھا نہیں لیتے تھے وہ کھا نہیں سکتا تھا۔ جو کھانا بچ جاتا تھا وہ اس کے حصے میں آتا تھا۔ اس کے علاوہ جس حقارت سے وہ اور اس کے دوسرے سائزر ساتھی دیکھے جاتے تھے اور امیر طلبہ جو سلوک ان کے ساتھ روا رکھتے تھے وہ الگ تھا۔ نہ صرف الگ بلکہ تکلیف دہ تھا۔ یہ سوچ کر اسے مزید اذیت ہوتی تھی کہ اس کی ماں اسے زیادہ رقم دے کر اسے امیر طلبہ کے طبقے میں شامل کر سکتی تھی۔

ان تھکا دینے والے معمولات کے باوجود اس کا تعلیمی سفر بڑی تیزی سے جاری تھا اور ٹرینیٹی کالج کے بقیہ سائزروں کے مقابلے میں اس کی تعلیمی حالت بہت بہتر تھی۔

اسے یہاں چند لیکچر سننے کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس میں کچھ ایسی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس نے جو پڑھا نہیں ہے وہ بھی اسے معلوم ہے۔ وہ فطری طور پر سائنس کے متعلق کیمبرج کے زیادہ تر اساتذہ سے بھی زیادہ جانتا ہے۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اس میں مختلف قسم کے علوم کے دقیق مسائل حل کرنے کی فوق الفطرت صلاحیت موجود ہے خصوصاً ریاضی کے مضمون کو ٹرینیٹی کالج کے تمام اساتذہ و طلبہ سے زیادہ جانتا ہے۔ یہ بات ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی پر ظاہر کرتا اس کے ذہن میں جو خیالات و نظریات ابھرتے تھے ان کی پردہ پوشی کو اس نے اپنا فرض بنا لیا۔ وہ انہیں اپنی نوٹ بک میں درج کر لیتا اور چپ سادھے رہتا۔ رفتہ رفتہ کیمبرج کے اساتذہ پر اس کی ذہانت ظاہر ہونے لگی لیکن وہ اپنی زبان سے کچھ کہنے سے گریز کرتا تھا۔

وہ اپنا موازنہ دوسرے لڑکوں سے کرتا تھا تو اسے واضح فرق نظر آتا تھا۔ بیشتر طلبہ وہ تھے جو اپنی رنگینیاں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اکثر طلبہ عبادت کے لیے گرجا جانے کا بہانہ کرتے اور مے خانوں کا رخ کرتے یا رقص گاہوں میں چلے جاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے سنجیدہ لڑکے بھی تھے جو تفریح کے لیے نہیں صرف پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ ان شرارتی لڑکوں کی وجہ سے ان سنجیدہ طلبہ کا ناک میں دم تھا۔ نیوٹن کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہوا۔ اسے ایک ایسے ساتھی کی رفاقت میں رہنا پڑ رہا تھا جو پڑھائی میں سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ باہر سے شراب پی کر آتا اور کمرے میں غل غپاڑہ مچاتا رہتا۔ ایک روز جب نیوٹن کا صبر جواب دے گیا تو اس نے

اس لڑکے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم یہاں پڑھنے آئے ہو یا شرارتیں کرنے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔"

"مطلب یہ کہ تم طوائفوں کے پاس بھی جاتے ہو اور شراب بھی پیتے ہو۔"

"تم اس کالج کے پروفیسر نہیں ہو نہ کسی گرجا کے پادری ہو جو مجھے اس طرح سمجھا رہے ہو۔"

"ایک دوست تو ہوں۔"

"پادری صاحب، اپنا منہ بند کرو ورنہ میں تمہارا منہ توڑ بھی سکتا ہوں۔"

نیوٹن نے اس سے زیادہ الجھنا مناسب نہ سمجھا اور کالج کے سرسبز میدان میں چہل قدمی کے لیے نکل آیا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ اپنے روم میٹ سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے۔ ٹہلتے ٹہلتے اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو اس کی طرح تنہائی پسند اور گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ نیوٹن کی تو عادت ہی نہیں تھی کہ کسی کے پاس جا کر بیٹھے اور دوستی کا ہاتھ بڑھائے وہ لڑکا ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا اور اسے لے کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔

"تم بھی میری طرح تنہائی پسند معلوم ہوتے ہو۔"

"تم کالج کا حال دیکھ رہے ہو۔ یہاں طلبہ پڑھنے آتے ہیں اور رقص گاہوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ اساتذہ جانتے بوجھتے اپنے چہرے دوسری طرف پھیر لیتے ہیں جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

"ہمیں اس سے کیا۔ کرنے دو جو وہ کر رہے ہیں۔"

"جب ایسا ہی کوئی لڑکا ہمارا روم میٹ ہو تو ہم کیسے یکسوئی سے پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ وہ کمرے میں غل غپاڑہ کرتا رہے اور ہم پڑھتے رہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔"

"یہ واقعی تکلیف دہ بات ہے۔ میں خود اسی اذیت کا شکار ہوں۔ اسی لیے تو یہاں آ کر بیٹھ گیا ہوں لیکن کب تک۔ پھر اسی جہنم میں جانا ہے۔"

"تم مجھے سنجیدہ طالب علم معلوم ہوتے ہو۔" نیوٹن نے کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔"

"میرا پورا نام جان وکنز ہے۔ تم مجھے وکنز کہہ کر پکار سکتے ہو۔"

"میرا نام آئزک نیوٹن ہے۔ سب مجھے نیوٹن کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"کیا ہم ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں؟"

"میں دوستیوں کا قائل نہیں ہوں۔ یہ اکثر تضیع اوقات کا باعث بنتی ہیں۔" نیوٹن نے کہا۔

"اگر ایک دوسرے کا سہارا بن جائیں تو......"

"پھر شاید ممکن ہے۔"

"میرا روم میٹ بھی ناپسندیدہ ہے اگر تم میرے رہائشی، ہم نوا بن جاؤ؟"

"تمہارا روم میٹ کہاں جائے گا؟"

"اسے تمہارے روم میں شفٹ کردیں گے۔ تم میرے پاس چلے آؤ گے۔"

"وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا؟"

"وہ مجھ سے تنگ ہے۔ وہ تو کہے گا جان چھوٹی۔"

"یونیورسٹی کو اعتراض ہوگا۔"

"میں اساتذہ سے مل کر انتظام کرلوں گا۔"

نیوٹن اپنے دوست وکنز کے ساتھ منتقل ہو گیا اور نہایت ہمدرد رفیق ثابت ہوا۔ نیوٹن بھی اس نئے ماحول میں یکسوئی سے اپنے تجربات اور مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ وہ سخت محنت کر رہا تھا۔ اپنے بستر پر کم ہی پایا جاتا تھا۔ اس کی نیند بہ مشکل چار گھنٹے کی رہ گئی تھی۔ اس کا نشانہ کیمیاوی تجربات تھے۔ وکنز خاموشی سے اس کے تجربات اور تحقیقی کاموں میں اس کی مدد کر رہا تھا اور اس کے تجرباتی نتائج کو خفیہ بھی رکھے ہوئے تھا۔ وہ وقت سے پہلے کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔

کیمبرج میں ان دنوں فرانس کے ایک سائنس داں ڈیکارٹ کا بہت چرچا تھا۔ سولہویں صدی کے پہلے نصف میں جن علوم پر کام ہو رہا تھا وہ سب اس کے دائرہ کار میں آتے تھے۔ نیوٹن بھی ڈیکارٹ اور اس کے متعلق کی جانے والی گفت وشنید پر توجہ دینے لگا اس نے کسی طرح کالج کی لائبریری سے ڈیکارٹ کی کتابیں لے کر ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ طلبہ اس وقت تک لائبریری میں داخل نہیں ہو سکتے تھے جب تک کوئی استاد ان کے ہمراہ نہ ہو اور وہ اس کے لیے کتاب منتخب نہ کرے۔ نیوٹن کو یہ رعایت حاصل ہوئی کہ وہ اپنے لیے خود کتاب منتخب کرلے۔

اب ڈیکارٹ اس کا استاد تھا۔ وہ اپنی کتابوں کے ذریعے اسے بہت کچھ سکھا رہا تھا۔ نئی راہیں دکھا رہا تھا۔ نئے راستوں پر چلنے کے لیے اکسا رہا تھا۔ وہ اسی مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے خود کو ریاضی کے لیے وقف کر دینا ہو گا اور کائنات ارضی کے سربستہ راز کھولنے کے لیے کچھ

سوال اٹھانے ہوں گے اور سائنسی تجربات کے ذریعے سوالات کا جواب ڈھونڈنا ہوگا۔ اس نے ایک نوٹ بک بنائی اور اس پر مختلف موضوعات لکھنے شروع کردیے۔ یہ وہ موضوعات تھے جنہیں وہ مستقبل میں پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ وہ موضوعات تھے جو اب فزکس یا طبیعات کہلاتے ہیں یعنی جوہری ذرات، وقت اور ابدیت، اجرام فلکی اور مدار دم دار ستارے، لطافت و کثافت، کشش ثقل، تندحرکت، خدا، تخلیق، روح وغیرہ۔

ڈیکارٹ کی کتابوں کے ذریعے نیوٹن کو اندازہ ہوگیا کہ وہ سادہ ریاضی کی بجائے اس کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ جہتوں میں جاسکتا ہے کیوں کہ ڈیکارٹ ریاضی کو ایک ایسی سطح پر لے جاچکا تھا جس پر اس سے پہلے کسی نے کام نہیں کیا تھا۔ ڈیکارٹ نے الجبرا کو جیومیٹری کے لیے استعمال کیا تھا اور اسے ”تجزیاتی جیومیٹری“ کا نام دیا تھا۔ اس نے اس کتاب کا لاطینی ترجمہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کالج میں ڈاکٹر آئزک بارو موجود تھے جو اس تجزیاتی جیومیٹری کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔

1664ء میں اسے وظیفے کا امتحان پاس کرنا تھا تاکہ اسے کیمبرج میں مستقل جگہ مل جائے۔ دوسرے طلبہ کی طرح وہ بھی سخت پریشان تھا کہ اگر وہ اس امتحان میں ناکام رہتا تو گھر جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ گریجویٹ ہوچکا تھا لیکن ماسٹر ہونے کے لیے اسے اسکالرشپ کی ضرورت تھی۔

اس نے یہ امتحان پاس کرلیا۔ ڈاکٹر بارو نے اس کا زبانی امتحان لیا۔ جیومیٹری کے بارے میں پوچھے گئے سوالات کے جواب نہ دینے کے باوجود ڈاکٹر بارو نے اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بھانپ لیا تھا۔

وہ گریجویٹ ہوچکا تھا اور اب ماسٹرز کی ڈگری کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ایک سال مزید گزر گیا تھا کہ لندن طاعون کی لپیٹ میں آگیا۔ 1665ء کا موسم گرما ضرورت سے زیادہ گرم اور حبس زدہ تھا۔ یہ موسم اس خاص قسم کے بیکٹریا کی افزائش کے لیے نہایت سازگار ہوتا ہے جو طاعون کا سبب بنتا ہے۔ جب یہ بیماری سفر کرتی ہوئی کیمبرج تک پہنچ گئی اور لوگ بڑی تعداد میں مرنے لگے تو یونیورسٹی بھی خالی ہونا شروع ہوگئی۔ اساتذہ اور طلبہ نے پناہ حاصل کرنے کے لیے مختلف قصبوں اور دیہات کا رخ کرنا شروع کردیا۔ وہ گاؤں عموماً اساتذہ کے ہوتے تھے۔ یہ طلبہ ان کے ساتھ چلے گئے تھے تاکہ اپنی پڑھائی جاری رکھ سکیں۔ نیوٹن کو کسی استاد کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا وہ سیدھا اپنے گھر ”وولز تھورپ“ چلا گیا۔

وولز تھورپ پہنچتے ہی اسے گرانٹ ہم کا قصبہ بہت قریب نظر آنے لگا۔ وہی قصبہ جہاں کنگز اسکول تھا۔ جہاں اس نے مسٹر کلارک کے گھر قیام کیا تھا۔ جہاں وہ کلارک کی بیٹی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ اس لڑکی سے یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ بہت جلد تعلیم مکمل کرکے واپس آئے گا۔ اس نے کہا تھا وہ اس کا انتظار کرے۔ شاید وہ اب بھی اس کا انتظار کررہی ہو؟ وہ ایک صبح گرانٹ ہم کے لیے روانہ ہوگیا۔

مسٹر کلارک اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ اس کمرے میں گیا جہاں اس نے کچھ دن قیام کیا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کیا اسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی؟ وہ ابھی اپنی سوچوں میں گم تھا کہ مسٹر کلارک ایک ننھی سی میز اٹھا کر لائے۔ یہ وہ میز تھی جو کبھی اس نے کلارک کی بیٹی کے لیے بنائی تھی کہ وہ اس پر اپنی گڑیا... رکھ لیا کرے۔

”نیوٹن، یہ میز تمہیں یاد ہے تم نے میری بیٹی کے لیے بنائی تھی۔ ایک الماری بھی بنائی تھی۔ اسے وہ اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ یہ میز وہ تمہارے لیے چھوڑ گئی ہے کہ تم اسے اپنے پاس اس کی نشانی کے طور پر رکھو۔“

”وہ کہاں چلی گئی انکل کلارک۔“

”ارے تمہیں نہیں معلوم۔ اس کی شادی ہوگئی۔ میں تمہیں اس کی شادی میں بلانا چاہتا تھا۔ میں خود وولز تھورپ گیا تھا اور تمہاری والدہ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں خط لکھ کر اطلاع کردیں لیکن یا تو انہوں نے خط لکھا نہیں یا تم تک پہنچا نہیں۔“

مسٹر کلارک اس کے جذبات سے بے خبر اس قصبے کی تعریف کررہے تھے جہاں وہ بیاہ کر گئی تھی۔ اس شخص کی تعریف کررہے تھے جس سے اس کی شادی ہوئی تھی۔

اس نے کلارک سے اجازت لی، ننھی سی میز اٹھائی اور گھر سے نکل آیا۔

وہ ایسی مٹی سے بنا ہی نہیں تھا جس میں پانی جذب ہوجائے۔ یہ پانی بھی پڑا اور پھسل گیا۔ کچھ دن اس لڑکی کو یاد کرتا رہا پھر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ اپنا وقت ضائع کررہا ہے۔ وولز تھورپ کی تنہائی اسے لے اڑی۔ دن کے اوقات میں وہ باغات کو دیکھتا رہتا تھا جہاں درختوں پر سیب پک جاتے تھے اور ان میں سے بعض اپنے ہی بوجھ سے گرجاتے

تھے۔ بارش کے بعد حیرت سے سوچتا تھا کہ قوسِ قزح کیسے نمودار ہوتی ہے۔ رات کو سونے کے لیے لیٹتا تو اسی طرح تاروں کو دیکھتا رہتا جس طرح بچپن میں دیکھتا تھا۔

وہ جو کچھ جانتا تھا اس خاموش تنہائی نے اسے پہچاننے کی منزل تک پہنچا دیا۔ مختلف سوال اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔

چیزیں ہمیشہ نیچے کیوں گرتی ہیں؟
چاند زمین پر کیوں نہیں گر جاتا؟
رفتار اور پرواز کیا ہے؟
توپ کا گولہ گرنے سے پہلے کیوں پرواز کرتا ہے؟
سیارے اپنے مدار میں کیوں قائم ہیں؟
مدار کیوں ہوتا ہے؟

یہ سوالات بظاہر پاگل پن نظر آتے تھے لیکن یہ کسی سائنس داں کے ذہن کا پھیلاؤ تھا۔ سوال اس نے اٹھا دیے تھے۔ اب وہ اس کے جوابات ڈھونڈنے میں کمربستہ تھا۔ وولز تھورپ کی تنہائی اس کی پوری مدد کر رہی تھی۔ یہاں نہ تو اس کے سر پر اساتذہ کے سامنے کچھ ثابت کرنے کی ذمہ داری تھی اور نہ یونیورسٹی کا وہ شور تھا جو اس کے خیالات کو منتشر رکھتا تھا۔

وہ ایک روز وولز تھورپ کے قریب ایک باغ میں بیٹھا تھا کہ اس کے سامنے سیب ایک درخت سے ٹوٹ کر نیچے گرا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جس گتھی کو سلجھانے کے لیے کوشاں رہا تھا پل بھر میں سلجھ گئی۔ زمین میں قوت کشش ہے جو ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جب یہ قوت ہر چیز کو کھینچ سکتی ہے تو چاند زمین پر کیوں نہیں گرتا؟ یہ سوال بڑا اہم تھا۔ اس کا جواب بھی نیوٹن نے فاصلے کی تھیوری سے حل کر لیا۔ فاصلہ جتنا بڑھتا جائے گا قوت اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ اس نے حساب لگایا کہ سیب پر زمین کی کشش ثقل چاند کے مقابلے میں تین ہزار چھ سو گنا زیادہ شدید ہے۔ سیب صرف چند فٹ کی دوری پر تھا۔ زمین نے اسے کھینچ لیا۔ اس نے ریاضی کی مدد سے زمین کے وسط سے چاند کا فاصلہ ثابت کیا اور یوں دنیا کو کشش ثقل کے قانون سے آشنا کیا۔

نیوٹن ابھی حرکت کے قوانین سے نمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیمبرج میں دوران تعلیم وہ محسوس کر چکا تھا کہ ایسے عجیب الفطرت سوالات ریاضی کی مدد سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ وولز تھورپ کی تنہائی میں وہ اسی سوچ کو اگلے مرحلوں میں لے کر جا رہا تھا۔ اس نے ایسے مقالات تخلیق کر لیے جس میں وہ خم زدہ شکلوں اور ان کی زد میں آنے والے رقبے کا ریاضی کی مدد سے حساب لگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ان حسابی صلاحیتوں نے متحرک اشیاء کے حسابی اصول و قواعد ڈھونڈنے میں مدد فراہم کرنی تھی۔ اس نے اس نئی ریاضی کو فلکس ڈیون کہا۔

وولز تھورپ کے قیام کے دوران میں اس نے روشنی پر بہت تجربات کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عمومی روشنی مختلف رنگوں کی شعاؤں کا امتزاج ہے۔ اس طرح اس نے اپنے سے پہلے کے ایک سائنس داں ڈیکارٹ کے نظریے سے انحراف کر دیا۔ ڈیکارٹ کا کہنا تھا سفید روشنی بس سفید ہوتی ہے۔ اس کا بذاتِ خود کوئی اور رنگ نہیں ہوتا۔

ابھی اس کے یہ تجربات ''خام'' تھے لیکن آگے چل کر ان نظریات نے ایسے رنگ دکھائے کہ سائنسی نظریات کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس کی ابتدا وہ اس وقت کر چکا تھا جب اس کی عمر محض پچیس سال تھی۔

ہر چند کہ کوپر نیکس اور گیلیلو نے قدیم علوم و نظریات کی کئی ایک غلط فہمیاں دور کر دی تھیں اور کائنات کے فہم میں گرانقدر اضافے کیے تھے لیکن تاحال قوانین کا کوئی مجموعہ وضع نہیں کیا جا سکا تھا جو ان بظاہر غیر متعلق دکھائی دینے والے حقائق کو ایک مربوط نظریے میں ڈھالے جس سے پھر سائنسی پیش گوئی ممکن ہو سکے۔ نیوٹن نے ہی یہ نظریہ پیش کیا اور جدید سائنس کو اس رخ پر موڑ دیا جدھر یہ آج بھی رواں ہے۔

اپنی تحقیقات کی اشاعت میں وہ ہمیشہ متذبذب رہتا تھا حالانکہ وہ اپنی تحقیقات کے ذریعے بنیادی نظریات کو وضع کر چکا تھا۔ اس کے یہ نظریات بہت دیر بعد منظر عام پر آئے۔ اس کے شائع ہونے والے اولین تہلکہ مچا دینے والے نظریات روشنی کی ہیئت سے متعلق تھے۔ محتاط تجربات کے ایک سلسلے کے بعد (بیشتر تجربات وولز تھورپ کی تنہا زندگی کے دوران میں کیے) اس نے دریافت کر لیا کہ عام سفید روشنی قوس و قزح کے تمام رنگوں کا آمیزہ ہے۔ اس نے روشنی کے انعکاس کے قوانین کے نتائج کا بھی محتاط تجزیہ کیا۔ ان قوانین کو بروئے کار لا کر اس نے 1688ء میں روشنی منعکس کرنے والی پہلی دوربین کا نقشہ تیار کیا۔ یہ خاص وضع کی دوربین ہے جو آج بھی بڑی فلکیاتی مشاہدہ گاہوں میں استعمال ہوتی ہے۔

ریاضیات میں اس کی بڑی کامیابی کمل علم الاحصاء (Calcalus) کی ایجاد ہے جو اس نے صرف پچیس

سال کی عمر میں ممکن بنائی تھی۔ یہ ایک ایسا جدید اوزار ہے جس کے بغیر جدید سائنس کی بیشتر کامیابی ممکن ہی نہیں تھی۔

☆......☆

وہ طاعون کی بیماری ٹل جانے کے بعد کیمبرج واپس آیا تو اس کا دماغ تجربات کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔ وہ بہت سے بنیادی نظریات تک پہنچ چکا تھا لیکن اس نے اپنے خیالات کی کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ دماغ کس عظیم سیاحت پر نکلا ہوا ہے۔ اس نے ریاضی سے متعلق اپنے نظریے فلکس ژیون کے بارے میں بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کن دنیاؤں کی سیر کو نکلا ہوا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آسمان میں عجیب و غریب انداز سے بھٹکتے ہوئے سیاروں کے پیچھے دیدہ زیب اور حقیقت کے قریب اصول و قواعد دریافت کرنے کی راہ پر چل پڑا ہے۔ یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا کہ ایک واقعے نے اس کی خاموشی کو توڑ دیا۔

کیمبرج کے ایک پروفیسر بارو نے اسے جرمنی کے ریاضی داں نکولس مرکیٹر کی لکھی ہوئی کتاب اسے پڑھنے کے لیے دی۔ اس کتاب میں مرکیٹر نے ریاضی کی بعض مشکل مساوات کو حل کرنے کے لیے مخصوص قسم کے اعداد کا نظام پیش کیا تھا۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد نیوٹن کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ اندر سے مل کر رہ گیا۔ یہ نظام وہی تھا جو نیوٹن پہلے ہی دریافت کر چکا تھا اور اس نے اسے فلکس ژیون کا نام دیا تھا لیکن اس کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا نہیں تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس اب ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ اسی طرح خاموش رہا تو اس کا بقیہ آدھا کام بھی کسی نہ کسی کے ہاتھوں منظر عام پر آ جائے گا۔ اس نے اپنی نوٹ بک نکالی اور اپنے حسابی مقالات لکھنے بیٹھ گیا۔ وہ دنیا کو بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کے خیالات تجربات اور تجزیات مرکیٹر سے کہیں بلند سطح پر ہیں۔ جب مقالہ مکمل ہو گیا تو اس نے پروفیسر بارو کے سامنے پیش کر دیا۔ پروفیسر بارو نے ایک اور ریاضی داں جان کولنز کے پاس مطالعہ کے لیے بھیج دیا۔ جان کولنز اس مقالے سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنا مثبت تبصرہ یورپ کے دیگر ریاضی دانوں کے پاس روانہ کر دیا۔

نیوٹن اب تک اپنے خیالات کو مشتہر کرنے سے بچتا رہا تھا لیکن جان کولنز نے انہیں پھیلا دیا۔ پہلی مرتبہ دنیا کو معلوم ہوا کہ وہ کس پائے کا سائنس داں ہے۔ اس کا نام ٹرینٹی کالج کی دیواروں سے نکل کر بقیہ دنیا میں پھیلنا شروع ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر بارو نے چرچ آف انگلینڈ میں اونچے درجے کا پادری بننے کے لیے ٹرینٹی کالج کی پروفیسری ترک کر دی۔ وہ نیوٹن کی صلاحیتوں کو پہچان گئے تھے لہٰذا جاتے جاتے وہ اپنی جگہ نیوٹن کو نامزد کر گئے۔

نیوٹن پچھلے سال اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اس کی اصل ذمہ داری یہ تھی کہ ہفتے میں ایک بار لیکچر تیار کرے، طلبہ کو سکھائے اور لائبریری میں جمع کرا دے۔ اس کے زیادہ تر لیکچر ریاضی کے مسائل اور حرکت کے قوانین سے متعلق ہوتے تھے۔

اس کے یہ لیکچر اتنے پر مغز تھے کہ ان لیکچروں نے ہر میدان کے سائنس دانوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ان ہی لیکچروں کے درمیان اس نے یہ انقلاب آفرین تصور پیش کیا کہ سفید روشنی میں تمام رنگین شعاعیں موجود ہوتی ہیں جو انسانی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔

نیوٹن کے اسی تجربے کو بڑھاتے ہوئے انیسویں صدی میں طبیعات والوں نے دریافت کیا کہ روشنی میں نہ صرف سات رنگ بلکہ ایک مکمل برقی مقناطیسی میدان موجود ہوتا ہے جس میں انسانی آنکھوں سے مکمل طور پر پوشیدہ شعاعیں موجود ہوتی ہیں۔

اس کی ایک اہم ایجاد ایک خاص قسم کی دوربین تھی۔ اس سے پہلے گلیلیو بھی دوربین بنا چکا تھا لیکن اس میں خامی رہ گئی تھی اور گلیلیو اسے کوشش کے باوجود دور نہ کر سکا تھا۔ اس کی ایک خوبی اس دوربین کا حجم تھا۔ وہ ہاتھ میں اٹھائی جا سکتی تھی اور وہ اشیا کو چالیس گنا زیادہ قریب کر کے دکھاتی تھی۔ وہ اس کارنامے پر اتنا خوش ہوا کہ اپنی نوٹ بک میں یہ الفاظ تحریر کیے۔

''گزشتہ کل میں نے اس دوربین کا ایک چھ فٹ بڑی دوربین سے موازنہ کیا تو پتا چلا کہ نہ صرف میری دوربین اشیا کو زیادہ قریب کر کے دکھاتی ہے بلکہ زیادہ صاف بھی دکھاتی ہے۔''

اس کی دوربین کی شہرت ہوئی تو ماہرین فلکیات نے اسے خطوط بھیجنا شروع کر دیے کہ انہیں اس ایجاد کے متعلق آگاہ کیا جائے۔ جلد ہی یہ خبر انجمن شاہی تک بھی پہنچ گئی۔ (لندن کے معتبر دانش مندوں کا حلقہ جس میں نئی دریافتوں

اور ایجادات پر اظہار خیال بھی کیا جاتا تھا)۔

اس موقع پر پروفیسر آئزک بارو نے نیوٹن اور اس کے چاہنے والوں پر ایک احسان یہ کیا کہ انہوں نے یہ دوربین اٹھائی اور انجمن شاہی میں پیش کرنے کے لیے لندن پہنچ گئے۔

بادشاہ چارلز نے بذاتِ خود اس ننھی منی ایجاد سے آسمان شب کا جائزہ لیا اور اس کی سفارش پر نیوٹن کو انجمن شاہی کا رکن بنالیا گیا۔ انجمن کا رکن بننا عظمت کا نشان سمجھا جاتا تھا اور یہ اعزاز 29 سال کی عمر میں نیوٹن کو مل رہا تھا۔

اس انوکھی ایجاد کی طرف سے یہ دھڑکا برابر لگا ہوا تھا کہ کسی وقت بھی اس دوربین کو ایجاد کرنے کے جھوٹے دعویدار پیدا ہو جائیں گے۔ ضروری تھا کہ اسے رجسٹرڈ کرالیا جائے۔ نیوٹن کے پاس اتنے ذرائع نہیں تھے کہ وہ اپنی ایجاد کا حق محفوظ کروا سکے۔ لہٰذا یہ قدم بھی انجمن شاہی نے اٹھایا اور نیوٹن کی طرف سے سندِ حق محفوظ کروا دیا۔

جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا، اب تک نیوٹن کا حال یہی تھا لیکن جب یہ مور جنگل سے نکل کر شہر میں آیا اور اس کے رقص دلپذیر نے ہوا باندھی تو پورا یورپ چشم تماشا بن گیا۔ نیوٹن کی خلوت گاہ میں خطوط کی یلغار شروع ہو گئی۔

انجمن شاہی کے تمام ارکان اب اس کے نظریات سنجیدگی سے سننے کو تیار ہو گئے تھے چنانچہ اس نے رنگ و روشنی سے متعلق اپنے نظریات جو اس نے مختلف تجربات کے بعد اخذ کیے تھے جن میں اس نے ثابت کیا تھا کہ سفید روشنی میں تمام رنگین شعاعیں موجود ہوتی ہیں۔ ایک مقالے کی صورت میں انجمن شاہی کو بھیجا۔ انجمن کے اگلے ہی اجلاس میں یہ مقالہ پڑھ کر سنایا گیا۔ تمام سائنس داں، اراکین نے اسے سراہا اور اسے اس قابل سمجھا کہ اسے انجمن کے رسالے "جریدۂ فلسفہ" میں شائع کیا جائے۔ نیوٹن کی اجازت سے اسے شائع کر دیا گیا۔

یہ خوشی کی بات تھی لیکن مقالے کی اشاعت کے ساتھ ہی ایک نیا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض نامور سائنس دانوں نے نیوٹن پر تنقید کی بارش کر دی۔ نیوٹن کا کہنا تھا کہ ان لوگوں نے اس کے نظریات کو سمجھا ہی نہیں۔ دوسری طرف اس کے مخالف اپنی رائے پر قائم تھے۔ نیوٹن غصے سے بپھر گیا۔ جب وہ وضاحتیں کرتے کرتے تھک گیا تو اس نے انجمن شاہی کی رکنیت سے دست برداری کا اعلان کر دیا کیوں کہ اس کے سب سے بڑے مخالف انجمن کے بعض ارکان تھے۔

انجمن بھی یہ نہیں چاہتی کہ وہ استعفیٰ دے۔ اسے بڑی مشکل سے منایا گیا اور بالآخر وہ مان گیا۔

وہ مان گیا تھا مگر یہ قضیہ ختم نہیں ہوا۔ جواب در جواب کا یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔

دوسری طرف اس کی خدمات کے صلے میں یونیورسٹی نے اسے ایک بہت بڑی جگہ رہائش کے لیے دے دی جس میں ایک بہت بڑا باغ بھی تھا۔

اس نے یہاں منتقل ہوتے ہی ایک خفیہ تجربہ گاہ بنائی۔ اس تجربہ گاہ میں اس کے دوست جان وکنز کے سوا کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی بلکہ اس کے قریب بھی کوئی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ اس عظیم تجربہ گاہ میں نیوٹن مختلف حجم کے شیشوں، سانچوں، چمٹیوں اور بوتلوں کے درمیان گھرا بیٹھا رہتا تھا۔ ان معاملات کو خفیہ رکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آرہی تھی کہ نیوٹن ایک فن ممنوعہ کے تجربات کر رہا تھا۔ یعنی کیمیا گری کے تجربات۔ وہ کسی ایسے راز کو ڈھونڈنے میں معروف تھا جس میں تمام کائناتی سچائیاں کسی ایک نکتے پر جمع ہوں اور اسے بیان کرنا اور سمجھنا آسان ہو جائے۔

اسے اپنے کاموں کو خفیہ رکھنے کا خبط تھا اس لیے کسی کو شک بھی نہیں ہوا کہ وہ کس کام میں لگا ہوا ہے۔

☆......☆

1670ء کی دہائی کا آغاز ہو چکا تھا کہ اس کی دلچسپیاں مذہب کے مطالعے کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے یونیورسٹی کے قوانین کے مطابق ایک خاص وقت گزارنے کے بعد چرچ آف انگلینڈ میں اعلیٰ سطح کا پادری بن جانا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے پروفیسر شپ سے دست بردار ہو جانا تھا۔ اس کے سامنے مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ چرچ آف انگلینڈ کی طرح وہ عقیدۂ تثلیث پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ وہ بہت پہلے عقیدۂ تثلیث کا انکاری ہو چکا تھا۔ اگر وہ کھل کر اظہار کرتا تو کافر، مرتد یا غدار کہلاتا۔ نہ صرف دائرۂ عیسائیت سے خارج کر دیا جاتا بلکہ یونیورسٹی سے بھی نکلنا پڑتا۔ وہ حضرت عیسیٰ کو صرف پیغمبر مانتا تھا خدا کا بیٹا نہیں۔

اس نے انجیل مقدس کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ "انجیل میں عقیدۂ تثلیث کا کہیں ذکر نہیں۔"

وہ سائنس دان تھا۔ تجربہ اور تحقیق اس کی فطرت میں تھی۔ اس نے تحقیق کی اور اس تحقیق کے نتائج کو اپنے کاغذات میں بند کر دیا جو کسی وقت ڈھونڈنے والوں کو ملے۔ اس نے لکھا عقیدۂ تثلیث ایک اختلافی مسئلہ تھا جو سیاسی مداخلت کی

وجہ سے طاقت ور ہو گیا اور اس کے ماننے والے گرجوں پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد عیسائیت کا مطلب ہی عقیدۂ تثلیث ہو گیا۔

اس کی تحقیق اپنی جگہ لیکن نہ تو وہ اپنے عقائد کسی پر ظاہر کرسکتا تھا اور نہ پادری بننے کی کسی تقریب میں انجیل پر ہاتھ رکھ کر عقیدۂ تثلیث کو ماننے کی گواہی دے سکتا تھا جیسا کہ قاعدہ تھا۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بالآخر ایک ترکیب سمجھ میں آئی کہ اپنی مصروفیات کو بہانہ بنا کر درخواست گزار ہو کہ اسے پادری نہ بنایا جائے اور اس کا ریاضی داں کا عہدہ برقرار رہے۔ یہ کوئی معمولی مطالبہ نہیں تھا جو کسی معمولی سفارش سے حل ہو جاتا۔ یہ رعایت صرف بادشاہ وقت چارلز دوم کی منظوری سے مل سکتی تھی کیوں کہ بادشاہ چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ تھا۔ بادشاہ تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ پھر اسے اپنے محسن پروفیسر آئزک بارو کا خیال آیا۔ یہ کام وہی کرسکتا تھا۔ پروفیسر بارو اس وقت چرچ آف انگلینڈ کا معتبر پادری تھا اور بادشاہ نے اسے اپنا مشیر خاص بنا لیا تھا۔

نیوٹن پہلی فرصت میں لندن جا پہنچا۔ پروفیسر بارو سے اس کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں اس نے پروفیسر بارو کو یہ ہوا نہیں لگنے دی کہ وہ عقیدۂ تثلیث کا منکر ہے۔ وہ اس کا کتنا ہی عزیز دوست کسی مذہب کے نام پر بھڑک سکتا تھا۔ عیسائیت کے خلاف زبان کھولنے والوں کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے پروفیسر بارو کو یہی باور کرایا کہ وہ (نیوٹن) محض ریاضی داں نہیں ہے بلکہ اس کے تجربات اس نوعیت کے ہیں کہ پادری بننے کے بعد وہ انہیں انجام نہیں دے سکے گا اور انسانیت کی عظیم خدمت سے محروم رہ جائے گی۔ پادری تو بہت ہو سکتے ہیں لیکن دوسرا نیوٹن پیدا نہیں ہو سکے گا۔

پروفیسر بارو کو اس کی باتیں سمجھ میں آ گئیں اور اس نے نیوٹن کی ملاقات بادشاہ سے کرا دی اور اس انداز سے اس کی خدمات کا تذکرہ کیا کہ بادشاہ نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔ اسے پادری بنائے جانے سے استثنیٰ مل گیا۔

☆......☆

وہ تینوں لندن کے ایک قہوہ خانے میں میز کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔ تینوں کے سر اس طرح آپس میں ملے ہوئے تھے جیسے اپنی آواز وہ صرف خود سننا چاہتے ہوں۔ یہ حقیقت بھی تھی کیوں کہ یہ تینوں ابھی ابھی انجمن شاہی کے دفتر سے اٹھ کر آئے تھے۔ اجلاس ختم ہونے کے بعد جو نکات تشنہ رہ گئے تھے ان پر بحث کی جارہی تھی۔ اس وقت وہ سیاروں کی ساخت اور ان کے مداروں پر بات کر رہے تھے ان میں ایک کرسٹوفر رین تھا۔ دوسرا رابرٹ ہک اور تیسرے کا نام ایڈمنڈ ہیلے تھا۔

کچھ دیر کی بحث کے بعد تینوں اس پر متفق ہو گئے تھے کہ سیارے، سورج کے گرد بیضوی مداروں میں محو سفر ہیں لیکن تینوں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ ثابت کر سکتے اور جب تک وہ ثابت کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے یہ محض مفروضہ رہتا۔ اہلِ دانش کے نزدیک مفروضوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

''ہم ایسی ریاضی تخلیق کرنے سے قاصر ہیں جو ان مفروضات کو معتبر بنا دے۔'' رین نے کہا۔

''جب تک اسے ثابت نہیں کیا جاتا کوئی بھی ہماری بات نہیں مانے گا۔'' ہیلے اور ہک نے بہ یک وقت کہا۔

''کیا کوئی ایسا ریاضی داں ہے جو ہماری مشکل حل کر سکے؟'' ہک نے کہا۔

''ہاں ایک ہے تو اگر وہ ہماری بات مان جائے۔'' رین نے جواب دیا۔

''کون ہے وہ۔'' ہک نے پوچھا۔

''نیوٹن اس قابل ہے کہ ضروری ریاضی تخلیق کر سکے۔'' رین نے نیوٹن کا نام پیش کیا۔

نیوٹن کا نام سنتے ہی رابرٹ ہک کی بھنویں تن گئیں۔ ہک اور نیوٹن ایک دوسرے کے حریف تھے۔ ہک اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ یقیناً یہی حال نیوٹن کا بھی تھا۔

''نیوٹن ناکارہ آدمی ہے۔ اس کام کے لیے وہ قطعی ناموزوں ہے۔'' ہک نے کہا اور دونوں دوستوں کے اصرار کے باوجود وہ تیار نہ ہوا کہ نیوٹن کا سامنا کیا جائے۔

یہ بحث کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

ایڈمنڈ ہیلے نے کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور ایک دن چپکے سے کیمبرج پہنچ گیا۔ نیوٹن اور ہیلے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہیلے نے وہ بحث نیوٹن کے سامنے رکھ دی جو کچھ دنوں پہلے قہوہ خانے میں ہوئی تھی۔ ہیلے کو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ نیوٹن کے خیالات بھی وہی ہیں جو اس کے اور دوستوں رین اور باروک کے تھے۔ مسئلہ صرف ثبوت کا تھا۔

''آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ سیارے بیضوی مداروں میں ہیں۔'' ہیلے نے پوچھا اور اتنی جلدی پوچھا کہ

نیوٹن کو سوچنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ جوش میں بھرے نیوٹن کے منہ سے نکلا۔ "ہاں۔"

"میں وہ ثبوت دیکھ لوں تو مجھے یقین آجائے۔" ہیلے نے کہا۔

نیوٹن نے "ہاں" کہہ تو دیا تھا لیکن اب اس کے دل میں شکوک و شبہات سر ابھار رہے تھے۔ وہ اپنی نوٹ بک کی طرف بڑھا ضرور لیکن پھر یہ ظاہر کیا جیسے وہ اسے کہیں رکھ کر بھول گیا ہے۔

"میں نے آپ کی بات کا جواب دس برس پہلے ہی تیار کرلیا تھا کسی جگہ تحریر بھی ہے لیکن اس وقت مل نہیں رہا ہے۔ میں فرصت سے تلاش کرلوں گا۔ آپ بے فکر رہیں جیسے ہی ملا میں اسے آپ کے پاس لندن روانہ کردوں گا۔"

ہیلے ناکام لوٹ آیا لیکن اسے اُمید تھی کہ نیوٹن اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

ہیلے کے چلے جانے کے بعد نیوٹن اپنے شبہات سے جنگ کرنے لگا۔ اسے ہیلے پسند آگیا تھا۔ جیسے جیسے وہ اس کے بارے میں سوچتا گیا اسے یقین ہونے لگا کہ ہیلے اس کے ساتھ کوئی جعل سازی نہیں کرے گا۔ بالآخر اس نے وہ نوٹ بک تلاش کرلی جس پر ثبوت درج تھا۔

اس نے یہ ثبوت تحریر کیا اور وعدے کے مطابق ہیلے کو ارسال کردیا۔

ہیلے نے ان صفحات کا مطالعہ کیا تو نیوٹن کی قابلیت کی دھاک اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ یہ کام کوئی غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل شخص ہی کرسکتا تھا۔ ان صفحات کو اس نے مزید غور سے پڑھا تو نیوٹن کی چالاکی کا بھی قائل ہوگیا۔ نیوٹن نے اس ثبوت کو اس طرح تحریر کیا تھا کہ ثبوت فراہم تو ہوتا تھا لیکن گہرائی میں جائے بغیر حقیقت تک نہیں پہنچا جاسکتا تھا۔ سائنسی حقائق کی گہرائی اب بھی نیوٹن کے پاس تھی۔ اس گہرائی سے پردہ وہی اٹھا سکتا تھا گویا یہ خاکہ تھا۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے تفصیل کی ضرورت تھی۔

ہیلے ایک مرتبہ پھر کیمبرج میں تھا اور پھر وہ متواتر گردش میں رہا۔ لندن سے کیمبرج، کیمبرج سے لندن۔ وہ نیوٹن کو آمادہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اپنے اس خاکے کو تفصیل سے بیان کرکے کتابی شکل دے دے۔ احتیاط پسند نیوٹن کسی طرح ان سربستہ رازوں کو کھونے کے لیے تیار نہیں ہورہا تھا۔

ہیلے بھی دھن کا پکا نکلا اور نیوٹن کو آمادہ کرلیا۔

نیوٹن ایک کمرے میں بند ہوگیا۔ دواتوں میں قلم ڈبوتا رہا۔ خیالات صفحوں پر منتقل ہوگئے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی فکر۔ مکمل دو سال اس نے لکھنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اس کی لاغری کتاب کی ضخامت میں تبدیل ہوگئی۔ دو سال کی محنت کے بعد وہ ایک عظیم کارنامہ انجام دے چکا تھا۔ لاطینی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا نام اس نے "پرنسپیا" (سائنس کے حسابی اصول) رکھا۔

اس نے یہ مسودہ ہیلے کے پاس بھیج دیا۔ اس نے انجمن شاہی سے رابطہ کیا۔ انجمن اس کتاب کو شائع کرنے پر رضامند تھی لیکن پیسے لگانے کو تیار نہیں تھی۔ اب اس کتاب کی اشاعت کی ایک ہی صورت تھی کہ ہیلے سرمایہ فراہم کردے۔ ہیلے کو معلوم تھا کہ یہ کتاب دنیائے سائنس میں ہلچل مچادے گی۔ نیوٹن کے ساتھ اس کا نام بھی ہمیشہ کے لیے زندہ ہوجائے گا۔ وہ اسے شائع کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ اس نے اپنی تمام جمع پونجی کتاب پر لگانے کا خطرہ مول لے لیا۔

وہ گھاٹے میں نہیں رہا۔ کتاب شائع ہوئی تو ایسی مقبول ہوئی کہ سائنس پر لکھی گئی کسی کتاب کو ایسی شہرت بھی نہیں ملی تھی۔ اس کتاب میں اس نے اپنے کشش ثقل اور حرکت کے قوانین کو بیان کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ کس طرح ان قوانین کے ذریعے سورج کے گرد گھومتے سیاروں کی حرکت کے متعلق پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ یہ حرکیاتی علم فلکیات کا بنیادی مسئلہ ہے یعنی کسی طور ستاروں اور سیاروں کے درست مقام اور حرکت کے متعلق پہلے سے جانا جائے۔ نیوٹن نے اسے یکسر حل کردیا۔

نیوٹن نے ایک ہی جھٹکے سے دو ہزار برسوں سے دنیا میں قائم ارسطو کے اس عقیدے کی دھجیاں اڑا دیں جس کے مطابق دنیا ایک الگ نظام کے مطابق چلتی ہے اور اس سے پرے سورج، چاند، ستارے اور سیارے ایک دوسرے نظام کے ماتحت ہیں نیوٹن نے ثابت کردیا کہ ہر دکھائی دینے والی چیز ایک ہی نظام کے تابع ہے اور نہ دکھائی دینے والی چیز بھی۔

یہ کتاب نیوٹن کے بیس برس کے مشاہدات کا نچوڑ تھی۔ اس نے اس کتاب میں جن اصطلاحات کو استعمال کیا آج بھی جدید علم طبیعات (فزکس) میں وہی اصطلاحات اسی طرح موجود ہیں۔ یہ اس کا کمال تھا کہ فزکس آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں اس نے اسے پہنچایا تھا۔

پرنسپیا کی اشاعت ہوچکی تھی۔ ہر آنے والا دن اس

کی شہرت میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔ جو اس کے نظریات کو سمجھنے سے قاصر تھے وہ بھی اسے عظیم تسلیم کر رہے تھے جو سمجھتے تھے وہ بھی اسے غیر معمولی سائنس داں کے لقب سے پکار رہے تھے کہ اچانک وہ کسی اور راہ چلنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے سیاست کی گتھیوں میں الجھنا پڑ گیا۔

چارلز دوم بادشاہ انگلستان کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا کوئی جائز وارث نہیں تھا۔ اس صورت میں قوی امکانات تھے کہ بادشاہ کے چھوٹے بھائی شہزادہ جیمز کو بادشاہ بنا دیا جائے گا۔ اس تقرری پر کیمبرج یونیورسٹی میں شدید غم و غصہ تھا کیوں کہ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ شہزادہ جیمس کیتھولک عیسائی ہے جب کہ یونیورسٹی میں چرچ آف انگلینڈ کی اجارہ داری تھی۔ یہی یونیورسٹی پادری مہیا کرتی تھی۔

جیمز کو بادشاہ بنائے جانے کے امکانات ضائع نہیں گئے۔ جیمز کو بادشاہ بنا دیا گیا۔ اس کے بادشاہ بنتے ہی وہی ہوا، کیمبرج کے اساتذہ کو جس کا خدشہ تھا۔ جیمز اور اس کے حامیوں نے حکومتی اداروں اور گرجوں میں کیتھولک منتظم لگوا دیے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہاں بھی کیتھولک منتظم آ گیا۔ اس عمل سے یونیورسٹی میں ایسا اشتعال پھیلا کہ نیوٹن کو بھی اپنی تنہائی سے باہر آنا پڑ گیا۔

وہ چرچ آف انگلینڈ سے اختلافات رکھتا تھا اور عقیدۂ تثلیث سے انکاری تھا لیکن اس کا عقیدہ کسی پر ظاہر نہیں تھا لہٰذا وہ پاپائیت کے خلاف چرچ آف انگلینڈ کا ساتھ دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا یا اٹھنا پڑا۔

ایک وفد ترتیب دیا گیا جس میں وہ بھی شامل تھا۔ اس وفد نے شاہی دربار میں جا کر آواز بلند کی اور بادشاہ جیمز کو متنبہ کیا کہ وہ زبردستی کیتھولیزم جاری کرنے سے باز رہے۔

بادشاہ کے خلاف ہر طرف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ کیمبرج بغاوتوں کا ہیڈ کوارٹر بنا ہوا تھا۔ پُرجوش نیوٹن پیش پیش تھا۔ قصبہ قصبہ جا کر تقریریں کر رہا تھا۔

بادشاہ کو سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ بادشاہ کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ مظالم سے دبایا جا رہا تھا۔ مذہبی آگ بڑی مشکل سے بجھتی ہے یہی سب یہاں بھی ہو رہا تھا۔

1688ء میں ولندیزی جنگی جہازوں نے انگلستان پر قابض ہونے کے لیے توپوں کے دہانے کھول دیے اور بالآخر جیمز کی مطلق العنانیت کا خاتمہ ہو گیا اور وہ فرار ہو کر فرانس چلا گیا۔

ان تین سالوں میں جیمز کے خلاف مزاحمت کاروں میں نیوٹن کا نام سرفہرست تھا لہٰذا کیمبرج کے عہدے داروں نے اسے متفقہ طور پر پارلیمان انگلستان میں کیمبرج کی نمائندگی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ وہ حقیقت تھی جب بادشاہ کی خالی کرسی پر بٹھانے کے لیے نئے بادشاہ کی تلاش جاری تھی۔

نیوٹن اور دیگر ممبران نے مل کر شہزادی میری کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہ شہزادی جیمز کی پہلی بیوی سے تھی اور پروٹیسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتی تھی اور ولندیزی شہزادے ولیم کی بیوی تھی جس نے جیمز (اپنے سسر) کا تختہ الٹ کر اسے بے دخل کیا تھا۔

یہ تبدیلی صرف انگلستان میں نہیں آئی بلکہ نیوٹن کی شخصیت میں بھی تبدیلی آئی۔ اب تک وہ تنہائی میں سانس لیتا رہا تھا۔ لیکن اب سماجی زندگی میں دلچسپی لینے لگا۔ دوستیاں کرنے اور نبھانے کی طرف راغب ہوا۔ ان دوستیوں میں اس نے عجیب و غریب رنگ شامل کیے ایسے رنگ جن کی توقع اس سے نہیں کی جا سکتی تھی۔

زندگی بھر ایک دوست جان وکنز پر گزارہ کرنے والے نیوٹن کی دوستی اب ایک بہت بڑے فلسفی جان لاک سے ہو گئی حالانکہ دونوں کے موضوعات الگ تھے۔ فلسفی جان لاک علوم و فنون کے معاملے میں بہت بلند سطح پر تھا لیکن ریاضی میں وہ کہیں پیچھے تھا۔ البتہ دونوں کا مشترکہ موضوع مذہب تھا۔ دونوں کے درمیان برس ہا برس تک خط و کتابت جاری رہی۔ سب سے زیادہ خطوط مذہب کے بارے میں تفصیل سے لکھتا لاک کی دوستی پر اعتماد کی شاندار مثال تھی۔ یا تو وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا یا اب ایسا اعتبار کر رہا تھا۔

اس کی دوستی ایک ایسے شخص سے بھی ہوئی جو کسی طرح بھی اس کا ''ہم مشاغل'' نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ شخص سیموئل پیپس تھا۔ اس نے کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی اور سرکاری ملازم تھا۔ وہ نہ سائنس داں تھا نہ ریاضی داں البتہ سائنسی کارناموں پر گہری نظر رکھتا تھا۔ کیمیا، حیاتیات اور فلکیات پر وسیع معلومات رکھتا تھا۔ غالباً اس لیے نیوٹن کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے نیوٹن کے قریب آیا تھا۔

پیپس کو سماجی محفلیں جمانے کا بے حد شوق تھا۔ ہر وقت عورتوں میں گھرا رہتا تھا۔ غرض ہر طرح کی رنگین زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اکثر نیوٹن کو اپنے گھر دعوت پر مدعو کرتا تھا اور عالمانہ گفتگو سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ نیوٹن کو دیگر رنگ رلیوں کی فرصت نہیں تھی لیکن وہ اس کے ساتھ سے خاتوں کا رخ

ضرور کرتا تھا۔ بعد میں وہ نیوٹن کا بڑا ابصر بن کر سامنے آیا۔

نیوٹن کے ایک اور ریاضی داں سے بھی دوستانہ مراسم استوار ہوئے۔ اس کا نام نکولس فاتیو تھا اور نیا نیا سوئزرلینڈ سے آیا تھا۔ وہ ڈیکارٹ کے نظریات سے بہت متاثر تھا لیکن نیوٹن سے ملاقات کے بعد اس کے خیالات تبدیل ہو گئے۔ وہ پوری طرح نیوٹن کے حصار میں آ گیا۔ یہ دوستی، استادی شاگردی میں تبدیل ہو گئی لیکن پھر ایسا ہوا کہ کسی غلط فہمی نے دونوں کو جدا کر دیا۔

سماجی زندگی میں شامل ہوتے ہی لندن میں اس کا جی لگنے لگا۔ یہاں رہ کر اسے ترقی کے بہتر مواقع مل سکتے تھے۔ یہاں انجمن شاہی کے طاقت ور لوگ موجود تھے جن سے اگر وہ تعلقات بحال کر لیتا تو اس کی تخلیقات یورپ بھر میں پھیل سکتی تھیں۔ وہ سنجیدگی سے کیمبرج سے لندن منتقل ہونے کے بارے میں غور کرنے لگا لیکن لندن جیسے بڑے شہر میں پُروقار زندگی گزارنے کے لیے اعلیٰ درجے کی ملازمت ضروری تھی، گھر خریدنا پڑتا۔ ملازم رکھنے پڑتے۔ اس کے لیے کثیر آمدنی کی ضرورت تھی۔ کیمبرج میں تو وہ مفت کی رہائش گاہ میں رہ رہا تھا اور جس حال میں بھی رہتا کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ملازمت ڈھونڈنے کے لیے جن سماجی تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے دستیاب نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ وہ لندن منتقلی کی شدید خواہش لیے کوششیں کرتا رہا جو دو چار دوست بن گئے تھے ان سے بھی رابطے کرتا رہا۔ اس کی ناکامی مایوسی میں بدلنے لگی۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے انگلستان کی ناموری کے لیے ایجادات کیں۔ دن رات محنت کر کے اپنی صحت خراب کر لی۔ اس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کا یہ عالم کہ شاندار زندگی کے خواب دیکھنے کے لیے بھی اس کے پاس پیسے نہیں۔ اس کی صلاحیتوں کے قائل سب ہیں کام آنے والا کوئی بھی نہیں۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا۔ احساسِ محرومی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسی عالم میں سخت طیش کی حالت میں اپنے گنے چنے دوستوں کو لکھ دیا۔

"اب وقت آ گیا ہے اب تم سے اور تم جیسے بے کار دوستوں سے چھٹکارا پا لوں۔"

اس نے کیمبرج کے چند لوگوں کے سوا باہر کے تمام لوگوں سے رابطے ختم کر دیے تھے۔ جب چند مہینے اسی عالم میں گزر گئے تو افواہیں گردش کرنے لگیں۔ لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ نیوٹن کا دماغ چل گیا ہے۔

"کام بھی تو اس نے اتنا کیا ہے پاگل تو ہونا ہی تھا۔"

"پاگل نہیں ہوا ہے صرف ذہنی طور پر تھک گیا ہے۔"

"بے چارے کے کام کی قدر نہیں ہوئی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر کمرے میں بند ہو گیا ہے۔"

"سنا ہے اس نے اپنے بہت سے کاغذات جو بہت اہم تھے آتش دان کی نذر کر دیے ہیں۔"

"یہ بھی سنا ہے کہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے بے وفائی کی۔"

ایک ہی وقت میں مختلف افواہیں گردش کر رہی تھیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ اپنی بے وقعتی کا احساس اسے کھائے جا رہا تھا۔ ایسے میں دو ایک واقعات اور بھی وقوع پذیر ہوئے جس نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اس کی ماں ہانہ سمتھ کی موت نے بھی اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہوگا۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانا شروع کر دیا اور کئی مہینے بعد وہ اس حالت سے باہر نکل آیا۔

دوستوں کو لکھے گئے اس کے خطوط کی نوعیت تبدیل ہو گئی۔ اب جو خطوط دوستوں کو پہنچ رہے تھے ان کا حوصلہ افزا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ بادل چھٹ گئے ہیں۔ خبریں یہ

ایک دن ابن سماک ہارون رشید کے دربار میں پہنچا۔ ہارون نے کہا "مجھے کوئی نصیحت کرو۔"

ابن سماک نے کہا "ہارون! اگر کبھی تمہارا گلا بند ہو جائے اور تم کچھ نہ پی سکو تو کیا کرو گے؟"

ہارون نے جواب دیا "میں اس بلا کو دور کرنے کے لیے اپنی پوری حکومت کا آدھا حصہ دے دوں گا۔"

ابن سماک نے پوچھا "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں ایسی بیماری ہو جائے جس کے باعث تم پیشاب نہ کر سکو تو اس سے بچنے کے لیے کیا کرو گے؟"

ہارون نے جواب دیا "میں اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنی حکومت کا نصف حصہ دے دوں گا۔"

اب ابن سماک نے نصیحت کرتے ہوئے کہا "اے ہارون! اس سے معلوم ہوا کہ تمہاری حکومت کی کل قیمت ایک پانی کے قطرے کا اوپر سے نیچے جانے اور اس کے باہر نکلنے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔"

بھی پہنچ رہی تھیں کہ وہ علمی کاموں کی طرف بھی متوجہ ہو رہا ہے۔ اپنی تصنیف پرنسیپا پر نظر ثانی کر رہا ہے اور ترمیم و اضافہ میں مشغول ہے۔

وہ خواہش اب بھی پوری نہیں ہوئی تھی جس نے اسے ڈپریشن کا شکار بنا دیا تھا۔ یہ اس کی قوت ارادی تھی کہ وہ اس بھنور سے باہر نکل آیا۔ قدرت بھی اس کی مدد کر رہی تھی۔ پروں کے لیے پرواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے پرواز کے لیے نکلنا تھا لہٰذا ہوش مندی کے 'پر' ضروری تھے۔ شاید اسی لیے وہ ڈپریشن سے باہر آیا تھا کہ برسوں کی تگ و دو اب ثمر بار ہونے والی تھی۔

نیوٹن کا ایک دوست، شاگرد اور پرستار ترقی کرتے کرتے وزیر خزانہ کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ نیوٹن کو اس کی طاقت کا اندازہ تھا۔ وہ برابر اس سے تعلقات استوار کیے ہوئے تھا۔ دوست بھی نیوٹن کو بھولا نہیں تھا۔ اس نے نیوٹن کو لندن بلوا لیا اور محکمہ ٹکسال کا نگراں مقرر کر دیا۔ برسوں بعد لندن میں ملازمت کرنے کا خواب پورا ہو گیا۔

شاہی محکمہ ٹکسال دریائے ٹیمز کے کنارے ایک قلعہ کی پختہ دیواروں کے اندر محفوظ تھا۔ پانی کی کھائی کے درمیان گھرا ہوا یہ قلعہ سونے چاندی کے قیمتی سکے بنانے والی فیکٹری کے لیے بہترین پناہ گاہ ہو سکتا تھا۔ یہاں آنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی رہائش بھی یہیں ہوگی۔ بات خوشی کی تھی لیکن چند روز ہی میں اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ نوکری نہیں سزا ہے۔ رہائش نہیں جیل ہے۔ فیکٹری میں صبح سے لے کر رات گئے تک سکے بنائے جاتے تھے۔ سکے بنانے اور دھات کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر چادریں بنانے کے لیے دیو نما آلات کی آوازیں اتنی پُرشور تھیں کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ جب دھاتیں پگھلائی جاتی تھیں تو بدبو دور دور تک پھیلتی تھی۔

اس شور اور ناقابلِ برداشت بو نے اسے بے حال کر دیا۔ صرف چھ مہینے میں وہ اتنا بے زار ہو گیا کہ قلعے کی رہائش گاہ سے اپنا بوریا بستر اٹھا کر لندن شہر کے ایک پُرتعیش مکان میں منتقل ہو گیا۔

اب وہ کسی قدر پُرسکون تھا۔ ہر روز ٹکسال آتا تھا اور اپنا کام نمٹا کر اپنے کانوں کی خیر مناتا ہوا چلا جاتا تھا۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق پوری توجہ سے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ اس کی ان تھک محنت اور ذہانت نے محکمہ ٹکسال کو تبدیلیوں کے کئی مراحل سے آشنا کیا۔ ان دنوں جب ٹکسال کا منتظم اعلیٰ ایک بیماری کے بعد وفات پا گیا تو اس کی جگہ لینے کے لیے نیوٹن سے بہتر کوئی نہیں تھا۔ اسے منتظم اعلیٰ بنا دیا گیا۔

ٹکسال کے اعصاب شکن کام کے باوجود وہ سائنسی مشاغل سے وابستہ رہا اور انجمن شاہی کے اجلاسوں میں برابر شریک ہوتا رہا۔

انجمن شاہی کے ممبران میں اب اسے ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ اب اس کے پاس دولت بھی تھی اور شہرت بھی۔ اس کی شخصیت میں اب یہ تبدیلی بھی آئی تھی کہ وہ سماجی دلچسپیوں میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ حلقہ احباب وسیع ہو گیا تھا۔ گاہے گاہے یہ احباب اس کے گھر پر یلغار کرتے رہتے تھے۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ کیا خبر یہ اس پہلی محبت کا ردِعمل ہو جو ناکام ہو گئی تھی۔ وجہ کوئی بھی ہو وہ مجرد تھا۔ وہ ایک شاندار گھر میں اکیلا رہ رہا تھا۔ گھر کی دیکھ بھال اور مہمان نوازی کے لیے گھر میں کسی عورت کا ہونا ضروری تھا اور اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس نے گاؤں سے اپنی سوتیلی بھانجی مس کیتھرین بارٹن کو لندن بلوا لیا۔

کیتھرین لڑکی کیا تھی حسن و جاذبیت کا مجسمہ تھی۔ ذہین بھی تھی اور گفتگو میں ایسی دل کشی تھی کہ وہ کہے اور سنا کرے کوئی۔ اس کے آتے ہی نیوٹن کے گھر میں بہار اتر آئی۔ آنے والے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ نیوٹن بھی یہی چاہتا تھا کہ لندن جیسے بڑے شہر میں ایسے لوگوں سے تعلقات استوار کیے جائیں جو اس کے کارناموں کی شہرت کا باعث بنیں۔ خاص طور پر انجمن شاہی میں اس کا اثر رسوخ بڑھ جائے۔ اس میں وہ کامیاب بھی ہوتا جا رہا تھا۔ لندن میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ وہ ہر وقت ملاقاتیوں کے ہجوم میں گھرا رہنے لگا تھا۔ اشرافیہ کے افراد، حکومتی اراکین اور دنیا بھر کے سائنس داں اس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ اس گرم بازاری میں یقیناً کیتھرین کا بھی ہاتھ تھا۔ نیوٹن کی شہرت کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا نام چائے خانوں اور مے خانوں میں گفتگو کی زینت بننے لگا تھا۔

کیتھرین کے بارے میں ایسی افواہوں کے بازار گرم ہونے لگے جس نے نیوٹن کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سب سے خطرناک الزام یہ تھا کہ نیوٹن نے اپنے دوست کی پرانی نوازشات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنی بھانجی کو اس کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ افواہیں بھی پھیلیں کہ مس کیتھرین

ایک شخص چارلز مونٹیگ کے گھر بغیر شادی کے منتقل ہو گئی ہے لیکن ان افواہوں میں صرف اتنی صداقت تھی کہ کیتھرین بہت خوب صورت تھی۔ یہ افواہیں بھی کئی برس بعد اس وقت دم توڑ گئیں جب کیتھرین نے اعلانیہ طور پر جان کونڈوئٹ نامی ایک نوجوان سے شادی کر لی۔ یہ الگ بات کہ ایک مرتبہ پھر کیتھرین خبروں میں تھی کہ وہ نوجوان اس سے عمر میں چھوٹا تھا۔

کیتھرین، نیوٹن کے گھر کو آراستہ کرنے اور اس کے مہمانوں کی دل داری میں مشغول تھی اور نیوٹن نئے عزم کے ساتھ نئی دنیاؤں کی سیر کو نکلا ہوا تھا۔ اس نے ایک خاص منصوبے کے تحت پارلیمان سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہ پارلیمان میں کیمبرج یونیورسٹی کا نمائندہ تھا۔ اس نے اس طرح کیمبرج سے اپنا آخری تعلق بھی ختم کر لیا۔ اب اس کی ساری توجہ انجمن شاہی کی طرف تھی جو اس کے خیال میں زوال پذیر ہو رہی تھی۔ اس کے گرد اب ایسے لوگ موجود تھے جو اسے اس کی منزل تک پہنچا سکتے تھے۔ اس کی منزل انجمن شاہی کی صدارت تھی۔

اس کے بعد وہ اسی سلسلے میں کوشاں رہا۔ بالآخر وہ اس میں کامیاب رہا۔

اس نے ذمہ داریاں سنبھالتے ہی انجمن شاہی کو دوبارہ اعزاز دلا دیا جس سے وہ محروم ہو چکی تھی۔ اب تک انجمن کا انتظام غیر سائنسی لوگوں کے ہاتھوں میں تھا۔ لایعنی بحثیں ہونے لگی تھیں۔ زیادہ تر اراکین غیر حاضر رہا کرتے تھے۔ اس نے سائنسی موضوعات کو دوبارہ داخل کیا۔ غیر حاضر اراکین کو مجبور کیا کہ وہ حاضری کو یقینی بنائیں۔ انجمن کے حالات میں پھر سے سدھار آنے لگا۔

وہ کیمبرج کو تقریباً بھول چکا تھا لیکن ایک اہم واقعہ اسے کیمبرج لے گیا۔ اس وقت اس کی عمر 63 برس تھی۔

یہ سفر کیمبرج سے متعلق نہیں تھا بلکہ اس کی اہلیت کا اعتراف تھا جس کا اعلان کیمبرج کی دیواروں کے سامنے ہونا تھا۔ یہ اس کے اعزاز میں دیے گئے ایک اہم خطاب کو حاصل کرنے کی تقریب میں شرکت کا سفر تھا۔

ملکہ این نے جو اس وقت تخت پر براجمان تھی، اس نے یونیورسٹی کا دورہ کیا اور نیوٹن کو اہم ترین خطاب سے نوازا۔ اس خطاب کے بعد نیوٹن، سر آئزک نیوٹن بن گیا۔

وہ اب انگلستان کا اہم ترین آدمی بن گیا تھا۔ سب سے اہم سائنس داں، انجمن شاہی کا صدر، محکمہ ٹکسال کا منتظم اعلیٰ اور سر کا خطاب یافتہ۔

اب اس کی عمر ایسی ہو گئی تھی کہ اس کا ذہن ماضی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ مستقبل میں جو کچھ کرنا تھا وہ سب حاصل کر چکا تھا۔ اب ماضی ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ اس نے گزشتہ کارناموں کو مزید مستحکم کیا۔ ریاضی کی کئی کتب جو بہت پہلے کیمبرج میں لکھی گئی تھیں نظرثانی کے بعد شائع کروائیں۔ کئی کتب جو لاطینی میں شائع ہوئی تھیں انہیں انگریزی میں شائع کروایا۔ اپنی شاہ کار تصنیف پرنسیپا پر بھی نظرثانی کی اور دوبارہ شائع کرایا۔

آخری برسوں میں مذہبی علوم کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ خاموشی سے کسی کو بتائے بغیر اہلِ یہود کی تاریخ پر لکھنے بیٹھا اور سیکڑوں صفحات لکھ ڈالے۔ وہ سب کو دکھانے کے لیے گرجا بھی جاتا رہتا تھا حالانکہ وہ عیسائیت کے بنیادی عقیدے تثلیث سے انکار کرتا تھا لیکن ہوش مند تھا۔ جانتا تھا کہ اس عقیدے سے انکار کا مطلب سزائے موت ہے۔ اس نے کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دی کہ وہ اس عقیدے کو نہیں مانتا۔

اس کی سوتیلی بھانجی کیتھرین نے شادی کر لی تھی اور اپنے شوہر کونڈوئٹ کے ہمراہ رہنے لگی تھی۔ کونڈوئٹ علم دوست شخص تھا۔ نیوٹن نے اس سے دوستی گانٹھ لی تھی یا پھر کونڈوئٹ ہی اس کے پیٹ میں گھسا تھا۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتے تھے۔ نیوٹن اب چونکہ ماضی میں سفر کر رہا تھا اس لیے ان نشستوں میں وہ اسے اپنے بچپن اور ٹرینٹی کالج میں زمانہ طالب علمی کے یادگار واقعات سنایا کرتا تھا۔ کونڈوئٹ ان واقعات کو لکھ لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سائنسی مہمات کا تذکرہ بھی آ جاتا تھا۔ درخت سے سیب گرنے اور نیوٹن کا کشش ثقل دریافت کرنے کا واقعہ بھی کونڈوئٹ ہی کو سنایا تھا اور پھر زبان زدِ عام و خاص ہو گیا۔

نیوٹن کی وفات کے بعد کونڈوئٹ نے ان واقعات پر مشتمل نیوٹن کی سوانح لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکا اور وفات پا گیا۔ وہ سوانح مکمل نہ کر سکا لیکن مسودات کی صورت میں واقعات لکھے رہ گئے۔ محققین نے ان واقعات سے بہت فائدہ اٹھایا اور نیوٹن سے متعلق معلومات اکٹھی کر لیں اگر کونڈوئٹ نے ان واقعات کو تحریر نہ کیا ہوتا تو نیوٹن کے بارے میں کوئی کچھ بھی نہ جان پاتا کیوں کہ نیوٹن بڑی آسانی سے خفیہ انسان کہلایا جا سکتا ہے وہ اپنے بارے میں کسی کو بھی کچھ بتاتے ہوئے ہچکچاتا

تھا۔ یہاں تک کہ ایک عمر تک اس نے اپنے سائنسی انکشافات بھی دنیا سے چھپائے رکھے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنی موت کا یقین ہوگیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو یادگار بنانے کے لیے بہت کچھ کر چکا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا خاص لوگوں کے لیے تھا۔ وہ عام لوگوں کو بھی بہت کچھ دینا چاہتا تھا تاکہ اس کی عظمت تادیر قائم رہے۔ اب وہ لندن کے مشہور ترین مصوروں اور مجسمہ سازوں کے پاس دیکھا جارہا تھا۔ ان سے اپنی تصویریں اور مجسمے بنوا رہا تھا۔ اس کا گھر اس کی تصاویر سے بھر گیا تھا۔

وہ زندگی بھر زہریلے کیمیاوی مرکبات سے کھیلتا رہا تھا۔ اس کی صحت متاثر ہونی چاہیے تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اس کی صحت شاندار تھی۔ وہ بچہ جس کی پیدائش کے وقت اس کے بچنے کی اُمید نہیں تھی اٹھہتر سال کی عمر میں بھلا چنگا تھا۔ اپنی موت کا انتظار کررہا تھا لیکن اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی تک سائنسی انکشافات و تجربات میں منہمک تھا۔ وہ جب مطالعاتی کمرے میں بند ہوجاتا تو پھر جیسے وہ کسی اور دنیا میں پہنچ گیا ہو یا پھر اس کا جسم یہاں ہو روح کہیں اور پہنچ گئی ہو۔ نہ کوئی اس سے مل سکتا تھا نہ وہ کسی سے ملتا تھا۔

ایک روز وہ مطالعاتی کمرے میں مصروف تھا کہ ایک ملاقاتی اس سے ملنے آیا۔ ملازم نے اسے بتادیا کہ سر آئزک نیوٹن مطالعاتی کمرے میں ہیں۔ وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔ شام کے کھانے کا وقت قریب ہے وہ کھانے کے لیے ضرور باہر آئیں گے۔ اس وقت ملاقات ممکن ہے۔

ملاقاتی وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ملازم بھنا ہوا مرغ لایا اور میز پر رکھ دیا۔ یہ مرغ ڈھکے ہوئے برتن میں تھا۔ اسے دیکھ کر ملاقاتی کو یقین ہوگیا کہ اب نیوٹن باہر آنے والا ہی ہوگا۔

ایک گھنٹا مزید گزر گیا۔ نیوٹن کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ مرغ الگ ٹھنڈا ہورہا تھا۔ ملاقاتی کو بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ اس نے وہ مرغ خود کھالیا اور ملازم سے کہا نیوٹن کے لیے دوسرا مرغ تیار کرکے لے آئے۔

اس سے پہلے کہ ملازم دوسرا مرغ تیار کرکے لاتا، نیوٹن کمرے سے باہر آگیا۔

''معاف کیجیے آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی۔ مجھے بس تھوڑا وقت اور دے دیجیے میں تھوڑا سا کھانا کھالوں سخت بھوک لگ رہی ہے کہیں بے ہوش ہی نہ ہوجاؤں۔'' نیوٹن نے کہا اور برتن کا ڈھکن اٹھایا۔ برتن خالی تھا۔ اس سے پہلے کہ ملاقاتی کچھ کہتا نیوٹن کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''یہ دیکھیے میری یادداشت کو بھی کیا ہوگیا ہے۔ اپنے کام میں مشغول ہوکر یہ یاد ہی نہیں رہا کہ کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔''

ملاقاتی نے اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ ہنسنے پر مجبور ہوگیا۔

اس عمر میں جب اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اسکی سخت محنت نے اس کی صحت کو متاثر کرنا شروع کردیا۔ وہ مثانے کے مسائل کا شکار ہوگیا۔ رفع حاجت پر اس کا اختیار ختم ہوگیا۔ گھوڑوں سے چلنے والی بگھیوں کی اچھل کود اس کے مسائل میں اضافہ کردیتی تھی۔ اس نے پالکی نما کرسی خرید لی جسے دونوں طرف سے ملازم اٹھا کر چلتے تھے۔ اسے انجمن شاہی کے اجلاسوں میں جانا ہوتا تھا تو اس کرسی پر نکلتا تھا۔ لندن کی گلیوں سے گزرتا ہوا وہ انجمن شاہی کے دفتر پہنچتا تو لوگ اس کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہتے۔

مارچ 1727ء میں اس نے انجمن شاہی کے اجلاس میں شرکت کی۔ یہ اس کا آخری اجلاس ثابت ہوا۔ وہ اس اجلاس سے واپس آرہا تھا کہ اس پر سخت گھبراہٹ طاری ہوئی۔ بہ مشکل گھر پہنچا اور بستر پر گر پڑا۔

اس کی زندگی کی طرح اس کی موت بھی خفیہ ہوگئی۔ ایک دن اچانک اس کی وفات ہوگئی۔ یہ 20 مارچ کا دن تھا۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ایک مجسمہ ساز ڈیتھ ماسک لیے اس کے گھر آیا۔ اس کے چہرے پر استرکاری کی۔ جب وہ خشک ہوگیا تو نیوٹن کے چہرے کے خطوط اس پر چسپاں ہوگئے۔ بعد کے زمانوں میں نیوٹن کے جتنے مجسمے تخلیق ہوئے اسی سانچے کے مطابق بنائے گئے۔

اس کے جنازے میں انگلستان کے اعلیٰ ترین افراد نے شرکت کی۔ انگلستان کے مختلف ضلعوں کے دو شہزادے اور شاہی خاندان کے افراد جو انجمن شاہی کے اراکین بھی تھے اس کا تابوت لے کر چلے۔

اسے ویسٹ منسٹر انگلستان کے گرجا میں بادشاہوں اور ملکاؤں کی قبروں کے درمیان دفنا دیا گیا۔

نیوٹن پہلا سائنس داں تھا جسے یہ اعزاز ملا۔

ماخذات

نیوٹن ایک عظیم اور پُراسرار سائنس داں؛ مترجم محمد حسن۔ سو عظیم آدمی؛ مترجم عاصم بٹ

چار روحوں والا

شکیل صدیقی

وہ رنگوں سے کھیلتا تھا۔ کینوس پر اس کے ہاتھ ایسے چلتے تھے جیسے بہتے پانی پر کنول، لوگ کہا کرتے تھے کہ اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ معجزنمائی جانتا ہے وہ مگر اس کی زندگی میں دھیرے دھیرے پُراسراریت آتی جارہی تھی وہ اپنے لاینحل زندگی جینے میں کوشاں تھا۔

عالمی پیمانے پر سب سے زیادہ مشہور مصور کا تذکرہ



مائیکل انجیلو 6 مارچ 1475ء کو پیر کے دن اٹلی کے مضافات فلورنس کے مضافاتی علاقے اریزو میں پیدا ہوا جواب کیپریسی کہلاتا ہے۔ اس کا چتسمہ اسی مہینے کی آٹھ تاریخ کو سان گیوونی کے کلیسا میں ہوا تھا۔ جس میں اس کے رشتے داروں نے شرکت کی۔ اس کا باپ لوڈ ویکو سیمونی جو نجم بھی تھا اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ مرکری اور وینس مشتری کے مدار میں داخل ہو رہے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا بیٹا غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔

انجیلو کے پانچ بھائی اور بھی تھے۔ اس کی ماں فرانسسکا سینا ایک ملنسار اور پُر خلوص عورت تھی۔ اس کا باپ اور شوہر بھی پتھروں کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ حالانکہ بیمار رہتی تھی لیکن اپنی صحت کی طرف توجہ نہیں دیتی تھی۔ اسی لیے وہ جلد مالک حقیقی سے جاملی اور انجیلو کی خاطر خواہ تربیت نہ کرسکی۔ اس کی موت 6 دسمبر 1481ء میں ہوئی۔ اس وقت انجیلو کی عمر محض چھ برس تھی۔ وہ ماں کی موت پر بہت گرویدہ ہوا۔ اس کے دل میں اتنی سی عمر میں یہ بات سما گئی کہ اسے اپنے خاندان کی خدمت کرنا ہے۔

انجیلو نے اپنے دوستوں اور واقف کاروں کو جو خطوط لکھے ان پر مارچ 1497ء سے دسمبر 1563ء کی تاریخیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان خطوط کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نرم دل اور پُر خلوص شخص تھا۔ ہر ایک کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ہمہ وقت ایک ڈھیلا ڈھالا سا کوٹ پہنے رہتا تھا جو اس کی قامت سے بڑا تھا۔ جب کوئی اس کوٹ کے بارے میں پوچھتا تو وہ جواب دیتا تھا کہ یہ کوٹ اس کے باپ کا ہے اور اسے پہن کر وہ فخر محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنے باپ سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس کے نام کا آخری حصہ ''سیمونی'' اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سیمونی خاندانی نام اختیار کرگیا۔

انجیلو کا باپ ایک چھوٹے سے بینک کا مالک تھا لیکن جب اسے بینک میں خسارہ ہوگیا تو اس نے حکومت میں ملازمت کرلی۔ وہ انجیلو کی پیدائش کے وقت حکومت کا ایک چھوٹا سا عہدے دار یعنی علاقائی مجسٹریٹ بن گیا تھا۔ تاہم وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اس لیے پورے خاندان کی زمینوں اور جائیداد کا حساب کتاب رکھتا تھا۔ اپنی مصروفیت کی بنا پر وہ اپنی اولاد کی طرف توجہ نہیں دے پایا۔ چنانچہ انجیلو کو والدین کی طرف سے جتنی محبت اور شفقت ملنا چاہیے تھی وہ اس سے محروم رہا۔ اس کا باپ اس حقیقت سے واقف تھا کہ اس کے بیٹے انجیلو میں زبردست تخلیقی قوت ہے، اس کی دماغی صلاحیتیں دوسروں سے سوا ہیں۔ چنانچہ اس نے انجیلو کو غیر ملکی زبانیں سکھانے والے ایک اسکول میں داخل کردیا تاکہ وہ بار آور ہو کر ہوشیار کاروباری بن سکے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کا باپ سیمونی اپنے خاندان کو لے کر فلورنس چلا گیا اور اپنے بھائی فرانسسکو کے پڑوس میں رہنے لگا۔

انجیلو کا بچپن ایک فارم میں گزرا جو اسکنا تو کہلاتا تھا۔ یہ فارم فلورنس کے نزدیک ہی واقع تھا جو اس کے باپ کا تھا اور اس کی سنگ مرمر کی دکان بھی تھی۔ انجیلو کی ایک ڈرائنگ ''ٹریتون'' میں اس پہاڑ کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے جو فارم کے نزدیک تھا۔ یہ ڈرائنگ یکم اپریل 1488ء میں بنائی گئی تھی۔ ابتدا میں وہ ایک اسکول میں داخل تھا اور عمومی تعلیم حاصل کررہا تھا مگر اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ وہ اسکول سے نکل کر کلیساؤں میں چلا جاتا اور گھنٹوں وہاں لگی ہوئی پینٹنگز کی نقل بنایا کرتا۔ فلورنس اس وقت آرٹ کا مرکز تھا۔ شہر کی کونسل آرٹ کی سرپرستی کیا کرتی تھی۔ کونسل کو بینک عطیات دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بادشاہ میڈیچی بھی فن کا شیدائی تھا اس لیے وہ بھی ہر ماہ ایک خطیر رقم کونسل کو دیا کرتا تھا۔ اسے جب انجیلو کے شوق کے بارے میں علم ہوا تو وہ اسے وظیفہ بھی دینے لگا۔

انجیلو نے نصابی تعلیم چھوڑ دی، اس لیے کہ اسے مجسمہ سازی اور پینٹنگز سے محبت تھی۔ اپنے طور پر اس نے لاطینی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی، قدرت اس پر مہربان ہوگئی اور اس کی ملاقات ایک مجسمہ ساز اور پینٹر ڈومینکو جرلینڈ سے ہوئی۔ انجیلو اس کے فن سے بہت متاثر ہوا اور اس نے پینٹر سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنا شاگرد بنالے۔ ڈومینکو نے اسے اجازت دے دی کہ وہ اس کے اسٹوڈیو میں آسکتا ہے۔ جب کہ انجیلو کا باپ اس کے شوق کا مخالف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انجیلو کوئی ایسا کام کرے کہ گھر کے اخراجات پورے ہوسکیں۔

اس کا اسٹوڈیو فلورنس کے بڑے اسٹوڈیوز میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی بیوی اپنے شوہر کی شیدائی تھی اور راتوں کو لیمپ لے کر اپنے شوہر کے قریب اس وقت تک کھڑی رہتی تھی جب تک کہ وہ تھک کر خود کام کرنا بند نہیں کردیتا تھا۔ انجیلو کی عمر اس وقت تیرہ برس تھی جب اس نے ڈومینکو کی شاگردی اختیار کرلی۔ اس کا استاد چوں کہ یسوع مسیح سے متاثر تھا اور اس کا مذہب کی طرف زیادہ رجحان تھا، لہٰذا یہ رجحان انجیلو میں بھی منتقل ہوگیا۔ انجیلو نے اسکیچ بنانے سے اپنے فن کا آغاز کیا۔ جب اس کی ڈرائنگ میں پختگی آگئی تو اس نے ڈومینکو سے گزارش کی کہ وہ اسے مجسمہ سازی بھی سکھائے۔ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ قدرت نے یہ ظلم کیا کہ بڑے بڑے اعلا شاہکار پتھروں میں مقید کردیے۔ اب مجسمہ ساز کا کام یہ ہے کہ وہ انہیں تراش کر پتھروں کی قید سے آزاد کرائے۔ وہ کہتا تھا کہ ہر پتھر میں

ایک مجسمہ ہے۔ مجسمہ ساز غیر ضروری پتھروں کو علیحدہ کر کے نقش و نگار نمایاں کرتا ہے۔ سقراط نے بھی برسوں پہلے یہی بات کہی تھی کہ پتھر میں ایک شکل موجود ہوتی ہے، مجسمہ ساز اسے باہر نکالتا ہے۔ انجیلو نے اس کی تائید کی اور عملی طور پر پتھروں سے مجسمے باہر نکالے۔

☆☆☆

اس کے باپ کو جب اس حقیقت کا پتا لگا کہ اس کا بیٹا مجسمہ ساز بن گیا ہے تو اسے صدمہ پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ جب اس کا بیٹا کاروبار کے اسرار و رموز سیکھ لے گا تو اپنے خاندان کی جائیداد کا حساب کتاب رکھے گا۔ ویسے بھی ان دنوں اٹلی میں فن مصوری کے فن کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس معاملے میں انجیلو کئی بار باپ کے ہاتھوں پٹا کہ وہ پڑھائی کی بجائے ڈرائنگ سیکھنے میں وقت ضائع کرتا ہے۔ ان دونوں میں یہی بات وجہ تنازعہ بن گئی جس کی بنا پر ایک دیوار ساری زندگی دونوں کے درمیان حائل رہی۔ انجیلو نے تھوڑی سی مدت میں اتنی اچھی ڈرائنگ بنانا شروع کر دیں کہ لوگ اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ خاکے بناتے بناتے وہ ان میں رنگ آمیزی بھی کرنے لگا اور پھر اس نے رنگ و برش اٹھا لیے اور پینٹنگز کی طرف توجہ دینے لگا۔ یوں وہ پینٹر کے ساتھ مجسمہ سازی بھی کرنے لگا۔ پتھر کو کیسے کاٹتے ہیں اور چھینی سے پتھر پر ضرب کیسے لگانا چاہیے، یہ اسے ڈومینکو نے بتا دیا تھا۔

انجیلو نے اپنے فن کی بنیاد ابتدا ہی سے نیچرل ازم پر رکھی۔ اس نے جب تک کہ فطرت کا مطالعہ نہیں کر لیا اپنے مجسموں کو اس وقت تک رنگوں کا لباس نہیں پہنایا۔ اس کے ایک دوست کولوجن نے بتایا کہ وہ فالتو اوقات میں مچھلی مارکیٹ چلا جایا کرتا تھا اور اعضا کا مشاہدہ کرتا تھا، خاص طور پر رنگوں کو دیکھتا تھا پھر انہیں اپنی پینٹنگز میں سمو دیتا تھا۔

اس اثنا میں جب کہ انجیلو کو پینٹنگز بنانے کا شوق ہوا تو اس کی ملاقات چند فلاسفیوں سے ہوئی جو انسانیت پر یقین رکھتے تھے اور خدا کی وحدانیت کی برتری تسلیم کرتے تھے۔ انجیلو ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سنگ تراش قدرت کے حسن اور جمالیات کو اجاگر کرنے میں خاطر خواہ حصہ لیتا ہے۔ انجیلو کے اعتقادات سو فی صد درست نہیں تھے اس لیے کہ وہ سائنس دانوں اور سیاست دانوں کے پاس بھی اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان خیالات کے درمیان ایک توازن برقرار رکھے۔

وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے "اب جبکہ میری عمر سولہ برس ہے، میں زبردست کش مکش کا شکار ہوں، اس لیے کہ میں قدرت کی سب سے حسین مخلوق یعنی مردوں کے بے لباس مجسمے تراشنا چاہتا ہوں جب کہ مذہب میرے آڑے آ رہا ہے۔ چنانچہ میں نے سنگ تراشی تو کی ہے لیکن مجسموں کو اپنے اسٹوڈیو میں چھپا رکھا ہے۔ جب وقت اجازت دے گا تب ہی میں اس کی نمائش کروں گا۔"

اس نے دو مجسمے "بیٹل آف سینٹارس" اور "میڈونا آف اسٹیرز" کے نام سے 17 برس کی عمر میں بنائے۔ بیٹل آف سینٹارس ایک اساطیری مجسمہ تھا۔ جس کا دھڑ گھوڑے کا اور سر آدمی کا تھا۔ دونوں طاقت کی علامت ہیں۔ دیوتاؤں کے دور کی کہانیوں میں ایسے مجسموں کا قصہ ملتا ہے، انجیلو نے ان ہی قصوں سے متاثر ہو کر وہ مجسمے تراشے تھے۔ لوگوں نے اس کے فن کو سراہا۔

انجیلو، فلورنس میں کلاسیکی آرٹ سے روشناس ہوا جس نے آگے چل کر اس کے فن پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ اس زمانے کے سائنس دانوں سے رابطہ رکھتا تھا جس سے اس کے فن میں جدیدیت پیدا ہوتی چلی گئی۔

جب میڈیچی نے جرلینڈ سے کہا کہ وہ اپنے دو شاگردوں کو اس کے پاس بھیج دے تو جرلینڈ نے انجیلو اور گرانیسی... کو اس کی خدمت میں بھیج دیا۔ بادشاہ لورینزو ڈا میڈیچی، جو "لورینزو دی میگنیفیشنٹ" بھی کہلاتا تھا، مجسمہ سازی میں دل چسپی رکھتا تھا اور اس نے میڈیسی گارڈن میں قدیم مجسمے جمع کر رکھے تھے۔ اس کی ہیومنسٹ اکیڈمی میں انجیلو نے دو برس (1490ء سے 1492ء) تک کام کیا۔ وہاں بہت سے شاعر، موسیقار، انٹلیکچول اور ادیب جمع رہتے تھے۔ میڈیچی نے انجیلو کو اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے پینٹنگ اور مجسمہ سازی سے عشق ہے اور وہ آگے چل کر کوئی کارنامہ انجام دے سکتا ہے۔

ایک بار انجیلو نے ایک بے کار سے پتھر کو تراش کر اس سے بوڑھے شخص کا مجسمہ بنا دیا اور میڈیچی کو دکھایا۔ میڈیچی نے اس مجسمے کی تعریف کی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ مجسمہ تو تم نے بوڑھے شخص کا بنایا ہے، لیکن اس کے دانت پورے ہیں۔ جب کہ اس عمر میں منہ میں سارے دانت نہیں ہوتے۔

انجیلو یہ تبصرہ سن کر رنجیدہ ہوا۔ اس نے میڈیچی سے

کچھ نہیں کہا لیکن ایک ہتھوڑا اٹھایا اور مجسمے کے آگے والے بیشتر دانت توڑ ڈالے۔ میڈیچی نے اسے تلقین کی کہ اسے اپنے غصے پر قابو رکھنا چاہیے۔ وہ اس کا استاد ہے اور فن کی باریکیوں کو اس سے زیادہ سمجھتا ہے۔

ایک بار کام کے دوران میں میڈیچی کے ایک شاگرد پائٹرو ٹوریگیانو نے ایک بار اس سے بھاری ہتھوڑا مانگا تو انجیلو نے انکار کر دیا، کیونکہ اسے خود اسی ہتھوڑے کی ضرورت تھوڑی دیر بعد پڑنے والی تھی۔ پائٹرو مغلوب الغضب تھا اس نے ایک برش اٹھایا اور مٹھی میں دبا کر انجیلو کی ناک پر وار کیا، جس سے انجیلو کی ناک سے خون بہنے لگا۔ دوسرے مجسمہ سازوں نے اسے پائٹرو کے مزید حملوں سے بچالیا۔ چہرہ صاف کر کے انجیلو اپنے کام میں مصروف تو ہوگیا، لیکن اس واقعہ نے اسے ذہنی طور پر ایک الجھن میں مبتلا کر دیا۔ اس حادثے کے بعد انجیلو کی جتنی بھی تصاویر بنائی گئیں، اس میں اس کی ناک کا عیب نمایاں ہے۔

میڈیچی کی موت کے بعد انجیلو نے اپنے زمانے کے ایک درویش سیوونورولا کا بہت اثر قبول کیا۔ اس نے دینی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ پھر وہ شاعری اور فلسفے کی طرف راغب ہوا تو عظیم شاعر دانتے نے اس کی رہنمائی کی۔ اسے فلسفے کی باریکیاں سمجھائیں۔ انجیلو نے اس کی مشہور زمانہ کتاب "ڈیوائن کامیڈی" پڑھی، جس نے اس کی زندگی پر گہرے نقوش مرتب کیے۔

اسی زمانے میں چند مصوروں کو ویٹیکن سٹی بلایا گیا تاکہ وہ چرچ کی دیواروں پر تصاویر بنائیں، وہاں جانے والے مصوروں میں جرلینڈ بھی شامل تھا۔ انجیلو بھی اس کے ساتھ ویٹیکن سٹی چلا گیا۔ وہاں وہ ایک معزز شخص جیووانی فرانسسکو کے مکان پر ٹھہرا جو مصوری میں ازحد دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے سینٹ ڈومینک کے چرچ کے لیے انجیلو سے تین مجسمے بنوائے۔ اس لیے کہ انجیلو کا یہ مطالبہ ماننے سے پادری نے انکار کر دیا تھا کہ وہ برہنہ مجسمے بنانا چاہتا ہے۔ چند ماہ بعد انجیلو نے ایک بہت بڑی چٹان خریدی اور 1493ء، 1494ء کے دوران روایتی کردار ہرکولیس کا مجسمہ بنایا۔ یہ مجسمہ ایک متمول شخص نے خرید لیا اور اسے پیرس کے ایک عجائب گھر میں بھجوادیا، جہاں سے وہ چوری ہوگیا اور آج تک اس کا پتا نہیں چل سکا۔

1491ء میں انجیلو نے "میڈونا آف اسٹیپس" نامی پینٹنگ بنائی، جو بہت پسند کی گئی اور لوگوں نے جان لیا کہ وہ مجسمہ سازی نہیں ایک بڑا پینٹر بھی ہے۔ اس کے جوہر بتدریج آشکار ہورہے تھے۔ 1495ء میں انجیلو فلورنس واپس آگیا۔ اسی اثنا میں اس نے "سلیپنگ کیوپڈ" نامی مجسمہ بنایا۔ مجسمہ دو بار فروخت ہوا۔ دوسری بار وہ بھاری قیمت پر فروخت ہوا۔ انجیلو سادہ لوحی سے وہ رقم لوٹانے پر تیار ہوگیا جو اسے پہلی بار فروخت ہونے پر ملی تھی۔

1496ء میں مائیکل انجیلو روم چلا گیا، جہاں اس نے سینٹ کے گرجا گھر، باسلیکا میں مجسمہ پاکا بنایا۔ جب کہ فلورنس میں وہ ایک شاہکار تخلیق کر چکا تھا جس کا نام "ڈیوڈ" رکھا گیا اور جو اب اکیڈیما میں عام نمائش کے لیے رکھا ہوا ہے۔ اب اس کی عمر اکیس برس ہو چکی تھی۔ فلورنس چھوڑنے کی وجوہات میں میڈیچی کی بربادی، آرٹ کے مجسموں کو جلا دیا جانا، فرانس پر چارلس ہشتم کے حملے شامل تھے۔ روم اس وقت آرٹ اور فن کا جیتا جاگتا شہر تھا اور وہاں اس کے فن کی زیادہ قدر ہو سکتی تھی۔ روم میں ایک پادری نے اسے روم کے شراب کے دیوتا بخاس کا مجسمہ بنانے کو کہا۔ انجیلو نے تین ماہ میں مجسمہ تیار کر دیا، جسے پادری نے مسترد کر دیا۔ یوں وہ ایک اور شخص جیکوپو کے باغ کی زینت بن گیا۔

میڈیچی 1492ء میں آنجہانی ہوگیا۔ اس کے بعد میڈیچیوں کا عہد ختم ہوگیا تو انجیلو کو پادریوں نے فلورنس سے نکلنے کا حکم دے دیا۔ پادری سیوونارولا کے خیالات اس معاملے میں سخت تھے کہ مذہبی رہنماؤں کے مجسمے تراشے جائیں۔ انجیلو چوں کہ میڈیچی کے ساتھ رہا کرتا تھا، اس لیے اسے بھی عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ بہرحال اسے یہ چھوٹ دی گئی کہ وہ اپنا سامان ساتھ لے کر جا سکتا ہے۔

اسی زمانے میں انجیلو نے فلورنس کو چھوڑ دیا اور اپنے باپ کے گھر وینس چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک چرچ کے لیے لکڑی کی بہت بڑی صلیب تیار کی۔ جب معاوضے کی بات ہوئی تو انجیلو نے مطالبہ کیا کہ چرچ کے زیرِ انتظام چلنے والے اسپتالوں کے مردہ خانوں میں جا کر لاشوں کا معائنہ کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ پادری صاحب نے اس کے کام سے خوش ہو کر اسے اجازت دے دی کہ وہ چرچ کے اسپتال جا کر انسانی لاشوں کا مطالعہ کر سکتا اور ان کے خدوخال کی ڈرائنگ بنا سکتا ہے۔ انجیلو نے ایک برس تک انسانی اعضا کا تندہی سے مطالعہ کیا اس کے بعد اس نے 1493ء میں ایک قد آدم پتھر کی سل خریدی اور

"ہرکولیس" نامی مجسمہ بنایا، جسے فرانس بھیج دیا گیا۔ اسے آرٹ کے کسی شیدائی نے راستے میں غائب کر دیا۔ پھر یہ مجسمہ اٹھارویں صدی عیسوی میں بازیاب ہوا اور اسے فرانس کے عجائب گھر، لوور کی زینت بنا دیا گیا۔

انجیلو نے اس کے بعد بولونا کا رخ کیا جہاں اسے اپنے آرٹ اور ثقافت کا پرچار کرنے کی اجازت تھی۔ مگر وہاں بھی انجیلو کا دل نہیں لگا اور وہ آخر کار 1496ء میں روم میں جا بسا۔ وہاں اس نے 1501ء تک قیام کیا۔ اس اثنا میں وہ کئی بار فلورنس گیا اور اس نے اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں دو مجسمے بھی بنائے۔ اس کے ایک دوست نے اسے مشورہ دیا کہ اسے اس انداز میں بنائے کہ مجسمہ بہت قدیم لگے، پھر اس کی اچھی قیمت مل جائے گی۔ انجیلو نے ایسا ہی کیا اور ایک نوعمر پادری رافیل کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس کی چالبازی عیاں ہو گئی تو پادری نے برا مانا لیکن وہ اس کے کام سے بہرحال متاثر ہوا۔ اس نے انجیلو کو دعوت دی کہ وہ روم آئے۔ اس طرح سے اس کے مجسمے دوسرے ملکوں میں بھی فروخت ہونے لگے۔

اسی زمانے میں اس نے حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی ایک پینٹنگ بنائی جس میں حضرت عیسیٰؑ کا بچپن دکھایا گیا تھا۔ یہ پینٹنگ مہنگے داموں سے فروخت ہوئی اور آج بھی لندن کی نیشنل گیلری آف آرٹ میں محفوظ ہے۔

نومبر 1497ء میں ایک پادری جین لاگرولاس نے اس سے کہا کہ وہ ایک مجسمہ بنائے جس میں حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ کی موت پر آنسو بہاتے دکھایا گیا ہو (ہرچند کہ بائبل میں ایسا کوئی منظر نہیں ہے)۔ انجیلو نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ اور کنواری مریم کا مجسمہ "پائکا" (جس کا مفہوم ہمدرد، مشفق اور رحم کرنے والا ہے) بنایا، جو عام افراد کے لیے 1498ء میں نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ اسے اس زمانے میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے بہت بڑا مجسمہ ساز تسلیم کر لیا گیا۔ ایک بڑے مجسمہ ساز "وساری" نے اسے دیکھنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ مجسمہ معجزہ لگتا ہے۔ اس لیے کہ قدرت نے تو حضرت مریمؑ اور عیسیٰؑ کو گوشت پوست سے بنایا تھا، لیکن انجیلو نے اسے بالکل اصلی کی مانند سنگ مرمر سے بنا دیا۔" یہ مجسمہ انجیلو نے 25 برس کی عمر میں بنایا تھا۔

"پائکا" کا مجسمہ یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ کو ان کی ماں حضرت مریم کی گود میں مردہ حالت میں لیٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا جسم لاغر ہے۔ جسم کی ہڈیاں نمایاں ہیں اور ان کے لباس پر سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ سنگ تراشی کا شاہکار ہے۔ جو بھی اس مجسمے کو دیکھتا وہ انجیلو کے فن کا گرویدہ ہو جاتا۔ اس مجسمے سے اس کی شہرت ساری عیسائی دنیا میں پھیل گئی۔ یہ عیسائیوں کے جذبات کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ یہ واحد مجسمہ ہے جس پر انجیلو نے دستخط کیے

اپنے روم کے قیام کے دوران 1536ء سے 1538ء میں اسے ایک بیوہ شاعرہ وٹوریا کلونا .... سے عشق ہو گیا تھا۔ وکٹوریا کی عمر اس وقت اڑتالیس برس تھی اور اس کی شادی کو تیرہ برس گزر چکے تھے۔ انجیلو اس وقت ساٹھ برس کا ہو چکا تھا۔ وٹوریا کلونا 1490ء میں مارینو میں پیدا ہوئی، جو روم کے پہاڑی علاقے کے نزدیک ہے۔ وہ فبریزیا کلونا کی سب سے چھوٹی بچی تھی۔ جو پوپ مارٹن پنجم کے بعد پوپ بنا۔ اس کی ماں شہر کی رہنے والی تھی۔ وٹوریا کی شادی فرانسسکو داولیس سے 17 برس کی عمر میں جزیرہ ازچیا میں 27 دسمبر 1509ء کو ہوئی تھی۔

☆☆☆

اس کی زندگی میں اس کی دو سوانح حیات منظر عام پر آئی تھیں، جو اب تک دستیاب ہیں اور ان کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ سوانح پینٹروں، مجسمہ سازوں اور انجینئروں کی اب تک رہنمائی کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک سوانح نگار اس کا شاگرد کونڈیوی اور دوسرا اس کا دوست واساری تھا۔ واساری نے اس کی زندگی کے نشیب و فراز اور حوادثات کو دو جلدوں میں قلمبند کیا تھا۔ انجیلو کو اس کی بعض باتوں سے اختلاف تھا، لہٰذا اس نے اپنے شاگرد کونڈیوی کو انہیں درست کر کے لکھوایا۔

☆☆☆

مائیکل انجیلو کی زندگی پر کئی فلمیں بنیں جن میں اسٹوری آف اے لو آفیئر (1950) اور لیڈی ودھ آؤٹ کیمیلیاس (1950ء) شامل ہیں۔ مجموعی طور پر اس کی زندگی پر تقریباً دس فلمیں بن چکی ہیں۔

ہیں۔ ورنہ کسی اور مجسمے پر اس کے دستخط نہیں ہیں۔

مجسمے میں حضرت مریم نوجوان ہیں، بے حد حسین لبادہ پہنے ہیں، جب کہ حضرت عیسیٰ جو 33 برس کے ہو چکے تھے ان کی گود میں پڑے ہیں۔ حضرت مریم کو بوڑھا بنانا چاہیے تھا اور ان کی عمر 50 برس کے لگ بھگ ہونا چاہیے تھی، مگر وہ نوجوان ہیں۔ مجسمے میں حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے بعد کے نشانات بہت کم ہیں اور ان کے چہرے پر کرب بھی نہیں ہے۔ یہ ماں اور بیٹے کا مجسمہ ہے۔ جب انجیلو سے پوچھا گیا کہ اس نے حضرت مریم کو اتنا جوان اور حسین کیوں بنایا ہے تو اس نے جواب دیا اس لیے کہ وہ پاکیزہ اور متبرک تھیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ تر وتازہ رہتے ہیں۔ وقت ان کا کچھ بگاڑ نہیں پاتا۔

اس مجسمے میں توازن نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت مریم بیٹھی ہیں اور ایک قد آور شخص ان کی گود میں پڑا ہے۔ یہ مجسمہ ساری دنیا میں بسنے والے عقیدت مندوں کو اتنا پسند آیا کہ اس کی نقلیں بنا کر جرمنی، پولینڈ اور فرانس کے کلیساؤں میں لگائی گئیں۔ جب کہ پائٹ کا اصل مجسمہ دو برس میں مکمل ہوا۔ اسے سب سے پہلے سانتا پٹرونیلا، جو رومی مقبرہ ہے وہاں لگایا گیا۔ جب اس مقبرے کو منہدم کیا جانے لگا تو اسے 1964ء میں ویٹیکن سٹی کے کلیسا میں لگایا گیا۔

1965ء میں اسے نیویارک میں منعقد ہونے والی عالمی نمائش میں ویٹیکن کے اسٹال پر لگایا گیا۔ لوگ گھنٹوں اس مجسمے کے دیدار کے لیے قطار بنا کر کھڑے رہتے تھے۔ مجسمے کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ کر انہیں اطمینان و تسکین ہو جاتی تھی۔ نمائش کے اختتام پر اسے دوبارہ ویٹیکن سٹی بھیج دیا گیا۔

اتنا طویل عرصہ گزرنے کے بعد مجسمے کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ 1736ء میں مریم کے مجسمے کی تین انگلیاں ٹوٹ گئیں۔ جسے ایک مجسمہ ساز گیسی لیرونی نے مکمل کیا۔ 21 مئی 1972ء میں ایک دیوانہ کلیسا میں داخل ہو گیا اور اس نے چیخ کر کہا۔ ”میں عیسیٰ ہوں لوگو! اور زندہ ہو گیا ہوں۔“ اس دیوانے کے ہاتھ میں ایک وزنی ہتھوڑا تھا۔ اس نے حضرت مریم کے بازو پر پندرہ سولہ ضربیں لگائیں اور اسے توڑ دیا۔ ناک اور آنکھ پر وار کیا تو پتھر کے ٹکڑے اڑ کر دور جا گرے اور مجسمے کی ہیئت تبدیل ہو گئی۔ اس کی مرمت کی گئی اور مریم کی ناک کو جوڑنے کے لیے ان کی پشت سے پتھر کاٹ کر لگایا گیا۔ پھر اسے داخلے کے دروازے پر لگایا گیا اور اس کے چاروں طرف شیشے کی دیواریں کھڑی کر دی گئیں جو بلٹ پروف ہیں۔

وہ دیوانہ شخص جس نے مجسمے کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی تھی، لیز لو ٹوتھ تھا جس کی عمر تقریباً 33 برس تھی۔ اسے مجرم نہیں گردانا گیا۔ البتہ 29 جنوری 1972ء کو اسے روم کی ایک عدالت نے خطرناک شخص قرار دیا اور اس کا علاج کرانے کی ہدایت کی۔ فیصلے میں کہا گیا تھا کہ وہ دماغی اسپتال میں دو برس تک علاج کرائے۔ 9 فروری 1975ء کو اسے اٹلی سے ناپسندیدہ شخص کی حیثیت سے ملک بدر کر کے آسٹریلیا بھیج دیا گیا جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ وہ ہنگری میں پیدا ہوا تھا اور اس نے زیادہ وقت ماہر ارضیات کی حیثیت سے آسٹریلیا میں گزارا تھا۔

☆☆☆

روم میں وہ سانتا ماریا کے چرچ کے نزدیک رہتا تھا۔ وہیں ایک شاعرہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا جو ایک تاجر کی بیوی تھی لیکن ان کے عشق کی بیل نہ منڈھ سکی۔ اس لیے کہ اس عورت کا شوہر اسے لے کر کہیں اور چلا گیا۔ مگر اس عشق کے نتیجے میں انجیلو میں شاعری کے جراثیم حلول کر گئے۔ وہ شعر کہنے لگا۔ چنانچہ اس کی غزلیں اور نظمیں اٹلی کی شاعری کے مجموعوں میں شائع ہونے لگیں۔

انجیلو کے اس مکان کو 1930ء میں منہدم کر کے جینیکولم پہاڑی پر ایک نیا مکان بنایا گیا اور اس کے مکان کی چیزیں لے جا کر وہاں سجائی گئیں اور اسے ایک جدید میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔

یہ 1501ء کا واقعہ ہے کہ جب وہ سنگ تراش کی حیثیت سے معروف و مقبول ہو گیا تو اسے فلورنس میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔ وہاں کی ریپبلکن حکومت نے اس سے درخواست کی کہ وہ ایک ایسا مجسمہ تراشے جو آزادی کی علامت ہے۔ انجیلو کے اس مجسمے کو بھی بہت پسند کیا گیا اور اسے غیر معمولی سنگ تراش کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہو کر پوپ جولیس دوم نے اس سے 15 مجسموں کا معاہدہ کیا، جنہیں اس کے مقبرے میں لگائے جانے کا منصوبہ تھا۔ ان میں ایک مجسمہ ”ڈیوڈ“ بھی شامل تھا جو اس نے 1504ء میں مکمل کیا تھا۔ مجسمے نے اتنی شہرت پائی کہ فرانس کے حکمراں نے ڈیوڈ کی نقل کانسی سے بنانے کا حکم دیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اسے کہاں

نصب کیا جائے، لیونارڈو دی ونچی کو بلایا گیا۔ جس نے تجویز کیا کہ اس بے مثال مجسمے کو دیشیو پلازا میں نصب کیا جانا چاہیے۔ ڈیوڈ کا مجسمہ چودہ فٹ بلند ہے۔ اس وقت تک روم میں اتنا بلند مجسمہ کسی نے نہیں بنایا تھا۔ مجسمہ پتلے پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ آرٹ کے ماہرین کا متفقہ خیال ہے کہ مجسمہ ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ (ان دنوں یہ مجسمہ فلورنس، اٹلی کی اکیڈمی آف آرٹس میں 1873ء سے رکھا ہوا ہے)۔

1975ء میں اس مجسمے کی 500ویں یادگار منائی گئی۔ مبصرین نے اسے آرٹ کی تاریخ کا شاہکار قرار دیا۔ یادگار کے دن دنیا کے کونے کونے سے فن کے شائقین اسے دیکھنے کے لیے آئے۔ انجیلو کے فن اور اس کی سوانح پر تقریریں ہوئیں، لیکن ان چیزوں پر بولنے سے احتراز کیا گیا جس سے اس کے کردار پر حرف آتا۔

''ڈیوڈ'' بائبل کی ایک کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ وہ ایک نوجوان چرواہا ہے جس نے اپنے قبیلے کو بچانے کے لیے ہتھیاروں کے بغیر صرف ایک تیر کمان سے جنگ کی اور بہت بڑے پہلوان گولائتھ کو شکست دے کر اپنی قوم کو ایک آفت سے بچا لیا۔ اس کے پاؤں گولائتھ کے سر پر ہیں۔ انجیلو نے اسے برہنہ بنایا ہے اور ایک ہاتھ میں تیر اور دوسرے میں کمان لیے ہوئے ہے اور سر کو بائیں شانے کی طرف کر کے اپنے مستقبل کی طرف دیکھ رہا ہے۔

ڈیوڈ دراصل حقیقی مرد کی علامت ہے۔ تندرست و توانا (یہ توانائی اس کے اعضا سے ظاہر ہوتی ہے)، روحانی قوتوں سے بھرپور، اس کے سر بال اتنے خوبصورت ہیں کہ اسے دوسروں کے مقابلے میں سرفرازی عطا کرتے ہیں، اس کے ہاتھ بھاری، جسم اور متوازن ہیں، انہی سے اس نے گولائتھ کو زیر کیا ہے۔ اس کی آنکھیں کشادہ، پھیلی ہوئی اور مستقبل میں جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مجموعی طور پر وہ خود اعتمادی مگر اپنائیت ہے۔ وہ مغرور نہیں لگتا ہے۔ اس مجسمے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جدید اور قدیم عہد کے لاطینی اور یونانی مجسموں میں اسے اولیت حاصل ہے۔ انجیلو نے یہ مجسمہ 29 برس کی عمر میں بنایا تھا۔

انجیلو کو بے جا تنقید اور تبصروں سے نفرت تھی۔ چنانچہ اسے جلد غصہ آجاتا تھا۔ جب ڈیوڈ مکمل ہو گیا تو ایک تنقید نگار نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''تم نے ایک شاہکار تخلیق کر دیا ہے، لیکن......''

''لیکن کیا؟'' انجیلو نے پوچھا۔

''اس کی ناک لمبی کر دی۔'' اس نے جواب دیا۔

انجیلو بھاگا بھاگا اپنے ورک شاپ میں گیا اور ہتھوڑا اٹھا کر لے آیا پھر اس نے مجسمے کی ناک پر ہتھوڑا مار کر اسے توڑ ڈالا۔ اس نے غصے سے پوچھا۔ ''اب ٹھیک ہے؟''

''ہاں، اب ٹھیک ہے، اس لیے کہ اس کا حسن بڑھ گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

ڈیوڈ کے علاوہ پوپ روم کے مقبرے کے لیے انجیلو نے چار مجسمے مزید بنائے۔ جو اب پیرس کے آرٹ کے عجائب گھر لوور میں محفوظ ہیں۔ وہ باغی قیدیوں، مرتے ہوئے قیدیوں اور بیدار ہوتے ہوئے قیدیوں کے مجسمے ہیں۔ پوپ نے انہیں کیوں بنوایا تھا اور اس کی غرض و غایت کیا تھی، یہ اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ ممکن ہے یہ مجسمے علامتی ہوں اور یہ ظاہر کرتے ہوں کہ انسان جبر و استبداد سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔

☆☆☆

انجیلو کہتا تھا ''اگر مجھ میں کوئی خصوصیت ہے تو محض اس وجہ سے کہ میں ایک بلند تخیلاتی ملک کی فضا میں پیدا ہوا جس کا نام ''اریزو'' ہے۔ میں پینٹنگز اور مجسمے کیوں بناتا ہوں؟ اس لیے کہ مجھے جس دایہ نے دودھ پلایا تھا اس نے ہتھوڑا اور چھینی بھی مجھے اپنے دودھ کے ساتھ پلا دی تھی۔ مجھے خوبصورتی سے عشق ہے، چاہے وہ مرد، گھوڑے، درخت، یا پہاڑ میں ہو۔ ان خوبصورت چیزوں کو دیکھ کر قادرِ مطلق کی صناعی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس کا خیال تھا کہ اس میں خدائی صفات حلول کر چکی ہیں اور وہ کوئی مقدس ہستی ہے۔ اس کا دعوا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا ہے وہ کوئی انسان تن تنہا نہیں کر سکتا۔ یہ سب کرتے وقت خدا نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس لیے کہ اس کی تخلیقات معجزا ہیں۔ اس کا اعتراف اس دور کے مصوروں اور بعد میں آنے والوں نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر یوم جزا و سزا میں اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر داڑھی کے بنایا ہے اور فرشتوں کے پر نہیں ہیں۔ انجیل کی جن چیزوں کے بارے میں تفصیل درج ہے وہ انجیلو کے مجسموں میں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

لیونارڈو ڈاونچی بھی اپنی لازوال پینٹنگ مونالیزا کی وجہ سے شہرت کے جھنڈے گاڑ چکا تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس سے خدمات حاصل کیں اور اسے گرانڈ کونسل چیمبر (دیوان خاص) کی

اس کا آخری کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ وہ اپنی زندگی ہی میں مشہور و معروف ہو چکا تھا۔ اسے کنجوس اور قنوطیت سمجھا جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ہر چند کہ مال دار ہوں، مگر میں مفلسوں اور غریبوں کی طرح سے رہنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ ایسے لوگ زندگی کے بے حد قریب ہوتے ہیں۔ اس کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ وہ دراز قامت تھا مگر اس کی پیٹھ میں درد رہتا تھا اس لیے وہ آگے کو جھکا رہتا تھا۔ اس کے سر کے بال خاکستری اور آنکھیں سیاہ لیکن بے حد چمک دار اور دل میں اترتی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ غذا صرف پیٹ بھرنے کے لیے کھاتا تھا اور نہ اسے لذت اور ذائقے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جن کپڑوں میں وہ کام کرتا تھا، انہی میں سو جایا کرتا تھا۔ وہ کئی مہینوں تک جوتے تک نہ اتارتا اور جب اتارتا تو اس کی کھال تک اتر جاتی۔ وہ فل بوٹ پہنتا تھا تاکہ پتھروں کی کرچیاں اس کے پاؤں میں نہ چبھیں۔ وہ مجمع سے گھبراتا اور تنہائی پسند تھا۔ اسے زیادہ گفتگو کا شوق نہیں تھا۔ وہ گھنٹوں خاموش رہتا تھا۔ سماجی اعتبار سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ بے ڈھنگا اور غیر دل چسپ تھا۔

وہ محنت کرنے سے نہیں گھبراتا تھا۔ مجسمہ سازی کے دوران میں اس کی پیٹھ میں ہمیشہ درد ہوتا رہتا تھا۔ اسے اپنے کام کی اتنی اُجرت ملتی تھی جو دوسرے فنکاروں کے مقابلے میں نصف ہوتی تھی، مگر اس نے کبھی اس معاملے میں ضد بحث نہیں کی۔ اسے جو کچھ بھی معاوضے کے طور پر ملا اس نے خاموشی سے قبول کر لیا۔ بازاروں میں جو سستی اور غیر معیاری غذائیں ملتی تھیں وہ انہیں

دیواروں پر پینٹنگ بنانے کو کہا۔ لیونارڈو نے ایک تاریخی لڑائی کا منظر پینٹ کرنا شروع کر دیا، جب کہ انجیلو کو بلایا گیا تو اس نے بھی ایک تاریخی منظر کو پینٹ کرنے کو ترجیح دی۔

فلورنس نظریاتی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان میں سے ایک لیونارڈو کی حمایت کر رہا تھا، جب کہ دوسرا انجیلو کو۔ ان میں سے ہر گروہ کا کہنا تھا کہ دوسرے کو اس کی خدمات سے سبک دوش کر دیا جائے اور کسی ایک کو سارا کام دے دیا جائے۔ اس جھگڑے میں کسی بھی پینٹر کا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ انجیلو نے منظر کشی کی بجائے کارٹون بنانا شروع کر دیے جو 1512ء کے فسادات میں ضائع ہو گئے۔

اس نے ایک مال دار شخص کی فرمائش پر ”میڈونا اور بچہ“ پینٹ کیا۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی وہ پینٹنگ اب لندن کی نیشنل گیلری میں لگی ہوئی ہے۔

اس اثنا میں روم کے پوپ جولیس دوم کو انجیلو کی کمی محسوس ہوئی۔ اس نے انجیلو کو روم طلب کیا۔ انجیلو جب روم پہنچا تو پوپ نے انجیلو کو ”ٹریجڈی آف دی ٹومب“ بنانے کا حکم دیا۔ اس میں چالیس پینٹنگز تھیں جنہیں پانچ برس میں مکمل کیا جانا تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ مقبرہ دنیا کا حسین ترین مقبرہ ہونا چاہیے۔ یہ مقبرہ پوپ پال دوم ہی کا تھا جو انجیلو سے مکمل نہیں ہوا۔ وہ اس کے تیار کرنے میں از حد پریشانی کا شکار رہا۔ پتھر کی کھدائی کے لیے مناسب افراد کی عدم دستیابی، عمدہ پتھر کا نہ ملنا، نامناسب مددگار، رقم کی فراہمی میں رکاوٹ، کبھی پوپ کا غصہ، مجسمے کے ڈیزائن میں تبدیلی۔ ان سب عوامل کے علاوہ پوپ آنجہانی ہو گئے۔

انجیلو پر مصیبت کا پہاڑ اس وقت ٹوٹا جب پوپ کے لواحقین نے اسے عدالت میں لے جانے کی دھمکی دے دی۔ اس لیے کہ اس نے چالیس برس لگا دیے تھے اور مجسمے اور پینٹنگز اس سے مکمل نہیں ہو سکی تھیں۔ مقبرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلا مجسمہ حضرت عیسیٰ کا تھا جو اپنی جگہ فن مجسمہ سازی کا شاہکار تھا، جو 1516ء میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کے دو مجسمے اس وقت لوور کے عجائب گھر پیرس کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

1505ء میں نئے پوپ جولیس دوم نے عیسائیوں کے بڑے کلیسا سسٹائن چیپل، (واقع ویٹیکن سٹی) کی تعمیر کے دوران میں انجیلو کو روم بلایا۔ سسٹائن چیپل کی تعمیر شروع ہوئی تو پوپ جولیس دوم کو گرجا گھر کی چھت کی تزئین و آرائش کے لیے کسی آرٹسٹ اور مجسمہ ساز کی تلاش ہوئی۔ مگر وہ اس سے پہلے گرجا گھر میں حضرت عیسیٰ، جادوگروں، شیطان، قادر مطلق اور عیسیٰ کی پیدائش اور ان کی ہلاکت سے متعلق مجسمے بنوانا چاہتے تھے۔ لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں مائیکل انجیلو کی خدمات حاصل کریں، کیوں کہ اس سے بڑا مجسمہ ساز اس وقت پورے روم میں کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے مائیکل انجیلو کو بلایا اور گرجا گھر کا کام کرنے کو کہا۔ اسے کلیسا کی چھت کی تزئین کرنا تھی جو 500 مربع فٹ تھی۔ اس کے علاوہ اسے 40 قد آدم مجسمے بنانا تھے۔ انجیلو نے اس کام کو کرنے کی ہامی بھر لی۔ سسٹائن چیپل (سسٹائن کا کلیسا) میں کام کرنے کا موقع ملا تو اس نے معاہدے میں شامل کر لیا کہ وہ مجسمے برہنہ ہی بنائے گا۔ اس لیے کہ افلاطون کا کہنا ہے کہ خدا نے

حلق سے اتار لیا کرتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات وہ روٹی کو پانی میں ڈبو کر کھا لیا کرتا تھا۔ اسی بنا پر اس کی صحت خراب رہتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ فقیر منش تھا۔ غالباً اس کی درویشی کے سبب اسے احیائے علوم کی تحریک کا ایک پیغمبر بھی کہتے ہیں۔

آخری عمر میں اس کی بینائی اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ روشنی اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس لیے کہ وہ تاریکی میں کام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک بار اس کا ملازم اس کے لیے بکری کی چربی کی موم بتیاں لے کر آیا تو انجیلو نے اس کو حکم دیا کہ وہ انہیں باہر پھینک دے۔ بینائی کمزور ہونے کی وجہ سے وہ کتاب کو آنکھوں پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا۔ اہل روم اسے "چار روحوں والا انسان" کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ نقشہ نویس، مصور، مجسمہ ساز اور شاعر تھا۔ ان چار روحوں نے مل کر ہی اس کی تشکیل کی تھی۔

جو پادری اس سے کام کراتا تھا، اس پر دباؤ ڈالتا تھا کہ وہ کام کو جلد ختم کر دے، لہٰذا اس کے ہاتھ ہر وقت چلتے رہتے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں ہر وقت مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے تاریخ میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ وہ درویشی کی حالت میں زندہ رہا، لیکن اب اس کے چھوڑے ہوئے اثاثوں کی قیمت کروڑوں ڈالر ہے۔ روم کے جس مکان میں اس کی موت واقع ہوئی اس کا فرنیچر سستا تھا۔ مکان میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے امارت کی بو آتی ہو۔ ہر چیز سے سادگی ٹپکتی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو نوازتا تھا اور اپنے نائبین کو اچھے معاوضے دیتا تھا اور اس سلسلے میں کوئی بخیلی نہیں کرتا تھا۔

بزرگ و برتر تو محض ایک نقاب میں لپٹا ہوا ہے۔ ہم یہ نقاب اتار دیں تو کیا حرج ہے؟ چنانچہ پادری نے اس کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا۔

بہت سے مجسمے تراشنے کے بعد 1508ء میں پوپ نے اس سے کہا کہ وہ سسٹائن چیپل کی چھت کی تزئین و آرائش کرے۔ جب اسے ہدایت دی گئی تھی کہ وہ چھت کی تزئین کرے تو کلیسا کی دیواروں پر پہلے ہی حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی پینٹنگز بنائی جا چکی تھیں اور انہیں بوٹیسلی نامی پینٹر نے بنایا تھا۔

گرجا گھر کی چھت پر انجیلو نے ایسی پینٹنگز بنائیں جن کا تذکرہ بائبل میں درج ہے۔ گرجا کی چھت محرابی ہے۔ اپنا زیادہ وقت اس نے چھت کے نزدیک تختہ بندھوا کر اور اس پر لیٹ کر کام کیا۔ اس نے چھت کو نو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور اس پر دنیا کی تخلیق، آدمی کی تخلیق اور اس کا زوال، اس کے علاوہ حضرت نوح کی کہانی پینٹ کی ہے۔ یہ نو کہانیاں بائبل سے لی گئی تھیں۔

دنیا کی تخلیق میں اس نے روشنی اور تاریکی کی علیحدگی، سورج اور چاند کی تخلیق اور خشکی اور پانی کا علیحدہ ہونا دکھایا ہے۔ جبکہ آدمی کے زوال میں اس نے آدم کی تخلیق، حوا کی تخلیق اور ان دونوں کا جنت سے نکلنا دکھایا ہے۔ حضرت نوح کی کہانی میں اس نے حضرت نوح کی قربانی، طوفان نوح اور اس کے بعد ہونے والی تاریکی کو پینٹنگ کی شکل دی ہے۔ اس سارے منظر کے بیچوں بیچ حضرت آدم کی پیدائش ہے، جس میں خدا عزوجلال اپنی انگلی حضرت آدم کو پکڑا رہے ہیں۔ (تمثیلی طور پر اس نے خدا کو آدمی کی شکل میں پینٹ کیا تھا، نعوذ باللہ)۔ اس کے علاوہ اڑتالیس برہنہ بچے ہیں جن کا بائبل میں تذکرہ نہیں ہے، لیکن وہ بالیدگی کی علامت ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کی نشوونما ہو رہی ہے۔ وہ صحت مند اور توانا ہے۔ مستقبل اس کے ہاتھ میں دیا جا سکتا ہے۔

چھت پر بنائی جانے والی پینٹنگز تعداد میں 300 کے قریب ہیں۔ سسٹائن چیپل کی چھت کی پینٹنگز اس نے 1508ء سے 1512ء تک یعنی چار برس میں مکمل کی تھیں۔ اس کی چھت کو بارہ تکونے ستونوں سے سہارا دیا گیا تھا۔ روم سے آنے والے پانچ مصوروں نے چرچ جا کر اس کی مدد کرنا چاہی، لیکن اس نے انہیں منع کر دیا۔ وہ سارا کام اس نے تن تنہا انجام دیا۔

جب کلیسا کی چھت مکمل ہو گئی تو اسے عوام الناس کے لیے کھول دیا گیا۔ لوگوں کے لیے یہ پینٹنگز اور مجسمے حیران کن تھے۔ فن کے شائقین ساری دنیا سے اس کے شاہکار دیکھنے کے لیے ویٹی کن سٹی پہنچے تھے۔ انجیلو نے چرچ سے ملنے والا معاوضہ اپنے خاندان کو بھیج دیا۔ اس کے بھائیوں نے ایک خط میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

انجیلو کو عورت کی بجائے مرد سے زیادہ دلچسپی تھی اور وہ اسے طاقت کی علامت سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ ماڈل کے لیے مردوں کی خدمات حاصل کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی ایک نظم میں کہا تھا۔ "عورت ذات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ دغاباز ہوتی ہے۔" تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ عورتوں کے خلاف اس کے دماغ میں اتنا گرد و غبار بھرا ہوا تھا، اسی لیے اس نے شادی نہیں کی۔ اس کے سوانح نگار کا

کہنا تھا کہ انجیلو نے اس سے کبھی عورتوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ اس موضوع پر بات کرنا پسند ہی نہیں کرتا تھا۔

ایک پاکستانی آرٹسٹ اقتدار نے انکشاف کیا کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب ان کا روم جانا ہوا تو وہ سسٹائن چیپل گرجا گھر بھی گئے تا کہ مائیکل انجیلو کا آفاقی کام دیکھ سکیں۔ وہ روز گرجا جاتے دیواروں، چھت اور صحن کو دیکھ کر محظوظ ہوتے جہاں پینٹنگز اور مجسمے نصب ہیں۔

آرٹ سے محبت کرنے والوں اور عقیدت مندوں کے لیے حکومت نے ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد سب سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ عمارت سے باہر چلے جائیں۔ ایک گارڈ نے ان کا شوق دیکھ کر کہا کہ جب وقت ختم ہو جائے تو وہ اس وقت آئیں، تا کہ ان پینٹنگز کو نزدیک سے دیکھ سکیں۔ وہ مقررہ وقت ختم ہوتے ہی گرجا میں پہنچ گئے۔ گارڈ نے انہیں چوری چھپے بڑے ہال میں بلا لیا۔ اندر چھت سے رسی کی سیڑھیاں لٹک رہی تھیں۔ گارڈ نے ان سے کہا کہ اب ان میں سے کسی ایک سیڑھی پر چڑھو اور ان پینٹنگز کو چھت کے قریب سے دیکھو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ چھت کے قریب پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ تمام پینٹنگز جو محرابی چھت پر بنی ہوئی ہیں ان میں سے کسی کی بھی ڈرائنگ درست نہیں ہے۔ آنکھیں، ہونٹ اور منہ آڑے ترچھے اور ٹیڑھے میڑھے بنے ہوئے ہیں۔ وہ پینٹنگز نزدیک سے بہت بھیانک لگیں۔ انہوں نے سیڑھی سے اتر کر گارڈ سے استفسار کیا تو اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ مائیکل انجیلو کتنا عظیم آرٹسٹ تھا اس کا اندازہ تمہیں ہو جانا چاہیے۔ گرجا کی چھت محرابی ہے اگر وہ درست طریقے پر تصاویر بنا دیتا تو نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو وہ صورتیں بدنما معلوم ہوتیں۔ اس نے بالکل درست اندازہ قائم کر کے کہ محراب میں کس طرح سے انہیں پینٹ کرنا چاہیے کہ وہ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو عجیب نہ معلوم ہوں۔ لوگ اب ان پینٹنگز کو دیکھتے ہیں اور انہیں کوئی بات عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ مگر انتہائی قریب سے دیکھنے پر وہ ہیبت ناک اور غیر متوازن معلوم ہوتی ہیں۔

☆☆☆

انجیلو نے اس کے بعد اس گرجا گھر کی قربان گاہ کی قریبی دیوار پر کام شروع کیا اور یوم حساب (قیامت) کی منظر کشی کی اور اس قیامت خیز کام کو جلد ہی مکمل کر ڈالا۔ اس منظر میں فرشتے گناہ گاروں کو جہنم میں ڈال رہے ہیں جبکہ دوسری طرف ایسے لوگوں کو جنت میں لے جا رہے ہیں جنہوں نے راستی کا دامن تھامے رکھا اور دنیا میں امن اور آشتی سے زندگی بسر کی۔ انجیلو کی یہ پینٹنگز اور سنگ تراشی رہتی دنیا تک فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

جب پوپ نے اسے کلیسا کا کام سونپا تھا تو انجیلو کو اس کا منصوبہ پسند نہیں آیا۔ اس نے پوپ سے اختلاف کیا۔ پوپ نے اس کی بات تسلیم کر لی اور اس کو ہدایت دی کہ وہ اپنے انداز سے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے، اس لیے کہ وہ ایک بہترین نقشہ نویس بھی تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو روم کے سارے پینٹروں اور سنگ تراشوں کو بلوا لیتا اور ان کے ساتھ مل کر اس جاں گسل کام کو کرتا لیکن اس نے اس بارِ گراں کو تنہا اٹھانے کا ذمہ لیا اور بہ طریق احسن اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اپنے کام میں پیش آنے والی صعوبتوں اور دشواریوں کا تذکرہ اس نے اپنی ایک نظم میں وضاحت سے کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی لیکن اس نے ایک جنون کے تحت اسے مکمل کیا، کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ کلیسا کے ساتھ اس کا نام بھی روشن رہے۔

کلیسا کی تعمیر میں اس نے ایک نئے قسم کا پلاستر استعمال کیا جو اس کے ایک شاگرد نے اس کی ہدایت پر بنایا تھا۔ کلیسا میں آج تک کوئی بڑی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اب وہ پلاستر روم کی بیشتر عمارات میں استعمال ہوتا ہے۔

جب کلیسا سسٹائن کی تعمیر اور اس کے عقبی حصے پر قیامت کا منظر مکمل ہو گیا تو اسے عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ لوگ ان مناظر کو دیکھ کر ناراض ہوئے۔ کیوں کہ اس میں مردوں اور عورتوں کی برہنہ تصاویر اور مجسمے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں ضائع کر دیا جائے، اس سے کلیسا کی توہین ہوتی ہے۔

پوپ پال سوم نے فیصلہ کیا کہ ان مجسموں کو ضائع نہ کیا جائے۔ پوپ سوم کے بعد چہارم آیا تو اس نے مشہور پینٹر ڈینئل ڈا ولٹرز کو حکم دیا کہ وہ ان تصاویر کو کپڑے پہنا دے۔ یا کم از کم ان کے جسم کے ان حصوں پر پردہ ڈال دے جہاں سے برہنگی جھلکتی ہے۔

انجیلو اپنے کام کو غارت ہوتے دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے کہا "اس جبر کی ہستی کو بتا دو کہ یہ بہت معمولی سا معاملہ ہے جس کی درستی ممکن ہے۔ وہ دنیا کی اصلاح

کریں جوان کا فرض ہے۔ رہی پینٹنگز کی اصلاح کی بات تو وہ نہایت آسانی سے ہوسکتی ہے۔"

لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ مائیکل انجیلو کا یسوع مسیح ان کے اعتقادات اور تصورات سے یکسر مختلف ہے۔ اس کی نہ تو داڑھی ہے اور نہ وہ بوڑھا لگتا ہے۔ وہ حسین و جمیل ہے اور اس طرح سے نہیں بیٹھا جیسا کہ بائبل میں لکھا ہے۔ اس کے انداز و اطوار بائبل کے یسوع مسیح سے مختلف ہیں۔

☆☆☆

انجیلو نے مصوری، مجسمہ سازی اور نقشہ نویسی کے بے شمار منفرد کام کیے ہیں جن کی تفصیل نہیں دی جاسکتی۔ اس نے متعدد ایسے منصوبوں کی ڈرائنگ بنا کر چھوڑ دی جنہیں بعد میں مکمل کیا گیا۔ اس کا ایک اہم کام 1530ء میں فلورنس کی ایک لائبریری کا ڈیزائن ہے، اسی لائبریری میں یونانی شاعر ہومر کی کتاب ایلیڈ رکھی ہے جس کا سرورق انجیلو نے بنایا تھا۔

1526ء میں اس نے دو شہزادوں سے ان کے مجسمے بنانے کا معاہدہ کیا۔ انہیں ان کے مقبروں پر لگایا جانا تھا۔ انجیلو نے انہیں بنانے میں کمال کر دیا۔ اس نے شہزادوں کے مجسمے برہنہ بنائے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے نہایت باریک کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ شہزادوں کا چہرہ کلین شیو تھا۔ مجسمے بنانے کے دوران میں کسی نے شہزادوں تک یہ اطلاع پہنچا دی کہ ان کے چہروں پر داڑھی نہیں ہے۔ وہ اس پر برہم ہوئے تو انجیلو نے جواب دیا۔ "آج سے ایک ہزار برس بعد کسی کو کیا پتا چلے گا کہ تم لوگوں کے چہرے پر داڑھی تھی یا نہیں۔ میں روایتی فنکار نہیں ہوں اور چیزوں کو ایسا نہیں بناتا جیسی کہ وہ نظر آتی ہیں۔" جب مجسمے تیار ہوگئے تو سب نے ان کے بارے میں مثبت رائے دی۔ چنانچہ شہزادے خاموش ہوگئے۔

1527ء میں اسپین نے روم پر حملہ کر دیا۔ پوپ اور حکمراں نے اپنے جھگڑے طے کر لیے اور فلورنٹائن پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ روم کو بچانے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ فلورنٹائن کی حفاظت کی جائے اس لیے کہ فوج کی سپلائی وہیں سے آرہی تھی۔ جنوری 1529ء میں مائیکل انجیلو نے شہر کو بچانے کے لیے اپنی خدمات پیش کردیں۔ اسے نائب جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ ہرچند کہ وہ سیاست سے متنفر تھا لیکن اس نے اسپین سے بچنے کی خاطر جنگ کا باقاعدہ نقشہ بنایا اور روم کو دشمنوں سے بچا لیا۔ انعام کے طور پر مڈیچی نے اسے اپنا مقبرہ بنانے کا حکم دیا۔ اس کا مقبرہ 1534ء میں مکمل ہوا۔ اس کے باپ کا انتقال 1531ء میں ہوا تھا۔ موت کے وقت اس نے انجیلو کے سارے "گناہ" معاف کردیے تھے اور اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ اس کے بیٹے نے خاندان کا نام روشن کیا تھا۔ انجیلو نے اپنی مداح سرائی میں ایک طویل نظم لکھی، جسے لازوال حیثیت حاصل ہے۔

1544ء میں انجیلو پر بیماری کا حملہ ہوا۔ اس کے دوست ریکو نے اسے اسٹروزی محل میں منتقل کردیا تاکہ اس کا بہتر طور پر علاج ہوسکے۔

1546ء میں انجیلو نے ایک اور کلیسا کی تعمیر کرائی اور اسے مکمل کرایا۔ ہرچند کہ اس کا نقشہ ایک اور آرکیٹیکٹ نے بنایا تھا لیکن انجیلو نے اس میں اتنی ترمیمات کرڈالیں کہ لوگ اس کے ڈیزائن کو اسی سے منسوب کرتے ہیں۔ 1550ء میں جب کہ وہ 75 برس کا ہوچکا تھا، اس نے کلیسا کے اندرونی حصے میں وہ مجسمہ تراشا جس میں حضرت عیسیٰ کو مصلوب ہوتے دکھایا گیا تھا۔

ہرچند کہ وہ بوڑھا ہوچکا تھا لیکن اسے کام کرتے دیکھ کر کوئی اسے بوڑھا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہمہ وقت مصروف رہا۔ اپنی موت سے صرف چھ روز پیشتر وہ میلان میں ایک چرچ کے لیے مجسمہ تراش رہا تھا۔ وہ مجسمہ نامکمل رہ گیا اور فرشتۂ اجل نے اسے مہلت نہ دی۔

انجیلو اپنے مقبرے کی تعمیر کے سلسلے میں 1545ء میں سخت بیمار پڑ گیا۔ اسے فالج ہوگیا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا اور 18 فروری 1564ء کو وہ روم میں 89 برس کی عمر میں آنجہانی ہوگیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اسے مشہور شاعر دانتے کے پہلو میں فلورنس میں دفن کیا گیا۔ پادری سالویتی نے آخری رسومات انجام دیں۔ کچھ دوست آخری وقت میں اس کے بستر کے نزدیک تھے۔ اعتراف کرتے ہوئے اس نے پادری سے کہا۔ "میں نادم ہوں کہ میں نے اپنی روح کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مجھے احساس ہے کہ میں اس طرح سے کورا اور کندۂ ناتراش کی طرح مر رہا ہوں جیسے کہ میں اپنے پیشے کی الف بے تے سے بھی واقف نہیں ہوں۔" اس نے کہا:

میں اپنی روح خدا کے ہاتھ میں دیتا ہوں
اپنا جسم مٹی کے سپرد کرتا ہوں
میرا اسباب و مال میرے رشتے داروں کو دے دیا جائے۔

سنسکرت

محمد ایاز راہی

دیومالائی اساطیر کے رنگ میں رنگی، دنیا کی قدیم زبانوں میں سے ایک زبان سنسکرت گو کہ مرچکی ہے لیکن کتابوں میں اب تک زندہ ہے۔ نصاب میں شامل کرکے اسے آکسیجن دی جارہی ہے۔ تاکہ اسے نئی زندگی ملے کیوں کہ علم و ادب کا ایک خزانہ اس مردہ زبان میں ہے۔ اس زبان کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟

مختصر مختصر مگر انتہائی جامع مضمون



انسانی اظہار کے تین ہی ذریعے ہیں؛ زبان، کنایہ (اشارہ)، اور تحریر۔ زبان یا آواز اوّلین ذریعہ ہے چاہے وہ ہنسی یا رونے کی آواز ہی کیوں نہ ہو۔ چیخ پکار، فریاد، دھاڑ اور چنگھاڑ وغیرہ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ بات چیت، بولی ٹھولی، نظم ونثر، آواز یا زبان کا ہی حصہ ہیں تفنن طبع کے طور پر اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ حضرت آدم نے بی بی حوا سے پہلی بات نثر میں کی تھی یا نظم میں؟ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ کنایہ (اشارہ) یا علامت (غم وخوشی دونوں) دوسرے درجہ پر آتے ہیں۔

اک دل ہے مرے پاس بتاؤ تو کسے دوں؟
شوخی کو؟ شرارت کو؟ کرشمہ کو؟ حیا کو؟
(حضور نعیمی)

تصویر وتحریر کے فن نے بعد میں جنم لیا۔

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

قلم اور موقلم نے صدیوں بلا شرکت غیرے انسانی سماج پر راج کیا (اب تو متحرک کیمرے اور کمپیوٹرز کی بورڈز کا عمل دخل ہے) مختلف خطوں میں بے شمار علیحدہ علیحدہ زبانیں وجود میں آئیں اور چھا گئیں۔ زبان یا بولی کئی ادوار سے گزرتی اور ارتقا کا سفر طے کرتی رہی۔ تحریر کا سانچا ایجاد ہوا تو ہر قوم اور خطے کے باشندوں نے اپنے اپنے رسم الخط میں اپنی زبان کو محفوظ کرنے کا جتن کیا تاکہ اگلی نسلوں تک یہ خزانہ یا سرمایہ بہ خوبی منتقل ہوسکے۔ اس کے باوجود بھی کئی زبانیں عنقا اور مردہ

ہوگئیں یا مرجھا کے نامانوس ہوگئیں۔ یا پھر صرف کتابوں تک ہی محدود ہوگئیں۔ کچھ زبانیں مذاہب کے سہارے اپنے وجود کو برقرار رکھے رہیں۔

ہر زبان کے اپنے اپنے قواعد وضوابط اور اصول مرتب ہوئے۔ علماء نے اس کام میں زندگیاں گزار دیں اور زبان کو خوب سے خوب تر بناتے گئے۔ ادیبوں نے خون جگر سے اس کی آبیاری کی۔ پروان چڑھایا۔ معاشرہ یا سماج لب ولہجے کو سنوارتا نکھارتا گیا۔ زبانوں کی ساخت وپرداخت۔ کاٹ چھانٹ۔ ارتقا کا عمل اور کہانی صدیوں قرنوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ زبان کی اہمیت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ ”بولو۔ تاکہ پہچانے جاؤ۔ لکھا کرو تاکہ تمہاری باتیں آنے والی نسلوں تک پہنچ سکے۔ ہوا میں نہ اڑ جائے۔“

یقیناً زبان آدمی کی پہچان اور خوب صورت گفتگو انسان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس مضمون میں سنس کرت زبان پر اک سرسری نظر ڈالی جائے گی۔ سنس کرت جسے عام طور پر غلط تلفظ (سن سک رت) سے لکھا، بولا اور ادا کیا جاتا ہے جب کہ اس کا صحیح تلفظ سنس۔ک۔رت۔ ہے۔

عربی زبان دنیا کی جامع ترین زندہ زبان تسلیم کی گئی ہے اب بھی اسے اوّلیت اور تقدم حاصل ہے جب کہ سنس کرت کو دوسرا درجہ دیا جاتا ہے جو ہندوستان (بھارت) کی مقدس ترین مذہبی وعلمی زبان ہے۔ سنس کرت کو وہی مرتبہ اور تقدس حاصل ہے جو ہمارے ہاں عربی کا شرف اور اختصاص ہے۔ عرب کے ایک معنی خوش بیاں، فصیح کے ہیں اور سنس کرت کے ایک معنی بھی سنوری ہوئی بولی ہے۔ سنس بہ معنی مقدس اور کرت بہ معنی بولی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سنس کرت پشتو زبان کا لفظ ”سم کڑت“ ہے۔ پشتو میں سم بہ معنی سیدھی، سنوری اور کڑت بہ معنی بولی زبان۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اڑھائی سو سال پہلے ضلع صوابی کے ایک ہندو عالم پانینی نے سنس کرت کو مدون کیا۔ باقاعدہ اصول وضوابط بنائے اور اسے اپنی پشتو زبان میں سم کڑت (سیدھی سنوری بولی) کا نام دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ضلع صوابی جو اب صوبہ خیبر پختون خواہ (سابقہ صوبہ سرحد) کا پرگنہ اور آثار قدیمہ کا امین خطہ ہے (ٹوپی صوابی وغیرہ) سنس کرت کو اس قدر اہمیت اور تقدیس دی گئی کہ اگر کوئی شودر ذات کا آدمی (دراوڑ نسل) اسے سن لیتا یا اس کے کانوں میں پڑ جاتی تو اس کے دونوں کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ (رانگ) انڈیل کر اسے ہمیشہ کے لیے بہرا کر دیا جاتا۔ یوں سنس کرت عوام سے دور ہی رہی یا رکھی گئی چناں چہ صرف برہمن ذات کے لیے ہی مختص ہو کے رہ گئی، مندروں اور ہندو راج درباروں میں ہی اس کا چلن رہا جب کہ عربی رسم الخط میں اترا قرآن پاک کا نہ صرف پڑھنا سمجھنا بلکہ دیکھنا بھی عام و خاص کے لیے ذریعہ ثواب قرار دیا گیا۔ کسی بھی مسلمان یا نو مسلم کے لیے حفظ قرآن باعث عزت وتکریم اور آخرت میں کامیابی کا ضامن ٹھہرا۔ اس وجہ سے عربی مقبول رہی۔ بہ ہر حال سنس کرت کی فصاحت وبلاغت، ہمہ گیری، تہہ داری، گہرائی اور جامعیت میں کوئی شبہ نہیں۔ سنس کرت کے ایک ویدی کلام (نظم۔ مذہبی اشلوک) گایت ری۔ کا منظوم اردو ترجمہ علامہ اقبالؒ مرحوم نے ”آفتاب“ کے نام سے کیا ہے جو ان کے مجموعہ کلام کی سترھویں نظم ہے۔ گایت ری جو نزع کے عالم میں مبتلا ہندو کو سنائی جاتی ہے جس طرح کسی مسلمان کو عالم نزع میں سورۂ یٰسین سنائی جاتی ہے۔ گویا ”گایت ری“ ذریعہ نجات کا منتر ہے۔ علامہ اقبالؒ مرحوم نے ”گایت ری“ کا منظوم ترجمہ اس اعتراف کے ساتھ کیا کہ یہ آزاد ترجمہ تو ہے مکمل ترجمہ نہیں کہ سنس کرت کا دامن بہت وسیع ہے۔ ہزاروں برس کی منجھی ہوئی پختہ اور فصیح زبان ہے۔ نظم آفتاب (منظوم ترجمہ گایت ری) بانگ درا کے پہلے حصے میں ہے۔ گایت ری بہ معنی آفتاب پرستی، رگ بید کا ایک مقدس منتر جو وظیفہ کے طور پر پڑھا جاتا ہے۔ ایک چھند (تال) کا نام، سلامتی کا نغمہ، تین طرح کا نغمہ، وانی، کلام، تقریر، برہما کی بیوی، سلامتی کا گیت گانے والی، ماتاؤں کا ایک ویدی کلام، منتر۔

آریاؤں کی اصل اور ان کے تہذیبی معاملات سے متعلق طرح طرح کے دعوے کیے گئے ہیں مگر اتنا یقینی ہے کہ وہ خانہ بہ دوش لوگ تھے۔ آریہ کے معنی معزز، بہادر، شریف وغیرہ ہیں، ایران کے سابق شہنشاہ رضا شاہ پہلوی اپنے نام کے ساتھ آریہ مہر (آریاؤں کا سورج) لکھا کرتے تھے۔ آریاؤں کی اہم ترین مذہبی کتابوں میں ایک سلسلہ آرنیک ہے۔ اس کے بارے میں مہارشی واتا دیال شیو برت لال ورمن کا کہنا ہے کہ آرنیک جنگل کی کتابیں کہلاتی ہیں۔ آرنیک کی تعلیم آبادی گاؤں قصبہ شہر میں نہیں دی جاتی تھی بلکہ جنگلوں میں رہ کر دی جاتی تھی۔ آریہ جنگل کو کہتے ہیں مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ان جنگل کی کتابوں (آرنیکوں) میں زیادہ تر کرم کانڈ (ہندو شاستر یعنی شریعت اصول) کے مضامین کی تشریح اور وضاحت ہے۔ جنگل کی زندگی میں عملاً اس کی پابندی مشکل

تھی۔ جنگلوں میں رہنے والے خانہ بہ دوش آریہ درختوں کے پھول پھلوں اور جانوروں کے شکار پر زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے مکانات وقتی اور عارضی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کی سرزمین پر تعمیری نوعیت کا اپنا کوئی نقش انہوں نے نہیں چھوڑا۔ بہ قول ڈاکٹر ایبرن فیلس، ابتدائی ویدک عہد کے آثار بہت کم ملتے ہیں سوائے ایک خاص قسم کے لوہے کے تبر (کلہاڑی) کے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں آریاؤں کی قدیم تہذیب بہت کم مایہ تھی۔ ان کی جھونپڑیاں مٹی کی ہوتی تھیں اور اکثر اوزار لکڑی، مٹی بانس اور چمڑے جیسی ناپائیدار چیزوں سے بنتے تھے۔ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے جن کو دراوڑ یعنی دکھنی بھی کہا جاتا ہے۔ شمال سے آنے والے آریاؤں نے انہیں ہی مغلوب کرکے شودر بنا دیا۔ دراوڑ یا دکھنی نسبتاً مہذب زندگی بسر کرتے تھے۔ جلبرٹ سلیٹر نے دلائل سے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ان دراوڑوں کی تہذیب مصر اور میسوپوٹامیہ کی تہذیب سے بہت مماثل تھی۔ تمل (تامل) جو دراوڑوں میں سب سے زیادہ پرانی اور لسانی اعتبار سے غیر آلودہ زبان ہے۔ مذکورہ مماثلت کی ایک حد تک عکاس ہے۔ ترقی یافتہ دراوڑ تہذیب نے آریاؤں کے معاملات زندگی میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا کردی تھیں۔ بہ قول ڈاکٹر ایبرن فیلس، آریائی تہذیب یعنی ان خانہ بہ دوش گلہ بانوں کی تہذیب جنہوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور آریائی زبانیں بولتے تھے آج تک بھی موجود نہیں بلکہ ہندوستان کی قبل از آریائی تہذیبوں کے ساتھ گھل مل گئی ہیں۔ آریاؤں نے یہاں کی قدیم تر قوموں سے شادی بیاہ کرکے میل جول بڑھایا اسی وجہ سے ان کی تہذیب میں اس قدر توسیع اور تغیر ہوا کہ وہ کچھ سے کچھ ہوگئی۔ جلبرٹ سلیٹر نے ذات پات کی تقسیم، کالی، شیو، وشنو، پاروتی، گنیش وغیرہ کی پوجا ہی نہیں بلکہ خود برہموں کے نظام کو بھی اصلاً دراوڑ بتایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر برہمن اصلاً آریائی نظام میں مذہبی پیشوا ہوتے تو ویدک دیوتاؤں مثلاً ورن۔ اندرا کی پوجا کو ہندوؤں میں غالب حیثیت حاصل ہوتی۔ کپاس کی کتائی بھی جس سے جنیئو (زنار۔ دھاگا) تیار ہوتا ہے ویدک آریاؤں کا فن نہیں تھا کہ وہ بہ ہر حال خانہ بہ دوش کھال چمڑا پہننے کے خوگر تھے۔ مہارشی شیوبرت لال اپنی کتاب جین دھرم مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس دلی 1928 عیسوی کے صفحہ نمبر 155 پر رقم طراز ہیں کہ ہندو ہندو ہے برہمن برہمن ہے۔ برہمن ہندو نہیں ہے نہ ہندو کہلانا پسند کرتا ہے بلکہ اپنے آپ کو ہندو پن کے دائرے سے جدا رکھتا ہے، اس لیے یہ کہنا کہ ہندو ایک قوم ہے بالکل غلط اور بے سروپا بات ہے۔ ہندو قوم کے اجزاء میں برہمن گروہ، ہندو عنصر نہیں ہے۔ (جین دھرم ص ۱۵۵) یہاں واضح ہو کہ مسلمان ایک قوم ہے جس میں گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے۔ سنس کرت کے حوالے سے قبل از مسیح " کے ہندوستانی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اسی سے سنس کرت زبان ابھرتی اور آہستہ آہستہ ترقی کرکے مقدس ترین اچھوتی زبان بنتی ہے۔ اس بات کو کہ آریہ برہمن اصلاً مذہبی پیشوا نہیں تھے خود مہارشی شیوبرت لال بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ منصب حاصل کرنے کے لیے برہموں کو بہت خون ریزی کرنی پڑی تھی چنانچہ مہرشی جی کے الفاظ یہ ہیں۔ "ابتدا میں یہ بات نہیں تھی (چھاندوگیہ اپن شد۔ صفحہ چودہ تا پندرہ) مشہور ہے کہ برہمن برہما (تخلیق کا خدا) کے منہ سے۔ کھشتری ذات بھجا (ہاتھ بازو) سے۔ ویش ذات ران سے اور شودر اچھوت پاؤں سے برآمد ہوئے۔ اس بارے مہرشی جی کا کہنا ہے کہ یہ صرف عقیدہ ہے حالاں کہ معاملہ بالکل برعکس ہے) قومی پیشوا ہر نظر سے کھشتری ہی تھا ممکن ہے۔ اس وقت یہ لفظ کھشتری مستعمل نہ رہا ہو۔ ہم ہندوؤں میں اس بات کی کوئی روایت تک نہیں ہے بعد کو کھشتریوں اور برہموں کے درمیان صدیوں تک خون ریزیاں ہوتی رہیں۔ پرس رام نے کھشتریوں کا قتل عام کیا۔ کوشش یہ تھی کہ دنیا سے کھشتریوں کا نام و نشان ہمیشہ کے لیے مٹا دیا جائے ایسا تو نہیں ہوا ہاں برہمن غالب آئے اور کھشتری مغلوب ہوئے۔ برہموں کی فضیلت تسلیم کرلی گئی۔ (اکیس مرتبہ تلواروں کی جھاڑو سے کھشتری کوڑا کرکٹ کی طرح سطح زمین سے صاف کردیے گئے) جین دھرم صفحہ 14"۔ حقیقت جو بھی ہو امر واقعی یہ ہے کہ تبدیل شدہ حالات میں آریاؤں کی زبان میں بھی غیر معمولی ترقی و توسیع ہوئی اور ایک مدت میں پاک صاف پختہ ہوکر اس نے سنس کرت نام پایا اس ضمن میں مہرشی جی کا یہ بیان بھی توجہ طلب ہے کہ کھشتریوں نے ویدک اصطلاحات کی تاویل روحانی نظر سے کرنا شروع کی اس میں کامیابی ہوئی اور برہمن مذہب میں خاص قسم کی تبدیلی پیدا کردی گئی۔ (جین دھرم صفحہ 14) خانہ بہ دوش آریاؤں نے ہندوستان کی مہذب اقوام کی صحبت میں رہ کر لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ کی۔ ابتدا میں تحریر کی جو صورت انہوں نے اختیار کی اسے خداداد سمجھ کر براہمی (برہمی) کہا گیا۔ زمانہ بعد اس سے تحریر کے جو خط نکالے گئے ان میں

سب سے زیادہ مقبول و مروج ناگری (دیوناگری) خط ہے۔ شمالی ہند میں سنس کرت کے لیے بھی عام طور سے اسی خط کا استعمال کیا گیا ہے جو مسلم ہے۔

اسلامی تعلیمات کی ابتدا اقراء (پڑھیے) سے ہوئی اور یہی اس خیر امت کا طرۂ امتیاز بنا عرب جہاں جہاں بھی گئے وہاں کی زبان نہ صرف سیکھی بلکہ اسے تصنیف وتالیف اور ترجمے کا ذریعہ بھی بنایا۔ ہندوستان آئے تو یہاں کی مختلف بولیوں کے ساتھ ساتھ ان کی گفت وشنید ہی نہیں ہر قسم کے علمی معاملات کے لیے بھی سنس کرت زبان استعمال میں آنے لگی۔ بادشاہوں کے سکے شاہراہوں اور عمارتوں کے کتبے درباروں کی مدحیہ نظمیں بلکہ معتقدات سے متعلق الوپنشد (وہ اپنشد جس میں اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے) جیسی کتابیں بھی سنس کرت میں لکھی گئیں الوپنشد کا مصنف علامہ ابوالفیض فیضی ثم فیاضی ہے جو جہاں پناہ اکبر اعظم کا سرفہرست رتن (نورتنوں میں سے) تھا علامہ فیضی نوجوانی میں بنارس گیا اور کسی بڑے گیانی پنڈت کی خدمت میں ہندو بن کے رہا خفیہ طور پر سنس کرت سیکھی جب تحصیل علم کر چکا تو وقت رخصت اپنا مسلمان ہونا ظاہر کیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ معلم پنڈت نے بڑے افسوس کا اظہار کیا مگر علامہ فیضی کی ذہانت اور لیاقت سے بڑا خوش تھا لہٰذا معاف اس شرط پر کیا یہ عہد لے کر کہ گایتری منتر اور چاروں ویدوں کا ترجمہ کسی بھی دوسری زبان میں نہ کرنا۔ علامہ فیضی (1547 تا 1598 عیسوی) نے سنس کرت کی دوسری عمدہ کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ان کے مضامین ظاہر کیے مثلاً لیلاوتی (لی لا وتی) مہابھارت۔ بھگوت گیتا۔ اتھروید بید وغیرہ۔ اسی طرح علامہ فیضی سے پانچ سو برس پہلے دربار غزنوی کے عالم بے بدل ابوریحان البیرونی (973 تا 1048 عیسوی) نے بھی سنس کرت میں مہارت تامہ حاصل کیا سنس کرت کتابوں کے ترجمے کیے البیرونی کی تصنیف گراں مایہ کتاب الہند (ہندو دھرم۔ ہزار برس پہلے) کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنے دلی والے سکوں پر سنس کرت زبان میں کلمہ طیبہ کا ترجمہ لکھوا کر نہ صرف اس زبان کو سلطنت کی زبان کا درجہ دے دیا تھا۔ بلکہ ان سکوں کے ذریعے اسلامی عقائد کو ہندوستانیوں کی گرہوں (گھروں۔ جیبوں) میں بھی بندھوا دیا تھا۔ ہندوستان کے مذہبی حلقوں میں منتر جادو اور طلسم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہندی معاشرے میں جوگی جادوگر اتنے مؤثر تھے کہ قدیم مسلم صوفیا کو بھی ان کے مقابلے کے لیے طرح طرح کے منتر وضع کرنے پڑے تھے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری سے منسوب ایک گنج مندرہ (بڑا منتر) کے کچھ کلمات یہ ہیں۔ "جن دیودانا۔ بھوت پریت۔ راکس بھوکس۔ ٹونا ٹومن۔ کیا کرایا۔ دیا دیوایا۔ بھیجا بھیجایا۔ بلٹ کھاٹ۔ سلیمان بن داؤد کی دہائی جسے رہیں۔ جاہ جاہ یاہ باہ مت دھرم کے واچا۔ سدھ کر کے سکت مخدوم شیخ یحییٰ منیری کے بھگت بہت سوابا۔ بہ حق لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

سلطان محمود غزنوی کی انگشتری پر اوم کندہ تھا۔ اوم (اونگ) یعنی بید کا عنوان اور منتر اعلیٰ جسے ہندو اپنی مذہبی رسومات کے آغاز۔ کتابوں وغیرہ کی ابتداء میں کہتے اور لکھتے ہیں۔ منتر یہ کلمہ اسم اعظم جو الف واؤ میم سے بنا ہے الف سے بشنو۔ واؤ سے شیو۔ اور میم سے برہما۔ تخلیق۔ تحفظ اور تخریب کے تین بنیادی اور بڑے دیوتا۔ اوم کی کو ہندو وہی فضیلت دیتے ہیں جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بارے میں حکم ہے۔ مسلمان شاعر جب سنس کرت میں شعر (سرلوک۔ شرلوک۔) کہتے تھے تو تخلص بھی سنس کرت میں ہی رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت عبدالقدوس رودولوی خود کو۔ الکھ داس۔ لکھتے تھے۔ مولانا داؤد نے اپنی نظم چندائن میں شرلوک (سرلوک) کے عام طور پر گائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ کتھا کاب۔ سرلوک۔ نار نبھ لکھی جائے۔ چھند پانت۔ مسلمان علماء نے سنس کرت میں قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا۔ سنس کرت میں قرآن پاک کے کتنے ترجمے ہوئے فی الوقت یہ بات معلوم نہیں ہو سکی البتہ اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ ایک ترجمہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے اس کے ایک صفحہ کا عکس جناب عبید اللہ (مدراس) کے تعاون سے نذر قارئین ہے۔ یہاں یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ مسلم سلاطین کے لیے یہ خیال بھی محض لغو اور لایعنی تھا کہ کسی ہندو عبادت گاہ کو مسجد بنا دیا جائے البتہ اس بات کا امکان ہے کہ کسی مندر کا پروہت جب مسلمان ہو گیا تو اس نے مندر کی عمارت پر اپنے قبضے کو باقی رکھا ہو اور اس ہندو عبادت گاہ کے احترام کو قائم رکھنے کے لیے اسے ذاتی قیام گاہ بنانے کی بجائے مسجد کی صورت دے دی ہو۔ غزنوی دربار کے عالم بے بدل اعلیٰ ریاضی دان اور محقق وحکیم ابوریحان البیرونی لکھتے ہیں کہ سنس کرت بجائے خود ایک وسیع زبان ہے ایک ایک لفظ بلکہ حرف کے کئی کئی معنی ہیں اس لیے ان حروف والفاظ میں وہی شخص امتیاز کر سکتا ہے جو موقع کلام کو سمجھتا اور سیاق وسباق سے واقف ہو۔

ماہِ موسمِ بہار

سلیم الحق فاروقی

عیسوی کلینڈر میں موسم بہار کے مہینے کو اپریل کا نام دیا گیا ہے اس مہینے میں ایسے بہت سے لوگوں نے جنم لیا جو ہمارے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔ انہی میں سے چند افرادِ خاص کا مختصر مختصر تذکرہ۔

معلومات حاصل کرنے کے شائقین کے لیے تحفۂ خاص



موسم بہار کے زمانے میں تیس دن کے مہینے کو جارجین اور جولین کیلنڈر میں اپریل کا نام دیا گیا ہے۔ کھلتے پھولوں کے موسم میں شروع ہونے والے اس مہینے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر سال اپریل اور جولائی کی پہلی تاریخ ایک ہی دن آتی ہے۔ 2015ء میں یکم اپریل بدھ کو آئے گا تو جولائی کی پہلی تاریخ بھی بدھ کو آئے گی۔ رومن اس مہینے کو Aprilis کہتے تھے۔ یورپ والے اس مہینے کو نحوست زدہ قرار دیتے ہیں۔ اس مہینے کے چند اہم واقعات ملاحظہ کریں:

منیر نیازی

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

اس مشہور شعر کے خالق نے دنیائے شعر و ادب کے بسیتوں کے دلوں پر جس طرح حکمرانی کی اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ زندگی کے حقائق کو منیر نے جس طرح آشکارا کیا ہے وہ انداز سیدھا دل میں ترازو ہوتا محسوس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری ہو یا پنجابی منیر کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے۔ کون ہے جو منیر کے اس بند سے نہ بچ سکتا ہے

کج انج وی راہواں اوکھیاں سن
کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوک وی ظالم سن
کج مینوں مرن دا شوق وی سی

منفرد لہجے کا شاعر منیر نیازی مرحوم 9 اپریل 1928ء کو ہردو خانپور، ضلع ہوشیار پور، مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے اور 26 دسمبر 2001ء کو لاہور میں وفات پا کر



میں آسودۂ خاک ہوئے۔ آپ کا اصلی نام منیر خان اور آپ کے والد کا نام فتح محمد خان تھا۔ یوں تو منیر کی پہچان اردو اور پنجابی شاعری میں زیادہ بنی لیکن انہوں نے اس کے علاوہ ڈراما نگاری، کالم نگاری اور سفرنامے کی صنف میں بھی اپنا لوہا منوایا۔

آپ کے کل 16 شعری مجموعوں میں 13 اردو اور 3 پنجابی میں ہیں۔ ان کے اردو مجموعوں میں "اس بے وفا کا شہر، تیز ہوا میں اور تنہا پھول، دشمنوں کے درمیان شام، جنگل میں دھنک، سفید دن کی ہوا، ماہ منیر، سیاہ شب کا سمندر، ایک دعا جو میں بھول گیا، پہلی ہی بات آخری تھی، چھ رنگین دروازے، محبت اب نہیں ہوگی اور ایک مسلسل شامل ہیں۔ پنجابی مجموعے چار چپ چیزاں، رستہ دسن والے تارے اور سفردی رات ہیں۔

منیر نیازی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی، اکادمی ادبیات پاکستان کا کمالِ فن ایوارڈ کے علاوہ ستارۂ امتیاز بھی عطا کیا۔ آخر میں منیر کی یہ ایک اور منفرد نظم ملاحظہ کیجیے

زندہ رہیں تو کیا جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا
ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا
اب کون منتظر ہے ہمارے لیے وہاں
شام آگئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا
دل کی خلش تو ساتھ ہی رہے گی تمام عمر
دریائے غم کے پار اتر جائیں ہم تو کیا

احمد رشدی

اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اردو گائیکی کے جدید انداز کے نغمات کون سے ہیں؟ تو یقیناً اکثریت "بندر روڈ سے کیماڑی، چلی رے چلی میری گھوڑا گاڑی" یا "کوکو کورینا" گنگنانے لگے گی۔ ان خوبصورت نغمات کے گلوکار احمد رشدی کو بلاشبہ اردو کی جدید طرزِ گائیکی کے بانیان میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ 24 اپریل 1934ء کو پیدا ہونے والے احمد رشدی نے ہندوستان میں بننے والی فلم "عبرت" سے اپنی پس پردہ گلوکاری کا آغاز کیا لیکن 1956ء کو اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ پاکستان آجانے کے بعد ریڈیو پاکستان میں گائے ہوئے ان کے نغمے "بندر روڈ



سے کیماڑی" نے ان کو شہرت کی بلندیوں کی طرف گامزن کردیا۔

"کارنامہ" وہ پہلی پاکستانی فلم تھی جس میں انہوں نے پہلی بار اپنی پس پردہ گلوکاری کے جوہر دکھائے لیکن بدقسمتی سے یہ فلم کوئی کارنامہ اس لیے نہ دکھا سکی کہ یہ فلم بھی ریلیز ہی نہ ہوئی۔ اس کے بعد 1956ء میں ریلیز ہونے والی فلم "انوکھی" وہ پہلی فلم ثابت ہوئی جس میں انہوں نے نہ صرف اپنی گلوکاری سے رنگ بھرا بلکہ ایک مختصر سے کردار کے ذریعے اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ اس فلم میں اداکار لہری پر ایک مزاحیہ گیت "ماری لیلیٰ نے ایسی کٹار، میاں مجنوں کو آیا بخار" گایا تھا۔ اس فلم سے احمد رشدی کو اتنی پذیرائی ملی کہ پھر وہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے، انہوں نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

فلمی دنیا میں احمد رشدی کی گلوکاری اور وحید مراد کی اداکاری اس طرح لازم و ملزوم ہوئے کہ دونوں ایک دوسرے کی شہرت کو چار چاند لگاتے رہے۔ جس فلم میں یہ دونوں یکجا ہوتے اس کو کامیابیوں کی سیڑھی چڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ احمد رشدی نے مجموعی طور پر 950 سے زائد نغمات ریکارڈ کروائے جن میں 800 سے زائد اردو نغمات تھے۔

احمد رشدی 11 اپریل 1983ء کو اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کے انتقال کے تقریباً 20 برس بعد 2003ء میں حکومتِ پاکستان نے ان کو ستارۂ امتیاز بعد از وفات عطا کیا۔

معین اختر

"وہ آیا، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا" اگر پوچھا جائے کہ یہ دعویٰ کن لوگوں پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے؟ اور اگر اس کلیے کے تحت ہزاروں افراد سے لے کر محض دس افراد کی فہرست بھی بنائی جائے تو اس میں یقیناً معین اختر کا نام سرِفہرست ہی ہوگا۔ صرف 16 سال کی عمر میں 6 ستمبر 1966ء کو پاکستان کے پہلے یومِ دفاع کے سلسلے میں منعقدہ تقریب میں اس نوجوان فنکار نے اپنے فن کا جوہر کچھ یوں دکھایا کہ فنی سفر کی گاڑی سے عقب نما Back View Mirror کو ہی نکال پھینکا۔ اور محض دو سال بعد ہی اکتوبر 1970ء کو پاکستان ٹیلی ویژن پر ضیاء محی الدین شو میں ان کے فنی مظاہرے نے دراصل ان کی فنی گاڑی کو چوتھے گیئر سے نکال کر ٹربو گیئر میں ڈال دیا۔ اور وہ ٹی وی اور اسٹیج کے معروف ترین فنکار بن گئے۔

یہ ان کی صلاحیتیں ہی تھیں جس کی بناء پر انور مقصود یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اگر معین اختر نہ ہوتے تو شاید ان کے لکھے ہوئے جملوں اور مکالموں کو اتنی پذیرائی کبھی نہ ملتی۔

معین اختر کے وہ مشہور ٹی وی ڈرامے جن میں وہ اپنی فنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر سڑکوں کو حقیقی معنوں میں سنسان کردیا کرتے تھے ان میں سے کچھ یہ تھے۔ ہاف پلیٹ، آنگن ٹیڑھا، عید ٹرین، بندر روڈ سے کیماڑی، سچ مچ اور مکان نمبر 47 لیکن وہ مس روزی میں فن کی جس بلندی پر پہنچے وہ ان کا ہی خاصہ تھا۔ اگر ٹاک شوز میں معین اختر کے فنی کمالات دیکھنے ہوں تو معین اختر شو اور یس سر، نو سر ضرور دیکھیے۔ اس کے علاوہ ان کا مایہ ناز پروگرام لوز ٹاک تھا جس میں انہوں نے 200 سے زائد بہروپ بدل کر ناظرین کے دل موہ لیے۔ کمپیئرنگ کے شعبے میں ٹی وی کوئز شو "کون بنے گا کروڑپتی؟" ان کی یاد ہمیشہ دلاتی رہے گی۔

ٹی وی کے علاوہ فلم اور اسٹیج میں بھی انہوں نے اپنا لوہا منوایا۔ انہوں نے تین فلموں راز، مسٹر کے ٹو اور مسٹر تابعدار میں کام کیا۔ اسٹیج پر ان کا نام کامیابی کی ضمانت مانا جاتا تھا۔ ان کے معروف اسٹیج ڈراموں میں بکرا قسطوں پر، بہروپیا،



بچاؤ معین اختر سے، ناردن معین اختر اور بڈھا گھر پر ہے شامل ہیں۔

24 دسمبر 1950ء کو بمبئی کے افق پر طلوع ہونے والا یہ "مددگار ستارہ" (معین اختر کا لفظی ترجمہ) 22 اپریل 2011ء کو کراچی سے راہیِ ملک عدم ہو کر ثابت کر دیا کہ وہ ایک سچا پاکستانی بھی تھا اور پیدا وہ بیشک ہندوستان میں ہوا لیکن اس کا خمیر اسی مٹی سے اٹھا تھا۔ معین اختر کی فنی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر ان کو صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی کے علاوہ ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا۔ ان کے لیے بجا طور پر یہ شعر پڑھا جاسکتا ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

علامہ محمد اقبال

درسگاہ میں کلاس شروع ہو چکی تھی، ایک طالبعلم قدرے تاخیر سے جماعت کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ استاد نے پوچھا کہ "اقبال تم دیر سے کیوں آئے ہو؟" اس ذہین طالبعلم نے برجستہ جواب دیا "جناب اقبال دیر سے ہی آیا کرتا ہے" طالبعلم کی اس حاضر جوابی نے وقتی طور پر تو شاید استاد کو خاموش کردیا لیکن جب اس طالبعلم پر واقعی اقبال آیا اور دنیا نے اس کو اقبال کے نام سے جانا تب پتا چلا کہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتا کس کو کہتے ہیں۔ سیالکوٹ میں شیخ نور حسین کے گھر 9 نومبر 1877ء کو



پیدا ہونے والے اس بچے کا نام تو والدین نے محمد اقبال رکھا، خاندانی نام شیخ کنیت ٹھہری۔ لیکن آگے چل کر پوری دنیا نے اس کو ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال کے نام سے یاد رکھا۔

شاعری علامہ اقبال کی روح میں بچپن سے ہی موجود تھی اور آپ نے لڑکپن میں ہی باقاعدہ شاعری شروع کردی تھی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق حضرت علامہ کو شاعری میں اصلاح کے لیے کسی استاد کی ضرورت تھی۔ وہ آج کی سہولیات کا دور تو تھا نہیں کہ تیز رفتار ذرائع مواصلات موجود ہوتے لیکن پھر بھی آپ نے اپنی اصلاح کے لیے استاد داغ دہلوی کا انتخاب کیا اور وہ ان سے بذریعہ خط و کتابت اصلاح لینے لگے۔ اس میں دلچسپ امر یہ تھا کہ دونوں کی کبھی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ابھی آپ نے چند غزلوں میں ہی اصلاح لی تھی کہ ان کو زبان و بیان کو اتنا معیاری پایا کہ حضرت داغ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگئے کہ پنجاب کے دور افتادہ ضلع کا یہ طالبعلم کوئی معمولی غزل گو شاعر نہیں ہے اور اس کو اصلاح کی مزید ضرورت نہیں ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ علامہ کو فلسفے سے خاص شغف تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی حالت زار نے حضرت علامہ کو اپنی طرز کا واحد شاعر ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں مصلح بنا دیا۔ ان کی شاعری کو بجا طور آمد کی شاعری کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو جگانے میں جتنا کردار ان کی شاعری نے ادا کیا اتنا شاید ہی کسی چیز نے ادا کیا ہو۔ حضرت علامہ اقبال کی شکوہ اور جواب شکوہ، فاطمہ بنت عبداللہ اور نوجوان مسلم سے خطاب ان کی انقلابی شاعری کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

علامہ اقبال کے شعری مجموعے بانگ درا، بال جبریل، ارمغان حجاز کے علاوہ نثر میں علم الاقتصاد مشہور ہیں۔ یہاں علامہ اقبال کا نمائندہ شعر اس لیے پیش نہیں کیا جا رہا ہے کہ وہ ایسے شاعر ہیں جن کے اشعار سے لے کر پورا پورا کلام بچوں سے لے کر بزرگوں تک بڑی اکثریت کو باقاعدہ حفظ ہے۔ علامہ اقبال 21 اپریل 1938ء کو ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھوں میں آزادی کا سپنا جگا کر قید حیات سے آزاد ہوئے اور بادشاہی مسجد لاہور کے پہلو میں آسودۂ خاک ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت

10 اور 11 نومبر 1974ء کی درمیانی رات اس وقت کے رکن قومی اسمبلی احمد رضا قصوری لاہور میں اپنے والد نواب محمد احمد خان قصوری، اپنی والدہ اور خالہ کے ہمراہ شادی کی ایک تقریب میں شرکت کے بعد اپنے گھر جا رہے تھے کہ ایک موڑ پر ان کی گاڑی پر فائرنگ ہوئی۔ ان کے والد شدید زخمی ہوگئے، وہ ان کو لے کر فوراً امریکن کرسچین اسپتال چلے گئے جہاں وہ جانبر نہ ہوسکے اور انتقال کر گئے۔ اس کے فوراً بعد احمد رضا قصوری نے تھانے میں اس کی ایف آئی آر درج کروائی جس میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ملزم نامزد کرتے ہوئے کہا



کہ 3 جون 1974ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں بھٹو نے ان کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں تم سے تنگ آچکا ہوں، تم اپنی زبان بند رکھو، میں تمہاری بکواس مزید برداشت نہیں کروں گا۔''

اس رپورٹ پر حکومت پنجاب نے جسٹس شفیع الرحمان پر مبنی ایک تحقیقاتی ٹریبونل بھی 26 فروری 1975ء کو تشکیل دیا لیکن اس ٹریبونل کی رپورٹ بھی منظر عام پر نہ آسکی، پھر اکتوبر 1975ء میں پنجاب پولیس نے اس کیس

جمہوریت

ایک طرزِ حکومت، یہ اصطلاح ترکی میں اٹھارویں صدی میں عربی لفظ جمہور سے وضع کی گئی جس کے معنی آدمیوں کا مجموعہ ہے۔ مجمع عام یا عام طور پر سارے لوگ مراد لیے جاتے تھا۔ جمہوریت کی اصطلاح پہلی مرتبہ فرانسیسی جمہوریہ کے بارے میں استعمال ہوئی۔

مرسلہ: نادر شاہ۔ کراچی

کو مزید تفتیش کے قابل نہ مانتے ہوئے داخل دفتر کر دیا۔ بعد میں جب جولائی 1977ء میں فوج نے جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں اقتدار سنبھالا تو 3 ستمبر 1977ء کو بھٹو کو اسی مقدمے میں گرفتار کرلیا گیا، لیکن صرف دس ہی دن بعد 13 ستمبر 1977ء پنجاب ہائی کورٹ کے جسٹس ایم کے صمدانی نے بھٹو کو ضمانت پر رہا کر دیا لیکن محض چار ہی دن بعد دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اس کے بعد بھٹو زنداں سے زندہ باہر نہ آسکے۔ 18 مارچ 1978ء ذوالفقار علی بھٹو کو اقبالی ملزمان محمد عباس، ارشد اقبال، غلام عباس اور رانا افتخار کے ہمراہ سزائے موت سنا دی اور مسعود محمود کو سلطانی گواہ بننے کی وجہ سے معاف کر دیا۔

بعد میں اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی جو سپریم کورٹ نے 6 فروری 1979ء کو مسترد کرتے ہوئے سزائے موت کو بحال رکھا، بالآخر 4 اپریل 1979ء کو 54 ممالک کے سربراہان مملکت و حکومت کی اپیلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھٹو کو راولپنڈی کی سینٹرل جیل میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اسی روز صبح ایک سی 130 طیارے کے ذریعے بھٹو کی نعش جیکب آباد لے جائی گئی پھر وہاں سے بذریعہ ہیلی کاپٹر بھٹو کے آبائی قصبے گڑھی خدا بخش پہنچائی گئی اور صبح ساڑھے دس بجے پاکستانی سیاست کا یہ متحرک ترین کردار منوں مٹی تلے جا سویا۔

فارغ بخاری

ہمیں سلیقہ نہ آیا جہاں میں جینے کا
کبھی نہ کیا کوئی کام قرینے کا

11 نومبر 1917ء کو پہاڑوں کے دامن پشاور میں ایک قیمتی نگینے نے اس دنیائے فانی میں قدم رکھا۔ جس کا نام میر احمد شاہ رکھا گیا۔ ترقی پسند ادیبوں کے اس نمائندہ شاعر کا اعتراف تو اوپر والے شعر میں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے جذبات کی عکاسی کے لیے یہ شعر زیادہ موزوں ہے



اب زباں کاٹنے کی رسم نہ ڈال
کہ یہاں لب سلے ہیں پہلے ہی

ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے قافلے کے اس راہی نے شاعری کے علاوہ ادب، افسانہ نگاری، ناول نگاری، تحقیق، صحافت اور کالم نگاری کے شعبے میں فارغ بخاری کے نام سے اپنا ایک منفرد مقام پیدا کیا۔ اردو، پشتو اور ہندکو زبان کے اس شہسوار نے لوک گیتوں کی طرف خاص توجہ رکھی اور ”نویں راہواں“ کے عنوان سے ہندکو شاعری کا مجموعہ دینے کے علاوہ ”سرحد کے لوک گیت“ بھی ترتیب دیے۔ دیگر شعری مجموعوں میں زیروبم، شیشے کا پیراہن، خوشبو کا سفر اور غزلیات کا مجموعہ ”آئینے صداؤں کے“ پیش کیا۔

نثر ادب میں البم کے عنوان سے دو حصوں پر محیط شخصی خاکوں پر مبنی کتاب پیش کی۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی رپورتاژ ”براتِ عاشقاں“ کے عنوان سے۔ خان عبدالغفار خان کی سوانح عمری ”باچا خان“ کے نام سے، ناولوں میں ”بے چہرہ سوال۔ عورت کا گناہ“ اور افسانوں میں ”پیاسے ہاتھ“ معروف کتب ہیں۔

انہوں نے خوشحال خان خٹک پر بھی قابلِ ذکر کام کیا۔ وہ 18 اپریل 1978ء کو اپنی جنم بھومی پشاور میں ہی فوت ہوئے اور وہیں آسودۂ خاک ہیں۔ ان کو حکومتِ پاکستان نے تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا۔ وہ تمام عمر اپنے اس شعر کو حقیقت ثابت کرنے پر تلے رہے

دیکھا تجھے تو آنکھوں نے ایوان سجا لیے
جیسے تمام کھوئے ہوئے خواب پا لیے

دنیا کے دورنے پن اور منافقت کو وہ کس عمدہ طریقے سے اس بند میں بیان کرتے ہیں

جب درد جگر ہوتا ہے تو دوا دیتے ہیں
رک جاتی ہے جب نبض تو دعا دیتے ہیں
کوئی پوچھے تو سہی ان چارہ گروں سے فارغ
جب دل سے دھواں اٹھے تو کیا دیتے ہیں

میر مٹھا خان مری

یوں تو بلوچستان کی سنگلاخ چٹانیں قیمتی معدنی خزانوں سے بھرپور ہیں لیکن ان چٹانوں کے اوپر بسنے والے انسانوں میں بھی ایک سے ایک ہیرا ملتا ہے۔ بلوچستان کی ذخائر سے بھرپور زمین کا ذکر ہو تو ضلع کاہان کے قصبے مری کا ذکر نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں۔ اسی علاقے سے میر مٹھا خان مری بھی ان ہی نادر روزگار افراد میں سے ہیں جنہوں نے بلوچستان کی پتھریلی زمین پر علم و ادب کے پودے کی آبیاری کی۔ وہ اردو اور بلوچی زبان کے ایک ممتاز شاعر، ادیب اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے ماہر لسانیات اور فرہنگ ساز بھی تھے۔ ان کی تالیف کردہ ''بلوچی اردو لغات'' ایک مستند لغت مانی جاتی ہے اور اس نے اردو اور بلوچی زبان کے درمیان فاصلوں کو قربتوں میں بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انہوں نے بلوچی شاعری کو مختلف جہات سے یکجا کرنے کا اہم کام بھی سرانجام دیا۔ جس میں بلوچی زبان کے جدید شعراء اور قدیم شاعری کو یکجا کرنے کا اہم کام بھی شامل ہے۔ شاعری کے علاوہ اہم بلوچ شخصیات پر بھی کام کیا۔ ان کی اکثر تصانیف بلوچی زبان میں ہیں۔ ان کی کتب میں ست توکلی، درگال اقبال، درچین، رحم علی مری، سادہ ئیں زند، ذیکی صوت، تونیں بلوچی شاعری، مہدی بلوچی شاعری، کہنیں بلوچی شاعری اور سوبیلی مست شامل ہیں۔

میر مٹھا خان مری یکم نومبر 1912ء کو قصبہ مری ضلع کاہان بلوچستان میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 14 اپریل 1988ء کو وفات پائی۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے ان کو صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی عطا کیا۔

مولانا دین محمد وفائی

یوں تو سندھ کے ریگزار اپنی پیاس کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس خطے کو دنیا کے سب سے لمبے دریاؤں



میں سے ایک دریائے سندھ سیراب کرتا ہے لیکن سندھ کے جن علاقوں تک اس دریا کی رسائی نہیں ہے وہاں پانی اتنا نایاب ہے کہ وہاں چشمہ تک نہیں پھوٹتا ہے۔ لیکن علم کی پیاس کے سلسلے میں سرزمین سندھ سے پھوٹنے والے علم کے چشمے اپنی مثال آپ ہیں۔ علم کا ایک ایسا ہی چشمہ 4 اپریل 1894ء کو ضلع سکھر کے تعلقہ گڑھی یٰسین کے قریب ایک گاؤں نئی آباد میں جاری ہوا، جس کو کل عالم مولانا دین محمد وفائی کے نام سے جانتا ہے۔ اگرچہ یہ چشمہ 10 اپریل 1950ء کو سکھر کی مٹی میں جا سویا لیکن یہ آج بھی اپنی تصانیف کے ذریعے علم کے پیاسوں کو سیراب کر رہا ہے۔

آپ کے زمانے میں برصغیر پاک و ہند میں تحریکِ خلافت عروج پر تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ جیسا صاحبِ علم اپنے آپ کو اس تحریک سے الگ رکھ سکے لہٰذا آپ نے تحریکِ خلافت میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ ایک معروف صحافی، مورخ، ادیب اور مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ معروف دینی عالم بھی تھے۔ حصولِ علم کے بعد آپ نے سندھ مدرسہ کراچی میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور الوحید، الحزب کے علاوہ توحید سے منسلک رہے۔ انہوں نے الوحید کے تحت سندھ آزاد نمبر بھی شائع کیا جو سندھ کی تاریخ و ثقافت پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کو 1940ء میں قائم ہونے والے سندھی ادبی

مرکزی صالح کا بورڈ کا رکن بھی نامزد کیا گیا۔ اس کے علاوہ آپ سندھی لغت تیار کرنے والی کمیٹی میں بھی شامل رہے۔ قیام پاکستان کے فوری بعد 1949ء میں سندھی درسی کتب کی ازسرِنو تیاری کے لیے جو کمیٹی قائم ہوئی آپ اس کے بھی اہم رکن تھے۔ علم و ادب کے میدان میں سیرت النبی ﷺ اور سیرت صحابہؓ ان کا پسندیدہ موضوع تھے۔ آپ کی معروف تصانیف میں سوانح محمد مصطفیٰ ﷺ، سوانح صدیق اکبرؓ، سیرت عثمان غنیؓ، سیرت حیدر کرارؓ، سوانح خاتون جنتؓ، سوانح غوث اعظم، نومسلم ہندو مہارانیاں، ہندو دھرم، قربانیاں، لطف اللطیف، راحت الروح، مقصد زندگی، تذکرہ مشاہیر سندھ اور رد قادیانی پر الفہم علی المختصر شامل ہیں۔

مولانا ابوالجلال ندوی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ موہنجو داڑو کے مخطوطات کو پڑھا نہیں جاسکا ہے۔ یہ خیال اس لیے صحیح مانا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالجلال ندوی کا کیا ہوا کام بھرپور طریقے سے منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ چریا کوٹ ضلع اعظم گڑھ میں 22 اپریل 1894ء کو تولد ہونے والے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہو کر جمالیہ کالج مدراس میں پرنسپل کی ذمہ داریاں نبھانے والے مولانا ابوالجلال ندوی تحقیق کے میدان کے شہسوار تھے۔ انہوں نے کافی زیادہ تحقیقی کام کیا۔ اردو، انگریزی، فارسی اور عربی زبان کے علاوہ سندھی اور عبرانی زبان میں عبور کی وجہ سے وہ موہنجو داڑو کے مخطوطات کو سمجھنے میں بھی کامیاب ہوئے۔

آپ سیاسی طور پر جمعیت العلماء ہند کے ساتھ کھڑے تھے لیکن آپ نے جو کارہائے نمایاں علم و تحقیق کے میدان میں سرانجام دیے وہ آپ کی اصل شناخت ہے۔ علمی و مذہبی تحقیق میں تقابل ادیان ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ آپ ماہنامہ تکمیل اور ہفت روزہ ملت کراچی کے بانی مدیر بھی رہے۔ زیادہ توجہ تحقیق کے میدان میں رکھی۔ آپ کے مقالات معارف اور دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ان کا زیادہ تر تحقیقی کام کتابی صورت میں محفوظ نہیں کیا جاسکا ورنہ آج موہنجو داڑو کے مخطوطات کے بارے میں تجسس کافی حد تک ختم ہو چکا ہوتا۔

آپ اپنی تحقیق کا بیش بہا خزانہ غیر مطبوعہ حالت میں چھوڑ کر کراچی میں تقریباً 90 سال کی عمر میں 4 اکتوبر 1984ء کو وفات پا گئے ماڈل کالونی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

نازیہ حسن

1980ء کی دہائی میں اردو موسیقی سے شغف رکھنے والے تقریباً ہر فرد کے لبوں پر بھارتی فلم "قربانی" کا یہ نغمہ چہکتا رہتا تھا "آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے"۔ اسی نغمے نے گلوکارہ نازیہ حسن کو ہفتوں اور دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں شہرت کی اُن بلندیوں پر پہنچا دیا جن کا اتنی کم عمری میں کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ 3 اپریل 1965ء کو



کراچی میں پیدا ہونے والی اس کم سن گلوکارہ نے ٹی وی کے پروگرام "سنگ سنگ چلیں" سے اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا، اس پروگرام میں اس کے بھائی زوہیب حسن بھی اس کے ہمراہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔

ان کا گایا ہوا فلم قربانی کا گانا دراصل ان کی فنی زندگی میں ساؤنڈ بیریئر کراس کرنے کی اہمیت رکھتا ہے، اس کی کامیابی کے بعد انہوں نے اپنے بھائی زوہیب حسن کے ہمراہ اپنا البم "ڈسکو دیوانے" ریلیز کیا۔ اس البم نے پاکستان کی پوپ موسیقی میں نئی راہیں متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے باعث پاکستان کی پوپ موسیقی میں جو نکھار آیا وہ شاید ہی کسی البم سے آیا ہو۔ اس کے بعد ان دونوں بہن بھائیوں نے "بوم بوم" اور "ینگ ترنگ" ریلیز کیا جس نے ان کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ اگرچہ ان دونوں بہن بھائیوں کی پرفارمنس پر کچھ حلقوں کی جانب سے اعتراض بھی ہوا لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان اعتراضات کے باوجود انہوں نے فنی کامیابیوں کے سفر کو جاری رکھا۔

فنی میدان میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑنے والی

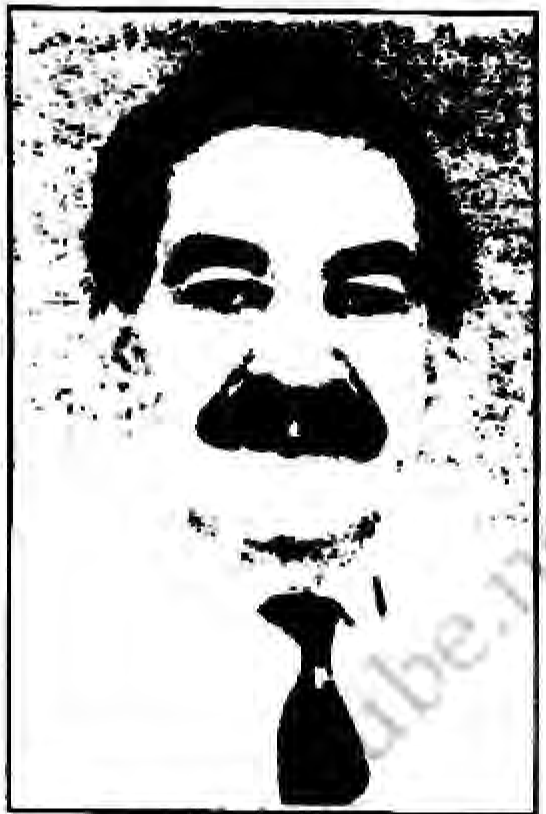
اس معروف گلوکارہ کی ازدواجی زندگی کوئی اچھی مثال پیش نہ کرسکی۔ 1995ء میں معروف کاروباری شخصیت مرزا اشتیاق بیگ سے شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ان کی شوہر سے اختلافات کی خبریں آنا شروع ہوگئیں لیکن بعد میں ان کے سرطان میں مبتلا ہوجانے کی اندوہناک خبر نے ازدواجی اختلافات کی خبروں کو پس پردہ کردیا۔ بالآخر 13 اگست 2000ء کو پاکستانی پوپ موسیقی کا یہ درخشندہ ستارہ لندن میں غروب ہوا اور وہیں نارتھ لندن کے مسلم قبرستان میں سپرد خاک ہوا۔

پروفیسر ڈاکٹر پری شان خٹک

صوبہ خیبر پختونخواہ کی مردم خیزی کا جب بھی ذکر ہوگا یہ ممکن نہیں کہ 10 دسمبر 1922ء کو ضلع کرک نواحی گاؤں غنڈی خیل میں محمد قمی خان کے نام سے پیدا ہونے والی معروف شخصیت جو دنیائے ادب میں پروفیسر ڈاکٹر پری شان خٹک کے نام سے پہچانی جاتی ہے اس کا ذکر نہ ہو۔ انہوں نے پشاور یونیورسٹی سے تاریخ اور پشتو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد وہیں سے بطور لیکچرر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔

براہ راست تعلیم کے میدان میں کامیابی سے فرائض انجام دینے کے بعد وہ پشتو اکیڈمی میں ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہاں علم کے ساتھ ساتھ ان کی انتظامی صلاحیتیں بھی کھل کر سامنے آئیں اور ان کی انتظامی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے ان کو متعدد علمی و تعلیمی اداروں کا سربراہ بھی مقرر کیا گیا۔ وہ 1980ء میں گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد وہ 1986ء میں "اکادمی ادبیات پاکستان Academy of Letter Pakistan" کے چیئرمین مقرر ہوئے تو ان کی ادبی اور انتظامی صلاحیتوں کے مزید پہلو بھی سامنے آئے جس کے بعد ان کو 1989ء میں آزاد جموں وکشمیر یونیورسٹی مظفرآباد کا وائس چانسلر بھی مقرر کیا گیا۔

وہ 50 سے زائد کتب کے مصنف اور مولف تھے۔ ان کی کتاب "پشتون کون؟" اپنے موضوع کے اعتبار سے مستند ترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ انہوں نے شاعری میں غزل گوئی اور نظم میں زیادہ مشق سخن کی لیکن ان کا پسندیدہ میدان پشتو شاعری ہی تھا۔ ان کی معروف کتابوں میں تتاکے، درانہ پختو، لیک دود، پختانہ کوچے، دوزخی پختو،



درانہ پختانہ، خیبر، اعتراف اور عزیزہ وینہ شامل ہیں۔ ان کی کتابیں پاکستان کے علاوہ افغانستان میں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

حکومت پاکستان نے ان کی صلاحیتوں کے اعتراف میں ان کو ستارۂ امتیاز کے علاوہ تمغۂ امتیاز بھی عطا کیا۔ انہوں نے 16 اپریل 2009ء کو اسلام آباد میں وفات پائی اور پشاور کے حیات آباد قبرستان میں مدفون ہوئے۔

منور ظریف

جب بھی پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کا ذکر ہوگا تو یقینا منور ظریف کا نام سرفہرست ہوگا۔ وہ 2 فروری 1940ء کو لاہور کے گنجان آباد علاقے قلعہ گجر سنگھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی ظریف اپنے زمانے کے مزاحیہ اداکاروں میں شامل تھے۔ مگر 1960ء میں ظریف کے انتقال کے بعد ان کی فنی سلطنت کی باگ ڈور منور ظریف نے سنبھالی اور انہوں نے فلم "اونچے محل" سے اپنی اداکاری کا آغاز کیا لیکن اس سے پہلے ان کی دوسری فلم "ڈنڈیاں" ریلیز ہوگئی یوں فلم "ڈنڈیاں" ان کی پہلی فلم ٹھہری۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اردو اور پنجابی فلموں کے معروف ترین مزاحیہ اداکار بن گئے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ ظریف مرحوم کی فنی وراثت منور ظریف نے سنبھالی اور منور ظریف کی فنی میراث ان کے چھوٹے بھائی منیر

ظریف نے سنبھالی اور اپنے دونوں بڑے بھائیوں کی طرف سے جاری کردہ مسکراہٹوں کے سلسلے کو اپنے طور پر مزید دوام بخشا۔

منور ظریف کے 15 سالہ فلمی کیریئر میں ہر سال اوسطاً ان کی 21 فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان کی پہلی سپرہٹ فلم "ہتھ جوڑی" تھی جو 1964ء میں ریلیز ہوئی اس کے بعد وہ اپنی بے مثال جگتوں اور بے ساختہ جملے بازی سے فلموں کی اس حد تک ضرورت بن گئے کہ فلموں کی کہانیاں ان کی شخصیت کو سامنے رکھ کر لکھی جانے لگیں۔ ان کی اور اداکار رنگیلا کی فلمی جوڑی ایسی بنی کہ جس فلم میں یہ دونوں شامل ہوتے کامیابی اس فلم کا مقدر بنتی۔

ان کی مشہور فلموں میں بنارسی ٹھگ، جیرا بلیڈ، نوکر ووہٹی دا، خوشیا، شوکن میلے دی، چکر باز، بدتمیز، دامن



اور چنگاری، داج دا مینوال اور خوشیا شامل ہیں۔ ان کی آخری فلم "لہو دے رشتے" ان کے انتقال کے تقریباً چار سال بعد 1980ء میں ریلیز ہوئی۔ ان کو دو بار نگار ایوارڈ کے علاوہ ایک بار خصوصی نگار ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔
20 اپریل 1976ء کو دنیا میں قہقہے بکھیرنے والا یہ فنکار لاہور میں اس دنیا کو اس چھوڑ کر راہیٔ ملک عدم ہوا۔ وہ لاہور ہی کے قبرستان بی بی پاک دامن میں مدفون ہیں۔

جی ایم سید

یقینی طور پر شاہ عبداللطیف بھٹائی، لال شہباز قلندر اور سچل سرمست وہ ہستیاں ہیں جن کی وجہ سے سندھ کو شناخت ملی لیکن ساتھ ہی بلاشک وتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ جی ایم سید وہ سیاسی شخصیت ہیں جن کو سندھ کی وجہ سے شناخت ملی۔ جی ایم سید کا پورا نام غلام مرتضیٰ سید تھا، وہ 17 جنوری 1904ء کو ضلع دادو کے قصبے "سن" میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کا گھرانا درگاہ پیر حیدر شاہ کے متولین میں



سے ہے اس لیے وہ بھی اس درگاہ کے سجادہ نشین بنے۔

ابھی جب ان کی عمر محض 16 برس تھی انہوں نے سیاسی میدان میں قدم رکھا اور تحریکِ خلافت سے منسلک ہوکر اپنا حصہ بٹانے لگے۔ ان کی سیاسی جدوجہد اور لگن نے ان کو 1937ء میں پہلی دفعہ سندھ اسمبلی تک رسائی دلوائی جس کے فوراً بعد 1938ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ 1942ء میں سر عبداللہ ہارون کے انتقال کے بعد وہ سندھ مسلم لیگ کے صدر بن گئے، اور پھر اسی حیثیت میں انہوں نے سندھ اسمبلی میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کے لیے قرارداد منظور کروائی لیکن اس کے فوراً بعد ہی ان کے مسلم لیگ سے اختلافات پیدا ہوگئے، اور 1946ء میں ان کو مسلم لیگ سے خارج کردیا گیا۔ اور پھر اسی سال انہوں نے پروگریسو مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی انہوں نے حزبِ اختلاف کی سیاست کا آغاز کیا اور جلد ہی خان عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر پاکستان کی پہلی سیاسی جماعت پیپلز پارٹی آف پاکستان قائم کی۔ انہوں نے 1948ء میں کراچی کی سندھ سے علیحدگی اور 1955ء میں ون یونٹ کے خلاف بھرپور تحریک چلائی۔ تحریک کے باعث ان کی قید و بند کی صعوبتوں کا بھی آغاز ہوا۔ اس دوران میں انہوں

نے نیشنل عوامی پارٹی کے قیام میں فعال کردار ادا کیا۔ انہوں نے 1969ء میں سندھ یونائٹڈ فرنٹ قائم کی۔ 1970ء کے انتخابات میں ان کو کامیابی نہ مل سکی۔ جس کے بعد انہوں نے جیے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا تقریباً ایک تہائی حصہ قید میں گزارا۔

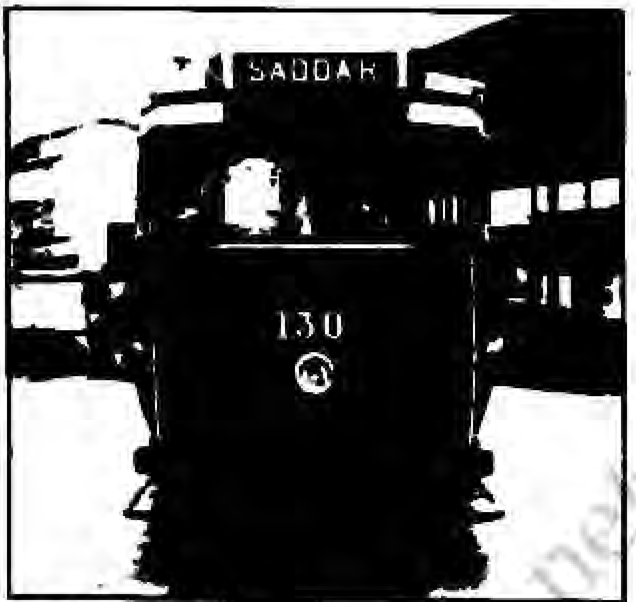
سیاست کے علاوہ ادبی میدان میں بھی ان کا بھرپور کردار رہا۔ انہوں نے تقریباً 60 کتابیں تحریر کیں۔ جن میں ایک نظریاتی رہنما ہونے کے باعث زیادہ تر ان کے سیاسی نظریات پر مبنی ہیں لیکن انہوں نے ادب کے میدان کو بھی خالی نہ چھوڑا اور شاعری اور ادب میں بھی کئی کتابیں پیش کیں۔ ان کی کتابوں کے نام دیارِ دل، محبت، پیغامِ لطیف، پاکستان جو ماضی حال ءِ مستقبل، سندھو جو ءِ چالاءِ، پنجھی کہانی، پنجھی زبانی (خودنوشت) کے علاوہ دیگر کئی کتب شامل ہیں۔

وہ تقریباً 91 سال کی بھرپور سیاسی، نظریاتی اور ادبی زندگی گزارنے کے بعد 25 اپریل 1995ء کو کراچی کے جناح اسپتال میں انتقال کر گئے اور اپنے آبائی قصبے سن میں آسودۂ خاک ہوئے۔

کراچی ٹراموے سروس

20 اپریل 1885ء کراچی کی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ اس دن کراچی میں پہلی بار شہر کے درمیان پٹری پر چلنے والی ٹرام کا آغاز ہوا۔ اس پہلی ٹرام میں اس وقت کے کمشنر کراچی ہنری نیپیئر ارسکن نے سفر کرکے اس کا افتتاح کیا۔ یہ وہی ہنری نیپیئر ارسکن ہیں جن کے نام پر آج بھی کراچی کی ایک مشہور سڑک موجود ہے۔ یہ ابتدائی ٹرام بھاپ کے انجن سے چلا کرتی تھی لیکن اس کے شور اور فضائی آلودگی کے باعث اس کو بند کرکے اس کی جگہ گھوڑے سے چلنے والی ٹرام سروس شروع کی گئی۔ کچھ ہی عرصے بعد اس میں ایک جدت یہ کی گئی کہ دو منزلہ ٹرام سروس بھی شروع کردی گئی۔ یہ دو منزلہ ٹرام بھی گھوڑوں سے ہی کھینچی جاتی تھی۔

20 ویں صدی کے اوائل میں ٹرامیں ڈیزل انجن سے چلنے لگیں اور پھر یوں یہ کراچی میں سفر کی بنیادی سہولت کی حیثیت اختیار کرگئی۔ اُس زمانے میں ٹرام سروس کا ایک باقاعدہ نظام موجود تھا جس کا مرکز صدر دواخانہ (نزد ایمپریس مارکیٹ) میں تھا اور یہاں سے یہ مختلف علاقوں کی طرف نکلا کرتی تھیں۔ ایک روٹ وہاں سے نکل کر گاندھی گارڈن (موجودہ چڑیا گھر) تک جاتا تھا، ایک روٹ بولٹن



مارکیٹ کا تھا اور ایک کینٹ ریلوے اسٹیشن کا۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ ٹرام سروس ایسٹ انڈیا ٹراموے کمپنی کی ملکیت تھی جو کراچی میونسپلٹی کو 500 روپے فی میل سالانہ کے حساب سے ٹرام لائن کی رائلٹی ادا کیا کرتی تھی۔

قیامِ پاکستان کے بعد یہ کمپنی محمد علی نام کے ایک سرمایہ کار نے خرید لی اور اس کا نام محمد علی ٹراموے کمپنی رکھ دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سروس روبہ زوال ہوتی چلی گئی۔ یوں 65 ٹراموں اور 800 سے زائد عملے کے افراد پر مشتمل یہ کمپنی محض 5 ٹراموں تک محدود ہوکر رہ گئی۔ بالآخر 30 اپریل 1975ء کا دن کراچی کی سڑکوں پر ٹرام سروس کے لیے آخری دن ثابت ہوا اور یوں اپنے وقت کی کراچی کی یہ مقبول ترین سفری سہولت اپنے ابتداء کے تقریباً 90 سال بعد تاریخ کے صفحات کا حصہ بن گئی۔

آغا حشر کاشمیری

آج ہمارے پاس محض تفریح یا تعلیم بذریعہ تفریح کے لیے بہت سارے وسائل مثلاً ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ، موبائل فون وغیرہ موجود ہیں لیکن آج سے تقریباً ایک صدی قبل تک اس مقصد کے لیے بہت محدود وسائل تھے اور ان میں اہم ترین ذریعہ تھیٹر یا اسٹیج ڈرامے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے باقی دیگر حصوں کی طرح برصغیر میں بھی ڈراموں کی روایت کافی پرانی ہے۔ گاؤں دیہات کے پتلی تماشہ سے لے کر بڑے شہروں اور قصبات میں تھیٹر اور اسٹیج ڈرامے روز مرہ کی تفریحی سہولیات کا اہم جزو تھے۔ اچھے ڈراما نگار عموماً اپنے سیاسی اور تاریخی واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے ان میں عوامی دلچسپی کے لیے عوامی مزاج کے مطابق کچھ مواد



اپنی طرف سے ڈال کر ایک کامیاب ڈرامے تحریر کرتے۔

19ویں صدی میں اگر ایک طرف برصغیر میں پرانی لوک داستانوں اور مذہبی و تاریخی واقعات پر مبنی ڈرامے پیش کیے جارہے تھے تو دوسری طرف مغرب میں شیکسپیئر اپنے ڈراموں کے ذریعے فن ڈراما میں ایک تاریخ رقم کررہے تھے۔ ایسے میں یکم اپریل 1879ء کو بنارس میں پیدا ہونے والے آغا حشر کاشمیری نے شاعری، ناول نگاری اور افسانہ نگاری کی صلاحیتوں کے ساتھ جب ڈراما نگاری کی طرف توجہ دی تو صحیح معنوں میں برصغیر کے ڈراموں کا انداز ہی بدل دیا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں ایک طرف عبدالحلیم شرر اپنے ناولوں کے ذریعے اردو ادب میں ایک نئی جہت روشناس کروا رہے تھے تو دوسری طرف آغا حشر کاشمیری نے اردو ڈراموں کو نیا رخ دینا شروع کیا۔ آغا صاحب ابتدا میں تو شاعری کی طرف متوجہ تھے لیکن جب ایک بار ان کو 1897ء میں بمبئی میں الفریڈ ناٹک منڈلی نامی تھیٹر کمپنی میں ڈراما دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ان کو اس میں اتنی دلچسپی ہوئی کہ انھوں نے خود ڈراما نویسی کا تہیہ کرلیا، اور پھر وہ اسی الفریڈ ڈراما منڈلی کے ساتھ منسلک ہوگئے۔ اس کے علاوہ وہ نوروجی پری کمپنی اور اردشیر بھائی کمپنی کے لیے بھی ڈراما نگاری کرنے لگے۔ وہ ڈراما نگاری میں اتنے معروف ہوئے کہ ان کو اردو ڈراموں کا شیکسپیئر مانا جانے لگا۔

آغا صاحب کو چونکہ شاعری سے بھی شغف تھا اس لیے ان کے شعری انداز کے مکالموں نے بہت پذیرائی حاصل کی۔ آغا صاحب نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا ترجمہ کرکے بھی ڈرامے تحریر کیے لیکن انگریزی زبان پر بھرپور عبور نہ ہونے کی باعث شیکسپیئر کا اصل ڈراما کہیں رہ جاتا اور آغا صاحب کا ڈراما کہیں اور نکل جاتا، یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان ڈراموں کا مرکزی خیال تو شیکسپیئر کا ہوتا لیکن ڈراما دہ آغا صاحب کا ہی ہوتا۔ آغا حشر کاشمیری نے 30 سے زائد ڈرامے تحریر کیے جن میں ان کا سب سے معرکۃ الآرا ڈراما رستم وسہراب ہے جو آج بھی شہرت کی بلندیوں پر ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مشہور ڈراموں میں شہید ناز، سفید خون، خوبصورت بلا، یہودی لڑکی، آج اور کل، خواب ہستی، آنکھ کا نشہ، عشق وفرض، شیر کی گرج اور انوکھا مہمان شامل ہیں۔

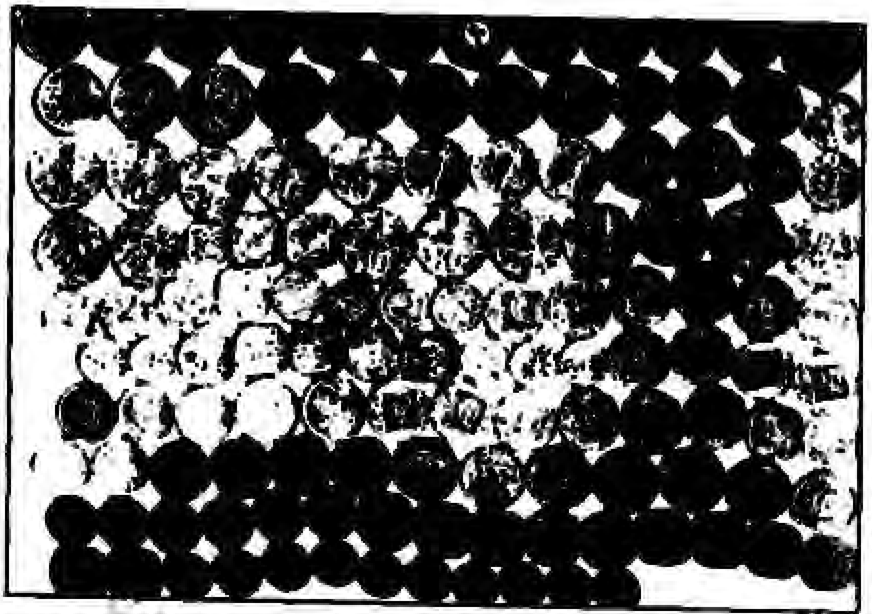
آغا حشر کاشمیری نے 1935ء میں اپریل ہی کے مہینے میں 28 تاریخ کو لاہور میں وفات پائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ آخر میں آغا صاحب کا ایک شعر حاضر ہے جس سے ان کے شعری مزاج کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے:

گو ہوائے گلستاں نے مرے دل کی لاج رکھ لی
وہ نقاب خود اٹھاتے تو کچھ اور بات ہوتی

پاکستانی کرنسی سکے

14 اگست 1947ء کو جب پاکستان وجود میں آیا تو ساتھ ہی مسائل کا ایک سمندر بھی حائل ہوگیا، سب سے اہم اور فوری مسئلہ تو ہندوستان سے ترک وطن کرکے آنے والے لٹے پٹے مسلمانوں کے قافلے تھے جن کی وجہ سے پاکستان کی لنگڑی لولی انتظامیہ کی تمام توجہ اسی طرف مبذول ہوکر رہ گئی۔ تارکین وطن کے اس سیلاب کے علاوہ پاکستان کا فوری مسئلہ یہ بھی تھا کہ پاکستان کی اپنی کرنسی یا سکے موجود نہ تھے۔ ابتدائی طور پر تو ہندوستان میں رائج برطانوی حکومت کے نوٹ اور سکے ہی قبول عام رہے، بعد میں انہی نوٹوں پر حکومت پاکستان تحریر کرکے ان ہی کو پاکستان کی سرکاری کرنسی کا درجہ دے دیا گیا لیکن پاکستانی کرنسی کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔

اس مسئلے کے حل کے لیے حکومت نے پہلی ہی فرصت میں پاکستان کے سکے جاری کیے۔ یکم اپریل 1948ء کو پاکستان کے وزیر خزانہ محمد علی نے سات سکوں کا ایک سیٹ قائد اعظم کو پیش کرکے ان کی ابتدا کی۔ ان میں ایک پائی، آدھا آنہ، ایک آنہ، دو آنہ، پاؤ روپیا (چار آنے)، نصف روپیا (آٹھ آنے) اور ایک روپے کے سکے شامل تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں رائج برطانوی کرنسی پر باقاعدہ طور پر ''حکومتِ پاکستان'' طبع کرواکر ان کو پاکستان کی سرکاری کرنسی کی حیثیت دے دی گئی، یوں 30 جون 1948ء تک پاکستان میں دونوں قسم کے سکے رائج رہے۔ لیکن بعد میں برطانوی



نوٹ بند کر دیے گئے۔ اور بعد ازاں اکتوبر 1948ء میں حکومتِ پاکستان نے اپنے منفرد رنگ اور ڈیزائن کے پانچ، دس اور سو روپے کے کرنسی نوٹ جاری کر کے پاکستانی کرنسی نوٹوں کی ابتدا کر دی۔ مارچ 1949ء میں پاکستان نے ایک اور دو روپے کے کرنسی نوٹ جاری کر کے اپنے کرنسی نوٹوں کی ابتدائی سیریز مکمل کر لی یوں اپریل 1948ء پاکستانی کرنسی کا افتتاحی مہینا ثابت ہوا۔

اسد امانت علی خان

پاکستان کی کلاسیکی موسیقی میں معروف پٹیالہ گھرانے کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ اس گھرانے نے استاد امانت علی خان، فتح علی خان، حامد علی خان، شفقت امانت علی خان اور رستم فتح علی خان کے علاوہ اسد امانت علی خان جیسے معروف اور دل موہ لینے والے گلوکار دیے۔ اسد امانت علی خان استاد امانت علی خان کے صاحبزادے، استاد فتح علی خان اور استاد حامد علی خان کے بھتیجے، استاد شفقت علی خان کے بڑے بھائی تھے۔ نیم کلاسیکی گائیکی کا یہ نمائندہ گلوکار 25 ستمبر 1955ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدا ہی سے اپنے گھرانے میں کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی کا ماحول دیکھ کر یہ اس طرف متوجہ ہوئے۔

یوں تو انہوں نے صرف دس سال کی عمر سے ہی اپنے فن کے جوہر دکھانا شروع کر دیے تھے لیکن اپنے والد استاد امانت علی خان کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے چچا حامد علی خان کی سنگت میں باقاعدہ گائیکی کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے معروف ہم عصر گلوکاروں مثلاً مہدی حسن، استاد غلام علی اور اعجاز حضروی جیسے معروف گلوکاروں کے دور میں متعدد نغمات گا کر اپنی پہچان بنائی۔ ان کے مشہور گیتوں اور غزلوں میں موسم بدلا رت گدرائی، ہونٹوں پہ ان کے کبھی میرا نام بھی آئے، گھر واپس جب آؤ گے تم شامل ہیں لیکن ان کو اصل شہرت انشاء جی کے اُس گیت گانے کے بعد ملی جو دراصل ان کے والد استاد امانت علی خان نے گایا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد اسد امانت علی نے وہ گا کر اپنے آپ کو والد کا صحیح جانشین ثابت کر دیا اور وہ مشہور زمانہ گیت تھا ”انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا“۔ اس کے علاوہ انہوں نے فلموں میں بھی پس پردہ گلوکاری کے جوہر دکھائے۔ انہوں نے جن فلموں میں گلوکاری کی ان میں شمع محبت، سہیلی، انتخاب، زندگی، ابھی تو میں جوان ہوں، آندھی اور طوفان شامل ہیں۔

انہوں نے جب ملی نغمات گائے تو ان کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا اور ان کے گائے ہوئے ملی نغمات بھی عام لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے، اکثر لوگ ان کو گنگناتے ہوئے نظر آتے۔ اسد امانت علی خان کی فنی خدمات کے



اعتراف میں ان کو حکومتِ پاکستان نے 1976ء میں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ اس اعزاز کے فوراً بعد ان کی طبیعت ناساز ہوگئی اور وہ علاج کی غرض سے لندن چلے گئے لیکن پھر وہاں سے زندہ واپس نہ آسکے، وہیں پر 8 اپریل 2007ء کو ان پر دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے اور داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ وہ لاہور کے مومن پورہ قبرستان میں مدفون ہیں۔

مینا کماری و کمال امروہوی کی زندگی پر طائرانہ نظر

مینا کمال

انور فرہاد

مینا کماری اور کمال امروہوی دونوں کا ہی معروف ہستی میں شمار ہے ملکہ درد مینا کماری کا شمار ان اداکاراؤں میں ہوتا ہے جو پردۂ سیمیں پر آتے ہی ناظرین کو اپنے سحر میں گرفتار کرلیتی تھیں۔ غمناک مناظر میں وہ دکھ درد کی تصویر نظر آتی تھیں۔ اداکاری کا ہلکا سا بھی شائبہ نظر نہ آتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود اس درد و الم کا شکار ہوں۔ اداکاری کے وقت غم کی مجسم تصویر بن جاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی بھی غم سے بھری ہوئی تھی۔ انہوں نے غموں سے فرار کی خاطر ہی کمال امروہوی جیسے ادب پرور سے شادی کی تھی۔ اس شادی کے بعد ان پر کیا گزری یہی کچھ اس مختصر سی تحریر میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

چھک چھک......چھک چھک......ریل اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور دوسرے مسافروں سے بے تعلق چندن میاں ریل کی کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر دیکھ رہے تھے مگر دوسرے مسافروں کی طرح وہ ان مناظر سے لطف اندوز نہیں ہو رہے تھے۔ ان کی نگاہیں، ریل کی کھڑکی سے باہر ضرور دیکھ رہی تھیں مگر ان کے دل و دماغ کہیں اور تھے۔ وہ گزرے ہوئے حالات و واقعات کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ بھائی جان کا رویہ ایسا کیوں ہے؟ آخر وہ ایسے کیوں ہیں؟ ان کی طبیعت کی یہ سخت گیری...... اپنے آپ کو جانے وہ کیا سمجھتے ہیں۔ مجھ سے بڑے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ جا و بے جا اس طرح میری تذلیل کریں۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے مگر انہوں نے اس کے بارے میں ذرا نہیں سوچا اور شادی کی بھری تقریب میں متعدد مہمانوں کے سامنے مجھے اس بے دردی سے مارنے لگے جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو۔ میرا قصور بس اتنا ہی تو تھا کہ میں کھاتے وقت قریب بیٹھے ہوئے ہم عمر لڑکے کی کسی بات پر ہنس پڑا تھا۔ ہنسنے سے منہ میں موجود لقمہ ذرا غیر متوازن ہو گیا تھا اور اس کا کچھ حصہ باہر آ گیا تھا۔ اگرچہ میں نے فوراً دوسرے ہاتھ سے اسے سنبھال لیا تھا۔ پھر وہ میرے ساتھ بیٹھے کسی دوسرے آدمی

کے برتن یا اس کے قریب نہیں گرا تھا۔ بس اتنی سی بات پر انہیں غصہ آ گیا۔ ”بد تمیز! نابنجار ..... محفل میں بیٹھنے اور کھانے کے آداب بھی بھلا بیٹھا!“ یہ کہتے ہوئے وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اردگرد کے سارے لوگ متوجہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی کو تو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ موصوف کس بات پر برہم ہو رہے ہیں۔ میں نے شرمندگی سے اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی مگر وہ بھائی جان ہی کیا جن کا غصہ اتنی جلدی ٹھنڈا ہو جائے۔ اٹھے اور مجھے گھسیٹ کر چند قدم کے فاصلے پر لے گئے اور مجھ پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ یہ ظالمانہ اور جابرانہ منظر کچھ لوگوں سے دیکھا نہ گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ظالم و جابر بڑے بھائی کے چنگل سے مظلوم چھوٹے بھائی کو بچایا۔

گزری ہوئی کڑوی کسیلی باتوں کو یاد کرتے ہوئے چندن میاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ بہت پرانا قصہ ہے۔ اب سے کوئی 75 سال پرانا، اس وقت چندن میاں کی عمر 20 سال تھی اور یہ وقوع امروہہ میں پیش آیا تھا۔ امروہہ بھارتی صوبہ اترپردیش کا ایک مشہور شہر ہے۔ امروہہ کو اس لحاظ سے بھی خصوصیت حاصل ہے کہ اردو ادب کے کئی نامور شاعر ادیب یہاں پیدا ہوئے۔ چندن میاں کے والد بھی شاعر تھے۔ ان کا گھرانا ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص روایات اور اصولوں کے لحاظ سے بھی خصوصیت کا حامل تھا۔ چندن اسی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ تین بڑی بہنوں اور ایک بڑے بھائی کے بعد وہ 1914ء میں ادیبوں اور شاعروں کے اسی مسکن امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک تو آنکھوں کو تراوت بخشنے والی ان کی خوب صورتی، اس پر خاندان کا سب سے چھوٹا لاڈلا۔ سب کے لیے چاند سے بڑھ کر تھا، صندل سی مہوبیت کر دینے والی خوشبو جیسا۔ اور پھر وہ اپنے پیار بھرے گھر میں چندن ہی کہلائے جانے لگے۔ چندن میاں کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی مگر ان کے اس سنہرے دور کا دورانیہ بہت مختصر تھا۔ فلک کج رفتار سے ان کی خوشیاں دیکھی نہیں گئیں اور ابھی وہ صرف آٹھ سال کے ہی تھے کہ بے حد شفیق اور چاہنے والے باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ بس یہیں سے ننھے اور معصوم چندن میاں کی زندگی میں غم کے بادل چھانے لگے۔

باپ کے بعد بڑے بھائی کی نگرانی میں ان کی پرورش و پرداخت ہونے لگی۔ بڑا بھائی باپ کے بالکل برعکس تھا۔ پیار محبت اور شفقت کا جذبہ تو جیسے اس میں تھا ہی نہیں۔ بے حد سخت گیر طبیعت کا مالک۔ ذرا ذرا سی بات پر۔ ڈانٹ ڈپٹ، غصہ تو جیسے ناک پر دھرا رہتا تھا۔ بے بات کی بات پر بھی غصہ آ جاتا تھا اور غصہ آتا تو وہ بھوت بن جاتا تھا اور بڑی بے دردی سے دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ چندن میاں جو باپ کی موجودگی میں اپنے آپ کو چاند نگر کا ہی کوئی باشندہ سمجھتے تھے۔ بڑے بھائی کے ظلم و استبداد نے انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ گھر ان کے لیے کسی عذاب گھر سے کم نہیں۔ ان کے ننھے ذہن میں ان باتوں کے نتیجے میں باغیانہ جذبات پرورش پانے لگے۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر اتنی بھی نہ تھی کہ وہ اپنے جذبات کے منفی اثرات سے صحیح معنوں میں واقف نہیں تھے۔ پھر بھی انہوں نے موجودہ تکلیف دہ حالات سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھنے کے لیے اپنی تعلیمی مصروفیات کے علاوہ شاعری کی طرف بھی اپنی طبیعت کو مائل کر لیا۔ یہ ان کے خانوادے کا اثر ہی تھا کہ وہ بہت صغیر سنی میں شعر کہنے لگے تھے مگر جانے کیا بات تھی کہ کسی نے ان کی شاعری کو قابلِ توجہ نہ سمجھا۔

اس زمانے میں امروہہ میں تھیٹر بڑا مقبول تھا۔ تھیٹروں میں عام طور پر تاریخی ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ کمسن چندن میاں کو بھی تھیٹر سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ شاید اس کی وجہ بھی اپنے دل و دماغ کو گھر کے ماحول سے بچانے کے اور پُرسکون رکھنے کے لیے تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو اسٹیج ڈراموں سے ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ انہیں اداکاروں کی گھن گرج اور زوردار مکالمے سن کر بڑا لطف آتا تھا۔ کبھی گھر سے اجازت لے کر ڈراما دیکھنے چلے جاتے اور کبھی بغیر اجازت کے چوری چھپے تھیٹر پہنچ جاتے۔ ڈراموں سے دلچسپی بڑھی تو انہوں نے دو تین بار خود بھی ڈراما اسٹیج کرنے کی کوشش کی مگر ان کی نوعمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کی کوئی بھی کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی۔ وہ جتنا اپنے آپ کو پُرسکون رکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے جس قدر گھر کے کثیف ماحول سے اپنے آپ کو دور رکھنا چاہتے تھے اسی قدر وقت اور حالات ان کے گرد ذہنی پریشانیوں کا دائرہ تنگ کرتے گئے اور پھر ایک دن شادی کی تقریب میں ذرا سی بات پر بڑے بھائی نے ان کا جو تماشا بنایا اس نے چندن میاں کے صبر و ضبط کی ساری بندشیں توڑ دیں۔ وہ آج کا دور نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنے دور اور خاندانی طور طریقے کے

پیش نظر بالکل خاموش رہے اور نہایت خاموشی کے ساتھ بھائی کے ہاتھوں پٹتے رہے۔ پھر جب لوگوں نے بے درد بھائی کے چنگل سے انہیں نجات دلائی تو وہ اس تقریب میں مزید نہیں رکے۔ سیدھے



گھر جا کر اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ اب ان کی آنکھوں سے ان کے دل کا غبار سیلاب بن کر بہہ رہا تھا مگر اس کی وجہ مار کی وہ تکلیف نہیں تھی جس سے ان کا جسم درد سے چٹخا جا رہا تھا بلکہ اپنی بے عزتی کا وہ احساس تھا کہ بھری بزم میں انہیں بے آبرو کیا گیا۔ وہ کوئی نا سمجھ بچہ نہ تھے۔ سولہ سال کی عمر کے باشعور نوجوان تھے۔ بے حد حساس نوجوان، ان سے اپنی یہ بے عزتی برداشت نہ ہو سکی۔ ان کا باغیانہ ذہن رات بھر ان کی حمیت کو للکارتا رہا اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ظلم و استبداد کی یہ آخری رات تھی جو انہوں نے اس چھت کے نیچے بسر کرلی۔ طلوع ہونے والا نیا دن ان کی نئی زندگی کا بھی نیا دن ہوگا۔

اگلے روز وہ چپکے سے اس گھر سے فرار ہو گئے جس میں انہوں نے جنم لیا تھا اور زندگی کے آٹھ سال جب تک باوا جانی حیات تھے، بڑے عیش و آرام میں گزارے تھے مگر اب وہ گھر گھر نہیں رہا تھا۔ ان کے لیے عذاب گھر بن گیا تھا۔ گھر سے جاتے وقت ان کے پاس بس وہ لباس تھا جسے وہ زیب تن کیے ہوئے تھے اور جیب میں تھوڑے سے روپے تھے۔ یہ روپے انہوں نے گھر سے چرائے تھے۔ پہلی بار انہوں نے چوری کی تھی۔ اگر ان کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ اس روز بھی چوری کا یہ مذموم ارتکاب نہ کرتے۔ انہیں گھر سے بھاگنے کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی جو فوری طور پر وہ اسی طرح حاصل کر سکتے تھے۔ اسٹیشن پہنچ کر انہوں نے لاہور کا ٹکٹ خریدا



کمالستان

اور پھر لاہور جانے والی ٹرین پر سوار ہو گئے۔

چھک چھک...... چھک چھک...... ریل اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور سولہ سالہ چندن میاں سوچ رہے تھے۔ لاہور ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ شاید میں وہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لوں۔ اپنی نئی زندگی کی شروعات بہتر طریقے پر کر سکوں۔

لاہور اسٹیشن پر اتر کر چندن میاں نے چاروں طرف دیکھا۔ جائزہ لیا پھر اسٹیشن سے باہر آ کر گھوم پھر کر اندازہ لگایا۔ امروہہ سے یہ شہر بالکل مختلف تھا۔ نئے لوگ، نیا ماحول۔ اس اجنبی شہر میں نہ ان کا کوئی شناسا تھا نہ کوئی ٹھور ٹھکانا، بالی عمریا اور ناتجربہ کاری، پہلی بار گھر سے تنہا سفر کیا تھا۔ وہ بھی اس حال میں کہ ساتھ میں کوئی ساز و سامان تھا نہ جیب میں پیسے تھے۔ اتنا بڑا شہر اور بے سرو سامان ایک کمسن لڑکا۔

ابتدائی دنوں میں چندن میاں جن حالات سے گزرے وہ بڑے آزمائشی تھے۔ کئی بار خیال آیا کہ میں نے اس طرح گھر سے فرار ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے واپس گھر لوٹ جانا چاہیے مگر جب گھر کا خیال آتا تو اس کے ساتھ بھائی جان کے ظالمانہ رویے کی بھی یاد آ جاتی اور وہ واپسی کا خیال ذہن سے جھٹک دیتے۔ یہاں کی تکالیف گوارا، بھوکا پیاسا رہنا قبول، بے گھری اور چھت کی محرومی کا دکھ میں سہہ لوں گا مگر اس عقوبت خانے میں واپس نہیں جاؤں گا۔ وہاں کی بے توقیری اور بے عزتی یہاں کی ساری تکالیف سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ جو اب میں کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

دکھ کے دن بھی بیت جاتے ہیں۔ اگر صبر و استقامت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ لاہور میں تھوڑے دنوں تک دھکے کھانے، بھوکے پیاسے رہنے اور کھلے آسمان کے نیچے رات بسر کرنے کے بعد چندن میاں کو بالآخر ایک اخبار میں ملازمت مل ہی گئی۔

اخبار کے مالک نے انہیں سر سے پیر تک گھور کر دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا نام ہے آپ کا؟"

"سید امیر حیدر کمال امروہوی۔"

"اچھا! تو آپ امروہوی ہیں؟"

"جی ہاں۔"

مالک نے ایک بار پھر انہیں تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کیا کام کریں گے؟"

"لکھنے پڑھنے کا سارا کام۔"

"کیا اس سے پہلے کسی اخبار میں کام کیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کس طرح کریں گے اخباری کام؟"

"آپ کی نگرانی اور رہنمائی میں۔ آپ مجھے آزما کر دیکھ لیجیے۔ اگر آپ کے معیار پر پورا نہ اتروں تو آپ کو اختیار ہے۔"

جہاندیدہ مالک نے دل ہی دل میں کہا۔ "میرے خیال میں تو تم میرے معیار پر ضرور پورا اترو گے۔ تمہارا اعتماد ہی تمہارے عزم وارادے کی عکاسی کررہا ہے۔"

اور کمال امروہوی نے بحیثیت اخبارنویس کام شروع کردیا اور امروہہ کے پہلے اخبارنویس بن گئے۔ امروہہ سے اس زمانے میں کوئی اخبار نہیں نکلتا تھا اور وہاں کے لوگوں نے اب تک صحافت کے کوچے میں قدم رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سید امیر حیدر کمال امروہوی نے اگرچہ پہلے کسی اخبار میں بحیثیت صحافی کام نہیں کیا تھا مگر اس کام میں دلچسپی، محنت اور لگن نے ان کے کام میں وہ نکھار پیدا کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ مستند اور تجربہ کار صحافی تسلیم کیے جانے لگے اور دو سال کی قلیل مدت میں انہیں ایک اخبار کی ایڈیٹری مل گئی۔ اس وقت ان کی عمر صرف اکیس سال تھی۔ اخبار "پھول" کا مدیر بننے کے بعد انہوں نے اپنی مدیرانہ صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کیا اور ان کی ذات سے پھول کی خوشبو دور دور تک پھیلی۔

اب وہ شخص چندن میاں نہیں تھے بلکہ ایک باکمال اور ہنرمند نوجوان تھے جو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو نت نئے رنگ میں ظاہر کررہے تھے۔ شاعری میں وہ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ پہلے ہی کرچکے تھے۔ اخباروں میں کام کرنے کے بعد انہیں اپنی نثرنگاری کا جوہر دکھانے کا بھی موقع ملا تو انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ایک افسانہ "مسافر" لکھا جو ایک مقامی اردو اخبار میں شائع ہوا۔ اگرچہ یہ کمسن کمال امروہوی کا پہلا افسانہ تھا مگر اس نے اردو اور انگریزی کے ممتاز ادیب خواجہ احمد عباس کو بے حد متاثر کیا۔ خواجہ صاحب کو یہ افسانہ اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے اسے انگریزی کے قالب میں منتقل کردیا۔ لاہور کے اردو اخبار میں شائع ہونے والے افسانے کو جتنے لوگوں نے پڑھا تھا اس کا انگریزی ترجمہ اس سے کہیں زیادہ لوگوں کی نظروں سے گزرا اور انہیں متاثر کیا۔ ان متاثر ہونے والوں میں کلکتے کا ایک بنگالی فنکار بھی تھا۔

ہمنسو رائے جو نیو تھیٹرز فرسٹ کمپنی کا منیجر تھا۔ یہ ادارہ ہندوستان میں فلمیں بنانے والے گنے چنے اداروں میں سے ایک تھا۔ ہمنسو رائے کو یہ افسانہ اتنا اچھا لگا کہ وہ اس کے مصنف کے بارے میں سوچنے اور غور وفکر کرنے لگا۔ اس دور کے فلم میکرز اچھی صلاحیتوں کی جستجو میں رہتے تھے۔ انہیں اپنی فلم کے گلدستے کے لیے جو بھی حسین اور رنگین پھول نظر آتا تھا اسے منتخب کرلیتے تھے۔ ہمنسو رائے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس افسانے کا مصنف کون ہے۔ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے۔ بس انہیں تو یہ دھن سوار ہوگئی تھی کہ اس کی صلاحیتوں کو وہ فلموں میں آزمائیں گے۔ اس عزم بالجزم کے بعد یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ وہ اس افسانے کے خالق تک کیسے پہنچیں، کیسے اپنا پیغام اس تک پہنچائیں۔ وہ زمانہ آج کی طرح اتنی سہولتوں کا نہیں تھا مگر ہمنسو رائے کا عزم جوان تھا۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ سب سے پہلے انہوں نے خواجہ احمد عباس سے رابطہ کیا اور ان سے پوچھا۔

"یہ کمال امروہوی کون ہے؟ مجھے اس کا پتا بھیجو۔"

خواجہ احمد عباس نے انہیں جوابی خط کے ذریعے مطلع کیا۔ "مجھے خود پتا نہیں، یہ کمال امروہوی کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ میں نے تو اس کا افسانہ لاہور کے ایک اردو اخبار میں پڑھا تھا۔" اور اس اخبار کا پتا ہمنسو رائے کو ارسال کردیا۔

ہمنسو رائے نے لاہور کے اس اردو اخبار کو خط لکھا اور پوچھا۔ "یہ کمال امروہوی کون ہے۔ جس کا افسانہ "مسافر" آپ کے ہاں گزشتہ دنوں شائع ہوا تھا۔ مجھے اس افسانے کے خالق کا مکمل پتا چاہیے۔"

اخبار کے ایڈیٹر نے سید امیر حیدر کمال امروہوی کے بارے میں لکھا۔ یہ یہاں کے ایک اخبار "پھول" کا ایڈیٹر ہے اور پھول کا پوسٹل ایڈریس یہ ہے۔

اس طرح ہمنسو رائے جیسے کھوجی کو کمال امروہوی کا

پتا معلوم ہوا۔ اس نے ان سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”تم اپنی صلاحیتیں، اخبار کے دفتر میں کیوں ضائع کر رہے ہو، میرے پاس کلکتہ آؤ اور یہاں آکر ہماری فلموں کے لیے اپنے جوہر دکھاؤ۔“



پہلے تو سید امیر حیدر کمال کو یقین نہیں آیا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔ اخبار کی ایڈیٹری ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ صحافت میں ان کا نام اور مقام متعین ہو چکا تھا۔ ”کیا مجھ میں اس کے علاوہ بھی کوئی خوبی ہے؟ کوئی فن ہے؟ کوئی صلاحیت ہے کہ مجھے کلکتے سے بلاوا آیا ہے۔ نیو تھیٹرز جیسی مستند فلم کمپنی کے لیے کام کرنے کی پیش کش کی جا رہی ہے۔ ہمنسو رائے جیسی بڑی فلمی شخصیت مجھے بلا رہی ہے۔“ ذرا دیر کے لیے وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ یہاں اپنی صحافت تو ٹھیک ٹھاک طریقے پر چل رہی ہے۔ فلم کا شعبہ بالکل مختلف ہے۔ کیا وہاں کے ماحول میں، میں ضم ہو سکوں گا؟ وہ بالکل الگ فیلڈ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو اس پوری روٹی کے چکر میں آدھی روٹی بھی چلی جائے مگر اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنا سر جھٹکا۔ یہ میں کیسی باتیں سوچنے لگا۔ ایسی کم حوصلگی کی باتیں تو میں نے امروہہ سے لاہور آتے وقت بھی نہیں سوچی تھیں۔ یہاں آتے وقت تو خود مجھے بھی اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں تھا لیکن مجھ میں صلاحیتیں تھیں جب ہی تو دوسروں نے اس کا اعتراف کیا اور اب بھی دوسرے میری صلاحیتوں پر بھروسا کر کے مجھے بلا رہے ہیں۔ اگر دوسروں کو مجھ پر اعتماد ہے تو میرے اپنے ارادے متزلزل کیوں ہوں؟ ہمت مرداں، مدد خدا۔ یہ اور ایسی ہی باتیں سوچ کر انہوں نے لاہور سے کلکتے جانے کا فیصلہ کر لیا اور جب انہوں نے ”پھول“ کے مالک ممتاز علی خان (والد امتیاز علی تاج) کو بتایا کہ میں کلکتے جا رہا ہوں تو وہ غریب بہت گھبرایا۔ ”کیوں بھائی! مجھ سے کیا قصور ہو گیا؟ کیا خطا ہوئی کہ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو۔“

انہوں نے نیو تھیٹرز کمپنی کی آفر کے بارے میں بتایا۔ ہمنسو رائے کا خط دکھایا اور کہا۔ ”شاید صحافت میری منزل نہیں، مجھے ابھی اور آگے جانا ہے۔ اس لیے قدرت میرے لیے راستہ ہموار کر رہی ہے۔ میں اس سنہری موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔“

”نیا شہر، نئی جگہ، نیا ماحول، نئے لوگ۔“ اخبار کے مالک نے کمسن سید امیر حیدر کمال کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اچھی طرح سوچ لیں۔ کیا وہاں ایڈجسٹ ہو سکیں گے آپ؟ کام کی نوعیت بھی بالکل نئی ہے اور پھر فلم والے یوں بھی ذرا مختلف مزاج کے ہوتے ہیں۔“

”شاہ جی! میں نے دوسروں کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ صرف اپنے بارے میں سوچا ہے۔ اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کیا ہے۔ اس لیے میں کبھی متوقع خدشات سے خوف زدہ نہیں ہوا۔“

اخبار کے مالک کو اندازہ تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے غلط نہیں ہے۔ اس میں اتنا حوصلہ ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ یہ خداداد صلاحیتوں کا حامل ہے۔ فلم کا کام اس کے لیے نیا سہی لیکن اسے بھی وہ یقیناً اسی اعتماد کے ساتھ خوش اسلوبی سے انجام دے گا جس طرح کامیابی کے ساتھ ایڈیٹری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ پھول کے مالک کو سید امیر حیدر کمال امروہوی کے جانے کا

افسوس بھی تھا اور خوشی بھی۔ افسوس اس بات کا کہ وہ ایک باصلاحیت کارکن کی خدمات سے محروم ہو رہا تھا اور خوشی اس بات کی تھی کہ اسے زیادہ ترقی کرنے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا موقع مل رہا ہے۔

لاہور کو خیرباد کہہ کر چندن میاں کلکتے پہنچے اور ہمنسو رائے سے ملے تو اس بنگالی فنکار کو جیسے دھچکا سا لگا۔ ان کے تصورات کا شیش محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ انہوں نے تو ”مسافر“ کے مصنف کے بارے میں سوچا تھا کہ کوئی عمر رسیدہ، تجربہ کار اور خرانٹ قسم کا افسانہ نگار ہوگا مگر ان کے سامنے تو ایک کمسن جوان موجود تھا۔ کیا یہ ان کی توقعات پر پورا اتر سکے گا؟ پھر انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ ”اگر یہ نوجوان مسافر جیسی کہانی تخلیق کر سکتا ہے تو اس میں یقیناً کچھ گن ہیں، خوبیاں ہیں۔“ پھر جب انہوں نے کمسن اور بظاہر ناتجربہ کار کمال امروہوی سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا تو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی عام نوجوان نہیں اس کے اندر بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس نے اس کا انتخاب غلط نہیں کیا ہے۔

”آپ کو فلموں کے بارے میں کوئی تجربہ ہے؟“

”جی ہاں ہے مگر بس فلمیں دیکھنے کی حد تک۔“

ہمنسو رائے مسکرائے۔ کس اعتماد سے جواب دیا ہے اس لڑکے نے۔ انہوں نے سوچا۔ پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ”ہم تم سے فلموں کی کہانیاں اور مکالمے وغیرہ لکھوائیں گے تم لکھ لو گے؟“

”اگر آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے مجھے بلایا ہے تو انشاء اللہ آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ بس ابتدا میں آپ لوگوں کی تھوڑی سی رہنمائی درکار ہوگی۔“

”ہاں ہاں ہم تمہیں بتائیں گے فلموں کی کہانیاں کس طرح لکھی جاتی ہیں۔ اسکرپٹ کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں باضابطہ اسٹوری ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس میں کام کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ یہ سب نامور لکھاری ہیں۔“

”اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی کہ مجھے ایسے لوگوں کی رہنمائی حاصل ہوگی۔“

اور اس نوجوان کا کمال نیو تھیٹرز فلم کمپنی میں آہستہ آہستہ اجاگر ہونے لگا۔ تھیٹر اور اسٹیج ڈراموں سے ان کی دلچسپی پرانی تھی۔ جب وہ امروہہ میں تھے تو نہ صرف ڈرامے بہت ذوق و شوق کے ساتھ دیکھتے تھے بلکہ انہوں نے خود بھی کئی بار ڈراما اسٹیج کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی ناتجربہ کاری اور وسائل کی کمیابی کی وجہ سے انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ فلمسازی، تھیٹرز سے بہت آگے کی چیز تھی۔ انہیں یوں لگا جیسے قدرت نے ان کے اس دیرینہ شوق کی تکمیل کے لیے انہیں اس اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے۔ ماضی کے چندن میاں کی حسرتیں امروہہ میں پوری نہیں ہو سکی تھیں۔ مگر اب یہاں کلکتے میں ان کا کمال انشاء اللہ دنیا ضرور دیکھے گی اور ایسا ہی ہوا، چندن میاں کے اندر فن کا سمندر موجزن تھا۔ انہیں تھوڑی سی رہنمائی ملی تو وہ کہانی اور اسکرپٹ رائٹنگ کے فن میں طاق ہو گئے۔ پھر تھوڑے ہی عرصے میں تین فلموں کے اسکرپٹ لکھ ڈالے۔

ان کی عمر اس وقت صرف انیس برس تھی جب وہ نیو تھیٹرز فرسٹ کمپنی کے لیے تین فلموں ”میں ہاری“، ”اجالا“ اور ”جیلر“ کے اسکرپٹ رائٹر بن چکے تھے۔ نیو تھیٹرز فرسٹ کمپنی کے منیجر ہمنسو رائے بے حد خوش تھے کہ ان کی نگاہ انتخاب نے ایک جوہر قابل کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ انہیں اس بات پر بھی خوشی تھی کہ ایک کمسن لڑکے کے انتخاب پر کمپنی کے جن لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور ان کے فیصلے کو غلط قرار دیا تھا آج وہ لوگ بھی اس نوجوان کی زبردست فنی صلاحیتوں کے معترف تھے اور ان کی جوہر شناس نگاہوں کی بھی تعریف کر رہے تھے۔

چھوٹے سے شہر امروہہ کے چندن میاں، امروہہ سے نکل کر لاہور اور لاہور سے ہو کر کلکتے پہنچے تھے۔ ذہانت و فطانت اللہ نے اسے بھرپور دی تھی اور جان توڑ محنت کرنا اس نے اپنی عادت بنالی تھی۔ یہ لائن اس کے لیے نئی ضرور تھی مگر اسے اس نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ تھوڑی سی رہنمائی اس کے لیے بہت تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنی نمایاں کارکردگی کی وجہ سے کمپنی میں ممتاز مقام حاصل کر چکا تھا۔ اسے اپنی تحریر اور اپنے لکھے پر بے حد اعتماد تھا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے درست لکھا ہے اور فلم کی ڈیمانڈ کے عین مطابق لکھا ہے۔ ایک بار ایک ڈائریکٹر نے اس کی کہانی میں اپنے طور پر کچھ تبدیلی کرنا چاہی لیکن نوجوان رائٹر کمال امروہوی نے صاف انکار کر دیا۔ نہیں جو منظر میں نے لکھا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ آپ اسے اسی طرح فلمائیں گے۔

ہدایت کار ان سے زیادہ سینئر تھا۔ اسے یہ بات بری لگی اس نے کمپنی کے بڑوں سے اس بات کی شکایت کی۔ انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ دونوں کی باتوں کا جائزہ لیا اور

اس نتیجے پر پہنچے کہ سین پرفیکٹ ہے۔ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک ہدایت کار نے ایک بار کہا۔ ''یہ منظر نکال دیجیے۔''

''کیوں! ایسا کیوں کیا جائے؟''

''اس لیے کہ اس منظر کی فلمبندی میں بڑے اخراجات آجائیں گے اگر یہ منظر حذف کردیا جائے گا تو کمپنی اس بوجھ سے بچ جائے گی۔''

یہ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ فلم کا ہیرو جو ذہنی طور پر کچھ کھسکا ہوا تھا طیش میں آکر ڈنڈے مار مار کر بیش قیمت فانوس توڑ دیتا ہے۔

ڈائریکٹر نے کمپنی کے اخراجات بچانے کے لیے تجویز پیش کی تھی مگر کمال امروہوی کو اس تجویز سے مطلق اتفاق نہیں تھا۔ ''آپ صرف اخراجات کو دیکھ رہے ہیں۔ کہانی کی ڈیمانڈ کو نہیں دیکھتے۔ اس منظر میں ہیرو جو توڑ پھوڑ کرتا ہے اس سے تماشائیوں کو اس کے کردار سے بخوبی آگاہی ہوگی۔ اس کی ذہنی حالت کا بھرپور طریقے پر اظہار ہوگا۔ میں اس بات کی کسی کو اجازت نہیں دوں گا کہ اس سین کو فلم میں شامل نہ کیا جائے۔''

یہ مقدمہ بھی کمپنی کے بڑوں کی عدالت میں پیش کیا گیا اور سینئر ڈائریکٹر سے کہا گیا۔ ''بے شک آپ نے یہ مشورہ بڑی نیک نیتی کے ساتھ دیا ہے۔ اس سین کے حذف کردینے سے کمپنی ایک بڑے خرچ سے بچ جائے گی مگر فلم کے جواں سال رائٹر کا موقف بھی غلط نہیں ہے۔ اس منظر کو نکال دینے سے کہانی کمزور ہوجائے گی۔ ہیرو کا کیریکٹر کھل کر شائقین فلم کے سامنے نہیں آئے گا۔ اس طرح فلم کے معیار پر اس کا منفی اثر پڑے گا۔''

اس موقع پر بھی کمال امروہوی کی جرأت اور ہمت کی وجہ سے ان کے موقف کو تسلیم کیا گیا۔ اس منظر کو عکس بند کرنے میں پچاس ہزار روپے کے اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے جو اس زمانے کے لحاظ سے ایک بڑی رقم تھی۔

وقت گزرتا رہا اور کمال امروہوی کا فنی کمال پروان چڑھتا گیا۔ اس کی تحریر میں پختگی آتی گئی۔ ایک کے بعد دوسری کہانی۔ بہتر سے بہتر کارکردگی سامنے آتی گئی۔ کہانی، مکالمے، اسکرین پلے، ہر شعبے میں بڑھ چڑھ کر کارہائے نمایاں پیش کرتا رہا۔ ابھی اس باکمال مصنف نے اپنی عمر کی صرف بائیسویں بہار ہی دیکھی تھی کہ اس کے جادو نگار قلم



مینا ماری اور اشوک

نے ''پکار'' جیسی شاہ کار اور یادگار فلم کی کہانی تخلیق کی۔ یہ نہ صرف اس دور کی بہت بڑی فلم تھی بلکہ برصغیر کی فلمی تاریخ میں اس کو اس کی متعدد خوبیوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ اس زمانے میں سب سے زیادہ دیکھی جانے والی فلم بن گئی تھی۔ اس کے مکالمے بچے بچے کی زبان پر رواں ہوگئے تھے۔

''پکار'' کی فقید المثال کامیابی سے برصغیر میں چندن میاں کی شہرت کا ڈنکا بج گیا۔ فلم انڈسٹری میں بطور فلم رائٹر ان کی حیثیت مضبوط اور مستحکم ہوگئی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس فلم کی نمائش سے پہلے اس کے بارے میں یہ خیال کیا جارہا تھا کہ یہ فلم بری طرح ناکام ہوجائے گی اس کے لیے عوامی مقبولیت حاصل کرنا دشوار ہوگا۔ یہ عام لوگوں کا خیال نہیں تھا۔ اس دور کے نامور اداکار سہراب مودی نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا۔ یہ فلم بری طرح پٹ جائے گی۔ وہ تجربہ کار لوگ تھے اور انہوں نے اس خیال سے یہ بات کہی تھی کہ اس زمانے میں عام طور پر جیسی فلمیں بنائی جارہی تھیں۔ پکار ان سے بالکل مختلف اور ہٹ کر تھی۔ اس دور کی فلموں میں مکالموں سے لے کر نام تک فلموں میں دکھائی جانے والی تہذیب، لباس اور بول چال میں بھارتی کلچر کی چھاپ ہوتی تھی۔ کرداروں کی بول چال ہی نہیں، فلم کی ابتدا میں جو کاسٹ اور کریڈٹ کی فہرست دکھائی جاتی تھی وہ ہندی میں پیش کی جاتی تھی۔ ایسے ماحول میں ایسی فلم پیش کرنا جس میں یہ سب کچھ یکسر نہ ہو بلکہ جس میں ایک مسلم حکمران کا دور حکومت دکھایا گیا ہو جس فلم کے کردار پرشکوہ اردو بول رہے ہوں، حتیٰ کہ فلم کا تعارف بھی اردو میں لکھے دکھائے جائیں۔ فلمی پنڈتوں کا خیال تھا کہ اس انداز میں پیش کی جانے والی فلم مالی لحاظ سے خودکشی کرنے کے

مترادف ہے۔

فلمی پنڈتوں کی ساری پیش گوئیاں غلط ثابت ہوئیں۔ "پکار" ہٹ ہی نہیں سپر ڈپر ہٹ ثابت ہوئی۔ کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا سکھ، کیا عیسائی سب نے اسے پسند کیا اور بار بار دیکھا۔ بلکہ ان لوگوں نے بھی بطورِ خاص دیکھا جو فلم کبھی کبھار ہی دیکھتے تھے یا دیکھتے ہی نہیں تھے۔ سینما گھروں کے تمام شو فل ہوتے، بہت سے لوگوں کو سینماؤں سے مایوس لوٹنا پڑتا اور وہ دوسری تیسری بار ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے۔

اس فلم کی کہانی عدلِ جہانگیری کے گرد گھومتی تھی۔ کمال امروہوی نے کہانی کے پیش نظر کرداروں کی بول چال مغلوں کے انداز میں تحریر کی تھی۔ مغل شہنشاہوں کے دربار میں جو تہذیب، معاشرہ اور آدابِ شاہی ملحوظ رکھے جاتے تھے، کمال امروہوی نے ان کی بڑی سچی اور اچھی عکاسی کی تھی۔ نوجوان تماشائی اس فلم سے اتنے متاثر ہوئے کہ مغلوں کی بولی بولنے لگے۔ "باادب باملاحظہ ہوشیار...... نگاہ روبرو...... ظلِ سبحانی، شہنشاہ دوراں تشریف لاتے ہیں۔"

"پکار" کی مقبولیت کے نتیجے میں ہر جملہ بچے بچے کی زبان پر آگیا تھا۔ یہ جملہ اس قدر مقبول ہوا کہ آج تک فلموں اور ڈراموں میں کسی بادشاہ کی آمد سے قبل استعمال کیا جاتا ہے مگر بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ اس جملے کے خالق کون ہیں۔

"پکار" میں اردو زبان کو اس طمطراق کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ اس سے متاثر ہو کر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی یہ فلم دیکھی۔ انہیں بھی یہ فلم بہت اچھی لگی۔ بہت پسند آئی۔ خاص طور پر اس میں جس شستہ و شگفتہ زبان کا استعمال کیا گیا تھا اس سے بابائے اردو بہت متاثر ہوئے اور اظہارِ پسندیدگی کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی مصنف نے تو کمال کردیا۔"

اس پر انہیں بتایا گیا۔ "کمال کی بات تو یہ ہے کہ اس فلم کی کہانی اور اس کے مکالمے لکھنے والا لکھاری ایک بیس بائیس سال کا نوجوان ہے۔"

یہ جان کر بابائے اردو مولوی عبدالحق کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ نواب صاحب آف بھوپال نے "پکار" دیکھ کر چندن میاں سے پوچھا۔ "کمال صاحب! آپ نے اتنی شاندار اور پرشکوہ اردو کیسے لکھ ڈالی؟"

جواں فکر قلم کار نے فخریہ جواب دیا۔ "یہ زبان میرے گھر میں بولی جاتی ہے۔ میرے دادا حضرت نصیر امروہوی اسی اردو میں بات چیت کرتے تھے۔ درحقیقت انہی کی شخصیت سے متاثر ہو کر جہانگیر جیسے عظیم بادشاہ پر کہانی لکھ ڈالی۔"

صاحبِ طرز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے بھی بڑے شوق سے پکار دیکھی تھی۔ انہیں اپنی زبان دانی پر بڑا اعتماد تھا اور ان کا کہنا تھا کہ میری تحریر پر صرف شاہد احمد دہلوی قلم چلا سکتے ہیں۔ میں کسی اور کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ منٹو نے پکار دیکھ کر اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "مصنف نے جو زبان لکھی ہے وہ واقعی کمال کی ہے۔ یہ صرف شاہی گھرانوں ہی میں استعمال ہوتی ہے۔"

"پکار" کے بعد انہوں نے اپنے وقت کی شہرہ آفاق فلم "مغلِ اعظم" کا اسکرین پلے تحریر کیا۔ اس فلم کی کاسٹ اور کریڈٹ کی فہرست میں اس کا نام محض اسکرین پلے رائٹر کی حیثیت سے دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اتنی شہرت کے باوجود کے آصف نے ان سے صرف منظر نامہ ہی کیوں لکھوایا؟ شاہی درباروں سے متعلق اتنے پرشکوہ مکالمے لکھنے والے مصنف کمال امروہوی کی خدمات کہانی اور مکالمے کے ضمن میں کیوں حاصل نہیں کی؟ یہ الجھن کمال امروہوی کے ایک خصوصی انٹرویو سے دور ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے۔ "مغلِ اعظم" کی کہانی اور مکالمے بھی میں نے لکھے ہیں۔"

"پھر اس کی تعارفی فہرست میں آپ کا نام بطور اسٹوری اور ڈائیلاگ رائٹر کے کیوں نہیں ہے؟" اس سوال کا جواب دیتے ہوئے بولے۔ "اس کی وجہ، آصف سے اختلاف ہے۔ کسی بات پر ہم دونوں میں ٹھن گئی۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں پروڈیوسرز کی انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی نہیں ہوں۔ اپنا کام میں اپنی مرضی سے کرتا ہوں۔ اگر میرے معاملات میں کوئی کسی طرح کی بھی مداخلت کرتا ہے تو میں ٹوک دیتا ہوں۔ آصف صاحب کو بھی میری ایسی ہی کوئی بات بری لگی ہوگی۔ اس کا غصہ انہوں نے اس طرح نکالا کہ وجاہت مرزا اور کچھ دیگر رائٹرز کے نام دے دیے۔ فلم کی تکمیل میں چونکہ غیر معمولی تاخیر ہوئی کم و بیش بارہ برس لگ گئے۔ فلم ریلیز ہونے پر یہ عقدہ کھلا۔ اس لیے کیا کیا جا سکتا تھا۔"

"مغلِ اعظم" کی تکمیل میں بارہ برس لگ گئے۔ یہ

مدت خاصی طویل ہے۔ اس عرصے میں چندن میاں المعروف کمال امروہوی کا فلمی سفر بڑی تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔

اپنی صغیر سنی کے باوجود انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر ایسے دکھائے کہ پورے ملک میں ان کی دھوم مچ گئی اور بمبئی جو فلمی دنیا میں راجدھانی کی حیثیت رکھتا ہے وہاں والے ایسے انمول ہیرے کو بھلا کلکتے میں رہنے کیوں دیتے۔ وہ انہیں اس کلیدی فلمی مرکز میں لے آئے۔ بڑی جگہ، بڑی ترقی کرنے کے بڑے اسکوپ ہوتے ہیں۔ بمبئی آکر کمال امروہوی کے کمال فن کو نکھرنے اور سنورنے کا مزید بہتر موقع ملا۔ انہوں نے جلد ہی یہاں بھی اپنی دھاک بٹھالی۔ کہانیاں، مکالمے اور اسکرین پلے لکھنے میں جب ان کی صلاحیتوں کا سکہ بیٹھ گیا تو انہوں نے خود فلمیں بنانے اور انہیں ڈائریکٹ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اچھے لکھاریوں کو عام طور پر یہ خیال اس وقت آتا ہے جب ان کی تحریروں کو ان کے فکروفن کے اعتبار سے فلمساز و ہدایت کار اسکرین پر پیش نہیں کرتے۔ کمزور حیثیت کے مصنف تو فلم ساز و ہدایت کار کی ایسی زیادتیاں سہہ جاتے ہیں مگر جن میں کچھ دم خم ہوتا ہے۔ وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتے۔ اپنی فنی صلاحیتوں کے مظاہرے کے لیے خود میدان میں اتر آتے ہیں۔ ان کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا۔ کمال امروہوی نے بھی اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے لیے فلم سازی اور ہدایت کاری کی اہم ذمہ داری سنبھال لی اور بیرم خان، شاہ جہاں، دائرہ، پھول، محل، پاکیزہ اور رضیہ سلطان جیسی فلمیں بنا کر اس میدان میں بھی اپنا سکہ جمالیا۔ فنی لحاظ سے ان کی ساری فلمیں شاندار اور قابلِ ذکر ہیں۔ دائرہ کو برصغیر کی پہلی آرٹ فلم کا درجہ دیا گیا۔ جب کہ محل اور پاکیزہ نے عوامی مقبولیت میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا اور ان فلموں نے ان کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی مالی منفعت میں بھی خوشگوار اضافہ کیا۔ جب کہ دیگر فلمیں مالی طور پر کامیاب ثابت نہیں ہوئیں۔ خاص طور پر بیرم خان، شاہ جہاں اور رضیہ سلطان وغیرہ کو ان کی توقعات کے مطابق عوامی پذیرائی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ فلمیں کمال امروہوی نے پکار کی زبردست کامیابی سے متاثر ہوکر بنائی تھیں۔ ہندوستان میں تماشائیوں کی اکثریت تھی۔ انہیں اسلامی تاریخ اور شہنشاہوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے ان

"مینا کماری نے 77 فلموں میں کام کیا اور ان سب میں مینا کماری کی وہی عظیم شخصیت نمایاں ہے جو فلم اسٹاروں میں اشوک کمار کی ہے۔" کیدار شرما۔

"مینا کماری سلولائیڈ میں روح پھونک دینے والی اداکارہ تھی۔" برجیشور مدن۔

"مینا کماری کیوں مرنے لگی۔ میں نے بیجو باورا، شاردا، پرنیتا، صاحب بی بی غلام، دل اپنا پریت پرائی اور پاکیزہ دیکھی ہے۔ جب تک یہ فلمیں زندہ ہیں وہ کیسے مرسکتی ہے۔" ڈاکٹر راہی معصوم رضا۔

"میں سمجھتی ہوں کہ مینا کے فن پر تنقید کرتے وقت یقیناً اچھے اچھے فلمی نقادوں کی زبان سوکھنے لگتی ہوگی۔ شاید اسی لیے تنقید نگار اپنے فکر کی کم مائیگی کو قابلیت کے بھرم میں چھپانے کے لیے مینا کی ذاتی کمزوریوں کا سہارا لیتے رہے۔" شریمتی کرشنا گوتم۔

☆☆☆

"فلم اسٹاروں کے بارے میں لینن کا قول ہے کہ یہ لوگ لافانی ہیں۔ انہیں فانی پیمانوں سے مت ناپو۔ میرا خیال ہے کہ عظیم فنکاروں کے بارے میں لینن سے بہتر بات میں نہیں کہہ سکوں گا۔ ہاں مینا صاحبہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے میں لینن ہی کے الفاظ دہرا سکتا ہوں۔" اداکار اجیت۔

فلموں میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ ان فلموں کے ساتھ وہی ہوا جو فلمی شخصیتوں نے پکار کی نمائش سے پہلے پیش گوئی کی تھی۔ مگر پکار نے ان پیش گوئیوں کے باوجود اس لیے فقیدالمثال کامیابی حاصل کی کہ اس وقت یہ ایک نیا تجربہ تھی۔ ایک تبدیلی تھی۔ تماشائی جب عام ڈگر سے ہٹی ہوئی کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اس پر خصوصی طور سے متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ بات کمال امروہوی شاید فراموش کر گئے تھے۔ اس لیے مار کھا گئے۔ اب ان فلموں نے عکس مکرر ہونے کی وجہ سے عوام کو متاثر نہیں کیا۔

کمال امروہوی نے جہاں متعدد فلمی کہانیاں لکھیں اور فلم کا مکمل اسکرپٹ تیار کیا وہاں انہوں نے اپنی فلموں کے لیے خصوصی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ کہانیاں تخلیق کیں۔ اس سلسلے میں دائرہ، محل اور پاکیزہ کی کہانیاں قابلِ ذکر ہیں۔ دائرہ نے اپنی کہانی کی وجہ سے پہلی بھارتی آرٹ فلم

ہونے کا اعزاز حاصل کیا جب کہ محل اپنی ہسٹری اور تجسس کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت کی کہانی تھی۔ اس کہانی کو برصغیر میں کئی بار کئی فلم والوں نے مختلف تبدیلیوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس فلم میں پہلی بار مدھوبالا کو کسی فلمساز و ہدایت کار نے اتنے موثر انداز میں اسکرین پر پیش کیا کہ اس کی دھوم مچ گئی۔ محل سے پہلے مدھوبالا چند نا کام فلموں میں کام کر چکی تھی اور فلم انڈسٹری میں اس کی شناخت بھی نہیں ہوئی تھی۔ کمال امروہوی نے اس کا لافانی حسن دیکھا تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے اور اسے پیش نظر رکھ کر محل کی کہانی تخلیق کی جس نے اس فلم ہی کو نہیں مدھوبالا کو بھی امر بنا دیا۔

پاکیزہ بھی ان کی ایک ایسی ہی کہانی پر بنائی گئی تھی جو ایک خاص انداز، موڈ اور مزاج کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی اور اس کے لیے ان کی نگاہ انتخاب نے مینا کماری کو پرفیکٹ اداکارہ سمجھا تھا اور ان کی یہ سوچ یہ فکر واقعی درست تھی سو فیصد درست تھی۔ مینا کماری نے پاکیزہ کی صاحب جان کے کردار میں ایسی لافانی اداکاری کی جو کوئی دوسری اداکارہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس فلم کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ مینا کی فلمی زندگی کی سب سے بڑی فلم تھی اور کمال امروہوی کا کمال بھی اس فلم پر آ کر ختم ہو گیا تھا۔ اس فلم کی تکمیل میں بڑی رکاوٹیں پیش آئیں۔ بڑی دشواریاں دیوار بنیں۔ بڑے نازک موڑ آئے ایسے موڑ جنہوں نے کمال اور مینا کے درمیان بہت فاصلہ پیدا کر دیا۔ فلم کی تکمیل میں تاخیر پر تاخیر ہوتی رہی۔ حالات اس نہج پر آ گئے کہ اس فلم کا مکمل ہونا ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ کمال امروہوی جو مغل اعظم کے بارہ برسوں کے بعد بننے پر اسے بہت طویل عرصہ قرار دے رہے تھے اور اس بات کا ذکر اچھے انداز میں نہیں کرتے تھے۔ حالات و واقعات نے ان کے راستے میں ایسے روڑے اٹکائے کہ انہیں اپنی فلم کی تکمیل میں سولہ سال لگ گئے۔ پاکیزہ کی شوٹنگ کا بڑا حصہ مکمل کر لیا گیا تھا۔ فلم پر اب تک چالیس لاکھ روپے خرچ کیے جا چکے تھے۔ (جو اس دور کے لحاظ سے خاصی بڑی رقم تھی) کہ مینا کماری اور کمال امروہوی کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اتنے کشیدہ اور اس قدر خراب کہ مینا نے کمال امروہوی سے علیحدگی اختیار کر لی اور ان سے ہر طرح کے تعلقات قطع کر لیے اور پھر بیماری نے انہیں روز بروز موت سے قریب سے قریب تر کرنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر کئی لوگوں نے کمال امروہوی کو کئی طرح کے مشورے دیے۔ ''تم تو خود ہی اس فلم کے مصنف بھی ہو۔ کہانی میں کوئی ایسا موڑ لاؤ کہ اب مینا کماری کے بغیر فلم مکمل ہو جائے۔''

''مینا کماری کی کوئی ڈپلی کیٹ تلاش کر لو۔''

یہ اور ایسے کئی مشورے، دینے والوں نے دیے، مگر کمال امروہوی کا جواب سب کے لیے ایک ہی ہوتا۔ فلم مینا کماری کے بغیر مکمل نہیں کی جا سکتی۔ کہانی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کوئی دوسرا اس کی جگہ کام نہیں کر سکتا۔ چاہے فلم بنے یا نامکمل رہ جائے۔

کمال کو جاننے والے لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنے ارادہ کا کتنا پکا ہے۔ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ وہ حالات سے سمجھوتا نہیں کر سکتا۔ وقت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ حالات روز بروز سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے تھے۔ مینا کی صحت بڑی تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ حالات کی ماری تو وہ ابتدا ہی سے تھی۔ ہر دور میں دکھ جھیلتی رہی تھی مگر کمال امروہوی سے علیحدگی کے بعد تو جیسے وہ بکھرتی جا رہی تھی، ٹوٹتی جا رہی تھی۔ ایسے میں کچھ لوگوں نے کمال امروہوی کا حوالہ دیے بغیر اس سے یہ کہنا شروع کیا کہ پاکیزہ مکمل کروا دو۔

''کیا کمال نے تم سے کہا ہے؟''

''نہیں، وہ کیا کہیں گے۔ وہ تو خود انا کی سولی پر لٹکے ہوئے ہیں۔ ہم سے ان کی یہ بے بسی نہیں دیکھی جاتی۔ اب تک کوئی چالیس لاکھ کا سرمایہ لگ چکا ہے۔''

''اگر انہیں اس 40 لاکھ کا غم ہوتا تو کم از کم مجھ سے تو آ کر کہتے۔''

''انہیں اس پیسے کا غم نہیں۔ اس بات کا دکھ ہے کہ یہ فلم جو تم دونوں کی فلمی کیریئر کی سنگ میل ہے یہ مکمل نہیں ہوگی تو ان کا اور تمہارا فن ادھورا رہ جائے گا۔ زندگی بھر کا کیا کرایا ضائع ہو جائے گا۔''

مینا کچھ دیر تک کھانستی رہی پھر خاموش ہو کر کچھ سوچتی رہی۔ پھر پیامبر سے بولی۔ ''اچھا جاؤ..... ان سے کہہ دو شوٹنگ کی تیاریاں کریں۔ میں آ جاؤں گی۔''

کمال کے حمایتی گئے تو اس کی بہنوں (خورشید آپا اور مدھو) نے کہا۔ ''مینو! یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ اس حال میں تم شوٹنگ کرو گی؟''

''ہاں۔'' مینا نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ پاکیزہ کو واقعی مکمل ہو جانا چاہیے۔'' پھر لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ ''جاتے جاتے کوئی نیک کام کرتا

چاہتی ہوں تو تم لوگ مجھے کیوں روک رہی ہو؟"

مینا کماری ایک بلند پایہ فنکارہ ہی نہیں بلکہ ایک بلند کردار کی خاتون بھی تھی۔ کمال امروہوی سے گھریلو تعلقات کی انتہائی کشیدگی کے باوجود اس نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ کمال کو کسی قسم کا نقصان اس کی ذات سے پہنچے۔ بس یہی جذبہ تھا کہ ہر چیز کے باوجود وہ پاکیزہ کو مکمل کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

شوٹنگ کے لیے آنے والی مینا کماری کو دیکھنے والے اس سوچ اور فکر میں مبتلا تھے کہ آنے کو تو یہ محترمہ آ گئی ہیں مگر کیا ان سے تیز روشنی کی زد میں اداکاری ہو سکے گی۔ لیکن مینا شاید یہ عزم و ارادہ کر کے آئی تھی کہ پاکیزہ کو مکمل کرانے تک وہ اپنی سانسوں کو سنبھال کر رکھے گی۔ اگر موت کا فرشتہ سامنے آ کر کھڑا بھی ہو گیا تو اس سے کہے گی۔ "ابھی چلتی ہوں، ذرا پاکیزہ مکمل کرا لوں تو چلوں۔"

جن دنوں پاکیزہ کی آخری عکس بندی ہو رہی تھی۔ مینا کماری کا یہ عالم تھا کہ اسے اکثر خون کی الٹیاں ہو جاتیں۔ کچھ دیر تک وہ نڈھال رہتی پھر اپنی توانائیاں مجتمع کر کے دوبارہ شاٹ دینے کے لیے تیار ہو جاتی۔ شراب اس کے لیے بند تھی۔

باخبر لوگوں کو تو اس بات کی بھی خبر تھی کہ محل پکچرز کی فلم پاکیزہ میں لگنے والے چالیس لاکھ روپے کا بڑا حصہ مینا کماری کا ذاتی سرمایہ تھا۔ وہ اس دور میں پانچ لاکھ روپے معاوضہ لینے والی اداکارہ تھی۔ اس کی ساری آمدنی کمال امروہوی اپنے پاس رکھتے تھے اور محل پکچرز کے اکاؤنٹ سے انہیں ماہانہ صرف سو روپے جیب خرچ دیا جاتا تھا۔ شوہر سے بے پناہ محبت کرنے والی صابر و شاکر مینا کماری نے کبھی اس بات کی شکایت نہیں کی۔ نہ کبھی اس بات پر توجہ دی کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے وہ غلط ہے۔ اسے اپنی آمدنی اپنے پاس اپنے اکاؤنٹ میں رکھنی چاہیے۔ اس کا اندازہ اسے اس وقت ہوا جب کمال امروہوی سے انتہائی کشیدگی کے بعد اسے 5 مارچ 1964ء کو کمال امروہوی کا گھر چھوڑنا پڑا۔ اس وقت وہ بالکل تہی دست تھی۔ اس کے پاس نہ کوئی جمع پونجی تھی نہ اس کا کوئی گھر۔ اسے فوری طور پر اپنی چھوٹی بہن مدھو کے گھر میں پناہ لینی پڑی۔ جہاں مدھو کے شوہر محمود اور اس کے گھر والوں نے اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جو دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کے کمرے سے بجلی کی لائن کاٹ دی جاتی، اس کا ایئر کنڈیشنڈ خراب کر دیا جاتا یا اور ایسے ہی متعدد طریقوں سے غم کی ماری کے غم میں اور اضافہ کیا جاتا۔

مجھے مینا کماری سے ملنے کے اکثر مواقع ملے۔ خصوصاً جب میں نے بہو بیگم شروع کی۔ مینا کماری اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان سے ملنے، باتیں کرنے، قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا بہتر موقع ملا۔ مینا کی شخصیت بہت متین، سنجیدہ اور بردبار تھی۔ ان کے انداز میں سادگی اور معصومیت تھی۔ البتہ ان کی گفتگو ان کی ذہانت کا آئینہ تھی لیکن ان سے ملنے پر یہ اثر دل پر مرتب ہوتا تھا کہ ان کی روح کی گہری تہوں میں ایک بیکراں درد، ایک گہری تشنگی ہے جو ان کی پاکیزہ مسکراہٹوں کے چھپائے بھی نہیں چھپ پاتی تھی۔ بلکہ ان کی مسکراہٹیں اس احساس کو اور شدید بنا دیتی تھیں۔ غالباً یہی روح کی تشنگی تھی جس نے کسی کمزور لمحے میں ان کو بری طرح ڈگمگا دیا۔

☆☆☆

ایک دن بہو بیگم کی شوٹنگ کے لیے مینا کماری آئیں تو ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور وہ ٹھیک سے کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ صادق بابو نے جو میری اس فلم کے ڈائریکٹر تھے میری اجازت سے شوٹنگ کینسل کر دی۔ میک اپ روم میں بابو جی نے ہمدردی کے چند ہی الفاظ کہے ہوں گے کہ مینا بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ یہ ایسا دردناک منظر تھا جو میں کوشش کے باوجود آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مینا ایسی دکھی ہستی تھیں جو اداکاری میں دوسروں کے دکھ سکھ کو اپنے میں سمو کر خود کو بالکل بھول جانا چاہتی تھیں اور غالباً اس چیز نے ان کو ایک عظیم اداکارہ بنا دیا تھا۔

جاں نثار اختر

لہٰذا مینا کماری محمود کا گھر چھوڑ کر جانکی چالی چلی گئی۔ اگرچہ وقت اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ محمود، مینا اور کمال میں صلح کرا دیتا۔ ان کی کشیدگی اور رنجش ختم کرا دیتا مگر اس نے مینا کو اپنے گھر پناہ دینے کے بعد کبھی اس مسئلے میں دلچسپی نہیں لی۔

مینا کماری کی بڑی بہن خورشید آپا کا بیان ہے کہ جب بھی پاکیزہ کی تکمیل کے بارے میں مینا سے گفتگو ہوتی وہ یہی کہتی۔ "آپا میں پاکیزہ کی شوٹنگ مکمل کروانے کے بعد زندہ نہیں رہوں گی۔ تم اسے لکھ لو اور اگر زندہ رہی بھی تو ہر حالت میں کمال سے طلاق لے لوں گی۔"

پاکیزہ کی تکمیل کے دوران میں ایک بار ایک صحافی سے، مینا نے کہا تھا۔ ”کل ہی تو پہاڑی سے بھاگنے کا ایک سین مجھ پر 28 بار فلمائے گئے۔ کمال کو کوئی شاٹ پسند ہی نہیں آتا تھا۔ ہر بار وہ یہی کہتے تھے۔ کچھ مزہ نہیں آیا۔ ذرا اور بہتر طریقے پر کوشش کرو۔ جب میں آخری بار نڈھال ہو کر گر پڑی تو میں نے روتے ہوئے ان سے کہا۔ ”کمال! کیا تم اس طرح پاکیزہ مکمل کرلو گے؟“

یہ لکھتے ہوئے اس صحافی نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔ ”یوں لگتا ہے جیسے مینا کماری کو پاکیزہ کی قربان گاہ پر جان بوجھ کر قربان کردیا گیا ہو۔“

”پاکیزہ“ مکمل ہوگئی اور مینا کماری اس دکھ بھری دنیا سے بے درد اور بے وفاؤں کی دنیا سے بہت دور چلی گئی۔ وہ غلط نہیں کہتی تھی کہ پاکیزہ مکمل کروانے کے بعد میں زندہ نہیں رہوں گی۔ اس نے تو فلم کی نمائش کا بھی انتظار نہیں کیا۔ 31 مارچ 1972ء کی منحوس دوپہر کو اس نے چپکے سے آنکھیں موند لیں۔

مینا کماری کمال امروہوی کی تیسری بیوی تھی۔ ان کی پہلی بیوی بانو تھی۔ کمال امروہوی کو اس وقت بانو سے عشق ہو گیا تھا جب ان کی عمر صرف 16 سال تھی۔ یہ ان کا پہلا پہلا پیار تھا جو کامیاب رہا اور انہوں نے اپنی محبوبہ بانو سے شادی کرلی مگر بانو زیادہ دنوں تک ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ ایک سال بعد زچگی کے دوران میں اس کا انتقال ہوگیا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے امروہہ کی ایک دوشیزہ محمودی سے نکاح کیا جس کے بطن سے کمال امروہوی کے تین بچے پیدا ہوئے۔

تیسری شادی انہوں نے اپنی فلم پاکیزہ کی ہیروئن مینا کماری سے کی۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ کمال امروہوی نے مینا کماری سے شادی کیوں کی؟ اس کی بے پناہ حسن و جوانی سے متاثر ہو کر اس سے شادی کی یا کسی خاص ڈپلومیسی کے تحت جس وقت انہوں نے مینا کماری سے شادی کی تھی اس وقت مینا کے عروج کا دور تھا۔ کمال امروہوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔ ”مینا سے میری ملاقات ہوئی تو میں اس وقت مشہور رائٹر اور ڈائریکٹر تھا اور ایک لاکھ روپے معاوضہ لیتا تھا۔“

ان دنوں پاکیزہ کی ابتدائی عکس بندی ہورہی تھی کہ ایک دن مینا کماری کار کے ایک ایکسی ڈنٹ میں زخمی ہوگئی۔ پونا اسپتال میں کچھ دن اسے اپنا علاج کروانا پڑا۔ اس دوران میں کمال امروہوی نے مینا کی جو تیمارداری کی۔ اس نے مینا کو بہت متاثر کیا۔ یوں تو اسپتال میں اس کے دوسرے عزیز و اقارب بھی اس کا خیال رکھنے کے لیے موجود ہوتے تھے لیکن کمال امروہوی نے جس کمال کے ساتھ مینا کی دل جوئی کی اس کے لیے اپنے خلوص و محبت کا اظہار کیا۔ تسلیاں تشفیاں دیں۔ یہ سب کچھ انہی کا کام تھا۔ مینا کو کار کے حادثے میں جو زخم لگے تھے وہ تو مندمل ہو گئے لیکن اس بھولی بھالی اور سیدھی سادی لڑکی کا دل زخمی ہوگیا۔

وہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر اپنے والد ماسٹر علی بخش کے گھر گئی تو اس گھر میں اسے ایک پل چین نہیں مل رہا تھا۔ لہٰذا اس نے کہہ دیا۔ ”اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔“

”اس گھر میں نہیں رہو گی تو پھر کہاں رہو گی؟ کہاں جاؤ گی؟“

”کمال صاحب کے گھر۔“

مینا کا یہ فیصلہ گھر والوں کو اچھا نہیں لگا تھا۔ بڑے تعجب سے اس سے پوچھا گیا۔ ”تو کیا تم نے ان سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟“

”ظاہر ہے۔ میں ان سے شادی کر کے ہی ان کے گھر جاؤں گی۔“

”تمہارا یہ فیصلہ غلط ہے۔ یہ فیصلہ کرتے وقت تم نے یہ نہیں سوچا کہ ان کی عمر تم سے بہت زیادہ ہے۔ وہ دو شادیاں کرچکے ہیں۔ آخر ان میں ایسی کیا خوبی ہے کہ تم نے ایسی باتوں کو بالکل نظر انداز کردیا؟“

”بھئی! آپ لوگ تو خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ ان میں کچھ خوبیاں ہیں جب ہی تو میں نے انہیں پسند کیا ہے اور پھر میں کب تک آپ کے گھر میں یونہی بیٹھی رہوں گی؟ میرا دل بھی شادی کرنے کو چاہتا ہے۔ اپنا گھر بسانے کو چاہتا ہے۔“

ماسٹر علی بخش سنانے میں آگئے۔ آخر بیٹی نے اپنی کمائی کھلانے کا طعنہ دے ہی دیا۔ فلموں میں کام کرنے والی لڑکیوں کے والدین یوں بھی بدنام ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کو سونے کی چڑیا سمجھ کر اپنے شکنجے سے آزاد کرنا نہیں چاہتے۔ باپ کو گم صم دیکھ کر مینا نے انہیں ٹوکا۔

”کیا سوچنے لگے آپ؟ بتایئے آپ کا کیا فیصلہ ہے؟“

”اب جب کہ تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں اور کیا فیصلہ کروں گا۔“

اور پھر جب مینا کماری نے اپنا یہ فیصلہ کمال امروہوی کو سنایا تو ان کی خوشیوں کی انتہا نہیں تھی۔ شاید انہیں اتنی

جلدی اپنی کوششوں اور کاوشوں کی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنی فلم پاکیزہ کی ہیروئن کو تین کپڑوں میں بیاہ کر اپنی ہیروئن بنا کر اپنے گھر لے گئے۔ یہ بمبئی کی فلمی دنیا کی بڑی خبر تھی۔ ماسٹر علی بخش کی طرح بہت سے لوگ سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ آخر مینا کماری نے اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ کیسے کر لیا؟ اسے کمال امروہوی میں آخر کیا خوبیاں نظر آئیں؟

اس وقت تو نہیں بہت بعد میں پتا چلا کہ مینا، کمال امروہوی کی شاعری کے جال میں پھنس کر اس کے پنجرے کی پنچھی بن گئی تھی۔ مینا کماری خود بھی شاعرہ تھی اور اپنے اصل نام ماہ جبیں کی نسبت سے جبیں اس کا تخلص تھا۔ شاعری کا شوق اسے اپنے نانا منشی پیارے لال شاکر میرٹھی سے ورثے میں ملا تھا جو ایک اچھے شاعر تھے۔ شاعری کے شغف نے مینا میں ہمیشہ شاعروں، ادیبوں سے ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ شاید کمال امروہوی کی دور بین نگاہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ مینا کی کمزوری ہے۔ اس لیے انہوں نے اس کی علالت کے دوران میں اسپتال میں اپنی شاعرانہ خوبیوں کا خوب دل کھول کر مظاہرہ کیا تھا۔ غالباً اس بھولی بھالی اداکارہ نے یہ سوچا ہوگا کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو مگر جب وہ اپنے محبوب شاعر کی محبوبہ سے بیوی بن گئی تو اس کے خوابوں کو وہ تعبیر نہیں ملی جس کی اسے تمنا تھی۔

اداکارہ سے بیوی بننے کے بعد وہ بہت خوش تھی۔ اپنے شوہر کو پوجنے کی حد تک چاہتی تھی۔ اپنے گھر سے اسے بے حد پیار تھا مگر اسے اس بات کی آگاہی نہیں تھی کہ شادی کے بعد عورت کی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیویوں کی لگام شوہروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ مینا کماری جو اب تک اپنے باپ کے گھر میں ایک آزاد پنچھی کی طرح رہتی تھی۔ کمال امروہوی نے اسے پنجرے کی پنچھی بنا دیا۔ ہر بات پر روک ٹوک، پابندیاں اور سختیاں۔ شادی سے پہلے اس کے چاہنے والوں کی ایک معقول تعداد تھی۔ ان کے بارے میں سب کو علم تھا۔ ظاہر ہے کمال امروہوی بھی اس سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ شادی کے بعد بھی مینا کے جن معاشقوں کی افواہیں اڑ رہی تھیں ان میں ایک نام بھارت بھوشن کا بھی تھا۔ بھارت بھوشن نے مینا کماری کے ساتھ ''بیجو باورا'' میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ وہ فلم تھی جس سے مینا کماری کو عروج حاصل ہوا تھا۔ بس اس فلم کے دوران میں ہی وہ مینا کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ کمال امروہوی سے شادی کے بعد دوسرے عشاق نے مینا سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا مگر بھارت بھوشن اپنی دیوانگی سے باز نہیں آیا تھا۔ کمال امروہوی نے اس ڈھیٹ عاشق کو اپنے آدمیوں سے پٹوا بھی دیا تھا پھر بھی اس کے سر سے مینا کے عشق کا بھوت نہیں اترا تھا۔ انہی دنوں کی ایک افواہ یہ بھی ہے کہ مینا اور اشوک کمار کا رومانس چل رہا ہے۔ اس افواہ کے تحت بھی مینا اور کمال میں شدید تلخی پیدا ہوئی اور مینا ایک دن اشوک کمار کے ہاں جا پہنچی۔

مینا کماری اپنے وقت کی بڑی طرحدار اداکارہ تھی۔ معروف مصنف، فلمساز و ہدایت کار کیدار شرما کا کہنا ہے کہ اس کی آنکھیں ہر خوب صورت چیز کو دیکھنے کی متمنی رہتی تھیں۔ وہ حسن کی پرستار تھی۔ مرد کو وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ سمجھتی تھی۔ بچپن سے ہی مینا کماری زبان سے کچھ کہنے کی بجائے صرف ایک نظر ڈالنے کی عادی تھی۔ وہ اپنے دور شباب میں بھی اسی مزاج کی لڑکی تھی۔

''مینا کی بڑی بہن خورشید آپا کا اس ضمن میں یہ خیال تھا کہ وہ ہر شخص سے اس طرح ملتی تھی جیسے اس پر واری صدقے جا رہی ہو۔ اس کے ملنے کا یہ والہانہ اور پُرخلوص انداز ہی اس کی صاف ستھری شخصیت کو مشکوک کرتا گیا۔ شاید ہمارے سماج نے ابھی عورت کو وہ حق نہیں دیا ہے جب وہ مردوں کی طرح ہر ایک سے آزادانہ گھل مل سکے۔''

مینا کی افتادِ طبع کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ ان سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں سے وہ بہت فری ہو کر ملتی ہوگی وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہوں گے کہ مینا ان سے محبت کرتی ہے، انہیں چاہتی ہے۔ ایسے لوگوں میں دھرمندر، ساون کمار اور گلزار کے نام بھی شامل ہیں۔

مینا کماری ایک نڈر عورت تھی۔ وہ کمزور، بزدل اور بے بس عورت نہیں تھی جیسا کہ اسے ثابت کیا جاتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اور زندگی کے طور طریقوں کو خود منتخب کیا تھا۔ اس کے شوہر اور اس کے مزاج، ماحول اور کردار میں بہت فرق تھا۔ کمال امروہوی کے گھر میں اسے ایک خاص طرح کے ماحول کا پابند ہونا پڑا تھا۔ کچھ روایات کا لحاظ بھی کرنا پڑتا تھا۔ تناؤ اور ٹکراؤ یہیں سے شروع ہوا۔ بہانے بے شمار بن گئے اور بنا لیے گئے مگر حقیقت اتنی ہی ہے کہ مینا کماری ایک حنوط شدہ ممی بن کے کسی خاص ماحول کے میوزیم میں سج جانے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ وہ تو پارے کی طرح بے قرار اور پہاڑی آبشار کی

طرح رواں دواں رہنا چاہتی تھی۔ اب بھلا پہاڑی آبشار کو یا جنگل کی ہوا کو کوئی بھی قید کر سکا ہے؟

کمال امروہوی کو بھی شاید اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ جس سیدھی سادی، بھولی بھالی دوشیزہ کو اپنے پنجرے کا پنچھی بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ خواب اسے کتنے گراں گزریں گے۔ وہ مینا، پنجرے کے اندر مینا بن کر کیسے رہتی۔ وہ تو پارے کی طرح بے قرار تھی۔ پہاڑی آبشار اور جنگل کی ہوا کی طرح آزاد تھی۔

مینا کماری کے ماموں کمار صاحب نے اپنی سوتیلی بہن کی شادی کا اہتمام کیا تو اس میں شرکت کے لیے مینا کماری کو بھی مدعو کیا مگر مینا اپنی خالہ کی شادی میں صرف اس لیے شریک نہیں ہو سکی کہ کمال امروہوی کے چشم و ابرو کا اس پر کڑا پہرہ تھا۔

مینا کماری کو جن چند اچھے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی اچھی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ان میں دیوندر گوئل کا نام بھی ہے۔ مینا نے سب سے پہلے ان کی فلم "چراغ کہاں روشنی کہاں" میں کام کیا۔ گوئل کہتے ہیں۔

"یوں تو میری فلموں میں مینا سے پہلے نرگس، نلنی جینت، گیتا بالی، کامنی کوشل اور مدھوبالا کام کر چکی تھیں لیکن چراغ کہاں روشنی کہاں میں ایک بیوہ عورت کے کردار کو جس تندہی اور خوب صورتی سے مینا نے کیا، وہ ان ہیروئنوں میں سے کسی ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جو سین مینا کماری کو سمجھایا گیا وہ توقع سے کئی گنا بہتر ہوا۔ اس فلم کے کورٹ سین میں جہاں اس کا بچہ چھینا جاتا ہے مینا کو ایک بے بس ماں کی اداکاری کرنی تھی۔ فلم بندی کے وقت سب مینا کی چیخ سن کر لرز گئے۔ شاٹ اوکے ہوا لیکن مینا کٹہرے سے نہ اٹھی۔ پاس جا کر دیکھا تو معلوم ہوا وہ سچ مچ بے ہوش ہو چکی ہے۔ یہی باتیں ہیں کہ اس کی اداکاری کو اداکاری نہیں کہا جاتا۔ وہ جو بھی رول کرتی اس کی تکلیف اور کرب کو اپنے اندر سمو لیتی تھی۔ پھر خود اس درد سے گزرتی تھی۔ فلم "پیار کا ساگر" میں رونے کا ایک منظر تھا۔ شاٹ اوکے ہو گیا لیکن مینا کے آنسو نہیں رکے۔ وہ ہر منظر میں بہترین کردار نگاری کرتی تھی۔ رونے کا وہ سین بے حد متاثر کن تھا۔ اسے کبھی گلیسرین کے مصنوعی آنسوؤں کی ضرورت نہیں پڑی۔"

گوئل صاحب سے کہا گیا۔ "اس کے باوجود آپ نے مینا کماری کو اپنی اگلی فلموں میں نہیں لیا۔ کیوں، اس کی وجہ؟"

گوئل صاحب کا جواب تھا۔ "دراصل مینا سے میرا معاہدہ محل پکچرز کے ذریعے ہوا تھا۔ وہ محل پکچرز کی ملازم تھیں۔ مینا پر محل پکچرز کی طرف سے کافی بندشیں تھیں۔"

"کیسی بندشیں......؟"

"سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ تھی کہ وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں حصہ نہیں لے سکتی تھیں۔ ان کی وجہ سے مجھے کئی بیرونی مناظر کے سیٹ اسٹوڈیوز میں لگانے پڑے۔ فلم پر خرچ بڑھ گیا۔ اگر مقررہ تاریخ سے کچھ زیادہ روز کا کام بڑھ جائے تو محل پکچرز کو طے شدہ رقم سے زائد رقم دینی ضروری تھی۔ ان سب کے علاوہ مینا ہمیشہ باقر صاحب کی نگرانی میں آتی تھیں۔ باقر انہیں چھوڑ کر چلے جاتے۔ چھ بجے کے بعد اگر دیر ہو جائے تو باقر صاحب کو اطلاع کرنی ضروری ہوتی اگر کبھی کام میں تاخیر ہو جاتی تو وہ گھبرا جاتیں۔ فوراً کہتیں۔ "خدا کے لیے کمال صاحب کو فون کرا دیجیے! ایسے موقع پر وہ ایک نڈر اور بے باک فنکارہ سے زیادہ خوف زدہ گرہستن ہوتیں اور کسی فنکار کا سہمے ہوئے انداز میں کام کرنا مجھے بھی پسند نہیں۔"

کمال امروہوی نے اپنے ایک مضمون میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ انہوں نے ہیئر ڈریسر کو تاکید کی تھی کہ مینا کے میک اپ روم میں کوئی نہ جائے۔ یہ بات انہوں نے باقر صاحب کے توسط سے مینا کو کہلوائی تھی جس پر مینا نے غصے میں کہا تھا۔ "میں کوئی مشین نہیں ہوں کہ جس پر کسی کو بھروسا نہیں۔" مینا نے یہ بات بظاہر باقر صاحب سے کہی تھی لیکن حقیقتاً اس کا اشارہ کسی اور طرف تھا۔ مینا باقر صاحب کی بڑی عزت کرتی تھی اور ان سے اس لہجے میں بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

علی باقر ایک زمانے تک کمال امروہوی کے ڈرائیور، سیکریٹری اور مشیر رہے تھے۔ یہی باقر کمال سے مینا کی شادی کے بعد مینا کے سیکریٹری بھی رہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مینا اور کمال کی علیحدگی میں بھی باقر نے اہم رول ادا کیا تھا۔

علی باقر کا کہنا ہے کہ پنجرے کا پنچھی کے سیٹ پر ہیئر ڈریسر کو اس لیے تاکید کی گئی تھی کہ کمال صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ مینا کے تعلقات ایک شاعر اور ادیب سے بڑھ گئے ہیں۔ ممکن ہے اس روز گلزار مینا کے میک اپ روم میں بیٹھے ہوں۔

مینا کماری کمال امروہوی کی پابندیوں اور سختیوں سے سخت نالاں تھی۔ اس بات کا اعتراف باقر صاحب نے بھی



کمال، رخسار، وسیم اور تاہیر

کیا ہے۔ ان کے سامنے کئی بار مینا پھوٹ پھوٹ کر روئی بھی اور باقر صاحب سے اس بات کی درخواست کی کہ اسے اس عذاب سے نجات دلا دیں۔

مینا کماری کے ایک ہاتھ کی ایک انگلی کٹی ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے اس کی فلمیں دیکھی ہیں انہیں یاد ہو گا کہ وہ رقص کرتے وقت یا اداکاری کرتے وقت اپنا ایک ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھتی تھی۔ اس طرح دراصل وہ اپنی کٹی ہوئی انگلی کا عیب چھپاتی تھی۔ وہ اس کے کٹ جانے کے بعد بہت روئی تھی اور پھر جب تک زندہ رہی اس کٹی ہوئی انگلی کے بارے میں جب بھی سوچتی دکھی ہو جاتی۔

مینا کماری نے اپنی ساری زندگی فلموں کے لیے وقف کردی تھی۔ یہ بات محض فسانہ طرازی نہیں، صد فیصد درست ہے۔ اسے بہت چھوٹی عمر سے فلموں میں کام کرنا پڑا تھا۔ پہلے وہ اپنے والدین کا سہارا تھی۔ باپ کے گھر سے شوہر کے گھر آئی تو بارہ برس تک شوہر کی تجوریاں بھرتی رہی۔ شوہر سے علیحدگی کے بعد دو بہنوں کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی رہی۔ ماں باپ اور بہنوں کی تو خیر مجبوری تھی۔ اس لیے وہ اس کی کمائی کے محتاج تھے لیکن کمال امروہوی کے ساتھ تو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ وہ محض شوہر کی محبت میں اپنی ساری کمائی، کمال امروہوی کے کھاتے میں جمع کراتی رہی اور خود ان کی طرف سے سو روپے ماہوار جیب خرچ لیتی رہی۔ شادی کے وقت وہ پانچ لاکھ روپے لینے والی ہیروئن تھی۔ پانچ لاکھ اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی لیکن یہ مینا کماری کا ظرف تھا کہ اس نے کمال امروہوی کی اس زیادتی کے بارے میں ایک حرف بھی زبان پر نہیں لایا۔ اس ضمن میں جب بہت کریدا جاتا تو اس طرح کی باتیں کہہ کر رہ جاتی۔

"شادی کے وقت دلہن کو سونے کی جو چوڑیاں پہنائی جاتی ہیں ان میں تانبا اس لیے ملایا جاتا ہے کہ چوڑیوں کی گولائی اور مضبوطی قائم رہے وہ ٹوٹ نہ سکیں۔ شاید کمال صاحب نے میری بڑی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سونے میں تانبے کی ملاوٹ کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس لیے ان چوڑیوں کی گولائی قائم نہ رہ سکی۔ وہ ٹوٹ گئیں۔ اس لیے انہیں قصوروار کیوں ٹھہراؤں؟ ویسے قصوروار ہی ٹھہراؤں تو کس کس کو؟" مینا کماری ایک بڑی اداکارہ ہی نہیں تھی۔ ایک بلند کردار کی خاتون بھی تھی۔ مشرقی روایات کی نمائندگی کرنے والی ایک شوہر پرست بیوی بھی تھی۔

ایک طرف تو ایسی والہانہ محبت، اپنے آپ کو نچھاور کر دینے والا انداز، دوسری طرف ایک سخت گیر شوہر کا دبدبہ، رعب اور شوہرانہ عمل داری۔ خورشید آپا کا کہنا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کمال صاحب مینا سے کس قسم کی اور کتنی سچی محبت کرتے تھے۔ کیوں کہ مینا نے ہمیشہ خود کو کمال کے گھر میں پنجرے میں بند پنچھی کی طرح سمجھا۔ اس نے مجھ سے کئی بار کہا۔ "آپا! میری زندگی اس بے بس پرندے کی طرح ہے جو اپنے آزاد ساتھیوں کو اڑتے ہوئے دیکھ کر پرواز کے لیے پر تولتا ہے لیکن پنجرے کی تیلیوں سے ٹکرا کر رہ جاتا ہے۔"

اس قسم کی باتیں بھی وہ صرف اپنی بہنوں یا انتہائی قریبی لوگوں سے کرتی تھی تاکہ وہ باتیں گھر سے باہر نہ جائیں۔ مینا تو پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ شوہر کی محبت کو آبگینے کی طرح سمجھتی تھی کہ کہیں ذرا سی ٹھیس لگ کر ٹوٹ نہ جائے۔

مینا پر جب شباب سایہ فگن ہوا اور اسے ایک جیون ساتھی کی رفاقت کی طلب اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ تو انہی دنوں اس نے کسی کی زبانی سنا۔ "جب عورت ماں بنتی ہے تو عرش کے کنگورے اس کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتے ہیں۔"

اس آگاہی کے بعد وہ ماں بننے کے خواب بھی دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ کسی کی بیوی

بنے گی اور اس کا شوہر اسے یہ اعجاز بخشے گا کہ عرش کے کنگورے اس کے قدموں میں سرنگوں ہو جائیں گے۔ اس کی موت کے بعد خورشید آپا نے کہا تھا۔ ''کون کہتا ہے کہ میری بہن بانجھ تھی۔ وہ دو بار اُمید سے ہوئی۔ پہلی بار جب وہ ماں بننے والی تھی تو کمال نے اس سے کہا۔ مینا! تم آج کی مصروف آرٹسٹ ہو۔ اس لیے تمہارے لیے اس وقت ماں بننا مناسب نہیں۔ اور مینا نے اپنے مجازی خدا کے اس فیصلے کو مان لیا۔ اور حمل ضائع کرا دیا۔ یہ مینا کی بہت بڑی قربانی تھی۔ اسے دلہن بننے کا ارمان تھا۔ وہ دلہن نہ بن سکی۔ صرف تین کپڑوں میں شوہر کے گھر گئی اور تین کپڑوں ہی میں شوہر کے گھر سے نکلی۔ دوسری بار جب وہ اُمید سے ہوئی تو اسے سیپٹک ہو گیا اور وہ بچہ بھی ضائع کرا دیا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس سیپٹک کی کیا وجہ تھی۔ اس کا ذمے دار کون تھا؟ اس کے بعد اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا۔ شاید اب کبھی میں ماں نہ بن سکوں گی۔ اور ایسا ہی ہوا اس کے کچھ دنوں کے بعد کمال سے اس کی علیحدگی ہو گئی لیکن میں جانتی ہوں اگر علیحدگی نہیں بھی ہوتی تو مینا ماں نہیں بنتی کیونکہ کمال یہ بات ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ مینا سے ان کی کوئی اولاد ہو۔ مینا کو بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا اور اس نے مرتے دم تک اس خلش کو محسوس کیا۔''

فلم ساز و ہدایت کار دیوندر گوئل کہتے ہیں۔ ''میری فلم چراغ کہاں روشنی کہاں میں بچے کی پیدائش کا ایک منظر تھا۔ مینا کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ ماں بننے کے درد سے ناآشنا تھی۔ پھر بھی اس سین میں اس کی فطری اداکاری کو دیکھ کر میری مسز جو اس وقت اتفاق سے سیٹ پر موجود تھیں حیران رہ گئیں۔''

گوئل کی اس بات سے جہاں مینا کماری کی اداکارانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئی تھی۔ اس نے اس کیفیت کو اپنے اندر کس قدر سمو رکھا تھا۔

مینا کماری ایک عظیم ایکٹریس تھی۔ اس بات کا اعتراف لوگوں کو اس کی زندگی میں بھی تھا اور اس کی موت کے بعد بھی اس بات سے کسی نے انکار نہیں کیا لیکن وہ اپنی شادی شدہ زندگی میں ایک بیوی کی حیثیت سے کتنی پابندیوں اور مجبوریوں میں گھری ہوئی تھی اس کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔

یہ اور ایسی ہی باتوں نے مینا اور کمال کے درمیان فاصلے بڑھا دیے تھے۔ کشیدگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور مینا کماری فلم انڈسٹری اور اس سے وابستہ لوگوں سے بدظن ہوتی گئی۔ ایک بار کمار صاحب نے اپنی لڑکیوں اور اپنی سوتیلی بہن کو فلم انڈسٹری سے وابستہ کر دینے کے لیے مینا کماری سے کہا جس پر مینا نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ماموں جان! جس گندگی کی دلدل کو میں عبور کر رہی ہوں، میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ کوئی دوسری لڑکی اس دلدل کی طرف قدم بڑھانے کا خیال بھی دل میں لائے۔''

مینا نے پاکیزہ مکمل کرا دی اور گھر آ کر موت کا انتظار کرنے لگی۔ جس کسی کو بھی مینا سے ذرا سی بھی محبت تھی وہ اس کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعاگو تھا۔ بس ایک کمال امروہوی تھے جنہیں اس کی موت کا یقین تھا۔

مینا کماری حسب توقع پاکیزہ کی نمائش سے پہلے عدم آباد چلی گئی۔ خورشید آپا نے بتایا۔ ''کمال صاحب کے دونوں لڑکے تاجدار اور شاندار جو مینا کو چھوٹی امی کہتے تھے۔ ہمارے گھر لینڈ مارک سے ہمارے فون پر مراٹھا مندر (سینما) ٹیلی فون کر کے پوچھتے تھے۔ پاکیزہ کے شوز ہاؤس فل جا رہے ہیں یا نہیں؟''

مینا مر چکی تھی لیکن چھوٹی امی کے چہیتوں کو پاکیزہ کے ہاؤس فل ہونے کی فکر تھی۔

کمال امروہوی کا ایک روپ یہ بھی تھا کہ وہ اپنے بیانات اور مضامین کی روشنی میں اپنی منجو کے عاشق صادق نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو ایک محبت کرنے والا ذمے دار شوہر ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ مینا کے سامنے شروع سے ہی اپنے ساز رفاقت پر محبت کی غزل گاتے رہے۔ اس کے باوجود مینا کماری کی موت کے بعد جب الزبتھ نرسنگ ہوم میں مرنے والی کے میڈیکل بل کی ادائیگی کا مسئلہ سامنے آیا تو ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو فون کیا اور ہدایت کی کہ وہ مینا کے میڈیکل بل کی ادائیگی کے لیے روپے اکٹھا کرے۔

کتنے دکھ کی بات ہے کہ وہ ہیروئن جس نے اپنی زندگی میں ستر اسی لاکھ روپیا کمایا ہو گا جس نے اپنی وصیت کے ذریعے اپنی املاک کی تقسیم میں اپنے عزیزوں کو شامل کیا اس کا میڈیکل بل دینے والا کوئی نہ تھا۔ سچ ہے شوبز کی دنیا میں رہنے والوں کا کردار بھی نمائشی ہوتا ہے۔ اوپر سے کچھ اندر سے کچھ۔

اور پھر جب میڈیکل بل کی ادائیگی ہو گئی تو میت کے

دعوے دار بھی نمودار ہو گئے اور اس بات پر ان میں آپس میں کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ مرنے والی کی بہن چاہتی تھیں کہ مینا کی خواہش کے مطابق اسے اس کی والدہ اقبال بیگم اور والد ماسٹر علی بخش کی قبروں کے قریب دفن کیا جائے جب کہ کمال امروہوی یہ چاہتے تھے کہ وہ امروہہ میں کمال صاحب کے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوں۔ کمال امروہوی کا کہنا تھا کہ مینا نے اس خواہش کا اظہار خود کیا تھا کہ انہیں امروہہ میں دفن کیا جائے۔ ثبوت کے طور پر ان کے پاس میناجی کی ایک ٹیپ شدہ آواز تھی۔ ان کی یہ آواز فور ہنس ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنی کی طرف سے پیش کیے گئے ایک پروگرام کے لیے ریکارڈ کی گئی تھی۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی کہ ایک اشتہاری فرم کے پروگرام کو مینا کی آخری وصیت کے طور پر پیش کیا گیا۔

مینا کی بہنیں اس کی میت لینڈ مارک لے جانا چاہتی تھیں لیکن کمال امروہوی شروع سے آخر تک اس کی مخالفت کرتے رہے اور پھر یہ افواہ اڑ گئی کہ پیٹ اس قدر پھول گیا ہے کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ لاش سیدھی قبرستان لے جائی جائے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ نہ اپنی مرضی سے زندہ رہ سکی نہ اپنی خواہش کے مطابق دفن ہو سکی۔ اس کی لاش بھی اس کی اپنی نہیں تھی۔

☆☆☆

نامور موسیقار نوشاد اپنی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے کہتے ہیں۔ ”جب میں فلمی دنیا میں نیا نیا آیا تھا اور اپنے باندرہ کے مکان میں کسی فلم کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ میرے پڑوس کی ایک شریر لڑکی مجھ پر پتھر پھینکا کرتی تھی۔ وہ چپکے سے آتی اور کھڑکی سے پتھر پھینک کر بھاگ جاتی۔ ایک دو بار تو میں نے بچی سمجھ کر اس کی اس شرارت کو نظر انداز کر دیا مگر جب اکثر ایسا ہونے لگا۔ پتھروں کا کھڑکی کے راستے آنا بند نہ ہوا تو میں نے عاجز ہو کر اس بچی کے باپ سے شکایت کر دی۔ اس کے باپ نے پہلے تو مجھ سے معافی مانگی پھر گھر جا کر بچی کی پٹائی کر دی۔“

جانتے ہیں یہ ننھی شریر بچی کون تھی؟ یہ مینا کماری تھی۔

اس وقت اس کا نام مہ جبیں تھا اور ان دنوں وہ بے حد نٹ کھٹ ہوا کرتی تھی۔ پھر جب وہ بڑی اداکارہ بن گئی تو اکثر ملاقاتوں میں، میں اسے وہ پٹائی یاد دلاتا اور وہ بچپن کے ان بھلے دنوں کو یاد کر کے خیالوں میں کھو جاتی۔

بچپن کا دور سب کے لیے بڑا سہانا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ زمانہ کچھ بچوں کے لیے خاصا طویل ہوتا ہے اور کچھ کے لیے بہت مختصر۔ کچھ بچے خاصی بڑی عمر تک بچے ہی رہتے ہیں اور کچھ بچوں سے تھوڑے ہی دنوں میں ان کا بچپن چھین لیا جاتا ہے جیسے مینا کماری سے ساڑھے چار برس کی عمر ہی میں اس کا بچپن چھین لیا گیا۔ جب وہ مہ جبین تھی اور اپنے ہم عمر ننھے ساتھیوں کے لیے ”چینی“ تھی۔ کیوں کہ وہ چینی کی گڑیا کی طرح من موہنی تھی اس لیے اس کے ننھے منے دوست اور سہیلیاں اسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ اس کے باپ ماسٹر علی بخش نے اپنی بے روزگاری اور بھوک سے تنگ آ کر اس ننھی منی گڑیا سے اس کا بچپن چھین کر اس کو عکس و آہنگ کے جہنم کا ایندھن بنا دیا۔ اس کی عمر محض ساڑھے چار سال تھی جب پہلی بار اسے احساس دلایا گیا کہ اب اس کے کھلونوں سے کھیلنے کے دن گئے۔ اب اسے اپنی

مینا کماری نے اپنی وصیت میں جہاں اپنی بہنوں خورشید آپا اور مدھو کو ان کا حصہ دیا تھا۔ وہاں اپنے ماموں کمار صاحب کے بچوں کو بھی فراموش نہیں کیا تھا جو اس کی موت کے بعد بھی بڑی کسمپرسی کے عالم میں ایک نجی ادارے کے محدود تعلیمی وظیفے کے سہارے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مینا کی وفا شعار ممانی ٹیوشن کر کے بڑی دقت کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش کر رہی تھیں۔

مینا کماری اپنی ابتدا سے آخری دم تک ایک شمع کی طرح جلتی رہی۔ پگھلتی رہی اور بجھنے سے پہلے بھی اپنے پیچھے روشنی کا وافر ذخیرہ دوسروں کے لیے چھوڑ گئی۔

☆☆☆

مینا کماری کو کمال امروہوی کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس بات کا سب سے زیادہ برا نرگس دت نے منایا۔

مینا کماری جن دنوں علاج کے لیے انگلینڈ گئی تھی۔ تب بھی کانا پھوسی ہوئی تھی کہ نرگس دت نے خاص اپنی جیب سے سارا خرچ اٹھایا تھا اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ مینا کماری کے سارے کفن دفن کا خرچ ریحانہ سلطان نے اٹھایا ہے۔

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

اور اپنے گھر والوں کے لیے روٹی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔
''بسنت'' بطور چائلڈ اسٹار اس کی پہلی فلم تھی۔ جس میں فلم کی ہیروئن ممتاز شانتی کی بیٹی کا کردار اس سے کروایا گیا تھا۔ اگرچہ اسٹوڈیو کا ماحول اور فلم سازی کا گورکھ دھندا اس کے لیے بالکل نیا تھا اور اسے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ وہ کوئی ایسا کھیل کھیلے جو بڑوں کی مرضی سے ہو اور اس کھیل میں اس کے ہم عمروں کی بجائے بڑے شریک ہوں مگر جبراً قہراً اسے یہ کھیل کھیلنا پڑا۔ کیونکہ اس کے ابا اسے یہ سمجھا کر لائے تھے کہ تم ہماری مرضی کے مطابق ویسا نہیں کرو گی جیسا تمہیں بتایا اور سکھایا جائے گا تو تمہیں اور ہمیں بھوکا رہنا پڑے گا۔ روٹی نہیں ملے گی۔ روٹی کے نام پر وہ رضامند ہو گئی تھی۔ کیونکہ اسے بھوک بہت لگتی تھی اور اس سے بھوکا نہیں رہا جاتا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ خاصی ذہین تھی۔ اسے ڈائریکٹر جیسا بتاتا وہ ویسا ہی کرنے کی بھرپور کوشش کرتی۔ بسنت ریلیز ہوئی تو فلم کے ساتھ اس ننھی منی گڑیا کی اداکاری بھی پسند کی گئی۔ پہلی کامیابی کا یہ مطلب تھا کہ اس پر فلموں کے دروازے کھل گئے اور چائلڈ اسٹار کے طور پر اسے فلموں میں کاسٹ کیا جانے لگا اور ماسٹر علی بخش کے گھر کی دال روٹی چلنے لگی۔

ماسٹر علی بخش ایک موسیقار تھا۔ اس کی بیوی اقبال بیگم ایک اچھی اداکارہ تھی مگر ان کے اچھے دن زیادہ دنوں برقرار نہیں رہے۔ فلمی دنیا میں چلتی کا نام گاڑی کے فارمولے پر جس کی فلمیں چلتی ہیں اس کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ ان دونوں کے برے وقت نے انہیں گھر بٹھا دیا تھا اس لیے انہیں روٹی کے لالے پڑ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں ننھی مہ جبیں کو فلموں میں کام کرانے کا خیال آیا۔ بندہ جہاں اور جس ماحول میں ہوتا ہے اس کے تناظر میں سوچتا ہے۔ مہ جبیں ناک نقشے کے لحاظ سے بڑی جاذبِ نظر تھی۔ بے حد شریر اور نٹ کھٹ تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بہت ذہین بھی ہے۔ اس لیے انہوں نے بطور اداکارہ اسے فلموں کے جہنم میں جھونک دیا۔

وہ غربت کے مارے ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئی تھی اس لیے ابتدا ہی سے دکھ درد سے آشنا تھی۔ دادر کی یتیم خانہ بلڈنگ میں پیدا ہونے والی مہ جبیں اپنے نام کی طرح بے حد خوب صورت تھی مگر ماں باپ کی موجودگی کے باوجود اس پر یتیمی کا سایہ تھا۔ جس گھر میں وہ پیدا ہوئی تھی وہ یتیم خانہ تو نہیں تھا مگر یتیم خانہ سے ملحق ضرور تھا۔ شاید اس لیے اس پر یتیم خانہ ہی جیسی بے بسی اور بے چارگی سایہ فگن رہتی تھی۔ ایک جہنم سے دوسرے جہنم کا ایندھن بنانا اس کے والدین کی مجبوری تھی۔ ان کے دال دلیے کا سہارا تو ہو گیا تھا مگر یہ کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا۔ کوئی فلم ملتی تو چولہا گرم ہو جاتا، فلم نہیں ہوتی تو گھر پر بھوک کی نحوست برستی رہتی۔ یوں بھی چائلڈ اسٹار کو معاوضہ ہی کیا ملتا تھا۔ اس لیے دونوں میاں بیوی اس دن کا شدت سے انتظار کرنے لگے جب وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے گی اور وہ اسے فلموں کی ہیروئن بنانے کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو ان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آ جاتا تھا کہ کھوٹی چونی بھی چلانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ مہ جبیں کے ماموں کمار صاحب نے ننھی مہ جبیں کو ایک کھوٹی چونی دی کہ وہ اسے چلانے کی کوشش کرے۔ ان دنوں مہ جبیں کی والدہ اقبال بیگم بے حد بیمار تھیں۔ افلاس اور غربت نے انہیں نیم جاں کر رکھا تھا مگر اس نیک دل خاتون نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس عالم میں بھی کوئی غلط، غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب ہو۔ کمار صاحب گھر سے باہر گئے تو انہوں نے بہلا پھسلا کر ننھی مہ جبیں سے وہ کھوٹی چونی لے کر اپنے پلو میں باندھ لی اور بعد میں بھائی صاحب سے کہہ دیا۔ وہ چونی مہ جبیں سے کہیں کھو گئی ہے۔ کمار صاحب واہی تباہی میں زندگی گزارتے تھے۔ خود کبھی جم کر کوئی کام نہیں کیا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں پڑے رہے۔ بیمار بہن اور بے روزگار بہنوئی کے لیے بس کڑھتے ہی رہتے تھے یا اس غم کو پی پلا کر کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اقبال بیگم کی بیماری بڑھتی ہی گئی۔ بڑھتی ہی گئی۔ ماسٹر علی بخش کے پاس دونوں وقت کی روٹی کے پیسے تو ہوتے نہیں تھے۔ بے چارے بیوی کا مکمل علاج کیسے کراتے۔ ایک دن وہ انتہائی حسرت اور کسمپرسی کے عالم میں یہ دکھوں بھری دنیا ہی چھوڑ گئیں۔ ماں کے مرنے کے بعد ان کی بیٹیاں کس حال میں تھیں کسی نے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کوئی ان کے پاس پھٹکنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ ماسٹر علی بخش کے لیے یہ وقت بڑا آزمائشی تھا۔ بہرحال یہ وقت بھی گزر گیا۔ مہ جبیں ذرا سیانی ہوئی، اس نے ذرا قد کاٹھ نکالا تو ماسٹر علی بخش نے دوڑ بھاگ کے بعد الہ دین اور جادوئی چراغ میں قدرے معقول کردار اس کے لیے حاصل کیا لیکن اس فلم نے فلم بینوں کو متاثر کیا نہ مینا کماری کی اداکاری نے۔ بہرحال اب سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس کے بعد کی فلموں سے آہستہ آہستہ مینا کی نئی خوبیاں کھل

کرسامنے آنے لگیں۔

معنف فلمساز و ہدایت کار کیدار شرما کہتے ہیں۔"جب میں پہلی بار مینا کماری سے ملا تو وہ صرف سولہ سال کی مہ جبیں تھی۔ میں اس وقت رنجیت موویٹون میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ مینا کماری کی ماں اقبال بیگم نے کافی دن پہلے مجھ سے خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر میں تھوڑی توجہ دوں اور کچھ محنت کروں تو اس کی بیٹی کو اسٹار بنا سکتا ہوں۔ اس کی ماں بھی ایک اچھی آرٹسٹ تھی اور میرے کام کی بہت قدر کرتی تھی۔ وہ انتہائی خوش مزاج اور انکسار پسند خاتون تھی۔ اس کے برعکس مینا کماری مجھ سے جانے کیوں کتراتی تھی۔ وہ ایک طرح سے خوف زدہ رہتی تھی۔ جب مجھے داداجی کی ہدایت کاری سونپی گئی تو اس فلم کے لیے میں نے مینا کماری کو جاگیردار اور الطاف کے ساتھ کاسٹ کیا۔ بدقسمتی سے یہ فلم ریلیز نہ ہو گی کیوں کہ رنجیت اسٹوڈیو میں آگ لگ گئی تھی اور اس پورے فلم کے نیگیٹو جل گئے تھے لیکن میں مینا کماری سے بہت متاثر ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے پُر ہوتا تھا اور اس کی معصومیت ایک نئی کشش پیدا کرتی تھی۔"

ان دنوں مینا کماری ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اپنے بچپن میں وہ جن دکھوں اور تکلیفوں کے دور سے گزری تھی۔ ابھی تک اس کے ذہن میں ان کے اثرات باقی ہوں۔ اس وقت بھی اس کے گھریلو حالات مکمل طور پر درست نہیں ہوئے تھے۔ غالباً اس لیے بھی وہ غمگین اور خاموش رہتی تھی۔ اس وقت کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ خوف زدہ ہرنی سی لڑکی کسی دن ہندوستانی اسکرین کی مایہ ناز اسٹار ثابت ہو گی۔ مینا کماری کی اداکاری میں جیسے جیسے نکھار آتی گئی۔ ماسٹر علی بخش کے گھر میں خوش حالی کی بہار آتی گئی۔ مکمل ہیروئن بننے سے پہلے بھی وہ چھوٹے موٹے رول کرتی رہی تھی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں اس نے پرتگیا میں کام کیا تھا۔ جس کی اداکاری کو دیکھ کر وہ لوگ چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے جنہوں نے "الہ دین اور جادوئی چراغ" دیکھ کر مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ جن دنوں پرتگیا کی عکس بندی چل رہی تھی انہی دنوں ماسٹر علی بخش "آرتی" کی موسیقی دے رہے تھے۔ ایک بار پھر انہیں اِکا دُکا فلمیں ملنے لگی تھیں اور باپ بیٹی کی مصروفیات کی وجہ سے گھر کی حالت سدھرنے لگی تھی۔ 1954ء میں ماسٹر علی بخش نے پہلی بار دادر سے باندرہ میں مکان تبدیل کیا۔ یہ 22 ہزار 5 سو کا فلیٹ تھا۔ مینا

مینا کماری پان کی بہت شوقین تھی۔ ہر وقت اس کے پاس پان کی گلوریاں موجود ہوتی تھیں۔ خود بھی کھاتی اور دوسروں کو بھی پیش کرتی تھی۔

جب وہ بستر مرگ پر دراز تھی تو معروف ادیب رشید احمد صدیقی کی بیٹی اور کرشن چندر کی بیوی سلمٰی صدیقی ان سے ملنے گئیں۔ اس وقت مینا کی ناک میں آکسیجن کی نلکی لگی ہوئی تھی اور ڈاکٹر نے اسے پان کھانے سے منع کر رکھا تھا۔ سلمٰی کو دیکھ کر مینا کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر اپنی روایت کے مطابق سلمٰی کو پان پیش کیا جب سلمٰی نے پان لے لیا تو مینا نے کہا۔"ہمیں پان نہیں دو گی؟"

سلمٰی نے جواب دیا۔"آپ پان نہیں کھا سکتیں۔"

اس پر مینا نے جھلا کر آکسیجن کی نلکی اپنی ناک سے نکال دی اور کہا۔"اب تو کھا سکتی ہوں۔"

اور اس کی بہنیں اس مکان میں آ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

حالات کیسے بھی ہوں وقت کا پہیا رکتا نہیں ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ حالات میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ مینا پر جب بھرپور جوانی آ گئی تو اسے مکمل ہیروئن کے کردار بھی ملنے لگے۔ اب انتظار تھا کسی ایسی فلم کا جو مینا کماری کو ایک دم بڑی اداکارہ بنا دے اس کی مقبولیت اور شہرت میں زبردست اضافہ کر دے۔ باپ اور بہنوں کی دعاؤں سے آخر اسے ایک ایسی فلم مل ہی گئی۔ یہ فلم تھی "بیجو باورا"۔ اس فلم کی کامیابی نے اسے بھی ایک کامیاب اداکارہ کی سند عطا کر دی۔ اس فلم میں مینا کماری کی اداکاری نے ہر ایک کو متاثر کیا اور فلم انڈسٹری کے دروازے اس کے لیے کھل گئے۔

مینا کماری کی کامیابی سے اس کے گھر والوں کے بھی دن پھر گئے۔ مینا سے بڑی بہن خورشید اور چھوٹی مدھو کی شادی ہو گئی۔ خورشید کی شادی الطاف سے ہوئی جو بھی فلموں میں کام کرتا تھا مگر اس فیلڈ میں کامیاب نہیں ہوا تو اس نے بزنس شروع کر دیا۔ مدھو کی شادی محمود سے ہوئی تھی جو زیادہ عرصہ تک کامیاب نہیں رہی اور یکے بعد دیگرے دونوں بہنیں مینا کماری کے پاس ہی واپس آ گئیں۔ خورشید کے شوہر الطاف کا بزنس بھی کچھ عرصے کے بعد حالات کا شکار ہو گیا تھا۔ اس لیے اب دونوں بہنوں کی کفالت کی ذمہ داری مینا کماری پر آ گئی تھی۔ جو مصیبتیں خورشید آپا اور مدھو کو شادی

کے بعد پیش آئیں وہ ان کی وجہ سے بہت دکھی رہتی تھیں۔ اسے ہمیشہ اس بات کا بڑا احساس رہتا تھا کہ اس کی بہنیں پریشان ہیں۔ اجڑ کر رہ گئی ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ اگرچہ اس کی اپنی زندگی میں بھی دکھ اور مصیبت روپ بدل بدل کر اسے بے کل اور بے چین رکھتے تھے۔ اسے اس بات کا بھی دکھ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے بھلے دنوں کی دعائیں مانگی تھیں انہیں وہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ ماں اقبال بیگم غربت، افلاس، بھوک اور بیماری کے صدمے جھیلتے جھیلتے چلی گئیں۔ باپ کا سہارا تھا تو انہوں نے بھی اس کے عروج کا دور بہت کم مدت تک دیکھا۔ ماسٹر علی بخش کے بعد وہ بالکل ہی بے آسرا ہو گئی تھی۔ حالات نے اسے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں خود اسے دوسروں کا سہارا بننا پڑا۔

اس نے سوچا تھا اپنا گھر بسا کر شوہر کے گھر میں راج کرے گی مگر اس کی بدنصیبی نے اس مرحلے پر بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور اس کے خوابوں کا شیش محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا اور اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کی روح بھی زخمی ہو گئی۔ وہ من میں خواب سجا کر پیا کے گھر گئی تو اسے پنجرے میں بند کر کے اس کی چابی کمال امروہوی نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ ایک آزاد پنچھی کو اس طرح پنجرے میں بند کر دینا اسے اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر خاموش رہی کہ شاید کمال امروہوی کو اس پر ترس آ جائے۔ اپنے کیے پر وہ پشیمان ہو جائے اور اس کی آزادی اسے لوٹا دے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی خاموشی کو شاید اس کی کمزوری تصور کیا گیا اور اس پر پابندیوں کا گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔

وہ اس دور میں پانچ لاکھ روپے معاوضہ لینے والی اداکارہ تھی جو اسے اپنے مجازی خدا کے حکم پر محل پکچرز کے اکاؤنٹ میں جمع کرانا پڑتا تھا اور محل پکچرز کے حساب سے اسے ماہانہ صرف سو روپے جیب خرچ کے نام پر دیے جاتے تھے۔ محبت کی ماری وہ خاموش طبع عورت، اگرچہ بچپن اور لڑکپن سے اب تک دکھوں کی آگ میں جل جل کر اسے حالات و واقعات کو سمجھنے اور پرکھنے کا بڑا تجربہ حاصل ہو گیا تھا مگر وہ کمال امروہوی کے معاملے میں دھوکا کھا گئی۔ پھر بھی اس نے اس پنجرے کی تیلیوں کو توڑ کر باہر نکلنے کا کوئی انقلابی فیصلہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جس طرح اس نے اچانک اس سے رشتہ جوڑا تھا اسی طرح وہ اس سے ناتا توڑ بھی سکتی تھی۔ کئی فلمی اداکاراؤں کی مثال اس کے سامنے تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا، وہ اس کے سدھرنے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ سوچتی رہی کہ شاید اس کی وفا شعاری اور شوہر پرستی، کمال کو راہِ راست پر لے آئے۔ اس انتظار میں اس نے ایک دو نہیں بارہ سال گزار دیے۔ پورا ایک جگ بتا دیا۔ اس دوران میں اس نے اُف تک نہیں کی۔ زبان پر حرفِ شکایت نہیں لایا مگر جب اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ اس کے کردار پر شک کیا جانے لگا۔ اسے دوستوں اور ساتھی فنکاروں سے ملنے سے روکا جانے لگا۔ سخت پہرے کی حالت میں اسے شوٹنگ کے لیے نگار خانہ لے جایا جاتا اور پہرے ہی کی حالت میں گھر لایا جاتا تو اسے بہت برا لگتا۔ ''اگر مجھے اتنا ہی کمزور کیریکٹر کا تصور کیا جاتا ہے تو اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ مجھے گھر بٹھا لیا جائے، مجھ سے فلموں میں کام نہ کرایا جائے جس طرح کئی اداکاراؤں کو ان کی شادی کے بعد ان کے شوہروں نے فلموں میں کام کرنے سے منع کر دیا مگر یہاں تو ایسا بھی نہیں کیا گیا۔ فلموں میں اگر میں کام کروں گی تو کیا میرے ساتھی فنکار ملیں گے نہیں؟ بات نہیں کریں گے؟ بس یہ اور ایسے ہی خیالات کبھی کبھی مینا کماری کے جذبات مشتعل کر دیتے اور اس کی چپ کی مہر ٹوٹ جاتی اور وہ کمال امروہوی سے الجھ جاتی۔ ''آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں تو اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکتی۔''

''ہم لوگ مشرقی روایات کے حامل لوگ ہیں۔ ہمارے خاندان میں عورتوں کو مردوں کا تابع فرمان رہنا پڑتا ہے۔''

''مگر مجھے ایسی پابندی پسند نہیں۔''

''لیکن ہمیں پسند ہے۔''

اس مسئلے پر اکثر دونوں الجھ جاتے۔ تو تو میں میں ہوتی اور رنجشوں اور تلخیوں میں اضافہ ہوتا رہتا اور آخر کار ایک دن مینا کے صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ کمال امروہوی کے گھر سے باہر آ گئی۔ جس طرح صرف تین کپڑوں میں اس گھر میں آئی تھی۔ اسی طرح اپنے تن کے تین کپڑوں کے ساتھ اس گھر سے نکل گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب اس کی دونوں بہنیں اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ اس لیے مینا کماری کو مدھو کے پاس جانا پڑا۔ سر چھپانے کے لیے آخر کسی چھت کی تو ضرورت تھی مگر محمود کے گھر والوں کو اس کا اس طرح آنا اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ بھی نہیں کہا لیکن اسے اتنا تنگ کیا کہ اسے اس پناہ گاہ کو چھوڑنا

پڑا۔ اس کے بعد اس نے جانکی چالی میں اپنی رہائش کا بندوبست کرلیا۔ یہاں آکر اس نے قدرے سکون کا سانس لیا تھا۔ یہاں اس کے دوست احباب اور دیگر افراد اس سے مل سکتے تھے۔ آزادی سے آجاسکتے تھے اور اسے یا آنے جانے والوں کو روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ مینا کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ تو ابتدا ہی سے آزاد پنچھی تھی۔ اپنی مرضی کی مالک، جب تک ماں باپ کے گھر میں رہی وہ بھی اسے پابند نہیں کرسکے تھے۔ اس کی سرشت میں ہی آزادی تھی۔ اب اسے اپنے احساسات کو شعروں میں ڈھالنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اس کی بیماریوں میں شعروشاعری بھی ایک پرانی بیماری تھی۔ اپنی کمسنی کے دور سے ہی شعر کہنے لگی تھی۔ شاعروں اور ادیبوں سے اس کی قربت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ انہیں اپنے ہی قبیلے کا فرد سمجھتی تھی۔ ان سے مل کر شعروادب کے موضوع پر گفتگو کرکے اسے بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس نے اردو لٹریچر کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ اس کے مکالمے زیادہ تر پُرمعنی ہوتے تھے۔ کیوں کہ الفاظ سے زیادہ تاثر اس کے چہرے اور حرکات وسکنات سے پیدا ہوتا تھا۔ اسے سیکھنے اور سمجھنے کا بڑا شوق تھا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں وہ بلا جھجک پنسل اور کاپی لے کر ادیبوں اور شاعروں کے پاس چلی جاتی اور اپنے اشعار کے بارے میں مشورے کرتی۔ کمال امروہوی سے قربت اور پھر محبت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مینا کماری ان سے کہیں زیادہ ان کی شاعری سے متاثر ہوگئی تھی۔ اسے اپنے اشعار پر بڑا فخر تھا اور وہ انہیں اپنا سرمایہ سمجھتی تھی اور یہ احساس اسے کمال امروہوی ہی نے دلایا تھا۔ وہ انسانی نفسیات کا ماہر تھا۔ مینا کماری کے اشعار اخباروں اور پرچوں میں چھپتے بھی تھے اور وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتی تھی۔ وہ مخصوص شعری نشستوں میں ہی نہیں بڑے اور انڈوپاک نوعیت کے مشاعروں میں بھی فراق، کیفی، جاں نثار اختر اور مجروح سلطان پوری کی موجودگی میں اپنی غزلیں اور نظمیں سنائی تھی۔

مینا کماری کو ضد تھی کہ وہ اپنی شخصیت کے تمام گوشے دکھائے گی اور لوگوں کو ضد تھی کہ وہ صرف وہی دیکھیں گے جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں یا جو انہیں پسند ہے۔ مینا نے یہ بات نہ سمجھی کہ وہیں تک اس کا جلوہ ہے نظر جس کی جہاں تک ہے اور باقی لوگوں کو تو کچھ بتانے یا سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ایک مفاد جو زرپرست اور مصنوعی ماحول میں اگر کوئی تہ دار شخصیت پیدا ہوجائے تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ جو



نرگس خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے

ہوگا سو ہوکر رہا۔ شہرت کی اونچائیوں سے اسپتال کی تنہائیوں تک وہ اپنی تہ داری کی قیمت ایک ایک بوند لہو کی صورت میں چکاتی رہی۔ بقول اختر الایمان

اس مسافت میں رہ رہ کے لپٹی تھی جو
میں نے دامن سے وہ گرد بھی جھاڑ دی
اور یار لوگوں نے وہ گرد بھی بیچ کھائی۔

"مینا کماری کے ہمدردوں، عزیزوں اور دوستوں نے بھی مرحومہ کے ساتھ وفا نہیں کی۔ تعاون نہیں کیا۔" یہ بات اے کریم نے مینا کماری کی موت کے بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ "مینا کماری کی موت کا سبب صرف کمال ہی نہیں، دوسرے کچھ لوگ بھی ہیں اور میں ان قاتلوں کو نہ صرف پہچانتا ہوں بلکہ ان کے نام بتانے کی جسارت بھی رکھتا ہوں۔" کریم صاحب نہ صرف کمال امروہوی کے گہرے دوست تھے بلکہ مینا کماری کے منہ بولے بھائی اور اس کے کاسٹیوم ڈیزائنر بھی رہ چکے تھے۔ انہوں نے کچھ فلموں کی ہدایت کاری اور فلم سازی بھی کی تھی۔

اے کریم کا کہنا ہے کہ کمال اور مینا کماری کی علیحدگی کی وجہ صرف کمال ہی نہیں بلکہ مینا کماری کے رشتے دار بھی ہیں۔ مینا اتنی جلدی ہرگز نہ مرتی اگر اس کی بہنیں اس کا خیال رکھتیں۔ یہ کرشمہ مینا کی چہیتی بہنوں کا ہی ہے کہ مینا کو شراب جیسی منحوس اور مہلک چیز کی عادت پڑ گئی، جو ظلم مینا کے رشتے داروں نے مینا پر کیے وہ شاید کوئی غیر بھی کسی پر نہیں کرسکتا۔ مینا کماری کی بہنوں نے اس کی زندگی میں شراب کا زہر بھر دیا تھا۔ وہ مینا سے وہسکی کے لیے پیسے لیتیں اور اسے وہسکی کے نام پر ٹھرا پلاتیں۔

کریم صاحب کی ان باتوں میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

دوسری طرف خورشید آپا کا کہنا ہے۔ "ہم نے کئی بار

مینا سے کہا: "مینو پیاری! اپنی جان کو گھن لگانے سے کیا فائدہ۔ کمال سے طلاق لے لو اور دوسری شادی کرلو۔" لیکن مینا کے سامنے ہم بہنوں کی پوری زندگی تھی جو مصیبتیں اور مشکلیں مجھے اور مدھو کو شادی کے بعد پیش آئیں وہ ان ہی کی وجہ سے کم ہو رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ میری مدد کی۔ الطاف کو بزنس میں نقصان ہونے کے بعد میں مستقل طور پر مینا ہی کے پاس رہی۔ اس نے ہر ممکن طور پر ہم لوگوں کی کفالت کی۔ وہ اپنے لیے ہی نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی پریشان رہتی تھی۔ وہ اکثر کہتی۔ "آپا! اب شادی کرنے سے کیا فائدہ۔ میرے لیے تو آپ لوگ ہی سب کچھ ہیں۔"

ایک بار "میرے چنے" کے سیٹ پر میں نے اور مدھو نے اسے چھیڑا۔

"کیوں ری مینو! اب تو تو ہماری ماں لگ رہی ہے۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "ہاں میں تو سب کی ماں ہی تو ہوں اور میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنا بڑھاپا بھی دیکھ لیا۔"

خورشید آپا کی ان باتوں کی روشنی میں کیا اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ دونوں بہنوں کے لیے مینا کماری کتنی اہمیت رکھتی تھی۔

جب وہ جوان بھی نہیں ہوئی تھی اس وقت سے اپنے گھر کی کفالت کرتی تھی۔ پھر جب کمال کے گھر گئی تو سب کچھ اس کے لیے وقف کر دیا۔ جب اس سے علیحدہ ہوئی تو صرف بہنوں اور ماموں کے لیے ہی نہیں بلکہ دوستوں اور جاننے والوں کی ضرورتیں بھی پوری کیں۔ اس کا تو مقصد ہی دوسروں کو فیض پہنچانا تھا۔ اپنی بہنوں کے علاوہ اپنے ماموں کمار صاحب کی بھی مینا کماری نے ہمیشہ مدد کی۔ یہ کمار صاحب بھی بڑے عجیب طرح کے آدمی تھے۔ اپنے والد منشی پیارے لال شاکر میرٹھی کی وجہ سے اپنے آپ کو زبردستی ادب نواز اور سخن فہم ثابت کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ عملی طور پر کچھ کرنے، کچھ کمانے کی فکر کم ہی کرتے تھے، جب مینا کماری کی ماں یعنی ان کی بہن اقبال بیگم حیات تھیں۔ جب بھی اس افلاس زدہ خاندان سے جڑے ہوئے تھے اور جب بیجو باورا نے مینا کو اچانک بام عروج پر پہنچا دیا تو اس وقت سے آخر وقت تک مینا سے خوب فائدہ اٹھاتے رہے۔ مینا کو اپنے اس قلاش ماموں سے بہت محبت تھی۔ اس لیے ماموں نے بھی بھانجی کی دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ ریس، نشہ اور قمار بازی کے بڑے شوقین تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ قمار بازی کی محفل کا اہتمام اپنے گھر میں بھی کرتے تھے۔ ایک دن گھر میں چھاپا بھی پڑا اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ دھر بھی لیے گئے مگر پولیس نے ان کو ایک نیک نام فلمی ادارے سے منسلک ہونے کی وجہ سے رعایت کرتے ہوئے انہیں صرف شہر بدر کرنے پر اکتفا کیا۔

شاید یہ وہی موقع تھا کہ کمار صاحب نے پونا میں اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے بمبئی میں اپنے دوسرے بھائی ہیرا لال کے پاس جوہو کی جھونپڑپٹی میں آ کر ایک جھونپڑا بنا لیا اور مینا کماری کے لیے ایک مستقل درد سر بن گئے۔ مینا جب تک کمال امروہوی کی بیوی نہیں بنی اس وقت تک تو کمار صاحب کی مٹھی ہمیشہ گرم کرتی رہتی۔ وہ انہیں روپیا کاروبار کرنے کے لیے دیتی تھی مگر کمار صاحب اپنی پرانی عادت کے مطابق اس رقم کو شراب اور ریس میں گنوا دیتے تھے۔ مینا سے ان کی یہ باتیں پوشیدہ نہیں تھیں مگر سب جانتے ہوئے بھی وہ ان کے فریب کا شکار ہوتی رہتی۔

ایک دن کمار صاحب مینا کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ "میں تم سے آخری بار مالی مدد کے لیے آیا ہوں۔ اس بار واقعی کوئی چھوٹا موٹا بزنس کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے ماموں، میں آپ کو یک مشت دس بارہ ہزار روپے دے دوں گی۔" مینا کماری نے کہا۔ "مگر اس وقت نہیں دل ایک مندر، کی نمائش کے بعد۔"

کمار صاحب خوشی خوشی واپس چلے گئے اور آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگے لیکن جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو مینا کماری اپنے ماموں کو ایک پیسا بھی نہ دے سکی کیونکہ اس دوران میں حالات بدل چکے تھے۔ اب کمال امروہوی مینا کماری کے شوہر اور سرپرست تھے اور مینا کماری کی ساری کمائی محل پکچرز کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی تھی اور مینا کو فقط سو روپے ماہانہ جیب خرچ ملتے تھے۔

مینا کماری کی آخری فلم گومتی کے کنارے جو پاکیزہ کے بھی بعد میں ان کی موت کے بعد ریلیز ہوئی۔ اس کے مصنف و ہدایت کار فلم ساز ساون کمار ٹاک تھے۔ ٹاک سے مینا کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر اس کے لیے بھی مینا نے بہت کچھ کیا تھا۔ یہ فلم مکمل ہی نہیں ہوتی اگر مینا کماری ساون کمار ٹاک کی مالی معاونت نہیں کرتی۔ مینا کماری نے ٹاک کو نہ صرف لاکھوں روپے قرض دلوائے اور قرض کی ہنڈیاں خود سائن کیں بلکہ خود بھی بہت کچھ دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مینا کماری جتنی بڑی اور عظیم اداکارہ تھی اتنا ہی بڑا اس کا دل

تھا۔ وہ کبھی بھی کسی ضرورت مند کی حاجت روائی سے انکار نہیں کرتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے لوگوں سے چالاک اور شاطر لوگ فائدہ بھی خوب اٹھاتے ہیں۔

انسان میں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی۔ مینا کماری بھی بہر حال انسان تھی اور انسان ہونے کے ناتے جہاں اس میں بہت ساری خوبیاں تھیں وہاں یقیناً کچھ خامیاں بھی ہوں گی اور ہمارے خیال میں ان خامیوں میں ایک بڑی خامی یہ بھی تھی کہ وہ سراپا محبت تھی اور یہ اس کی محبت کا فلسفہ ہی تھا جس نے اسے صحیح یا غلط راستے پر گامزن کر دیا تھا۔

اس کی ایک تحریر کا اقتباس دیکھیے۔

''ہم یہ نہیں جانتے کہ کون کس سے محبت کر رہا ہے۔ صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہم محبت کر رہے ہیں۔ کیا محبت ہی اصل شے ہے؟

میرے دل میں بے ساختہ خیال آتا ہے کہ میں اس سوال کے جواب میں ہاں کہہ دوں۔ میری زندگی میں ایسے مقام آئے کہ مجھے خود کو یہ کہہ کر سمجھانا پڑا کہ محبت ہی اصل شے ہے۔ نہ صرف میں نے خود کو سمجھانے کے لیے ایسا کیا بلکہ میرا یقین بھی یہی رہا کہ محبت ہی بذات خود اصل شے ہے اور میں نے اس معاملے میں دنیا کی پروا بھی نہیں کی۔ دنیا تو دنیا رہی، خود اپنی بھی پروا نہیں کی۔ نہ اپنے مستقبل کی نہ اپنی زندگی کی اور نہ اپنی شہرت وعزت کی۔ میں ان سب سے بے نیاز ہو کر محبت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتی پھرتی ہوں۔''

مینا کماری کی ایک نظم کے ایک بند سے بھی اس کی محبت کے فلسفے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''پیار کا ایک خوب صورت خواب\
جو میری سلگتی ہوئی آنکھوں میں ٹھنڈک بھر دے\
محبت کا ایک پُر تپاک لمحہ\
جو میری بے چین روح کو پُر سکون کر دے\
بس انہی ایک دو چیزوں کی میں خریدار تھی\
اور وقت کی دکان ان چیزوں سے خالی نکلی

مینا کماری کی زندگی کا جائزہ لیجیے تو ابتدا سے انتہا تک اس کی محبت کی جلوہ سامانیاں نظر آئیں گی۔ اس کی روح محبت کی متلاشی تھی اس لیے جہاں بھی اور جب بھی اسے کہیں محبت کی کوئی کرن نظر آتی وہاں وہ دیدہ ودل فرش راہ کر دیتی۔ اس کی یہ محبت ماں سے بھی، باپ سے بھی، بہنوں سے بھی اور دیگر عزیزوں اور رشتے داروں اور دوستوں سے

مینا کی نظمیں

آخری خواہش

یہ رات، یہ تنہائی\
یہ دل کے دھڑکنے کی آواز، یہ سناٹا\
یہ ڈوبتے تاروں کی\
خاموش غزل خوانی\
یہ وقت کی پلکوں پر\
سوئی ہوئی ویرانی\
جذبات محبت کی\
یہ آخری انگڑائی\
بجھتی ہوئی ہر جانب\
یہ موت کی شہنائی\
سب تم کو بلاتے ہیں\
پل بھر کو تم آجاؤ\
بند ہوتی ہوئی آنکھوں\
میں میری محبت کا\
اک خواب سجا جاؤ

خالی دکان

وقت اپنی دکان کیوں سجائے بیٹھا ہے\
میرے سامنے؟\
وہ چیزیں جن کی خریدار تھی میں\
کہاں ہیں؟\
یہ مصنوعی مسرتوں کے کھلونے\
شہرت کے یہ کاغذی پھول\
اور دولت کی یہ موٹی گڑیا\
جو شیشے کی الماریوں میں بند ہیں\
(کہ کسی کے چھو لینے سے پگھل جو سکتی ہیں)\
یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جنھیں میں خریدنا چاہتی ہوں\
پیار کا ایک خوب صورت خواب\
جو میری سلگتی ہوئی آنکھوں میں ٹھنڈک بھر دے\
محبت کا ایک پُر تپاک لمحہ\
جو میری بے چین روح کو پُر سکون کر دے\
بس ان ہی ایک دو چیزوں کی میں خریدار تھی\
مگر وقت کی دکان ان چیزوں سے خالی نکلی

بھی وابستہ ہوتی تھی۔ جہاں بھی اسے اپنے لیے کوئی چاہنے والا نظر آتا وہ اس پر نچھاور ہو جاتی۔ اس سلسلے میں اس نے کبھی غور و فکر نہیں کیا کہ چاہنے والا کون ہے اور جس کو وہ چاہ رہی ہے اس کی محبت میں کتنی گہرائی اور گیرائی ہے۔

مینا کماری کی موت کے بعد پاکیزہ کی ریڈیو پبلسٹی میں صرف ایک جملہ بڑے واضح انداز میں بولا جاتا تھا۔

''عظیم فنکار کمال امروہوی کا شاہکار۔ پاکیزہ۔''

حیرت ہے مینا کی موت کے بعد ہٹ ہونے والی فلم کی ریڈیو پبلسٹی میں بھی اس کے نام کو اہمیت نہیں دی گئی۔ وہ پاکیزہ جس کی تکمیل مینا کماری کے تعاون کے بغیر ناممکن تھی اس فلم کی کامیابی کا کریڈٹ بھی کمال امروہوی کے نام ہو گیا۔

کچھ ایسی ہی محبت کا اظہار ساون کمار ٹاک نے بھی کیا تھا۔ مینا کماری کی زندگی میں تو ساون کمار ٹاک نے اپنے آفس میں اپنی فلم گومتی کے کنارے کے بینر کے نیچے لکھ رکھا تھا۔

''مشہور اداکارہ مینا کماری پیش کرتی ہیں۔ گومتی کے کنارے۔''

لیکن مینا کی موت کے فوراً بعد یہ عبارت بدل گئی۔ دوسری عبارت یہ تھی۔ ''ساون کمار ٹاک پیش کرتے ہیں، گومتی کے کنارے۔''

یہی حال دوسرے چاہنے والوں کا بھی تھا۔ وہ جن لوگوں کے لیے اپنی جان چھڑکتی تھی وہ لوگ اپنا موقع نکال کر دامن جھٹک کر الگ ہو جاتے تھے اور ایسے لوگوں میں بقول کریم صاحب سب ہی شامل تھے۔ وہ کہتے ہیں۔

''میں جب بھی دھرمیندر سے ملتا۔ اس سے کہتا۔ تمہاری جدائی میں مینا کی جو حالت ہے اسے دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی موت کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ کمال کو ہی ہر پہلو سے موردِ الزام ٹھہرانا مناسب نہیں۔ مینا کماری کے ہمدردوں، عزیزوں اور دوستوں نے بھی مرحومہ کے ساتھ وفا نہیں کی، تعاون نہیں کیا۔''

5 مارچ 1964ء کو مینا کماری نے کمال امروہوی کا گھر چھوڑا تھا۔ تقریباً چار سال بعد 25 اگست 1968ء کو کمال امروہوی نے اپنے اور مینا کماری کے تنازع کے دوران میں ایک خط لکھا تھا۔ کمال کا یہ خط بے حد جذباتی تھا جس کے ساتھ ایک قانونی دستاویز بھی منسلک تھی۔ کمال امروہوی کی اس قانونی دستاویز کے مطابق وہ تمام شیئرز جو محل پکچرز میں ان کے نام تھے۔ انہوں نے مرحومہ کے نام منتقل کر دیے تھے۔ کمال امروہوی نے اس دستاویز میں لکھا تھا۔ محل پکچرز کے جملہ املاک، تمام اکاؤنٹس، محل پکچرز کی پاکیزہ، پاکیزہ کا کل سامان۔ کمال اسٹوڈیو اور اس کے سارے متعلقات۔ تمہارے سارے کنٹریکٹ، ان کے معاوضے، تمہارا مکمل قانونی مستقبل، یہ سب اس کے علاوہ تمہارے تمام زیورات، کپڑے لتوں کی حفاظت سے سبکدوشی چاہتا ہوں۔''

کمال امروہوی نے اپنے اس خط میں صاف طور پر لکھا تھا۔ ''اب امروہہ میں میرے چند بوسیدہ مکانات مسکونہ کے علاوہ میرے یا میرے رشتے دار کے نام سے کوئی جائیداد نہیں ہے۔ بمبئی، امروہہ یا کسی دوسرے شہر میں میرا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے۔ سینٹرل بینک بمبئی کے ہیڈ آفس میں میرے نام سے ایک لاکر ہے۔ جسے دو سال سے استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی جانچ کرنے کا مختار نامہ اس کی چابی کے ساتھ تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔''

اگر کمال امروہوی کی تحریر سچ تھی تو اشوک اسٹوڈیو اور آر این مل کالونی کی لاکھوں کی زمین جس پر کمالستان اسٹوڈیو تعمیر کیا جا رہا تھا۔ وہ سب کیا تھا؟

کمال امروہوی نے اپنے خط میں بار بار فلم پاکیزہ کو مینا کی فلم لکھا ہے لیکن جب یہ فلم مکمل ہونے کے بعد اس سے لاکھوں روپے کا منافع ہو رہا تھا تو وہ منافع کس کا تھا؟

بقول کمال امروہوی کے پاکیزہ پر اس وقت تک چالیس لاکھ روپے کی لاگت آ چکی تھی اور کمال امروہوی نے مینا کو اپنے مستقبل کا نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے مستقبل کا واسطہ دے کر کہا تھا کہ اسے مکمل کرا دو۔ وہ چالیس لاکھ روپیا کس کا تھا؟ کیا صرف کمال امروہوی کا؟ جس کے پاس اس کی اپنی تحریر کے مطابق سرمایہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ صرف چند بوسیدہ مکانات تھے۔ کیا پاکیزہ پر مینا کماری کا ایک پیسا نہیں لگا تھا؟ اگر نہیں تو مینا کماری کے معاوضے کی رقم واجب الادا ہوتی ہے۔ مینا پانچ لاکھ کے معاوضے کی ہیروئن تھی۔ کیا کمال امروہوی نے مرحومہ کے معاوضے کی رقم ادا کر دی تھی؟

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ کمال واقعی باکمال شخصیت قلم کے ہی دھنی نہیں تھے۔ اپنی مثال آپ تھے۔

کمال امروہوی سے علیحدگی کے بعد مینا کماری اپنی زیرِ تکمیل فلموں، پورنیا، چندن کا پلنا، نور جہاں، بھیگی رات وغیرہ کی شوٹنگ میں جاتی تھی تو پولیس کے پہرے میں۔

اب کریم صاحب کی باتیں پڑھیے اور خود غور و فکر کیجیے۔

''مینا سے میری پہلی ملاقات انارکلی کی تکمیل کے دوران میں ہوئی تھی۔ ان دنوں کمال ''قلم کار'' کے لیے انارکلی بنارہے تھے۔ انارکلی تو نہیں بن سکی لیکن میں مینا کا منہ بولا بھائی ضرور بن گیا اور کمال صاحب سے میری دوستی اس حد تک گہری ہوگئی کہ ہمارے گھریلو مراسم ہوگئے۔ مینا سے میری اس حد تک قربت ہوگئی کہ میں اس کے کپڑوں کے ڈیزائن بھی تیار کرنے لگا۔ میں نے اس دوران میں مینا اور کمال میں بے حد محبت کا سلوک دیکھا۔ انہیں لڑتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جن دنوں مینا سخت بیمار تھیں اور کمال انہیں دیکھنے جاتے تھے تو وہ فوراً اٹھ کر کمال صاحب کے پیر دبانے لگتیں۔ یہ سچ ہے کہ ان میں بعد میں علیحدگی ہوگئی تھی مگر اس کی وجہ کمال نہیں مینا کماری کے رشتے دار ہیں۔ مینا اتنی جلدی ہرگز نہ مرتی اگر اس کی بہنیں اس کا خیال رکھتیں۔ یہ کرشمہ مینا کی چہیتی بہنوں کا ہی تھا کہ مینا کو شراب جیسی منحوس اور مہلک چیز پینے کی عادت پڑ گئی۔ جو ظلم مینا کے رشتے داروں نے مینا پر کیے وہ شاید کوئی غیر بھی کسی پر نہیں کرسکتا۔ مینا کی کمال صاحب سے محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کمال کے لیے پاکیزہ کی تکمیل کی ورنہ پاکیزہ کبھی مکمل نہ ہوتی۔ دراصل کمال اور مینا کے قضیے کو سلجھانے کی کسی شخص نے ایمانداری سے کوشش نہیں کی۔ مینا اگر زندہ ہوتی تو اب ضرور کمال کے یہاں واپس چلی جاتی۔''

جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی طرح سارے اخبار والے بھی ایک ہی فطرت اور طبیعت کے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ حقائق کی صحیح عکاسی کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی ایک صاف گو جرنلسٹ کی زبانی مینا کماری کے بارے میں کچھ باتیں سنیے۔

''میں لینڈ مارک کی گیارہویں منزل پر مینا کے فلیٹ کے عقبی برآمدے میں کھڑا ہوں۔ تڑپتی ہوئی موجیں ساحلی ریت کے خشک لبوں کی تشنگی بجھا رہی ہیں۔ میں کتنی بار لینڈ مارک کی اس گیارہویں منزل پر آیا ہوں۔ پہلی بار کب؟ یہ مجھے یاد نہیں لیکن آج سے قبل مینا کے سوم پر۔ وہ دن مجھے یاد ہے اور جب میں مینا کے گھر جواب مینا کی وصیت کے مطابق خورشید آپا کا گھر ہے۔ آیا ہوں تو برابر والے کمرے میں ایک حافظ کلام پاک کی تلاوت کررہے ہیں۔ مرحومہ مینا کماری کی بہن خورشید آپا مجھے مینا کی خواب گاہ میں لے آئی ہیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ۔ سامنے قرآن

مینا کی نظمیں

ودیعت

کہاں اب میں اس غم سے گھبرا کے جاؤں
کہ یہ غم تمہاری ودیعت ہے مجھ کو
نہ پھولوں کے جھرمٹ میں جی میرا بہلا
نہ راس آئی مجھ کو ستاروں کی محفل
سلگتی ہوئی غم کی تنہائیوں میں
یہی مجھ سے کہتا ہے میرا وحشی دل
مرا جینا مرنا تمہارے لیے تھا
تم ہی ہو مسیحا تم ہی میرے قاتل
ابھی تک تمہیں ڈھونڈتی ہیں نگاہیں
ابھی تک تمہاری ضرورت ہے مجھ کو

☆☆☆

بلاوا

دل میں پھر درد اٹھا
پھر کوئی بھولی ہوئی یاد
چھیڑتی آئی پرانی باتیں
دل کو ڈسنے لگیں گزری ہوئی ظالم راتیں
دل میں پھر درد اٹھا
پھر کوئی بھولی ہوئی یاد
بن کے نشتر
رگِ احساس میں اتری ایسے
موت نے لے کر مرا نام پکارا جیسے

☆☆☆

ٹوٹے رشتے جھوٹے ناطے

ٹوٹ گئے سب رشتے آخر
دل اب اکیلا روئے
ناحق جان ہے کھوئے
اس دنیا میں کون کسی کا
جھوٹے سارے ناطے
بس چلتا تو
ہم پہلے ہی اس دل کو سمجھاتے
ہم بھی نہ سمجھے دل بھی نہ سمجھا
کیسی ٹھوکر کھائی
اب ہم ہیں اور جیتے جی کی
درد بھری تنہائی

شریف، بائبل اور گیتا رکھی ہے۔ خورشید آپا کہہ رہی ہیں۔

"یہ سوکھے پتے، خشک ٹیڑھی میڑھی ٹہنیاں اور چھوٹے بڑے بھدے، کالے، سفید، بھورے، مٹیالے، بن ترشے بدصورت پتھر دیکھ رہے ہیں؟ یہ سب مینا نے جمع کیے تھے۔ اسے یہ جمع کرنے کا بہت چاؤ تھا۔ ان سب کے اس نے عجیب نام رکھے تھے۔ گھنٹوں ان بے کار چیزوں سے بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔"

عجیب سا حسرت ناک ماحول تھا۔ کتنی اداسی اور گھٹن تھی۔ پتھر، سوکھی ٹہنیاں، خشک پتے، قرآن کریم، بائبل اور گیتا۔ سب ہی کچھ تھا یہاں، بس وہی نہیں تھی۔ مینا ایک بدنصیب عورت۔ ایک خوش قسمت ہیروئن۔

خورشید آپا نے طاق میں رکھی گڑیا کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مسکراتی گڑیا خود مینا نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ دلہن کا سرخ جوڑا بھی اس نے سی کر اسے پہنایا تھا اور یہ شمع جو گڑیا کے قریب رکھی ہے اس کا مطلب ہم مینا کی زندگی میں نہیں سمجھ پائے لیکن اس کی موت نے یہ عقدہ بھی حل کردیا۔"

مینا کماری نے ایک بار اپنے اس شوق کے بارے میں خود بھی لکھا تھا۔

"میرا ایک دلچسپ مشغلہ یہ ہے کہ جہاں بھی ملیں، میں پتھر کے ٹکڑوں کو چن لیتی ہوں۔ خواہ وہ ریت میں پڑے ہوں، کیچڑ میں ہوں، پہاڑوں پر ہوں یا مٹی میں ہوں۔ مجھے اس سے بھی بحث نہیں کہ وہ خوب صورت یا سڈول ہوں، بھونڈے اور بیڈول پتھر بھی چن لیتی ہوں۔"

میرے ایک نوکر نے میری اس عادت کا مضحکہ اڑایا اور اس عادت کو بے وقوفی قرار دیا۔ اس نے ان پتھروں کی قسم اور ان کی جگہوں سے نفرت کی اور میری اس عادت کو یا شوق کو ناپسند کیا۔ اس نے اس شوق کو ایک بڑی فلم اسٹار کے شایان شان نہیں کہا۔ مجھے اس کی ان باتوں پر ہنسی آئی۔ میں اس نادان انسان کو کیسے سمجھاؤں کہ دنیا میں کوئی شے بے کار نہیں ہے اور کوئی چیز گندی یا بری نہیں ہے۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ ان بھدے پتھروں کے ٹکڑوں کے اندر کتنے حسین ٹکڑے چھپے ہوئے ہیں۔ میں اسے سمجھا نہیں سکتی اس لیے میں اس پر ہنسی اور پھر ان پتھروں کو اپنے سرہانے قرینے سے سجانے لگی۔

اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں، مینا کماری بہت بڑی اداکارہ تھی۔ اس بات کا اعتراف اس کی زندگی میں بھی ناقدین اور مبصرین نے کیا تھا اور اس کی موت کے بعد بھی اس کا اظہار کیا گیا اور آج بھی اس کے عظیم فن کی وجہ سے اسے خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

مینا کماری نے ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا تھا۔

بعض اوقات میرے فنکار ہونے پر کچھ لوگ مجھ سے محبت ضرور کرتے ہیں اور میری تعریف بھی کرتے ہیں لیکن مجھے جب اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے تو اس پر وہ پھر بددل ہو جاتے ہیں اور میں حیران رہ جاتی ہوں کہ یہ تبدیلی ان میں آئی ہے یا مجھ میں؟

کمال امروہوی جنہوں نے ایک بار کہا تھا۔ "میں جب چاہوں دس مینائیں بنا سکتا ہوں۔" مگر وہ مینا کماری کی موت کے بیس سال بعد تک کوئی دوسری مینا تو کیا کوئی دوسری پاکیزہ نہ بنا سکے۔ ان کی آخری فلم رضیہ سلطان تھی جسے انہوں نے یہ سوچ کر بنایا تھا کہ یہ بھی ان کی ایک بڑی فلم ثابت ہوگی مگر بڑے بجٹ کی اور بڑے پیمانے پر تشہیر کے باوجود باکس آفس پر فلاپ فلم ثابت ہوئی۔ یہی حال ان کی چوتھی شادی کا ہوا۔ یہ شادی انہوں نے مینا کماری کی موت کے بعد ایک خوب صورت مگر غیر معروف اداکارہ سے کی تھی جو ان سے عمر میں دوگنی چھوٹی تھی مگر اسے کمال امروہوی مینا کماری جیسی اداکارہ نہ بنا سکے نہ کامیاب خاتون خانہ۔ یہ شادی صرف تین سال بعد اپنے انجام کو پہنچ گئی اور پھر ایک دن موت کا نقارہ بجاتے ہوئے اجل کا قزاق آن موجود ہوا کہ چلو کمال امروہوی عرف چندن میاں ہمارے ساتھ۔ بہت ہو چکی دھماچوکڑی بہت دکھا چکے اپنا کمال اور سب ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر فروری 1993ء کو بنجارا کوچ کر گیا۔

ان کے بیٹوں اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ان کی تدفین ان کی دوسری بیگم محمودی کے پہلو میں ہو مگر ایسا نہ کیا جاسکا کیوں کہ محمودی بیگم کے پہلو میں کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں مینا کماری کے پہلو میں دفنایا جائے۔ کیوں کہ وہاں کافی جگہ خالی تھی کتنی بڑی اور کس قدر کشادہ قلب تھی مرنے والی کہ بیس سال سے اپنے پہلو میں اس لیے جگہ بچا کر رکھی تھی۔

"آؤ چندن میاں آؤ...... مجھے معلوم تھا کہ تم سکون کی تلاش میں میرے ہی پاس آؤ گے اور میرے ہی پہلو میں تم گہری نیند سوسکو گے۔"

مدھیہ پور کا چیتا

خالد قریشی

ہیجان انگیز کھیلوں میں شمار کیے گئے کھیل کو شکار کا نام دیا گیا ہے۔ اسے بادشاہوں کا کھیل قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ خطرے جابجا ہوتے ہیں۔ اگر مقابل میں چیتا ہو وہ بھی آدم خور چیتا تو سنسنی مزید بڑھ جاتی ہے۔

شکاریات پڑھنے والوں کے لیے ایک تحفہ

میرے گہرے دوست راجامان سنگھ اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر دوسرے ملکوں میں جاتے رہتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ چند ہفتوں میں لوٹ آتے تھے مگر بعض اوقات انھیں کئی ماہ وہاں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ مندرجہ ذیل کہانی کا تعلق ان دنوں سے ہے۔ جب وہ طویل عرصے کے لیے باہر گئے۔ جاتے وقت انہوں نے مجھے خاص طور پر ہدایت کی کہ میں ان کی جاگیر کی دیکھ بھال کرتا رہوں اور گاہے بگاہے وہاں جاتا رہوں۔ ایک دن اچانک مجھے مسز سنگھ



کے نگراں کا خط ملا۔ جس میں اس نے چیتے کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا اور یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے میرے دوست کی دو تین بہترین گائیں ہضم کرلی تھیں۔ خط پڑھتے ہی میں نے چیتے سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان دنوں میں نہایت ضروری کاموں میں الجھا ہوا تھا اور اگلے دو ہفتوں تک فرصت کی کوئی امید نہ تھی۔ مسٹر سنگھ کے نگران کے خط کو مجھ تک پہنچنے میں پہلے ہی چودن لگ گئے تھے۔ اس صورتِ حال میں میرا لڑکا ڈونلڈ میرے کام آیا اور اس نے چیتے سے نمٹنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ میں نے خوشی خوشی ہر فرض اسے تفویض کردیا لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ ڈونلڈ کس طرح مدھیانور کے قریب واقع راجا مان سنگھ ...... کی جاگیر تک پہنچے۔ کیونکہ میری کار کا ایک اہم پرزہ ٹوٹ گیا تھا اور میرے خط کے جواب میں متعلقہ کمپنی نے ابھی تک وہ پرزہ بمبئی سے روانہ نہیں کیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اگر اس جگہ سے ڈونلڈ اپنی داستانِ شکار خود بیان کرے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کیوں کہ یہاں سے آگے میں نے داستان میں مزید حصہ نہیں لیا ماسوا ڈونلڈ کو چند نصیحتیں کرنے کے۔

جب والد صاحب نے مجھے مدھیانور جانے کی اجازت دے دی تب پہلا مسئلہ سفر کے لیے کار کی دستیابی تھی۔ اچانک مجھے اپنے دوست رستم کا خیال آیا جس کے پاس دو تین کاریں تھیں۔ لہٰذا تھوڑی سی ترغیب کے بعد میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے رضامند کرلیا۔ سفر کے لیے تیاری کرنے میں مجھے تین چار گھنٹے لگے۔ روانہ ہونے سے پہلے مجھے اپنے ایک دوسرے دوست کا خیال آیا۔ اس کا نام سیڈرک بون تھا۔ وہ بہت اچھا فوٹوگرافر اور ایک عمدہ شکاری بھی تھا۔ سیڈرک سے پوچھا تو وہ بھی ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم تینوں مدھیانور کے راستے پر رواں دواں تھے۔ میرے پاس میری 423 ماؤزر رائفل تھی۔ جو 405 ونچسٹر رائفل سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ موخرالذکر رائفل میرے والد صاحب کے پاس ہے اور وہ جانتے ہیں کہ میری رائفل ان سے برتر ہے۔ اس کے باوجود روایت پسند ہونے کے سبب وہ اپنی پرانی رائفل ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ 423 ماؤزر کے علاوہ میں اپنی 3006 سپرنگ فیلڈ بھی ہمراہ احتیاطاً لے گیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے والد صاحب نے یہ بھی نصیحت کی کہ میں ہرن وغیرہ کے شکار سے احتراز کروں۔ میں ان کی نصیحتیں سن تو لیا کرتا ہوں مگر ان پر عمل کم ہی کرتا ہوں۔

مدھیانور کی آخری سترہ میل کی مسافت بے حد تکلیف دہ تھی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں پورے آٹھ گھنٹے لگے۔ مسٹر سنگھ کی جاگیر کے نگراں مسٹر آنند نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ والد صاحب کے نہ آنے پر وہ قدرے مایوس ہوا تھا۔ نوجوانوں کے سلسلے میں بڑی دقت یہ ہے کہ انہیں ذمہ دار تصور نہیں کیا جاتا مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہ بھی جوان ہوا کرتے تھے۔ مسٹر آنند نے ہمیں بتایا کہ گزشتہ تین روز میں چیتے نے گاؤں کے چند مویشیوں کے علاوہ مسٹر سنگھ کی ایک مزید عمدہ نسل کی گائے بھی ہلاک کردی تھی۔ سب سے فوری مسئلہ یہ تھا کہ چند جوان بچھڑے خریدے جائیں۔ اس معاملے میں رستم نے ہماری مدد کی۔ اس نے اپنی جیب سے چار جوان بچھڑے خریدے۔ جنہیں ہم نے ان مختلف جگہوں پر باندھ دیا جہاں چیتے نے مویشی ہلاک کیے تھے۔ ان میں سے پہلا بچھڑا مسٹر سنگھ کی جاگیر اور جنگل کی سرحد کے ساتھ باندھا گیا۔ دوسرا بچھڑا نصف میل دور ایک ایک جھیل کے کنارے جس کے چاروں طرف گھنے بانسوں کا جنگل تھا۔ تیسرا بچھڑا مدھیانور گاؤں کے قریب اور چوتھا بچھڑا اس راستے پر جو مدھیانور کی طرف آتا تھا۔ میں اپنے ہمراہ والد صاحب کی مچان نہ لایا تھا۔ کیوں کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ مسٹر سنگھ کی جاگیر پر مجھے ان کی مچان مل جائے گی۔ میرا منصوبہ تھا کہ جونہی کوئی بچھڑا ہلاک ہوجائے گا اس کے قریب درخت پر مچان لگا کر بیٹھ جاؤں گا۔ ہم نے چاروں بچھڑوں کو زمین میں کھونٹے گاڑ کر ان کی پچھلی ایک ایک ٹانگ رسوں کی مدد سے باندھ دی تھی۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ ایسے بیل یا بچھڑوں کی گردن میں رسہ باندھنا سخت غلطی ہوتی ہے۔ بعض اوقات چیتا اور خصوصاً شیر ایسے جانور پر حملہ نہیں کرتا۔ یہ درندے اپنے شکار کی گردن پر حملہ کرتے ہیں اور شکار کی گردن میں رسہ دیکھ کر انہیں شک پڑ جاتا ہے کہ انہیں پھانسنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ہو۔

شام کے وقت ورگیس نے ہمیں بتایا کہ وہ گزشتہ دو راتوں سے بنگلے کے نزدونواح میں ایک شیر کی آواز سن رہا تھا۔ لہٰذا میں نے جلدی سے بنگلے کے قریب والے بچھڑے کے پاؤں سے رسہ کھول کر وہاں لوہے کی زنجیر باندھ دی۔ ایسا میں نے اس خیال کے تحت کیا تھا کہ اگر شیر رات کے وقت بنگلے کے قریب والے بچھڑے کو ہلاک کردے تو زنجیر

کے سبب اسے اٹھا کر نہ لے جاسکے۔ چونکہ جاگیر میں اور کوئی زنجیر موجود نہ تھی۔ لہٰذا میں نے باقی تینوں بچھڑے رسوں سے بندھے رہنے دیے۔ رستم اس رات مدھیا نور کے گردونواح کے کھیتوں میں خنزیر کا شکار کھیلنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا کیوں کہ گولی کی آواز سے چیتے کو ہراساں کرنا مناسب نہ تھا۔ اگلی صبح معائنہ کرنے پر چاروں بچھڑے زندہ ملے۔ جس پر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔

والد صاحب نے مجھے سکھا رکھا تھا کہ شکار میں بڑے ضبط اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے رستم کو سمجھایا کہ وہ صبر سے کام لے اور آیندہ ایک دو روز تک چیتے کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی امید نہ رکھے۔ تیسری رات چیتے نے وہ بچھڑا ہلاک کر دیا۔ جسے ہم نے بنگلے کے قریب باندھا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اتفاق بھی ہوا کہ ایک شیر نے اس رات وہ بچھڑا بھی ہلاک کر دیا جو جھیل کے قریب بانس کے درختوں کے اندر باندھا گیا تھا۔ اب مجھے ایک عجیب مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ”چیتے کو دفع کرو۔ پہلے شیر سے نمٹنا چاہیے لیکن دوسرے حالات پر غور کرنا ضروری تھا۔ رستم نے مجھے یاد دلایا کہ میں مدھیا نور والوں کو اس چیتے سے نجات دلانے کے لیے آیا تھا۔ جو ان کے اور مسٹر سنگھ کے مویشیوں کے لیے ایک مسلسل خطرہ بن گیا تھا۔ اس کے برعکس شیر تو اتفاقاً ادھر چلا آیا تھا اور بچھڑے کو دیکھ کر اسے اپنا شکار بنا لیا تھا۔ لہٰذا میرا فرض تھا کہ میں پہلے چیتے سے نمٹوں، میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اور اس کی جگہ اگر والد صاحب ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے۔ شیر پر گولی چلانے کا موقع ہاتھ سے کھونے کو جی نہ چاہتا تھا۔ میں نے ہر طرح رستم کو ترغیب دی کہ وہ چیتے کے انتظار میں بیٹھے مگر وہ اس بات پر اڑا رہا کہ چونکہ مجھے چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لہٰذا اس سے نمٹنا میرا فرض تھا۔ آخر صورتِ حال کے پیشِ نظر مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

فوٹو گرافر سیڈرک نے میرے ساتھ آنا پسند کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے ساتھ رہ کر چیتے کو دیکھنے کا زیادہ امکان تھا۔ بہ نسبت رستم کے ساتھ جا کر شیر کو دیکھنے کا اس نے مجھ سے کہا تھا کہ رستم مچان پر اس قدر شور کرے گا کہ شیر اپنے شکار پر آتے ہی بھاگ جائے گا۔ بہرحال میں نے مسٹر سنگھ کی مچان لی اور سرِشام مردہ بچھڑے سے تقریباً تیس گز دور ایک درخت پر اسے باندھ دیا۔ دوسرے مردہ بچھڑے کے قریب درخت پر مچان تیار کرانے کے لیے رستم کو دیہاتیوں کی مدد لینی پڑی۔ میں یہ بات لکھنا بھول گیا ہوں کہ بچھڑوں کو باندھتے وقت ہم نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ ان کے قریب کوئی نہ کوئی درخت ضرور ہو۔ تاکہ بعد میں مچان تیار کرنے کے لیے ہمیں کوئی دقت نہ اٹھانی پڑے۔ دونوں پارٹیاں شام کے چار بجے بنگلے سے روانہ ہو گئیں۔

رستم کو زیادہ فاصلہ طے کرنا تھا۔ لہٰذا وہ مسٹر آنند کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ رات بسر کرنے کے لیے اس نے ضروری اشیاء مثلاً سینڈوچ بسکٹ، پانی کی بوتل، ٹارچ اور مفلر وغیرہ لے لیں تھیں۔ ان دونوں کے جانے کے بعد سیڈرک اور میں بھی اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔ کسی مچان پر بیٹھنا ایک بیزار کن کام ہے اور میرے لیے اس پر خاموش رہنا انتہائی مشکل ہے۔ والد صاحب مجھے کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ مچان پر بے حس و حرکت ایک بت کی طرح بیٹھے رہنا بے حد ضروری ہے۔ وہ ایسا کس طرح کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میں ان کے ہمراہ کئی دفعہ مچان پر بیٹھا ہوں۔ وہ اپنی ٹانگیں تہہ کر کے اپنے نیچے کر لیتے ہیں۔ تھرماس میں سے چائے وغیرہ پیتے ہیں اور پھر باقی رات کے لیے بت بن جاتے ہیں لیکن ایسی صورتِ حال میں مجھے بے چینی سی لگی رہتی ہے۔ میرے پاؤں اور ٹانگوں میں سوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ میری پشت اکڑ کر درد کرنے لگتی ہے اور مچھر میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ مجھے فقط کاٹتے ہی نہیں بلکہ میرے کانوں اور نتھنوں میں گھس جاتے ہیں۔ ان سے نجات پانے کا یہی طریقہ ہے کہ جونہی وہ پاؤں وغیرہ پر بیٹھیں انہیں ہاتھ مار کر ہلاک کر دیا جائے لیکن والد صاحب نے مجھ سے کہہ رکھا ہے کہ مچان پر ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔ شاید وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ان کے پرانے خون کی نسبت مچھروں کو میرا تازہ خون زیادہ لذیذ محسوس ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارے بزرگوں کو نصیحت وغیرہ کرنے میں کس قدر مزہ آتا ہے۔

سات بج چکے تھے اور اس دوران میں مچھروں نے سیڈرک اور مجھ پر اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ میں نے سیڈرک کو پہلے ہی ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مچھروں کو مارنے کی کوشش نہ کرے۔ یہی بات تھی کہ جب بھی میں کسی مچھر کو مارتا تو وہ میرے پہلو میں کہنی چبھو دیتا۔ وقت گزرتا گیا اور آٹھ بجے کے قریب ایک لمبی سی چیز جو

اندھیرے میں خاکستری دکھائی دیتی تھی نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ وہ چاندنی رات نہ تھی مگر ہر طرف ستاروں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور شاید آپ اس حقیقت سے واقف نہ ہوں کہ جنگل میں ستاروں کی روشنی زیادہ چمکیلی ہوتی ہے۔ اس روشنی میں درختوں اور دوسری چیزوں کو دیکھا جاسکتا تھا لیکن مردہ بچھڑا دکھائی نہیں دیتا تھا کیوں کہ اس کا رنگ کالا تھا۔ وہ خاکستری سایہ حرکت کرتا ہوا اس طرف آیا۔ جدھر مردہ بچھڑا پڑا ہوا تھا۔ پھر مجھے بچھڑے کے پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد گوشت کھانے اور ہڈیاں ٹوٹنے کی مدھم آوازیں خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ میں آہستہ سے رائفل کو کاندھے تک لایا مگر بدقسمتی سے میری ٹارچ جو رائفل کی نالی کے ساتھ نصب تھی۔ اچانک درخت کی بڑی شاخ کے ساتھ ٹکرا گئی اور فضا میں ہلکا سا شور ابھرا۔ اس شور پر بچھڑے کی جانب سے ایک بلند غرغراہٹ سنائی دی اور خاکستری سایہ میری بائیں جانب جنگل میں حرکت کرنے لگا۔ دوسرے لمحے وہ میری نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ دس منٹ کے بعد دوبارہ نمودار ہوا مگر اس دفعہ میری دائیں طرف اور میرے عین نیچے۔ پھر مجھے چاٹنے کی آواز سنائی دی اور چیتا کتے کی طرح بچھڑے کے قریب اپنی اگلی ٹانگیں آگے کی سمت پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس دفعہ میں نے رائفل بڑی احتیاط کے ساتھ اٹھائی اور ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ ٹارچ کی روشنی عین چیتے کے اوپر پڑی۔ جو مجھ سے بیس گز دور پیٹ کے بل بیٹھا تھا۔ پھر میں نے رائفل کا گھوڑا دبا دیا اور 423 دندنا اٹھی۔ چیتا دائیں پہلو کے بل گرا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا کام تمام ہو گیا ہے مگر اچانک وہ تیزی کے ساتھ اٹھا اور چھلانگ لگا کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

اس دوران میں سیڈرک نہایت جذباتی ہوتا رہا۔ جونہی چیتا نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہوا۔ وہ درخت سے چھلانگ لگانے کی تیاری کرنے لگا مگر میں نے اسے روک لیا وہ میرے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔

آؤ اس کے پیچھے چلیں لیکن میں نے اسے بتایا کہ احمق بننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں چیتے کا تعاقب کرنے کے لیے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہم مزید ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھے رہے پھر مچھر اس قدر ناقابلِ برداشت ہو گئے کہ ہم نے واپس بنگلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں پہلے اترا اور سیڈرک نے مجھے میری رائفل پکڑائی۔ رائفل پکڑنے کے بعد میں نے اسے کاندھے کے ساتھ لگا لیا۔ سیڈرک درخت سے نیچے اتر رہا تھا جب وہ چھ فٹ اوپر رہ گیا تو اس نے درخت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ جونہی وہ دھم کے ساتھ زمین پر گرا ہمیں اپنے قریب سے ایک گرج سنائی دی۔ میں جلدی سے مڑا اور ٹارچ کو روشن کر کے رائفل کا منہ آواز کی طرف کر دیا لیکن ہمیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ دو چار منٹ انتظار کر کے ہم چند قدم آگے بڑھے لیکن وہاں گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور اندھیرے میں ان کے اندر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پھر ہم اس جگہ گئے جہاں میں نے چیتے پر گولی چلائی تھی۔ میں نے زمین کا جائزہ لینا شروع کیا مگر ٹارچ کی روشنی میں مجھے خون دکھائی نہیں دیا۔ اچانک دل ہلا دینے والا یہ خیال میرے ذہن میں ابھرا کہ کہیں میرا نشانہ خطا تو نہیں گیا تھا میں نے سرگوشی کے عالم میں سیڈرک کو بتایا مگر اسے یقین تھا کہ میری گولی چیتے کو لگی تھی اس کے باوجود صورتِ حال مشکوک تھی۔ لہٰذا میں نے دوبارہ مچان پر بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید نشانہ خطا ہونے کی صورت میں چیتا دوبارہ اپنے شکار پر آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے خود بھی چیتے کے دوبارہ آنے کی اُمید نہ تھی۔

باقی کی رات بے آرام گزری۔ مچھروں اور رات کے آخری وقت سردی نے ہماری حالت بری کر دی۔ بہرحال جوں توں کر کے وقت گزرا۔ صبح کے وقت ہماری حالت قابلِ دید تھی۔ درخت سے اترنے کے بعد ہم سورج طلوع ہونے کی اُمید لیے گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ جسموں کو تھوڑی دیر دھوپ میں گرم کرنے اور سکڑنے ہوئے اعضا کو آرام پہنچانے کے بعد ہم چیتے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ سات بجے کے بعد ہم چیتے کے خون کی تلاش میں نکل پڑے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے یہ جان کر بے حد خوشی کا احساس ہوا کہ جس جگہ سے چیتا گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوا تھا وہاں خون کے چند خشک قطرے پتوں پر جمے ہوئے تھے۔ پھر چالیس گز آگے مجھے زمین پر چیتے کا بہت سا خون دکھائی دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ چیتے کو گہرا زخم آیا تھا اور وہ تکلیف سے نڈھال ہو کر اس جگہ آرام کرنے کی نیت سے لیٹا تھا۔ گزشتہ شب سیڈرک کی آواز سن کر اس جگہ سے وہ بڑی جرأت سے غرایا تھا۔

اس وقت مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ رات کو چیتے نے ہم پر حملہ نہ کر کے بڑا احسان کیا تھا۔ بہر حال اس جگہ سے خون کی لکیر ایک سو گز تک صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ فاصلہ طے کرتے وقت چیتا ایک دفعہ مزید لیٹا تھا اور یہ بات میرے اس خیال کی تصدیق کرتی تھی کہ اسے گہرا زخم آیا تھا۔ پھر خون کی یہ لکیر مدھم ہوتی چلی گئی جس سے میں نے اندازہ کر لیا کہ گولی کے زخم کے آگے چربی وغیرہ آ گئی ہوگی جس کے سبب خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ وہاں گھاس اور جھاڑیاں خاصی گھنی تھیں۔ لہٰذا ہم بڑی احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے لیکن چیتا کہیں دکھائی نہ دیا۔ راستہ آگے نکلتا چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں کو بغور دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اس طرح ہم نے کوئی سو گز کا فاصلہ طے کیا۔ سیڈرک مجھ سے بیس قدم پیچھے ہاتھ میں کیمرا تھامے چلا آ رہا تھا پھر اچانک یہ واقعہ رونما ہوا مجھ سے چند قدم آگے چیتا ایک جھاڑی سے گرج دار آواز کے ساتھ نمودار ہو کر عقب سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں برق رفتاری سے پیچھے مڑا اور اسے اپنی سمت آتے ہوئے دیکھ لیا۔ خوش قسمتی سے میری گزشتہ شب کی گولی اس کے داہنے اگلے بازو پر لگی تھی اور وہ اسے گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ ورنہ اس نے مجھے مڑنے کی مہلت کب دینی تھی۔ میں نے جلدی سے نشانہ لیا اور گولی اس کی گردن میں اتار دی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے لڑکھڑایا مگر پھر آگے بڑھنے لگا۔ اس عرصے میں مجھے دوسری گولی چلانے کا موقع مل گیا۔ دوسری گولی چلانے کے بعد میں نے دیکھا کہ سیڈرک عین چیتے کے عقب میں تھا اور اگر میرا نشانہ خطا جاتا۔ تو سیڈرک یقیناً گولی کی زد میں آ جاتا مگر اس عرصے میں وہ چیتے کے حملے اور اسے گولی لگنے کی تصویر اتار چکا تھا۔ سیڈرک کو اس خطرناک صورتِ حال میں تصویر اتارنے کی کس طرح جرأت ہوئی۔ اس بات نے مجھے عرصہ دراز تک حیرت میں ڈالے رکھا حالانکہ سو میں سے ننانوے آدمی ایسی صورتِ حال میں بھاگ جاتے ہیں۔ اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ وہ کس قدر جوشیلا فوٹو گرافر ہے۔ فقط ایک تصویر کے لیے اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال لی۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کیمرے کو فوکس کر کے بلا سوچے سمجھے بٹن دبا دیا تھا۔

جب ہم یہ اچھی خبر سنانے کی خاطر بنگلے کی طرف بھاگے تو رستم اور ورگیس پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ مچان پر رات کے دو بجے تک بیٹھے تھے چونکہ شیر اس وقت تک نہیں آیا تھا اور مچھروں نے کاٹ کاٹ کر ان کا برا حال کر دیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے واپس بنگلے میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نو بجے تک ہم چیتے کو اٹھا کر بنگلے میں لے آئے۔ اس کی کھال اتارنے میں ایک گھنٹا صرف ہوا۔ وہ خاصا بڑا چیتا تھا۔ پیمائش کرنے پر وہ پانچ فٹ آٹھ انچ لمبا نکلا۔ وقت سے پہلے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے رستم کو رائے دی کہ ہمیں چل کر وہ بچھڑا دیکھنا چاہیے جس پر وہ رات کو شیر کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس دوران ورگیس نے تیسرے اور چوتھے بچھڑے کو دیکھنے کے لیے آدمی بھیج دیے تھے اور انہوں نے آ کر اطلاع دی تھی کہ وہ دونوں زندہ ہیں۔ جب ہم رستم کی مچان پر پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ شیر رستم کے چلے آنے پر وہاں آیا تھا۔ شاید اس نے رستم اور ورگیس کو مچان پر بیٹھا دیکھ لیا تھا اور جب وہ وہاں سے اتر آئے تو اپنے شکار پر پہنچ گیا۔ اس نے بچھڑے کا تین چوتھائی حصہ کھا لیا تھا۔ رستم کو بڑی مایوسی ہوئی مگر اس نے دوبارہ وہاں بیٹھنے کا تہیہ کر لیا۔ پھر اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے ورگیس کے ہمراہ ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ چوتھا بچھڑا کھول کر وہاں لے آئے۔ انہیں واپس پہنچنے میں دو گھنٹے لگے۔ ہم نے اسے مردہ بچھڑے سے تقریباً تیس گز دور باندھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ شیر مردہ بچھڑے پر شاید دوبارہ آئے اور وہاں کچھ نہ پا کر زندہ بچھڑے پر حملہ کر دے لیکن رستم کو میرے خیال سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیر اسی جگہ ایک زندہ بچھڑا دیکھ کر ڈر جائے گا۔ بہرحال میرے سمجھانے پر وہ مجھ سے متفق ہو گیا۔

کوئی ساڑھے پانچ بجے ہم تینوں یعنی رستم، سیڈرک اور میں ضروری سامان لے کر مچان پر جا بیٹھے۔ ہم نے سب سے پہلے یہ کیا کہ مچان پر سے پرانے اور خشک پتے ہٹا کر وہاں تازہ پتے رکھوا دیے۔ تا کہ ان کے درمیان ہم تینوں آسانی سے چھپ سکیں۔ فیصلہ ہوا کہ شیر کے آنے کی صورت میں سب سے پہلے رستم گولی چلائے گا اور اس کے بعد میں۔ سیڈرک نے اپنے کیمرے کے ساتھ فلیش نصب کر لیا تھا۔ وہ ایک دوسری ولولہ انگیز تیاری کر کے آیا تھا۔ شام ہوتے ہی مچھروں نے ہم پر یلغار کر کے پھر سے ہمارا جینا دوبھر کر دیا مگر ہم جوان اور جذبات سے بھرپور تھے۔ رستم عرصہ دراز سے ایک شیر شکار کرنے کی فکر میں تھا اور یہ

موقع اسے بڑی مشکل سے ہاتھ آیا تھا۔ آٹھ نو اور پھر دس بج گئے۔ تھوڑی دیر بعد پہاڑیوں کی طرف سے ایک شیر کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اندازاً ایک میل دور سے آرہی تھی۔ تقریباً پون گھنٹا گزر گیا۔ تب اچانک میری بائیں سمت سے بانسوں کے ایک جھنڈ سے کنکر کی تیز آواز آئی۔ صاف ظاہر تھا کہ شیر ہماری سمت آرہا تھا۔ ہم تینوں ایک دم چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔ شدت جذبات سے ہمارا دم گھٹ رہا تھا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔

مچان پر گزشتہ شب کی نسبت زیادہ اندھیرا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آس پاس بانسوں کے گھنے درخت موجود تھے۔ میں نے رستم کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ اتنی دیر تک انتظار کرے۔ جب تک شیر نئے بیل پر حملہ نہ کر دے یا وہ اپنے پرانے شکار پر نہ آئے۔ پھر میں اپنی ٹارچ کے ذریعے اسے گولی چلانے میں مدد دوں گا۔ خوش قسمتی سے شیر کو زندہ بچھڑا پسند آیا ہم اسے اندھیرے میں تھوڑا بہت دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں بیل کے ڈکرانے اور رسی سے آزاد ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے آنے والے خطرے کو دیکھ لیا تھا اور اب اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ دس منٹ تک مکمل خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ایک تیز غراہٹ سنائی دی۔ شیر زندہ بچھڑے پر پل پڑا۔ رستم شدت جذبات سے کانپ رہا تھا۔ اس کے حواس بحال رکھنے کے لیے میں نے اس کا ایک شانہ مضبوطی کے ساتھ پکڑ رکھا تھا۔ پھر بچھڑے کے گلے سے کھرکھر کی ایسی آواز نکلی جو گردن ٹوٹ جانے پر نکلا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ میں نے بدستور رستم کا کاندھا مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ اس کے بعد دس منٹ تک مزید خاموشی طاری رہی۔ پھر شیر زمین پر بیٹھ کر بچھڑے کو چیرنے پھاڑنے لگا۔

ہم اب بھی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شیر بچھڑے کی آنتیں الگ کر رہا ہو۔ اس وقت تک شیر اپنے شکار کی طرف پوری طرح متوجہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے رستم کا شانہ چھوڑتے ہوئے اسے گولی چلانے کی تیاری کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ رائفلیں اوپر اٹھائیں کوئی دس سیکنڈ کے بعد میں نے اپنی ٹارچ کا بٹن دبا دیا جب شیر پر روشنی پڑی تو اس نے لیٹے لیٹے گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ اسی لمحے رستم نے بھی اپنی ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ دو ٹارچوں کی روشنی میں شیر صاف طور پر ہمیں اپنی طرف گھورتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چند سیکنڈ گزر گئے۔ میں حیران تھا کہ آخر رستم گولی کیوں نہیں چلا رہا تھا اور پھر جب میں اپنی رائفل کا گھوڑا دبانے ہی والا تھا تو مجھے رستم کی دو نالی رائفل 450/400 کی گرج سنائی دی۔ رستم نے ایک ساتھ دونوں گولیاں چلا دیں۔ اسے رائفل کا خاصا زور سے دھکا لگا ہوگا۔ اس کے باوجود دونوں گولیاں صحیح نشانے پر بیٹھی تھیں اور وہ کاندھے کے اوپر شیر کی گردن میں پیوست ہو گئی تھیں۔ شیر نے بڑی تیزی سے جنبش کی اور آگے کی سمت جھک گیا جیسے سونے کی تیاری کر رہا ہو۔ اس کی دم چند مرتبہ ہلنے کے بعد ساکت ہو گئی۔ رستم نے اپنا پہلا شیر مار لیا تھا۔ ہم مزید نصف گھنٹے تک انتظار کرتے رہے لیکن شیر نے کسی قسم کی حرکت نہ کی۔ پھر ہم مچان سے نیچے اتر آئے مگر ہماری ٹارچیں ابھی تک شیر پر جمی ہوئی تھیں۔ ہمارے قریب پہنچنے پر بھی شیر نے جنبش نہ کی۔ ظاہر ہے وہ مر چکا تھا۔ رستم خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے ایک شیر شکار کر لیا تھا۔ پیمائش کرنے پر وہ سات فٹ چار انچ نکلا۔

ہم خوشی خوشی بنگلور واپس چلے آئے۔ رستم شیر کا شکار کرنے اور میں مدھیا نور کو چیتے سے نجات دلانے پر خوش تھا مگر ہم دونوں کی نسبت سیڈرک زیادہ خوش تھا جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ایک بہترین فوٹو اتاری تھی اگر میری بجائے چیتا اس پر حملہ کر دیتا تو اس صورت میں یا تو اسے گہرے زخم آتے یا پھر اسے تکلیف دہ موت کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب میں نے والد صاحب کو سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے ہمیں مبارک باد دی لیکن اس وقت تک انہیں یہ پتا نہ چلا تھا کہ سیڈرک کس طرح معجزانہ انداز میں میری گولی اور چیتے کے حملے سے بچا تھا۔ دوسرے دن جب انہوں نے تصویر دیکھی تو وہ ہمیں ملامت کرنے لگے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ وہ یونہی بے سود ناراض ہو رہے تھے۔ مگر اب جان گیا ہوں کہ وہ ہمیں ملامت کرنے میں حق بجانب تھے۔ میں نے دو بڑی غلطیاں کی تھیں۔ اول چیتے کو تلاش کرتے وقت میں نے جھاڑیوں کو بغور کھنگالا تھا اور چیتے کو دیکھے بغیر آگے گزر گیا تھا۔ دوم اپنی ولولہ انگیزی میں یہ دیکھے بغیر میں نے گولی چلا دی تھی کہ میری گولی کی عین سیدھ میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ لیکن وہ جو کہاوت ہے کہ تقدیر متبدیوں کی مدد کرتی ہے۔ واقعی سولہ آنے صحیح ہے۔



ڈارون کا سفر

طارق عزیز خان

ڈارون نے نظریہ ارتقا پیش کر کے پوری دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اس نے تخلیقِ انسان کی تاریخ جانچنے کے لیے ایک طویل تحقیقاتی سفر اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انسان قبل از تاریخ درختوں پر رہتا تھا۔ یہ بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

ایک محقق کے تاریخی سفر پہ تحقیقی تحریر

انگریز ماہر حیاتیات چارلس رابرٹ ڈارون کو نظریہ ارتقاء کا بانی مانا جاتا ہے۔ تاہم اس کہانی میں اس کا نام بطور مہم جو شامل کیا گیا ہے۔ درحقیقت ڈارون کے نظریے کی بنیاد اس کا 1831-36ء کے دوران کرۂ ارض سے گرد کیا گیا سمندری سفر ہے جو مغربی سائنس کی تاریخ میں سب سے زیادہ سودمند سفر ثابت ہوا۔ ڈارون نے اپنے اس تاریخی سفر کے دوران دنیا کے مختلف علاقوں میں پائی جانے والی حیات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس نے اپنے تجربات

و مشاہدات پر مبنی کتاب (On the Origin of Species) تحریر کی، جس سے اسے شہرت دوام حاصل ہوئی۔

چارلس رابرٹ ڈارون 12 فروری 1809ء کے دن وسطی انگلینڈ کے شہر شریوسبری میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے والدین کے چھ بچوں میں پانچویں نمبر پر تھا۔ اس کے والد رابرٹ ڈارون اور دادا ایراسمس ڈارون ماہر طب جبکہ نانا جوزیا ویجووڈ کامیاب تاجر تھے۔ اس نے 1825ء میں شریوسبری کے ہائی اسکول سے گریجوایشن مکمل کی اور طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکاٹ لینڈ کی ایڈنبرگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ تاہم اسے یہ شعبہ غیر دلچسپ لگا اور وہ 1827ء میں مذہبی تعلیم کے لیے انگلینڈ کی کیمبرج یونیورسٹی چلا آیا۔ کیمبرج میں ڈارون کو ماہر ارضیات ایڈم سیڈوک اور ماہر طبیعات جون سٹیونز ہینس لو (John Stevens Henslow) کی صحبت ملی۔ خاص طور پر ہینس لو کی قربت سے ڈارون کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔

1831ء میں ڈارون نے کیمبرج سے مذہبی علوم میں ڈگری لی تو ہینس لو نے اسے کرۂ ارض کے مطالعاتی دورے کی دعوت دی۔ ڈارون نے یہ پیش کش قبول کرلی جس کے بعد اسے بادبانی بحری جہاز ایچ ایم ایس بیگل پر "ماہر طبعی تاریخ" کا عہدہ دیا گیا۔ شروع میں ڈارون کے والد اس کے سمندری سفر سے خوش نہیں تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ یہ سفر اس کے بیٹے کو زندگی میں سنجیدگی سے کوئی کام کرنے میں مزید تاخیر کا باعث بنے گا۔ تاہم ہینس لو نے اس کے والد کو سفر کی اجازت دینے کے لیے قائل کرلیا۔

ایچ ایم ایس بیگل نے 27 دسمبر 1831ء کے دن پلے ماؤتھ کی بندرگاہ سے لنگر اٹھائے تو 22 سالہ چارلس ڈارون بھی اس پر سوار تھا۔ بیگل نے جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے جنوری 1832ء کے دوران شمالی بحر اوقیانوس میں میڈیرا کے جزائر کینری کے جزائر اور کیپ ورڈے کے جزائر میں مختصر قیام کیا۔ اس نے فروری کے دوران خط استواء پار کرکے جنوبی بحر اوقیانوس میں رسائی حاصل کی اور برازیل کے شمال مشرقی علاقے باہیا میں لنگر گرائے۔ چارلس ڈارون نے مارچ 1832ء سے دسمبر 1832ء کے دوران برازیل، یوراگوئے اور ارجنٹائن کی سیاحت کی۔ برازیل کے استوائی خطے میں کیڑے مکوڑوں پر تحقیق کے دوران زہریلی چیونٹیوں کے کاٹنے سے ڈارون کو جلدی بیماری لاحق ہوگئی۔ تاہم اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس نے برازیل کی بندرگاہ ریو ڈی جنیرو میں بسنے والے گورانی قبائل کے رسم و رواج کو قریب سے دیکھا۔ ڈارون کا بحری جہاز، یوراگوئے کے دارالحکومت مونٹی ویڈیو میں رکتا ہوا ارجنٹائن کے دارالحکومت بیونس آئرس پہنچا۔ ڈارون نے بیونس آئرس سے ایک کشتی کرائے پر لے کر دریائے پرانا کی سیاحت کی۔ ڈارون کے لیے پیٹاگونیا (جنوبی ارجنٹائن) کے سرد ویرانے میں اٹھکیلیاں کرتے شتر مرغ گرے ہیا اور بغیر کوہان کے اونٹ جیسے دکھنے والے جانور لاما کا نظارہ دلچسپ تھا۔ اس کی ٹیم نے پیٹاگونیا میں کھدائی کے دوران لاکھوں سال پرانی ہڈیاں اور پتھر (Fossils) دریافت کیے۔ ایچ ایم بیگل، جنوری 1833ء میں جنوبی بحر اوقیانوس میں واقع برطانوی جزائر فاک لینڈ پہنچا۔ چارلس ڈارون نے اگلے چند ماہ کے دوران فاک لینڈ میں پائے جانے والے پینگوئن اور دیگر سمندری پرندوں پر تحقیق کی۔ وہ نومبر 1833ء میں ایک بار پھر ارجنٹائن کے علاقے پیٹاگونیا پہنچا۔ اس نے جنوری 1834ء سے مئی 1834ء کے دوران چلی اور ارجنٹائن کے جنوبی علاقوں پر مشتمل علاقے ٹیرا ڈیل فیوگو کی سیاحت کی۔ ڈارون نے ٹیرا ڈیل فیوگو کی خشک اور جھلسی ہوئی سرزمین سے پتھروں کے نمونے اکٹھے کیے۔ ایچ ایم بیگل جون 1834ء میں جنوبی امریکا کی ٹیل کیپ ہارن کے گرد گھوم کر بحر الکاہل میں داخل ہوا۔ ڈارون نے جولائی سے مارچ 1835ء کے دوران چلی، پیرو اور ایکویڈور میں پائے جانے والے آثار قدیمہ پر تحقیق کی۔ اس نے انڈیز کے سلسلۂ کوہ میں رہنے والے قدیم کوئے چواقی قبیلوں سے ملاقات کی۔ اس نے پیرو کی انکا تہذیب کے آثار دیکھے۔ پیرو اور ایکویڈور میں قیام کے دوران ڈارون کو متعدد بار زلزلے کا تجربہ ہوا۔ ایکویڈور کے بعد بیگل کی اگلی منزل بحر الکاہل کے کھلے سمندر میں واقع گلاپاگوس کے استوائی جزائر تھے، جہاں وہ اپریل 1835ء میں پہنچا۔

جنوب مشرقی بحر الکاہل میں عین خط استواء پر ایکویڈور کے زیر کنٹرول گلاپاگوس کے 13 بڑے اور 107 چھوٹے جزائر واقع ہیں۔ ان جزائر کا کل زمینی رقبہ 7964 مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی 30 ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ گلاپاگوس کے بڑے جزائر میں ازابیلا، سانتا کروز، سان کرسٹوبل اور سان سیلویڈور نمایاں ہیں۔ جزائر کا علاقائی

دارالحکومت Puerto Baquerizo Moreno ہے جو سان کرسٹوبل کے جزیرے پر واقع ہے۔ ازابیلا سب سے بڑا جزیرہ ہے جس پر ایک درجن کے قریب زندہ آتش فشاں پہاڑ موجود ہیں۔ گلاپاگوس کے جزائر سارا سال بارش کی زد میں رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے اور اوسط درجۂ حرارت 25 سے 32 ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔

گلاپاگوس پر نہ تو مسلسل بہنے والا کوئی دریا موجود ہے اور نہ ہی میٹھے پانی کی کوئی جھیل۔ تاہم جزائر پر پائی جانے والی جنگلی حیات کی نشو و نما کے لیے میٹھے پانی کی ضرورت یہاں ہونے والی بارشوں سے بخوبی پوری ہو جاتی ہے۔ گلاپاگوس کے جزائر کو نایاب جنگلی حیات کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہاں پرندوں کی 185 اقسام پائی جاتی ہیں۔ جن میں فیلمنگو، سرمئی پینگوئن، البٹروس، سمندری عقاب، سرخ فلائی کیچر، نہ اڑنے والے پرندے کور مورینٹ اور چھوٹی چڑیا نمایاں ہیں۔ گلاپاگوس کی فنچ کو ڈارون فنچ بھی کہا جاتا ہے۔ گلاپاگوس پر ملنے والے جانوروں میں فرسیلز، کچھوے، سرخ چٹانی کیکڑے اور سمندری چھپکلی اگوانا اہم ہیں۔ یہاں کچھوے کی چھ ایسی اقسام پائی جاتی ہیں جو دنیا میں اور کہیں نہیں ملتیں۔ دراصل انہی کچھوؤں کے نام پر جزائر کو گلاپاگوس کہا جاتا ہے۔ گلاپاگوس کے تمام جزائر "گلاپاگوس نیشنل پارک" کا حصہ ہیں، جسے 1959ء میں قائم کیا گیا۔ ایکویڈور کی حکومت نے 2000ء میں ایک قانون بنایا جس کے تحت گلاپاگوس میں باہر کی دنیا سے جنگلی حیات کے لانے اور لے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ گلاپاگوس کے جزائر کی لگ بھگ 20 ملین سال پہلے جنوبی امریکن پلیٹ اور پیسفک پلیٹ کے ٹکراؤ کے نتیجے میں ابلنے والے لاوے سے تشکیل ہوئی۔ جبکہ ان جزائر کو 10 مارچ 1535ء کے دن ہسپانوی پادری فرائے تھوماس ڈی برلانگا نے دریافت کیا۔ چارلس ڈارون نے اپریل 1835ء میں اپنے بحری جہاز ایچ ایم ایس بیگل پر گلاپاگوس کا دورہ کیا۔ اس نے یہاں چھ ہفتے گزارے اور یہاں پائی جانے والی نایاب جنگلی حیات کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ ڈارون نے محسوس کیا کہ گلاپاگوس میں پائے جانے والے چند پرندے اطوار باقی دنیا میں پائے جانے والی جنگلی حیات سے الگ تھلگ تھے۔

ایچ ایم ایس بیگل نے اکتوبر 1835ء سے مارچ 1836ء کے دوران بحرالکاہل میں واقع اوشنیا کے جزائر اور آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ ڈارون نے بحرالکاہل کے میلینیشن ماہی گیروں اور نیوزی لینڈ کے ماوری قبائل کے اطوار کا موازنہ کیا۔ اس نے جنوبی آسٹریلیا کے ایبوریجن قبائل کے رسم و رواج کو قریب سے دیکھا۔ اس کا بحری جہاز اپریل 1836ء میں بحر ہند میں داخل ہوا۔ جہاں اس نے شمال مشرقی بحر ہند میں واقع جزائر کوکس (Cocos Is) اور مغربی بحر ہند میں ماریشس اور مڈغاسکر کے جزیرے پر مختصر قیام کیا۔ بیگل کے عملے نے جنوبی افریقا کی بندرگاہ کیپ ٹاؤن میں قیام کر کے تازہ رسد جمع کی۔ انہوں نے جون 1836ء میں کیپ ٹاؤن سے لنگر اٹھائے اور جنوبی بحر اوقیانوس میں مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک بار پھر برازیل پہنچ گئے۔ بیگل نے اگست کی شروعات میں انگلینڈ واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہ شمالی بحر اوقیانوس میں ایزورس (Ezores) کے پرتگالی جزائر میں رکتا ہوا 2 اکتوبر 1836ء کے دن انگلینڈ کی بندرگاہ فال ماؤتھ واپس پہنچ گیا۔

چارلس ڈارون کے بحری جہاز ایچ ایم ایس بیگل نے اپنی پانچ سالہ مہم کے دوران کرۂ ارض کے گرد کامیاب مطالعاتی چکر پورا کیا۔ اس نے دنیا کے سمندروں میں مجموعی طور پر 90 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ اس سفر کے دوران ڈارون نے دنیا کے سرد، گرم اور معتدل حصوں کی سیاحت کی اور وہاں پائے جانے والے چرند پرند اور پودوں کی لاتعداد اقسام کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اس نے اپنے مشاہدے سے متعلق تفصیلی نوٹس تحریر کیے۔ بحری جہاز پر تحقیقی کام کے دوران ڈارون کو آفیشل معاون فٹز روے کی خدمات حاصل تھیں۔ جس نے ڈارون کی تحریروں کو سنبھال کر رکھا، انہیں ترتیب دی اور حوالہ جات تلاش کرنے میں اس کی مدد کی۔

1837ء میں ڈارون نے اپنی کزن ایما ویج ووڈ سے شادی کی جس سے اس کے 10 بچے پیدا ہوئے۔ یہی وہ سال تھا جب وہ اس بات کا قائل ہوا کہ حیوانی اور نباتاتی انواع ارضیاتی تاریخ کے مختلف ادوار میں ارتقا پذیر ہوئیں۔ تاہم اس نے اپنے نظریات کی اشاعت میں عجلت نہ برتی۔ اسے احساس تھا کہ اس نظریہ کے سامنے آنے پر نئے تنازعات پیدا ہو جائیں گے۔ ڈارون نے ایک طویل عرصہ شواہد اکٹھا کرنے اور اپنے نظریے کے حق میں دلائل ترتیب دینے پر صرف کیا۔ اس نے 1842ء میں نظریہ ارتقاء کے حق میں ایک خاکہ تحریر کیا، تاہم اپنی توجہ ایک مفصل کتاب تحریر کرنے پر مرکوز رکھی۔

1859ء میں نظریہ ارتقاء کے حق میں چارلس ڈارون کی شہرہ آفاق کتاب "انواع کا ماخذ" منظر عام پر آئی۔ ڈارون نے اس کتاب میں فطری انتخاب کے طریقے سے ہونے والے عضویاتی ارتقاء کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں پائی جانے والی جنگلی حیات کا موازنہ کیا اور فطری انتخاب کا پورا انتظام پیش کیا، جس کے ذریعے ارتقاء وقوع پذیر ہوا۔ ڈارون نے خاص طور پر گلاپاگوس کے استوائی جزائر پر پائی جانے والی حیات کو اپنی تحقیق کی بنیاد بنا کر پیش کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ گلاپاگوس کے جزائر پر پائے جانے والے چرند و پرند دنیا کے کسی دوسرے علاقے سے ہجرت کر کے وہاں آباد نہیں ہوئے۔ وہاں پائی جانے والی حیات ایک دوسرے کی رشتہ دار ہے جو لاکھوں سال سے جاری ارتقائی عمل کے نتیجے میں اپنی موجودہ صورت تک پہنچی ہے۔

اس کتاب کی اشاعت نے یورپ کے سائنسی حلقوں میں دھوم مچادی۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس پر شائع شدہ کسی کتاب پر سائنس دانوں اور عام لوگوں نے اس قدر رائے زنی نہ کی ہوگی جتنی کہ ڈارون کی کتاب انواع کا ماخذ پر کی گئی۔ ڈارون نے اپنے نظریات کی بنیاد پر کتب کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس سے اس کی انگلینڈ کے سرکردہ ماہر حیات کے طور پر شہرت پھیل گئی۔ ڈارون کو اس کے تحقیقی کام پر 1853ء میں رائل میڈل، 1859ء میں Wollaston میڈل اور 1864ء میں Copley میڈل دیا گیا۔ 1871ء میں ڈارون کی ایک اور مشہور تصنیف The Descent of Man and Selection in Relation to Sex منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں ڈارون نے نظریہ پیش کیا کہ انسان درحقیقت بندر کی نسل سے ہے۔ عوام کی اکثریت اور مذہبی حلقوں نے ڈارون کی اس کتاب کو ناپسند کیا۔ تاہم سائنس دانوں کی اکثریت نے چارلس ڈارون کی زندگی ہی میں اس کے نظریے کو تسلیم کرلیا تھا۔ چارلس ڈارون پوری زندگی تحقیق و تصنیف میں مصروف رہا، یہاں تک کہ 19 اپریل 1882ء کے دن 73 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔

دیواریں

منظر امام

انسان نے حفاظت کے ساتھ رہنے کی خاطر مکان بنائے اور مکان کی حفاظت کے لیے چہار دیواری تعمیر کی۔ مزید حفاظت کے لیے فصیلِ شہر تعمیر کرائی۔ گویا دیواریں ہی حفاظت کے لیے ضروری سمجھی گئیں۔ دنیا بھر میں ایسی بہت سی دیواریں ہیں جو کافی مشہور ہیں۔ انہی میں سے چند ایک کا تذکرہ۔

آپ کے علم کو وسیع کرنے والی تحریر

غالب نے کہا تھا کہ بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے۔ لیکن جب گھر ہوگا تو دیواریں بھی ہوں گی۔ ہمارے یہاں دیوار ایک علامت کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

جیسے سماج کی دیوار۔ حالانکہ یہ دیوار کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے باوجود اس کے ہونے کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

"کیا کروں۔ میرے اور تمہارے درمیان سماج نے دیوار کھڑی کر دی ہے۔" یا پھر "گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو۔"

ہمارے شاعروں نے دیوار کو بہت استعمال کیا ہے۔

میرے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

گھر کے باہر تو خدا جانے ہے منظر کیسا
گھر کا یہ حال کہ دیوار کہاں در کیسا

ہمارے فیض صاحب نے بھی کہا تھا:

دیوارِ شب اور عکسِ رخِ یار سامنے
پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا

پوری اردو شاعری دیواروں کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے لیکن ہم آپ کو جن دیواروں کا حال سنا رہے ہیں وہ شاعری یا گھر کی دیواریں نہیں ہیں بلکہ وہ اینٹوں، پتھروں وغیرہ کی بنی ہوئی دنیا کی مشہور دیواریں ہیں۔

ان میں سے کچھ دیواریں آج بھی باقی ہیں اور کچھ دیواروں کے کچھ حصے رہ گئے ہیں اور جن ملکوں میں یہ دیواریں موجود ہیں وہاں کے قومی ورثے میں شامل ہیں۔

دیواروں کا یہ دلچسپ معاملہ یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔

اناستاسین کی دیوار

Anastasian wall

یہ دیوار ترکی میں استنبول کے پاس ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ترکی ایک قدیم ترین تہذیبی ملک ہے۔ اس ملک میں اس قسم کی نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ یہ دیوار بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ اس دیوار کو قومی ورثے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ دیوار بازنطینی عہد میں بادشاہ Anas Tasius(2) کے نام پر بنائی گئی۔ اس دیوار کی تعمیر 491 عیسوی سے 518 عیسوی تک ہوئی۔ شمال سے جنوب کی طرف جاتی ہوئی یہ دفاعی دیوار 56 کلومیٹر طویل ہے۔ اس کی چوڑائی گیارہ فٹ اور اونچائی 16 فٹ ہے۔ یہ چونکہ خاصی طویل



دیوار ہے اس کے علاوہ جس دفاعی علاقے کے لیے اس کی تعمیر کی گئی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ موقع بھی فوت ہو گیا۔ اس کی دیکھ بھال کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور لوگوں نے اس دیوار سے پتھر اور اینٹیں لے جا لے جا کر اپنی عمارتوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بہرحال اب اس کی حفاظت کی جاتی ہے اور سیاحوں کے لیے قابلِ دید ہے۔

انتونائن کی دیوار

Antonine wall

یہ پتھروں سے بنی ہوئی ایک طویل دیوار ہے۔ یہ دیوار 63 کلومیٹر طویل اور دس فٹ بلند اور پندرہ فٹ چوڑی تھی (جس وقت اس کی تعمیر ہوئی)۔

اسکاٹ لینڈ کی اس دیوار کو رومن عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تعمیر 142 عیسوی میں رومن بادشاہ (4) Antoninus کے حکم پر ہوئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس دیوار کی تعمیر 12 برسوں میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کے بعض حصے ابھی تک موجود ہیں اور یونیسکو کے ثقافتی ورثے میں شامل ہیں۔ انہیں تعمیر کے کچھ ہی دنوں کے



بعد اس کا استعمال بھی ختم ہو گیا تھا۔

اورے لین کی دیوار

Aurelian Wall

یہ دیوار اٹلی کے شہر روم میں واقع ہے اور ثقافتی ورثے میں شامل ہے۔ اس کی تعمیر 271 اور 275 عیسوی کے درمیان ہوئی۔

روم میں بے شمار تاریخی دیواریں ہیں۔ یہ دیوار ان ہی دیواروں کے سلسلے کی ایک دیوار ہے۔ ان کی تعمیر رومن عہد میں ہوئی تھی۔



یہ دیوار 19 کلومیٹر طویل ہے۔ 13.7 کلومیٹر رقبے پر محیط ہے اور 26 فٹ بلند ہے۔ دشمنوں کی نگرانی کے لیے اس پر 383 مینار تعمیر کیے گئے ہیں جہاں اس زمانے میں مستعد سپاہی چوکس کھڑے ہو کر پہرے دیتے ہوں گے۔ اس دیوار کے درجنوں بلند دروازے (گیٹ) ہیں اور 2066 کھڑکیاں ہیں۔ اندازہ کر لیں کیا تعمیر ہوگی۔

بنیادی طور پر یہ دیوار بربریوں کے حملوں سے بچاؤ کے لیے تعمیر ہوئی تھی اور اسے ایمرجنسی کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ 1870 تک اس دیوار کو فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور اب یہ دیوار سیاحوں کے لیے سیر کی جگہ ہے۔

اویلا کی دیوار

Avila wall

اویلا اسپین کے ایک شہر کا نام ہے۔ اسی مناسبت سے اس دیوار کو اویلا کی دیوار کہا جاتا ہے۔ اس





بارسلونا کی دیوار

دیوار کی تعمیر گیارہویں اور چودہویں صدی میں ہوئی ہے۔ یہ 2516 میٹر طویل اور 12 میٹر بلند دیوار ہے۔ اس دیوار کے 88 مینار ہیں اور 9 عدد بڑے بڑے گیٹ ہیں۔

بارسلونا کی دیوار

یہ دیوار اسپین کے شہر بارسلونا میں ہے۔ بارسلونا اپنی جگہ ایک تہذیبی شہر ہے۔ یہاں درجنوں میوزیم اور دلچسپی کی دیگر چیزیں موجود ہیں۔

باسل سٹی وال (باسل کی دیوار)

یہ دیوار سوئٹزر لینڈ کے شہر باسل میں واقع ہے۔ بنیادی طور پر یہ دو دیواریں ہیں۔ ایک 1080 میں مکمل ہوئی جس کو بشپ برک ہارڈ نے تعمیر کروایا تھا۔ اس کے بعد اس کے اندر دوسری دیوار 1230 میں مکمل ہوئی۔

باسل شہر جب پھیلنے لگا اور آبادی بڑھنے لگی تو 1859ء میں دیوار اور گیٹ گرا دیے گئے لیکن تھوڑا سا حصہ اور دو تین گیٹ قومی اثاثے کے طور پر محفوظ کر لیے گئے۔



شمالی کوریا کی دیوار

شمالی کوریا کی دیوار

لگتا ہے کہ دیواریں ہر عہد اور ہر قابل ذکر شہر میں تعمیر ہوتی رہی ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ یہ دیواریں کتنی عظیم ہوتی ہوں گی۔ میلوں تک پھیلی ہوئیں۔ یہ دیوار بھی ایک ہزار میٹر طویل اور 24 فٹ بلند ہے۔ اس کی تعمیر کوریو 8 کے عہد میں ہوئی۔ تعمیر کا زمانہ 1033 سے لے کر 1044 عیسوی تک کا ہے۔ یہ دیوار کوریا کے سترہ اٹھارہ شہروں تک پھیلی ہوئی ہے۔



باسل کی دیوار



برطانیہ کی چیسٹر سٹی دیوار

70 اور 80 عیسوی میں تعمیر ہوئی۔ رومیوں نے اس کی تعمیر دفاعی نقطۂ نظر سے کی تھی۔ اس کی دوبارہ مضبوط تعمیر 100 ویں عیسوی میں ہوئی۔ آج بھی یہ دیوار پورے شہر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں نگرانی کے لیے کئی ٹاورز تعمیر کیے گئے تھے۔

دیوار چین

The great wall of china

کون ہے جو اس دیوار کے بارے میں نہیں جانتا۔ یہ دنیا کی عظیم ترین تعمیرات میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر چاند سے زمین کو دیکھا جائے تو ہمیں دیوار چین دکھائی دیتی ہے۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ پتھر، لکڑی، مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی اس عظیم دیوار کو دفاعی نقطۂ نظر سے بنایا گیا تھا۔ یہ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ایک عظیم الشان دیوار ہے۔ ساتویں صدی میں کئی دیواریں ملا کر ایک کردی گئی تھیں۔ اس طرح یہ عظیم الشان دیوار سامنے آئی۔

یہ دیوار 206 بی سی سے 220 بی سی تک تعمیر ہوتی رہی۔ اس دیوار کو چین کے پہلے بادشاہ کن شی ہوانگ 10 نے تعمیر کروایا تھا۔ اس دیوار کی کئی بار مرمت ہوتی رہی ہے۔ اس دیوار کی مختصری تاریخ کچھ یوں ہے۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً دو سو سال پہلے چین کے بادشاہ شی ہوانگ نے اپنے ملک کو دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لیے شمالی سرحد پر ایک دیوار کی تعمیر کا ارادہ کیا۔ لہٰذا اس عظیم دیوار پر کام شروع کردیا گیا۔ اس دیوار کی ابتدا چین اور منچوکو کے درمیان ہوئی۔ اس زمانے میں چین کے دشمن ہن اور تاتار تھے جو وسط ایشیا میں کافی طاقت ور سمجھے جاتے تھے۔ یہ دیوار خلیج لیاؤ شنگ سے تبت تک پھیلی ہوئی ہے۔ شنگ ہو کی سرحدیں بھی اس دیوار کے حصار میں آتی ہیں۔ اس کی لمبائی تقریباً پندرہ سو میل ہے۔ (اندازہ کرلیں کہ کراچی سے چترال تک ایک دیوار

دیوار چین



چلی جارہی ہے)۔ یہ دیوار بیس سے تیس فٹ اونچی ہے۔ چوڑائی نیچے سے پچیس فٹ اور اوپر سے بارہ فٹ ہے۔ ہر دو سو گز پر پہریداروں کے لیے مضبوط پناہ گاہیں بنائی گئی ہیں۔ بلاشبہ دیوارِ چین دنیا کی عظیم ترین دیوار ہے۔

Walls of constan tinopole

(کونسٹائن ٹین پرل کی دیوار)

پتھروں کی بنی ہوئی یہ شاندار دیوار ترکی میں ہے۔ یہ کونسٹائن 12 کے عہد میں بنائی گئی تھی جو موجودہ استنبول کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ شہر حضرت عثمانؓ کے دور میں فتح ہوا تھا۔ اس


قسطنطنیہ کی دیوار

دیوار میں 9 بڑے اور اہم گیٹ ہیں جیسے ملٹری گیٹ، گولڈن گیٹ، اسپرنگ گیٹ، گیٹ آف سینٹ رومنس وغیرہ۔

کنوائی ٹاؤن کی دیوار

Conwy Townwalls

اس دیوار کی تعمیر 1283 اور 1287 کے درمیان ہوئی تھی۔ یہ دیوار شہر کے نام پر ہے۔ یعنی کنوائی۔ ایڈورڈ اول نے



جب شہر کی بنیاد رکھی تو اس وقت یہ دیوار... تعمیر ہوئی۔ اس کی لمبائی دو کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس دیوار میں 21 ٹاورز بنائے گئے ہیں اور اس کی تعمیر پر اس زمانے میں پندرہ ہزار پاؤنڈز خرچ ہوئے تھے۔

اس زمانے میں بھی یہ خطیر رقم تھی اور اس لحاظ سے آج کا حساب لگالیں۔ یونیسکو کے ثقافتی ورثے میں شامل ہے۔

دیار بکر کی دیوار

دیار بکر ترکی کے ایک شہر کا نام ہے۔ یہ دیوار شہر کے نام سے منسوب ہے۔ اس شہر کو بکر کیلیے نے فتح کیا تھا۔ یہ دیوار 367 اور 375 عیسوی کے درمیان تعمیر ہوئی۔ اسے



Valantinion اول نے تعمیر کروایا تھا۔

اس دیوار کی لمبائی 5 کلومیٹر تھی۔ اب تو صرف آثار باقی رہ گئے ہیں۔

Walls of Dubrovnik

یہ دیوار کروشیا میں ہے۔ اس زمانے میں یہ دیوار شہر کی فصیل کا کام کرتی تھی۔

Erdenzu Monastry

یہ بدھ حضرات کی بہت قدیم عبادت گاہ ہے۔ اس عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے ایک طویل دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ سنگ لیائی، اس دیوار کی لمبائی دو میل ہے اور اس کی ایک حد سلسلۂ قراقرم سے آکر ملتی ہے۔ اس کی تعمیر 1688ء میں ہوئی تھی۔ اس دیوار میں 108 اسٹوپا بنائے گئے ہیں۔ یہ دیوار کچھ کمزور ہو چلی تھی اس لیے اٹھارویں صدی میں دوبارہ تعمیر کی گئی۔ ایک بدھسٹ حکمران تھا Abtaisain Khan۔ یہ دیوار اس نے تعمیر کروائی تھی۔

ایڈن برگ میں ٹاؤن ہال کی دیوار

ایڈن برگ اسکاٹ لینڈ کا ایک شہر ہے۔ اس شہر میں یوں تو بہت سی دیواریں ہیں لیکن جس دیوار کی بات ہو رہی ہے



اسے مرکزیت حاصل ہے۔ اس دیوار کی لمبائی 4 کلومیٹر ہے۔ اس کی تعمیر پندرہویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی۔ اس دیوار میں بہت سے مشہور گیٹ ہیں۔ اس شہر کی بندرگاہ بھی اس دیوار کے احاطے میں آتی ہے۔

ایڈن برگ کی دو اور دیواریں بھی بہت مشہور ہیں جیسے Flodon Wall، Talfar wall وغیرہ۔

افریقا کی فوساٹم دیوار

Fossa Tum wall

شمالی افریقا کی اس دیوار کو دفاعی نقطہ نظر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دیوار 750 کلومیٹر سے زیادہ طویل ہے۔ اس کی تعمیر رومیوں نے کی تھی اور تعمیر کا زمانہ 122 عیسوی ہے۔



ایران کی گورگان کی دیوار



دیوارِ گریہ

ایران کی گورگان کی دیوار

ایران دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے اس ملک کے مہذب ہونے کی تاریخ ہزاروں سال قدیم ہے۔ ہزاروں برسوں پر محیط اس ملک کی تاریخ نے نہ جانے کتنے ناموروں کو دیکھا ہے اور کیسی کیسی تہذیب نے اس زمین پر جنم لیا اور اب یہ اسلامی جمہوریہ ایران ہے۔

اس ایران میں ایک ایسی دیوار بھی ہے جس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ دیوارِ چین کے بعد وہ دنیا کی دوسری بڑی دیوار ہے۔ یہ دیوار گورگان شہر کے پاس گلستان صوبے میں ہے اور اس کی لمبائی ہزاروں میل طویل ہے۔ سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی یہ دیوار 247 بی سی ای BCE سے 224 BCE تک تعمیر ہوتی رہی تھی۔ یہ عظیم الشان دیوار 20 سے 33 فٹ تک بلند ہے۔ اس میں 30 قلعے ہیں۔ اس دیوار کو اس کے رنگ کی مناسبت سے سرخ سانپ بھی کہا جاتا ہے۔ اس دیوار سے کئی پُراسرار کہانیاں منسوب ہیں۔

دیوارِ گریہ

یہ مشہور ترین دیوار یروشلم میں ہے۔ یروشلم دنیا کا وہ واحد شہر ہے جو تینوں بڑے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے مقدس ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کے لیے اور یہودیوں کے لیے۔

دیوارِ گریہ اس دیوار کو کہتے ہیں جس کے سامنے یہودی کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ مغربی دیوار ہے۔ اس کی تعمیر شاید 19 BC میں حضرت داؤدؑ کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس دیوار کے کئی گیٹ ہیں جن میں نیو گیٹ، ہیروڈ گیٹ، لائن گیٹ اور ویسٹرن گیٹ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

یاجوج ماجوج کی دیوار

یہ ایک روایتی دیوار ہے لیکن اس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ کہف میں بھی ہے۔

یہ روایت چونکہ بہت دل چسپ ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اس کو دہرا دیا جائے۔ یاجوج ماجوج اس مفسد قوم کا نام ہے جس کے انسداد فساد کے لیے ذوالقرنین نے ان کے راستے پر ایک آہنی دیوار کھنچوا دی تھی۔ یہ ایک نہایت مستحکم اور عظیم الشان دیوار تھی۔ روایت یوں ہے کہ ''جب ذوالقرنین چلتے چلتے ایک دیہات کے گھاٹ کے دو کناروں کے بیچ میں پہنچے تو انہوں نے



دیکھا کہ دوسری طرف ایک قوم آباد ہے جو غیر متمدن ہے اور ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ پریشان حال ہیں۔

بہر حال ان لوگوں نے انہی کی بولی میں عرض کیا کہ اے ذوالقرنین اس گھاٹی کے ادھر یاجوج ماجوج کی قوم ہے اور وہ لوگ ہمارے ملک میں آکر فساد کرتے ہیں۔ آپ کی مرضی ہو تو ہم آپ کے لیے چندہ جمع کر دیں بشرطیکہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں۔

ذوالقرنین نے کہا کہ وہ مال جس میں میرے پروردگار نے مجھے پورا اختیار دے رکھا ہے وہ کافی ہے۔ ہاں تم ہاتھ پیروں سے مدد کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔

پھر لوہے کی سلیں لائی گئیں اور ذوالقرنین نے ان سلوں کو گھاٹی کے درمیان بھر دیا۔ پھر ان سلوں کو دہکایا گیا۔ حتیٰ کہ وہ سرخ ہو گئیں پھر ان میں تانبہ پگھلا کر ڈالا گیا۔ اس طرح ایک ایسی اونچی اور مضبوط دیوار تعمیر ہو گئی کہ جس کو نہ عبور کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں سوراخ ہو سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ قیامت کے قریب یہ دیوار ٹوٹ جائے گی اور یاجوج ماجوج باہر نکل آئیں گے۔

روایت ہے کہ یاجوج ماجوج بر بن یافث بن نوح کی اولاد ہیں۔ عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ یہ انتہائی قد آور لوگ ہیں۔ اور ان کے چار بادشاہ ہیں۔ طوعان، اشمع، عارون اور عاتر۔

دیوارِ برلن

یہ بھی نہایت مشہور دیواروں میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب اس دیوار کا وجود نہیں ہے۔ یہ دیوار گرا دی گئی ہے لیکن یہ دیوار دنیا کی تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ یہ تعمیر مشرقی اور مغربی برلن کو الگ کرنے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر 1961ء میں ہوئی تھی۔

یہ ایسی دیوار تھی جو بلڈنگوں کو جوڑنے کے لیے بنائی گئی تھی عمارتوں کی قطار کے درمیان بنی اس دیوار نے ایک شہر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ نہ جانے ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو ادھر رہ گئے یا جو اُدھر رہ گئے۔

دو دلوں اور خاندانوں کو الگ کر دینے والی یہ دیوار سیاسی جبر کی ایک مثال تھی۔ اس دیوار کے حوالے سے کئی کہانیاں لکھی گئیں فلمیں بنائی گئیں۔

4 میٹر بلند اس دیوار کو 1989ء میں توڑ دیا گیا تھا۔

دیواروں کی یہ داستانیں یہیں تک تھیں۔ ان دیواروں کے علاوہ بھی دنیا میں بہت سی دیواریں ہیں جو دفاعی نقطۂ نظر سے بنائی گئی ہیں۔

یعنی انسان نے ہمیشہ انسان ہی سے خطرہ محسوس کیا ہے اور انسان ہی ایک دوسرے کو روکنے کے لیے دیواریں بناتے ہیں۔

ان دیواروں کے علاوہ بہت سی دیواریں علامتی بھی ہیں۔ جیسے سماج کی دیوار۔ زبان اور ثقافت کی دیوار۔ محبوب کے مکان اور گھر کی دیوار۔ مذہب کی دیوار۔

پاکستان میں بھی ایک دیوار تاریخی ورثے میں شامل



ہے۔ اسے عباسی عہد میں عمران بن موسیٰ برمکی نے جو 836ء میں سندھ کا گورنر تھا اس نے تعمیر کرائی تھی۔ اسے میر کرم علی تالپر نے دوبارہ تعمیر و مرمت کرائی جس پر تقریباً ایک کروڑ روپے لاگت آئی تھی۔ یہ سن کے نزدیک ضلع جامشورو میں واقع ہے۔ اسے دنیا کا سب سے بڑا قلعہ بھی کہا جاتا ہے جو 16 کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ دیوار رنی کوٹ قلعہ کے گرد قائم ہے۔

پھندا

مریم کے خان

مہم جوئی کا دوسرا نام موت کو آواز دینا ہے. وہ لوگ بھی ایک ایسی سرنگ میں اترنے والے تھے جو زمانہ قدیم میں زمین کی گہرائی تک جاتی تھی. پاتال تک پہنچنے والی وہ سرنگ موت کا دہانہ تھی مگر ان کے حوصلے بلند تھے. وہ موت کو پچھاڑنے کی خاطر کمر کس چکے تھے مگر اس مشہور مہم کا انجام کیا ہوا؟

لہو کی گردش تیز کردینے والی ایک دلچسپ روداد



سنگاپور ائرپورٹ پر مسافر آجا رہے تھے۔ شفاف شیشے کی طرح چمکتے اس ائرپورٹ پر دنیا جہان کے مسافر آتے ہیں۔ میں ایک ڈیپارچر لاؤنج میں اپنے سامان سمیت بیٹھا ہوا اگلی فلائٹ اور اپنے دو ساتھیوں کم سوان اور شان چارلی کا انتظار کررہا تھا۔ کم کا تعلق کوریا سے تھا اور شان جاپانی تھا۔ میرا تعلق جرمنی سے ہے اور میرا نام ہنرک فاس ہے۔ میں دو گھنٹے پہلے میونخ سے براہ راست سنگاپور پہنچا تھا۔ یہاں سے ہمیں جنوب میں پاپوانیوگنی جانا تھا۔

وہاں مزید تین افراد ہماری ٹیم میں شامل ہوتے۔ حسن احمد کا تعلق مراکش سے تھا۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ اس کا تعلق مراکش کے شاہی خاندان سے ہے مگر اس نے کبھی تصدیق نہیں کی۔ فرینکلن موریس آسٹریلین تھا اور جولی ایمرسن اس کی ہم وطن اور شریک حیات تھی۔ پانچ سال پہلے ہماری ملاقات انٹارکٹیکا کی ایک مہم میں ہوئی تھی۔ میرا تعلق جرمنی کے ایک معروف اسپورٹس برانڈ سے ہے۔ یہ مہم میری کمپنی اسپانسر کررہی تھی۔ ہمارا مقصد انٹارکٹیکا کے کچھ ایسے حصوں تک رسائی کا تھا جہاں اس سے پہلے انسانی قدم نہیں پہنچے تھے۔

اس مہم میں سوائے شان کے سب شامل تھے۔ وہاں سے ہمارا ایک گروپ بن گیا اور ہم آزادانہ مہمات کرنے لگے۔ انٹارکٹیکا والی مہم کے بعد میں نے کمپنی چھوڑ دی تھی اور اب ہم خود اسپانسر تلاش کرتے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ پیشہ ور مہم جو بن گئے تھے۔ ہماری کوئی مخصوص فیلڈ نہیں تھی بلکہ ہمیں جو مہم اچھی لگتی اسے اپنے پلان کا حصہ بنا لیتے۔ عام طور سے ہر چھ مہینے بعد ہم کوئی مہم کرتے تھے۔ شان تین سال پہلے ہمارے ساتھ شامل ہوا۔ وہ شوقیہ مہم جو مگر پیشہ ور فوٹوگرافر تھا اور اس کی آمد کے بعد ہمیں فوٹوگرافری سے نجات مل گئی تھی۔ اس سے پہلے فوٹوگرافر و کیمرا مین تو بے شمار مل جاتے تھے مگر وہ ہر جگہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ بہت سوں میں مہم جوئی کا حوصلہ اور صلاحیت نہیں ہوتی تھی اس لیے ہماری مہم کی ریکارڈنگ بہت پھیکی سی ہوتی تھی اور ہمیں اس حوالے سے کچھ خاص نہیں ملتا تھا۔ شان کے آنے کے بعد ہم نے اپنی مہمات بہت اچھے طریقے سے ریکارڈ کیں اور ان سے اچھا خاصا کمایا۔

انٹارکٹیکا کے بعد ہم ایک نئے راستے سے کوہ کلمنجارو پر پہنچے۔ پھر ہم نے دریائے کانگو کے بیسن کا سفر کیا جب اس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ چین میں پامیر کے سفر پر گئے اور پچھلے موسم گرما میں صحرائے گوبی کی مہم تقریباً ناکامی سے دوچار ہو گئی تھی جب ہمیں اچانک چین میں غیر قانونی داخلے کے الزام میں منگولین حکام نے گرفتار کر لیا مگر ہمارے سفری ریکارڈ سے ثابت ہو گیا کہ ہم چین کی سرحد سے دور رہے تھے تب ہماری جان چھوٹی۔ ایک وقت تھا کہ ہم ڈی پورٹ کیے جانے کے قریب تھے کہ ایک چینی افسر زین ہن فینگ نے ہماری مہم کو ناکامی سے بچایا۔ چند سال پہلے میری اس سے ہانگ کانگ میں ملاقات ہوئی تھی اور ہم اچھے دوست بن گئے تھے۔ چین کی طرف سے وہی اس معاملے کو دیکھ رہا تھا اور اس نے میری ذاتی ضمانت دی تب کہیں جا کر ہمیں مہم جاری رکھنے کی اجازت ملی تھی۔ مہم کے خاتمے کے بعد میں نے خود جا کر زین کا شکریہ ادا کیا تھا۔ مہم کی ناکامی کی صورت میں ہم تقریباً دو ملین ڈالرز کی اسپانسر شپ کھو دیتے۔

اس بار ہمارا ارادہ پاپوانیوگنی کے شمال مشرقی علاقے الائی میں واقع زیرزمین غاروں میں مہم جوئی کا تھا۔ یہ غار آج سے کوئی پچاس سال پہلے دریافت ہوئے تھے مگر اس وقت ان کے بارے میں دنیا کو اتنا علم نہیں تھا۔ چند سال پہلے دریافت کنندگان کی ایک ٹیم نے اس غار کا دورہ کیا تو انہیں پتا چلا کہ یہ غار زیرزمین کئی فلورز پر ہے اور تقریباً چار مربع میل کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں اس میں زیرزمین جھیلیں، برساتی جنگل، دریا اور عظیم الشان ہال تھے۔ اس کے بعد یہ غار مہم جوؤں کا مرکز بن گئے مگر مقامی محکمۂ سیاحت یہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ عام سیاحوں کو غار کے صرف ان حصوں تک جانے کی اجازت ہے جو محفوظ ہیں۔ غیر محفوظ جگہوں پر جانے کے لیے خصوصی اجازت لینی پڑتی ہے۔ ہمارے لیے یہ کام کلارا فن کرتی۔ کلارا مقامی مہم جو اور ٹیکنیکل انسٹرکٹر تھی۔ ساتھ ہی وہ محکمہ سیاحت سے بھی منسلک تھی۔ جب ہم نے ایک مقامی مددگار کے لیے اشتہار دیا تو اس نے ہم سے رابطہ کیا تھا۔ کلارا کے انٹرویو کے بعد میں مطمئن ہو گیا کہ وہ ہماری مہم کے لیے موزوں تھی۔

میونخ سے روانہ ہونے سے پہلے میری فون پر کلارا سے بات ہوئی تھی اور اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جب ہم پاپوانیوگنی پہنچیں گے تو اجازت نامہ مل جائے گا۔ مجھے اس اجازت نامے کے بارے میں کسی قدر تردد تھا کیونکہ یہ غار کے ان حصوں کے بارے میں تھا جہاں اس سے پہلے کسی نے قدم نہیں رکھا تھا اور یہ حصے حکومت کی طرف سے نہایت خطرناک قرار دیے گئے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں جانا جرم ہے اور اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اسے نہ صرف جرمانہ ہوتا ہے بلکہ قید کی سزا بھی دی جاتی ہے۔ اس لیے میں فکرمند تھا کہ اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ کم اور شان آگئے۔

کم تقریباً چالیس برس کی لیکن صورت اور جسم سے

بیس سال کی نظر آنے والی نہایت حسین عورت تھی۔ اس کے برعکس شان صرف چھبیس برس کا تھا مگر اپنے کھردرے نقوش، چھوٹے اور کسی قدر بھاری جسم اور سامنے سے اڑ جانے والے بالوں کی وجہ سے تیس سے زیادہ کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ دونوں گرم جوشی سے ملے۔ دونوں کا تعلق دو ایسے ایشیائی ملکوں سے ہے جو آپس میں دشمن رہے ہیں مگر شان اور کم میں مثالی دوستوں جیسے تعلقات تھے۔ حال احوال کے بعد میں نے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کیا مگر وہ بھی پر امید تھے کہ اجازت مل جائے گی۔ کم نے کہا۔ ''اس ملک کی معیشت سیاحت پر چلتی ہے اور ہم وہاں تقریباً نصف ملین ڈالرز خرچ کرنے جا رہے ہیں۔ اس لیے اجازت مل جائے گی۔ دوسری صورت میں انہیں زرمبادلہ نہیں ملے گا۔''

پاپوانیوگنی کے دارالحکومت پورٹ مورس بے کے لیے طیارے میں سوار ہوتے ہوئے بھی ہمیں یہی تشویش لاحق تھی۔ یہ براہ راست پرواز نہیں تھی بلکہ طیارہ ملائیشیا اور انڈونیشیا کے کئی شہروں سے ہوتا ہوا پورٹ مورس بے پہنچا اور وہ سفر جو مشکل سے چھ گھنٹے کا تھا بار بار رکنے کی وجہ سے چودہ گھنٹے میں طے ہوا اور جب طیارہ دارالحکومت کے اس معمولی سے ائرپورٹ پر اترا تو بیٹھے بیٹھے ہمارے جسم اکڑ گئے تھے اور جب سیٹ سے اٹھنے لگے تو بڑی مشکل سے ہماری ٹانگیں سیدھی ہوئی تھیں۔ کم نے میرا سہارا لے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ میری زندگی کا سب سے بھیانک ہوائی سفر ہے۔''

''صرف ایک فائدہ ہوا۔'' شان نے اس کی تائید کی۔ ''کہ ہمیں بار بار طیارے بدلنے نہیں پڑے۔''

''درحقیقت اسی لیے میں نے اس پرواز کا انتخاب کیا۔'' میں نے اوپری خانے سے اپنا ہینڈ کیری اور دوسرے سامان نکالتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا سارا سامان بہت اہم ہے اور ہم متحمل نہیں ہو سکتے کہ کچھ سامان کہیں رہ جائے اور اس کے بعد نصف دنیا گھوم کر ہمیں اس وقت ملے جب ہماری مہم ختم ہونے کا وقت آ جائے۔''

یہ درست ہے کہ میں نے اسی لیے ایک ریجنل ائر لائن کی اس پرواز کا انتخاب کیا تھا اور جب ائرپورٹ پر ہمارا سامان آیا تو یہ جان کر میرا صدمے سے برا حال ہو گیا کہ میرا ایک بیگ جس میں مہم جوئی سے متعلق سامان تھا سنگاپور میں ہی رہ گیا ہے۔ میں ائر لائن کے مقامی آفس پر چڑھ دوڑا تھا اور اس کے گنجے مقامی منیجر کو انگریزی میں بے نقط سنائیں۔ میری اپنی انگریزی زیادہ اچھی نہیں ہے۔ مگر جب میں تھک کر خاموش ہوا تو پتا چلا کہ اسے انگریزی نہیں آتی ہے۔ میرا ایک لفظ اس کے پلے نہیں پڑا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔ مجبوراً مجھے کلارا کی مدد لینی پڑی اور اس نے میری تقریر کا ترجمہ کیا۔ اس پر منیجر نے اطمینان سے کہا۔ ''بیگ کہیں نہیں جائے گا اگلی پرواز سے آ جائے گا۔''

وہ کہتے ہی فون اٹھا کر کسی سے بات کرنے لگا۔ میرا بلڈ پریشر بدستور ہائی تھا کیونکہ کل صبح مجھے اور میری ٹیم کو ایک چھوٹے طیارے میں الائی تک جانا تھا۔ یہ طیارہ چارٹرڈ تھا۔ بیگ کے چکر میں میں کلارا سے اجازت نامے کا پوچھنا بھول گیا تھا۔ جب منیجر نے فون رکھا تو میں نے اگلی فلائٹ کا پوچھا کہ وہ کب آئے گی۔ اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''کل اسی وقت۔''

''لیکن ہمیں صبح روانہ ہونا ہے لائی کے لیے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''دوسری کوئی صورت نہیں ہے بیگ جلد آنے کی اور مہربانی کرکے ذرا آہستہ بولو میں یا یہ حسین خاتون بہرے نہیں ہیں۔''

ترجمہ کرتی کلارا کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ پھر وہ سیز فائر کراتے ہوئے مجھے اس کے آفس سے باہر لائی۔ ''ہم کل صبح جا بھی نہیں سکتے ہیں۔''

تب مجھے اجازت نامہ یاد آیا اور میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ ''اجازت نامہ نہیں ملا؟''

وہ مسکرائی۔ ''مل گیا ہے لیکن آج چھٹی ہے کل دفتر کھلے گا اور ملے گا۔ تم فکر مت کرو ہم شام کو روانہ ہوں گے میں نے پروگرام ری سیٹ کر لیا ہے، ہم صرف بارہ گھنٹے کی تاخیر کا شکار ہوں گے۔ اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا اگر ہم عین وقت پر چارٹرڈ فلائٹ کینسل کرتے تو خاصا جرمانہ بھرنا پڑ جاتا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ کلارا چھوٹے قد اور بھرے جسم والی خوب صورت عورت تھی۔ اس کا رنگ سرخی مائل سفید تھا جو مقامی لوگوں کی نسبت خاصا صاف تھا۔ حسن، فرینک اور جولی آ چکے تھے اور ہوٹل بھی پہنچ گئے تھے۔ ہم سنگاپور سے رات کے چار بجے روانہ ہوئے تھے اور مزید مشرق میں آئے تھے۔ اس لیے یہاں وقت مزید دو گھنٹے پیچھے ہو گیا تھا اور اکتوبر کا مہینا ہونے کی وجہ سے یہاں دن

ویسے ہی چھوٹے ہو رہے تھے اس لیے جب ہم ائرپورٹ پر اترے تو رات چھا چکی تھی۔ ہوٹل پہنچے، ڈنر کیا اور پھر جو لیٹا تو اگلے دن سورج نکلنے کے بعد ہی آنکھ کھلی تھی۔ جب تک ہم ناشتے سے فارغ ہو گئے۔ کلارا آگئی تھی۔ وہ اپنا سامان ساتھ لائی تھی کیونکہ اسے ہمارے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا۔

پاپوانیو گنی کا موسم گرم مرطوب ہے اور سرما کے چند ہی مہینے کچھ سردی پڑتی ہے۔ کیونکہ یہ سارا خطہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوے سے وجود میں آیا ہے اس لیے یہاں ہموار زمین کم ہے اور پہاڑ زیادہ ہیں مگر یہ زیادہ بلند نہیں ہیں۔ آبادی ساڑھے سات ملین سے زیادہ نہیں ہے۔ شروع میں یہاں بہت غربت تھی مگر اب کسی قدر ترقی ہوئی ہے اور فی کس آمدنی تقریباً تین ہزار ڈالرز سالانہ ہے۔ قدرت نے اس ملک کو قدرتی وسائل سے نوازا ہے، خاص طور سے معدنیات اور قیمتی لکڑی کے جنگلوں سے۔ جہالت بہت زیادہ ہے تقریباً نصف بچے کبھی اسکول نہیں گئے مگر اب تعلیم اور صحت کے میدان میں بتدریج ترقی ہو رہی ہے۔ امن عامہ کی صورتِ حال اچھی نہیں ہے خاص طور سے چند شہروں کو چھوڑ کر باہر کے علاقوں میں جرائم بہت عام ہیں۔ غربت کی وجہ سے نوجوان لوٹ مار کی طرف راغب ہوتے ہیں اور یہاں آنے والے سیاح ان کا آسان نشانہ ہوتے ہیں۔ کم آبادی کی وجہ سے بہت سے علاقے قطعی ویران ہیں اور کئی مقامات ایسے ہیں جہاں آج تک کسی انسان نے قدم نہیں رکھا ہے۔ اس لیے سیاحوں اور مہم جوؤں کے لیے اس ملک میں بہت کشش ہے۔

اجازت نامہ دوپہر میں ملا اور خوش قسمتی سے شام پانچ بجے آنے والی فلائٹ سے میرا بیگ بھی آگیا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد ہم تقریباً تین سو کلومیٹرز دور لالائی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ سمندر کے کنارے آباد ملک کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہاں ہمارا قیام رات بھر کا تھا اور اگلی صبح ہم تین بڑی گاڑیوں میں سوار ہو کر غار کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ غار اس جگہ سے صرف پچاس کلومیٹرز کی دوری پر تھا مگر راستہ نہایت دشوار گزار پہاڑوں اور کھائیوں سے گزر رہا تھا۔ ایک وقت ہم تقریباً دو ہزار میٹرز کی بلندی پر تھے اور یہاں موسم باقاعدہ سرد تھا جب کہ نیچے گرمی تھی۔ چار گھنٹے کے مشکل سفر کے بعد ہم غار کے پاس پہنچ گئے۔ اس سے پہلے میں نے صرف تصویروں میں اسے دیکھا تھا اور جب میں نے پہلی بار سامنے سے اس کا دہانہ دیکھا تو مجھے مایوسی ہوئی تھی۔

دہانہ بہ ظاہر کسی کان کا راستہ لگ رہا تھا۔ بہت چھوٹا اور معمولی سا۔ اس سے پہلے میں نے جو زیرِ زمین غار دیکھے تھے ان کے دہانے بہت عالی شان اور مبہوت کر دینے والے تھے۔ وہ عام طور سے بہت بڑے اور اپنی وسعت سے دل کو سہما دینے والے ہوتے تھے۔ یہاں پہنچ کر مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا تھا اور یہی حال میرے باقی ساتھیوں کا تھا۔ وہ مایوسی سے غار کے دہانے کو دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹے سے کیبن میں مقامی حکام کا دفتر تھا جہاں سے سیاح غار میں جانے کے لیے ٹکٹ اور اجازت حاصل کرتے تھے۔ میرے ساتھی گاڑیوں سے سامان اتارنے میں لگ گئے۔ میں اور کلارا دفتر تک آئے۔ وہاں ایک نوجوان خوش مزاج افسر کارڈین مارشل موجود تھا اور خوش قسمتی سے وہ انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس نے بہ غور ہمارے اجازت نامے کا جائزہ لیا اور پھر بولا۔ ”مجھے بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ جس حصے کے بارے میں یہ اجازت نامہ ہے اس کی رپورٹ اچھی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب کہ رپورٹ اچھی نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”غار کے اس حصے سے دو دن پہلے دھماکوں کی آوازیں ریکارڈ کی گئی ہیں اور کچھ ایسی آوازیں بھی جن سے پتا چلتا ہے کہ زیرِ زمین کوئی نیا چشمہ جاری ہوا ہے۔“

”اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ غار کا یہ حصہ مخدوش ہوگیا ہے؟“

”ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس حصے میں آج تک کوئی نہیں گیا ہے۔“ کارڈین نے نرمی سے کہا۔ ”مگر دھماکوں کی آوازیں ایسی تھیں جیسے اندر چٹانیں ٹوٹ رہی ہوں۔“

”میری معلومات کے مطابق یہاں زیرِ زمین آتش فشانی سرگرمی نہیں ہے۔“

”یہ درست ہے۔ ممکنہ طور پر پانی کے دباؤ ان دھماکوں کی وجہ بنتے ہیں۔“

”کیا ہمارا اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔“ کلارا نے اب کام کا سوال کیا۔

”نہیں کیونکہ ہمارے پاس اسے منسوخ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔“

میں نے اور کلارا نے بیک وقت سکون کا سانس

لیا اور میں نے کہا۔ "گویا تم ہمیں صرف خبردار کر رہے ہو۔"

اس نے شانے اچکائے۔ "میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں روک دیتا۔ کم سے کم دو دن اس طرف کسی کو نہ جانے دیتا۔"

"دو دن سے کیا ہوگا؟"

"ممکن ہے اندر مزید چٹانیں ٹوٹ رہی ہوں۔ میں نے مائک لگوا دیے ہیں جو چوبیس گھنٹے ریکارڈنگ کرتے ہیں۔"

"مجھے غاروں میں اترنے کا وسیع تجربہ ہے اور تم اطمینان رکھو اگر یہ جگہ مخدوش ہوئی تو ہم آگے جانے کی بجائے واپس آجائیں گے۔"

"بعض اوقات دیکھنے سے پتا نہیں چلتا ہے جب تک آدمی عملی طور پر ان راستوں سے نہ گزرے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر مجھ سے اور کلارا سے ہاتھ ملایا۔ "وش یو گڈ لک۔"

میں باہر آیا اور اپنے ساتھیوں کو کارڈین سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور ان کی رائے مانگی۔ وہ متذبذب ہوئے تھے مگر تقریباً سب نے یہی فیصلہ کیا کہ ہمیں اندر جا کر دیکھنا چاہیے اور اس کے بعد فیصلہ کیا جائے کہ ہمیں آگے جانا ہے یا نہیں۔ کلارا نے ہمارے لیے تین کارکنوں کا بندوبست کیا تھا جو ہمارے ساتھ اندر تک جاتے اور پھر وہ پیچھے رہ جاتے اور کسی ہنگامی صورت حال میں مدد کے لیے آتے یا پھر باہر والوں کو ہمارے بارے میں بتاتے۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور دہانے سے اندر اتر گئے۔ باہر سے معمولی نظر آنے والا دہانہ اندر سے بھی معمولی ثابت ہوا تھا۔ یہ کسی سرنگ کی طرح نیچے جا رہا تھا۔ تقریباً سو گز بعد ہم ایک لفٹ تک پہنچے۔ کیونکہ اس جگہ سے نچلے فلور تک جانے کا راستہ نہایت خطرناک تھا اس لیے مقامی حکام نے یہاں لفٹ لگوا دی تھی۔ یہ تقریباً سو فٹ نیچے غار کے پہلے فلور تک لے جاتی تھی۔

دو باریوں میں ہم سامان سمیت نیچے پہنچے۔ یہاں سے ہمارا سفر شروع ہوا۔ سیاحوں کی مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے حکومت نے غار کے مشکل حصے تراش کر ہموار کیے تھے۔ عام لوگوں کے لیے آسانی ہوئی تھی مگر ہمارے نقطہ نظر سے غار کو برباد کیا تھا۔ کیونکہ فطری مشکلات کو سر کرنے کے لیے ہم جیسے ہم جو یہاں آتے ہیں۔ بہر حال جس حصے میں ہم نے جانا تھا وہ جگہ اپنی اصل شکل میں تھی کیونکہ وہاں آج تک کسی نے قدم نہیں رکھا تھا۔ دوسرے فلور پر پہنچے اس دوران میں ہم ایک جنگل سے گزرے یہ قدرتی جنگل اس زیر زمین غار میں تھا اور کسی عجوبے سے کم نہیں تھا۔ شان اس دوران میں ویڈیو بنا رہا تھا۔ ہم آدھے گھنٹے کے لیے اس جنگل کے پاس رکے اور اس کی ویڈیو بنائی تھی۔ ہال نما حصوں سے گزرتے ہوئے ہم تقریباً ایک گھنٹے بعد تیسرے فلور میں داخل ہوئے اور اصل غار یہاں سے شروع ہوا تھا۔

مقامی لوگ اس غار کو ماتھا کن پوٹ کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے جانے والا واپس نہیں آتا۔ جو مقامی اس غار سے واقف تھے وہ اسے بدروحوں کا مسکن قرار دیتے ہیں اور کوئی فرد یہاں نہیں جاتا۔ ان کا کہنا تھا کہ صدیوں سے کوئی مقامی فرد غار کے دہانے پر بھی نہیں گیا اور جو ایک بار اندر گیا وہ واپس نہیں آیا۔ جب ماہرین نے اس غار کو دریافت کیا تو یہ اندر سے خالی تھا۔ یعنی جہاں تک اس کو دیکھا گیا تھا یہاں انسانوں کی آمد و رفت کے آثار نہیں تھے۔ چند ایک معمولی جسامت کے جانور، پرندے اور کیڑے مکوڑے یہاں کے باسی تھے۔ یہاں سانپ بھی تھے مگر وہ زہریلے نہیں تھے۔ کسی زمانے میں یہاں کوئی آتش فشاں پھٹا تھا اور سمندر سے قربت کے باعث اس کا لاوا بہت تیزی سے ٹھنڈا ہوا اور نتیجے میں اس کی اندرونی پرتیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں اور یہ غار وجود میں آگیا۔ پانی کی قربت نے اس کی شکست و ریخ میں مزید اضافہ کیا اور یہ بڑا ہوتا چلا گیا۔ یہ سارا عمل لاکھوں سال میں انجام پایا۔ اندر میٹھے پانی کی ندیاں جاری تھیں اور ایک کھارے پانی کی جھیل بھی تھی۔ ایک جگہ ہمیں عجیب سی کائی ملی یہ سنہری اسفنج جیسی اور بہت بڑے ڈھیر کی صورت میں اگی ہوئی تھی۔

ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے آگے صرف ہمیں جانا تھا، تینوں مقامی کارکن یہیں رہ جاتے۔ ہم نے یہاں کیمپ لگایا۔ یہ ایک چھوٹا سا ہال تھا۔ جو تیسرے فلور کے آخری حصے میں تھا۔ یہاں غار حیات سے تقریباً خالی ہو گیا تھا ورنہ اب تک زندگی کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی رہی تھی۔ یہاں سناٹا تھا کیمپ لگا کر وہاں دیواروں پر روشنیاں لگائی گئیں۔ یہ چھوٹی سی چپک جانے والی ایل ای ڈی لائٹ تھیں جو ایک بار لگائے جانے کے بعد بارہ گھنٹے تک روشن رہتی تھیں۔ ایسی لائٹس ہمارے پاس بھی تھیں ہم انہیں راستے کی نشانی کے طور پر استعمال کرتے۔ اپنا اکثر سامان ہم نے اسی کیمپ میں چھوڑا، صرف وہی سامان لیا جو ساتھ

طرح جما ہے اس لیے بہت سخت ہو رہا ہے۔"

"یہ جگہ لاوے سے بنی ہے لیکن لاوا سمندری پانی سے ٹھنڈا ہوا ہے۔"

"یہ جگہ بلندی پر ہے اس لیے ممکن ہے سمندری پانی یہاں تک نہ آسکا ہو اور لاوا از خود ٹھنڈا ہوا ہو۔"

لاوا اگر جلدی ٹھنڈا ہو تو اس میں دراڑیں آجاتی ہیں اور اس سے بننے والی چٹانیں جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ مگر یہاں چٹانیں بالکل ٹھوس تھیں۔ فرینک نے درست کہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس میں یہ سرنگ کیسے وجود میں آئی۔ مگر کیا کہا جا سکتا کہ جب یہاں آتش فشاں سے لاوا نکلا ہوگا تو یہاں کی کیا صورت حال تھی اور وہ کون سے عوامل تھے جن سے یہ سرنگ وجود میں آئی تھی۔ تقریباً سو گز کے بعد ہم ایک گنبد نما جگہ پہنچے۔ اس کے نیچے بہت گہرائی تھی۔ ہم نے ایک ڈسپوزیبل ٹارچ جلا کر نیچے پھینکی تو وہ کوئی دو سو فٹ کی گہرائی میں جا گری۔ یہ پوری جگہ ٹی جیسی اور ہیبت ناک سی تھی۔ نیچے جہاں ٹارچ گری تھی اور تیز روشنی دے رہی تھی وہاں سے مزید نیچے کی طرف گڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتھ حسن تھا اس نے مایوسی سے کہا۔ "ڈیڈ اینڈ، اب آگے کیسے جائیں؟"

میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن شان کا خیال مختلف تھا۔ وہ اپنے کیمرے سے زوم کر کے نیچے کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہا تھا اس نے ایک ابھری چٹان کے ساتھ تاریک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے وہاں کوئی راستہ ہے۔"

یہ چٹان کوئی پچاس فٹ نیچے اور ذرا دائیں طرف تھی۔ جولی نے اس کا جائزہ لیا اور بولی۔ "میں جاتی ہوں۔"

"نہیں میں جاؤں گا۔" حسن نے کہا اور دیوار میں کیل ٹھونکنے لگا۔ پھر اس سے کلپ اور رسی باندھ کر اس نے اپنی بیلٹ سے منسلک کی اور کناروں پر قدم جماتا ہوا نیچے اتر گیا۔ یہاں اتنی جگہ نہیں تھی کہ سب کھڑے ہو سکتے اس لیے باری باری آگے آ کر گنبد کا جائزہ لے رہے تھے۔ حسن ایک منٹ میں اس چٹان کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے اپنی تیز روشنی والی ٹارچ سے اسے دیکھا اور پکار کر کہا۔ "کچھ نظر آ رہا ہے لیکن جا کر دیکھنا ہوگا۔"

حسن نے رسی ڈھیلی کی اور دیوار کے ابھرے حصوں کو پکڑ کر چٹان کی طرف جانے لگا۔ ایک جگہ خاصا بڑا خلا تھا۔ یہاں دیوار پر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے حسن گرفت میں لے سکتا مگر اس سے آگے کچھ پتھر ابھرے ہوئے تھے حسن نے ناپ تول کر دیکھا اور چھلانگ لگائی۔ ہم سب سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ خطرہ نہیں تھا کیونکہ حسن رسی سے بندھا ہوا تھا وہ دیوار سے ٹکرا سکتا تھا مگر نیچے نہیں گر سکتا تھا۔ جب اس نے باحفاظت ایک پتھر کو گرفت کر لیا تو ہم نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے بعد راستہ آسان تھا اور وہ چٹان تک پہنچ گیا۔ اس کے چھجے پر بیٹھ کر اس نے اندر روشنی ڈالی اور بولا۔ "راستہ دکھائی دے رہا ہے۔"

"آگے جا کر چیک کرو۔" میں نے کہا۔

جولی بولی۔ "میں بھی جا رہی ہوں۔"

"اسے چیک کرنے دو۔" فرینک بولا۔

"میں اور نیچے جا رہی ہوں شاید کوئی اور راستہ بھی ہو۔" اس نے کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مگر احتیاط کرنا۔"

جولی نے الگ سے کیل ٹھونکی اور اس سے اپنی رسی منسلک کر کے نیچے اتر گئی۔ وہ سیدھی جا رہی تھی اور ہر چند فٹ کے بعد رک کر چاروں طرف کا جائزہ لیتی تھی۔ اس دوران میں حسن واپس آیا۔ آگے راستہ ہے۔ ایک چھوٹے ہال سے کئی راستے نکل رہے ہیں۔"

جولی سو فٹ نیچے تک گئی اور اسے مزید کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے وہ واپس آگئی اور اسی چٹان پر پہنچ گئی۔ حسن نے واپس آ کر درمیان کے خالی حصے میں کیلوں کی مدد سے رسی باندھ دی اور باقی اس کی مدد سے یہ حصہ عبور کرنے لگے۔ کچھ دیر میں سب اس چٹان کے آگے موجود راستے میں داخل ہو چکے تھے۔ حسن کا کہنا درست ثابت ہوا تھا کہ آگے کئی راستے نکل رہے تھے اور ہم نے اگلے آدھے گھنٹے میں جانچ لیا کہ یہ تمام راستے کہیں نہ کہیں نکل رہے تھے۔ روانگی سے پہلے ہم نے ہلکا پھلکا لنچ کیا تھا۔ اب بھوک لگنے لگی تھی۔ اس لیے آدھے گھنٹے کا ریفریشمنٹ بریک لیا اور اس دوران میں ہمیں فیصلہ کرنا تھا کہ ہمیں کس راستے سے آگے جانا چاہیے۔ شان اب تک بنائی جانے والی ویڈیوز کا جائزہ لے کر ان کے کیسٹس پر وقت اور تاریخ کے ساتھ وضاحت ڈال رہا تھا۔

اس کے پاس موجود کیمرا بہت اعلیٰ درجے کا رزلٹ دیتا تھا اور سپر ڈی وی ڈی کوالٹی ویڈیو بناتا تھا اس لیے اس کے کیمرے کی کیسٹ آدھے گھنٹے میں بھر جاتی تھی۔ کیسٹوں

”معمولی زخم ہے۔“

میں نے واکی ٹاکی پر فرینک سے رابطہ کیا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”یہاں پتھر گرے ہوئے ہیں۔“

”ہمیں بھی پتھر ملے ہیں۔“

”مگر یہ خطرناک ہیں میں سوچ رہا ہوں کہ بائیں طرف والی سرنگ آزما کر دیکھوں۔“

”بہتر یہی ہوگا۔ یہاں بھی بہ ظاہر راستہ نہیں ہے مگر جولی نے کچھ دریافت کیا ہے۔“

اتنے میں جولی واپس آگئی۔ ”اس طرف راستہ ہے لیکن بہت تنگ ہے۔“

”ایسا کرتے ہیں پہلے میں اور تم جا کر دیکھتے ہیں۔“ میں نے تجویز دی۔ ”تب تک شان اور کلارا یہیں رکتے ہیں۔“

”میں بھی چلوں گی۔“ کلارا بولی۔ ”شان یہاں رک جائے گا۔“

شان نے سر ہلایا۔ ”یہ سوراخ میری جسامت کے لیے موزوں نہیں ہے۔ تم تینوں جاؤ میں یہیں رکتا ہوں۔“

اس بار بھی جولی آگے تھی اور میں پیچھے تھا۔ سب سے پیچھے کلارا تھی۔ یہ دراز پتھروں سے صاف تھی مگر بہت تنگ اور نہایت کھردری دیواروں پر مشتمل تھی۔ ہمارے جسم آگے جاتے ہوئے چھل رہے تھے۔ درمیان میں ایک جگہ میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا تو مجھے لگا جیسے دیوار ہل رہی ہے۔ میں نے روشنی میں اس کا جائزہ لیا مگر مجھے کوئی دراز دکھائی نہیں دی۔ جولی نے آگے سے پکار کر پوچھا۔ ”رک کیوں گئے ہو؟“

”مجھے لگا جیسے یہاں دیوار ہل رہی ہے۔“

”یہاں پوری ٹھوس دیوار ہے۔“ عقب سے کلارا نے کہا۔

میں نے ایک بار پھر اسی جگہ زور دیا تو اس بار دیوار نہیں ہلی تھی۔ میں نے دیوار ہلنے کو اپنا وہم قرار دیا تھا۔ جولی آگے سرک رہی تھی اس نے کہا۔ ”مجھے پانی گرنے کی آواز آرہی ہے۔“

”شاید ہم چشمے کے پاس ہو گئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

چند منٹ بعد ہم ایک گول کھلے کمرے میں آئے۔ مگر یہ چاروں طرف سے بند تھا اور صرف اس کے اوپر ایک خلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ مگر آواز واضح تھی۔ جولی دیواروں پر کان اور ہاتھ لگا کر چیک کرنے لگی کہ پانی اصل میں کہاں ہے؟ اس نے ایک جگہ سنا اور مجھ سے بولی۔ ”یہاں اس دیوار کے پیچھے پانی ہے۔“

میں نے دیوار کو ہاتھ لگایا تو مجھے پھر وہی احساس ہوا کہ دیوار ہل رہی ہے۔ مگر دوبارہ زور لگانے پر ویسا احساس نہیں ہوا۔ کان لگانے پر دیوار کے پیچھے پانی کے گرنے یا بہنے کی آواز واضح تھی۔ میں نے جولی کی تائید کی۔ ”پانی بہہ رہا ہے۔“

”مگر یہ ڈیڈ اینڈ ہے۔“ کلارا بولی اور اوپر موجود سوراخ کی طرف دیکھا۔ ”ہم وہاں تک نہیں جا سکتے ہیں۔“

جولی نے سوراخ کا جائزہ لیا۔ وہ فرش سے کوئی پچیس فٹ اوپر تھا۔ وہاں تک رسائی کی کوئی صورت نہیں تھی کیونکہ اس جگہ دیواریں بھی ہموار اور چکنی تھیں۔ میں نے شان کو آواز دی۔ اس نے جواب دیا پھر میں نے واکی ٹاکی پر فرینک سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس بار مجھے ناکامی ہوئی۔ ایک بار رابطہ ہوا مگر آواز ناقابل شناخت تھی۔ جولی اپنی ہتھوڑی سے دیواریں بجا کر دیکھ رہی تھی۔ اچانک پانی گرنے کی آواز میں اضافہ ہو گیا۔ کلارا سرنگ کے دہانے کے پاس کھڑی تھی جب کہ میں اور جولی اس سے دور تھے۔ پانی کی آواز میں اضافہ ہوا تھا۔ پھر ایسی آواز آئی جیسے پتھر ٹوٹ رہے ہوں۔ ہم دیوار کی طرف متوجہ ہوئے مگر اصل میں اوپر چھت سرک رہی تھی اور کلارا نے بروقت دیکھا۔ اس نے چلا کر ہمیں خبردار کیا اور سرنگ میں داخل ہو گئی۔ اس کے اندر جاتے ہی اوپر سے پتھر کا ایک خاصا بڑا ٹکڑا عین دہانے پر گرا اور اس نے اسے تقریباً بند کر دیا۔ میں چلایا۔

”یہاں سے نکلو۔“

جولی پہلے ہی حرکت میں آگئی تھی۔ سرنگ میں پہنچنے تک اس کے اوپر مشکل سے ڈیڑھ فٹ کا خلا باقی رہ گیا تھا۔ میں نے جولی کو سہارا دے کر اوپر چڑھانے کی کوشش کی۔ وہ پتھر پر چڑھ گئی مگر اسی لمحے میری نظر اوپر سے ہلتی دیوار پر گئی اور میں نے اسے بروقت پیچھے کھینچا اور جیسے ہی ہم اس جگہ سے ہٹے پتھر ٹوٹنے اور وہاں پانی بہنے لگا تھا۔ ٹوٹنے والے پتھر اس طرح گرے کہ سرنگ کا رہا سہا حصہ بھی بند ہو گیا۔ میں اور جولی پیچھے ہٹے تھے۔ میں نے چلا کر کلارا کو آواز دی۔ ”تم ٹھیک ہو؟“

اونچا ہونے میں آدھا گھنٹا لگا تھا اور یعنی ہمیں مزید آدھا گھنٹا اور تیرنا پڑتا تب کہیں جا کر ہم سوراخ تک پہنچ سکتے تھے۔ پانی کے ساتھ کائی اور دوسری سمندری نباتات اور اشیا کے ٹکڑے بھی آرہے تھے گویا یہ پانی سمندر کی تہہ سے آرہا تھا۔ ہم دیواروں سے لگ کر تیر رہے تھے اور جہاں تک ممکن تھا اپنی توانائی بچا رہے تھے۔ نہ جانے ہمیں کتنی دیر اس پانی میں تیرنا پڑے اور آگے کن مراحل سے گزرنا پڑے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب کمرے میں پانی بھرنے کی رفتار سست ہو گئی۔ اب یہ مشکل سے ایک منٹ میں ایک انچ کے حساب سے بڑھ رہی تھی اور اگر اس رفتار سے بھی بڑھتی تو بری نہیں تھی مجھے اور جولی کو خدشہ تھا کہ کہیں پانی بھرنا رک نہ جائے۔

شام کے چھ بج رہے تھے اور اور ہمیں پانی میں تیرتے ہوئے ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ مسلسل تیرنے سے ہمارے جسم شل ہو گئے تھے۔ مگر تیرتے رہنا مجبوری تھی۔ دس منٹ بعد پانی بھرنا بند ہو گیا اور اس کی سطح ایک ہی جگہ قائم ہو گئی تھی۔ میں اور جولی ہراساں ہو گئے۔ جولی نے کہا۔ ”اب ہم پھنس گئے۔“

”ایک حد سے زیادہ تیرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اس لیے ہمیں کوئی سہارا لینا ہوگا۔“

”وہ کیسے؟“

جولی کے سوال پر اس کا جواب اچانک ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ ”دیوار میں کیل گاڑ کر۔“

نیچے کے مقابلے میں اوپر دیواریں کسی قدر کھردری تھیں اور ان میں رخنے بھی نظر آرہے تھے۔ جولی نے ایسے ہی ایک رخنے کی نشان دہی کی مگر وہ دیوار میں کوئی دو فٹ اوپر تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں تمہیں اوپر کرتا ہوں تم کیل ٹھونکو۔“

جولی نے کیل اور ہتھوڑی نکالی۔ میں نے اسے کمر سے پکڑ کر اوپر کیا اور وہ رخنے میں کیل گاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر ایک تو میں اسے اٹھائے ہوئے تھا اور دوسرے میں پانی میں تیر رہا تھا اس لیے وہ پوری قوت سے کیل پر ہتھوڑی استعمال نہیں کر پا رہی تھی۔ جب وہ کیل پر ہتھوڑی مارتی تو رد عمل میں، میں پیچھے چلا جاتا تھا۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد وہ بالآخر کیل گاڑنے میں کامیاب رہی۔ مگر یہ ابھی مضبوط نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے چھوڑ دو اور اسے مضبوطی سے گاڑو۔“

میں نے ہتھوڑی لی اور ہاتھ بلند کر کے اسے کیل پر

بائی والوز

لوتھڑے کی طرح کے آبی جانوروں کا نام جو دو سیپیوں کے درمیان میں رہتے ہیں۔ یہ سیپیاں آپس میں اس طرح جڑی ہوتی ہیں گویا ایک ہی خول ہو لیکن ضرورت کے وقت یہ جانور ان کو کھول اور بند کر سکتے ہیں۔ بند حالت میں بھی ہر سیپی میں ایک سوراخ ہوتا ہے جو لعاب سے بند اور کھل سکتا ہے۔ اسی ہوا سے یہ جانور سانس لیتا ہے اور اسی سوراخ کی وجہ سے اس کو بائی والو یعنی دو ڈھکنوں والا کہتے ہیں۔ دہری سیپیوں والے بے شمار جانور ہیں جن میں موتیا جانور مشہور ہے۔ ان جانوروں کی سیپیاں اندر سے نہایت چمکدار اور شوخ رنگ کی ہوتی ہیں اور گراں قیمت پر بکتی ہیں۔ ان سے چاقوؤں کے دستے، بٹن اور دیگر اشیاء بنائی جاتی ہیں۔

مرسلہ: اریبہ شکیل۔ سیالکوٹ

مارنے لگا بالآخر میں اسے اتنا ٹھونکنے میں کامیاب رہا تھا کہ اب وہ آسانی سے نہیں نکل سکتی تھی اور اس سے رسی باندھی جاتی تو یہ ہم دونوں کا بوجھ برداشت کر سکتی تھی۔ جولی نے اس سے دوہری رسی باندھی اور ان کے سرے ہماری کمروں سے لگے کلپس سے منسلک کر دیے۔ اب ہم بغیر کوشش کے آرام سے پانی میں تیر رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل کوشش نے ہمیں تھکا دیا تھا اس لیے آرام کا یہ وقفہ بہت اچھا لگا۔ پانی اب نہ ہونے کی رفتار سے بڑھ رہا تھا اور اس کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا کہ ہم چھت پر موجود سوراخ تک پہنچ سکیں۔ مگر یہ بھی کم نہیں تھا کہ اب ہمیں کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ اتنی دیر سے ہم نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اس لیے جب آرام ملا تو سب سے پہلے پانی پیا اور پھر جولی نے ایک چاکلیٹ نکال کر آدھی مجھے دی اور آدھی خود کھائی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا خیال ہے باہر سے کتنی دیر میں مدد آسکتی ہے؟“

”کچھ کہنا مشکل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھو سرنگ کے آغاز تک آنا مسئلہ نہیں ہے لیکن اس کے بعد دو جگہ ملبہ گرا ہے اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام پانی کے ہوتے ہوئے

نہیں کر رہے تھے۔ جب پیاس محسوس ہوتی تو ایک ایک گھونٹ پانی لیتے اور بھوک لگتی تو ایک بسکٹ یا چاکلیٹ کا ٹکڑا کھاتے۔ اگر چوبیس گھنٹے تک مدد نہ آتی تو ہم اس راشن کو مزید آدھا کر دیتے۔ پانی میں کئی گھنٹے رہنے سے ہمارے جسموں کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ مگر مجبوری تھی۔ عام پانی کے مقابلے میں سمندری پانی جسم کے لیے جہاں فائدے مند ہوتا ہے وہیں یہ زیادہ دیر پانی میں رہنے کی صورت میں جسم کو نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ شکر ہے سمندری پانی کے ساتھ کیڑے مکوڑے اور کاٹنے والے جانور اندر نہیں آئے تھے۔ دس بجے جولی نے کہا۔

''میں بہت تھکن محسوس کر رہی ہوں۔''

''سو جاؤ۔'' میں نے مشورہ دیا۔

سونا اتنا مشکل نہیں تھا کیونکہ سر ہمارے پانی سے اوپر تھے اور کسی صورت پانی کے اندر نہیں جا سکتے تھے اس لیے ہم جسم ڈھیلا چھوڑ کر سونے کی کوشش کر سکتے تھے۔ جولی نے ایسا ہی کیا اور کچھ دیر بعد وہ غنودگی میں چلی گئی۔ وہ سو تو نہیں رہی تھی مگر ایک سکون والی کیفیت میں آ گئی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد مجھے بھی غنودگی محسوس ہونے لگی مگر میں جاگتا رہا۔ دونوں میں سے کسی ایک کا جاگنا لازمی تھا۔ کوئی ہنگامی صورتِ حال پیش آ سکتی تھی یا پھر مدد آ جاتی اور ہمیں علم نہ ہوتا۔ جولی کے آرام کی وجہ سے میں نے ہارن کا وقفہ ایک گھنٹے بعد کر دیا تھا۔ جولی نے کانوں میں مستقل پلگ لگا لیے تھے اس کے باوجود جب میں ہارن بجانے لگتا تو اسے ہلا دیتا کہ وہ ذہنی طور پر مستعد ہو جائے۔ ہارن کی بھیانک آواز سے اسے ذہنی دھچکا نہ لگے۔ بارہ بجے میں نے اسے جگا دیا اور خود آرام کرنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ چار بجے مجھے اٹھا دے۔ اس دوران میں ہارن بجانے کی ذمے داری جولی کی تھی۔ مگر اس نے مجھے تین بجے ہی ہوشیار کر دیا۔

''ہنرک، پانی کی سطح بڑھ رہی ہے۔''

میں چونکا۔ واقعی پانی کی سطح بڑھ گئی تھی اور اب یہ ہماری گردن تک تھا۔ یعنی رسی ہمیں اتنا سپورٹ کر رہی تھی۔ میں نے روشنی کر کے نشان دیکھا تو وہ پانی میں نیچے جا چکا تھا اور اب کیل صرف ایک فٹ اوپر رہ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''پانی کب سے بڑھ رہا ہے؟''

''تقریباً آدھے گھنٹے سے۔'' اس نے جواب دیا۔

اب پانی بڑھنے کی رفتار خاصی تیز تھی اور میں نے اندازہ لگایا کہ یہ دو فٹ فی گھنٹے کے حساب سے بڑھ رہا تھا۔ جولی نے

ایک فٹ تک نکل آیا۔ میں نے ٹارچ روشن کی اور اندر ہاتھ ڈال کر ہلانے لگا۔ ایک منٹ بعد میرا دم اکھڑنے لگا تھا میں سانس لینے اوپر آیا اور جولی کو بتایا کہ میں نے کوشش کر کے کچھ پتھر ہٹا دیے ہیں۔ وہ پُرامید ہوگئی۔

"پانی میں پتھر کا وزن کم ہوگیا ہے اس لیے وہ ہلائے جا سکتے ہیں۔ میں بھی آتی ہوں۔ شاید ہم مل کر راستہ صاف کر سکیں اور کلارا زندہ ہے تو اسے بھی یہاں سے نکال سکیں۔"

جولی نے اپنا بیگ اور دوسری چیزیں بھی رسی سے باندھیں اور خود آزاد ہو کر نیچے آئی۔ میں نے اور جولی نے مل کر زیادہ بڑے پتھر ہٹائے اور پھر بڑھنے والے خلا میں ہاتھ ڈال کر ٹارچ کی روشنی لہرانے لگے۔ وہ بڑا پتھر جس نے دہانے کا بڑا حصہ بند کر دیا تھا اتنا بڑا تھا کہ ہم تمام تر کوشش کے باوجود اسے ہلا نہیں سکے تھے۔ جولی کا سانس جلد اکھڑ گیا اور وہ سانس لینے اوپر گئی۔ جب وہ سانس لے کر آئی تو میں گیا اور اس دوران میں ہم مسلسل سرنگ میں روشنی سے اشارے دیتے رہے۔ مگر کلارا کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں آیا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ زندہ نہیں تھی؟ تقریباً دس منٹ بعد ہم نے کوشش ترک کر دی۔ ایک تو ہماری حالت اس قابل نہیں تھی کہ ہم زیادہ دیر غوطہ خوری جیسا مشکل کام کر سکتے۔ دوسرے ہمارے پاس موجود روشنی کی اشیا کی بیٹریز کمزور ہو گئی تھیں۔ ہم انہیں زیادہ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اوپر آنے کے بعد ہم نے دوبارہ خود کو رسی سے باندھ لیا اور سستانے لگے۔ میں دل گرفتہ تھا اور جولی روہانسی ہو رہی تھی۔

"شاید وہ....."

"نہیں ابھی اُمید رکھو۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ممکن ہے وہ نکل گئی ہو۔"

"شاید۔" وہ بولی۔ "اب ہم کیا کریں؟"

"سوائے انتظار کے ہم اور کیا کر سکتے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا ہم اس سوراخ تک رسائی کی کوشش نہیں کر سکتے؟" جولی نے کہا۔

"تم نے دیکھ لیا ہے اوپر دیوار ہموار اور بہت سخت ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں کیل ٹھونکنا بہت مشکل ہے۔"

"بڑی کیل ٹھونکنا مشکل ہے لیکن اگر چھوٹی کیل استعمال کریں تو وہ لگ سکتی ہے اور اس میں کلپ لگا کر ہم

عظیم مسلمان سرجن دس صدیاں پہلے انہوں نے سرجری کے جو اصول بتائے، مغربی علما نے انکی اصولوں پر موجودہ نظریات کی بنیاد رکھی ہے۔ یورپی انہیں Abul Cases کہتے ہیں۔ انسانی اعضاء کی تحقیق کے لیے ڈائی سیکشن کی ضرورت کو انہوں نے معتبر بتایا۔ سرجری پر ان کی کتاب "التصریف" کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عظیم مسلمان سرجن ابوالقاسم الزہراوی تھے جو کہ 936ء کو قرطبہ میں پیدا ہوئے اور سرجری کی دنیا میں انکی خدمات انجام دیں کہ تا ابد انہیں سرجری کا بے تاج بادشاہ اور بانی مانا جاتا رہے گا۔

مرسلہ: ملک ثاقب شاد تحولی ایڈووکیٹ

کام چلا سکتے ہیں۔"

میں نے سوچا تو مجھے جولی کی تجویز اچھی لگی۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہم کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ کام ہم اگلی ٹائیڈ میں کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگلی بار پانی دوپہر تین بجے کے آس پاس چڑھنا شروع ہوگا۔"

جولی نے سر ہلایا۔ "تب تک ہم آرام کریں گے تاکہ ہماری توانائیاں برقرار رہ سکیں۔"

ہم باری باری آرام کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر گھنٹے بعد ہارن بجانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔ چھبیس گھنٹے بعد میرا ہارن ختم ہو گیا تھا اس لیے اب جولی کا ہارن استعمال ہو رہا تھا۔ بہت احتیاط سے استعمال کے باوجود چالیس فیصد پانی اور ایک تہائی خوراک ختم ہو گئی تھی۔ کئی بار میں نے واکی ٹاکی استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اس بند جگہ یہ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ مسلسل پانی میں رہنے سے ہمارے پیروں میں خارش شروع ہو گئی تھی اس لیے ہم نے اپنے جوتے اتار کر بیگ میں رکھ لیے تھے۔ اس کے باوجود خارش میں کوئی خاص کمی نہیں تھی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ٹانگوں اور جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل رہی تھی۔ ہم نے باری باری ایک دوسرے کے پیروں کا معائنہ کیا اور ہمیں جلد پر سرخ دھبے نظر آئے تھے۔ شاید پانی میں کوئی ایسی چیز تھی جس سے ہمیں خارش لاحق ہو رہی تھی۔

جولی نے مختصر سی نیکر پہنی ہوئی تھی اور میں نے گھٹنوں تک شارٹ پہنا ہوا تھا۔ اوپر سینڈو تھا اور جولی نے

اچھالوں تو کیا تم کنارے پر ہاتھ جما سکو گی؟"

جولی نے اوپر دیکھا۔ "مشکل لگ رہا ہے کیونکہ جب تم مجھے اوپر اچھالو گے تو ردِ عمل میں تمہارا جسم پانی میں جائے گا اور تم مجھے اتنا نہیں اچھال سکو گے کہ میں کنارے تک ہاتھ لے جا سکوں۔"

"کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔" میں نے اصرار کیا تو جولی باول ناخواستہ راضی ہو گئی۔ اس نے اپنا بیگ اتار دیا۔ میں نے بھی بیگ اتار دیا اور تمام وزن والی چیزیں بیگ میں ڈال کر انہیں کیلوں سے ٹکا دیا۔ میں نے جولی کو کمر سے پکڑا اور اس نے آخری کیل تھام لی۔ میں نے ایک دو تین کہہ کر اسے اوپر اچھالا۔ جولی نے بھی کلپ پر زور دیا اور وہ اوپر گئی۔ مگر اس کے ہاتھ کنارے سے کوئی پون فٹ نیچے رک گئے تھے۔ ایسا میرے جسم کے پانی میں جانے کی وجہ سے ہوا اور نہ اس کا ہاتھ کنارے تک چلا جاتا۔ ہم نے دو بار اور کوشش کی مگر کنارہ جولی کے ہاتھ سے نصف فٹ سے زیادہ ہی دور رہا اور پھر یہ فاصلہ ہی طے نہیں کرنا تھا بلکہ جولی کا ہاتھ اتنا اوپر جانا بھی لازمی تھا کہ وہ کنارے کو مضبوطی سے تھام سکے اور اوپر چڑھ سکے۔ اس نے تین ناکامیوں کے بعد ہانپتے ہوئے کہا۔ "یہ کام اس طرح نہیں ہو گا۔"

"پھر کیسے ہو گا؟"

ہم سوچ میں پڑ گئے۔ اس طرح سے تو یہ کام ممکن نہیں تھا اور وقت تیزی سے ہمارے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ پانی کی سطح کم ہونے لگی تھی۔ جب کچھ میں کچھ نہ آیا تو ہم نے پھر کوشش کر کے دیکھی اور انجام سابق رہا۔ اس وقت میں صحیح معنوں میں مایوس ہو چکا تھا اور مجھے لگا کہ ہم اس پھندے سے کبھی نہیں نکل سکیں گے جس میں اپنی بدقسمتی سے پھنس گئے تھے۔ آٹھ بجے کے بعد پانی کی سطح میں واضح کمی آنے لگی اور پانی جتنا کم ہوتا سوراخ تک پہنچنے کے امکانات اتنے ہی کم ہو جاتے۔ اچانک جولی بولی۔ "سنو مسئلہ اس وقت ہوتا ہے جب تم مجھے اچھالتے ہوئے پانی میں جاتے ہو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی طریقے سے خود کو پانی میں جانے سے روکو؟"

جولی کے سوال نے میرے دماغ میں ایک کھڑکی سی کھول دی اور کچھ دیر بعد مجھے اس کا حل بھی سوجھ گیا۔ میں نے کہا۔ "اگر میں پانی میں موجود کلپ میں پاؤں پھنساؤں اور پھر تمہیں اچھالوں تو میں پانی میں نہیں جاؤں گا۔"

"ہاں لیکن اس صورت میں تمہیں دیوار کے بہت پاس ہونا پڑے گا۔"

"اور تم دیوار کے پاس ہوگی تو دیوار سے ٹکرانے کا خطرہ ہوگا۔ تمہیں چوٹ لگ سکتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں برداشت کرلوں گی۔" جولی نے کہا۔ میں نے اپنا دایاں پنجہ پانی میں کوئی تین فٹ نیچے لگے ایک کلپ میں پھنسایا اور جولی کو کمر سے تھاما۔ ایک دو تین کہہ کر میں نے اسے اچھالا اور اس بار وہ تیزی سے اوپر گئی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ اس کا ہاتھ کہاں تک پہنچا مگر وہ پلٹ کر واپس مجھ پر آئی اور پانی میں گری۔ پھر سنبھل کر کہا۔ "میرا ہاتھ کنارے تک پہنچا ہے مگر اور زور لگانا ہوگا۔"

اگلی بار میں نے زیادہ قوت استعمال کی اور جولی نے بھی کلپ پکڑ کر خود کو اچھالا تھا اور اس کا ہاتھ کنارے تک پہنچ بھی گیا تھا مگر وہ گیلا ہونے کی وجہ سے جم نہ سکا اور پھسل کر واپس آ گیا۔ جولی دیوار سے ٹکرائی اور اسے چوٹ بھی لگی

آہ! ادا جعفری

اردو شاعری کا ایک بڑا نام ادا جعفری 12 مارچ 2015ء کو کراچی کی مٹی اوڑھ کر سو گئیں۔ ان کا اصل نام عزیز جہاں تھا۔ انہوں نے 22 اگست 1924ء کو بھارت کے شہر بدایوں (اتر پردیش) میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پہلی غزل 1945ء میں معروف جریدے "رومان" میں شائع ہوئی۔ ابتداء میں ادا بدایونی کے نام سے شاعری کی مگر 29 جنوری 1947ء کو جب نورالحسن جعفری کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں تو ادا جعفری کے نام سے مشہور ہوگئیں۔ نورالحسن جعفری بھی ادب پرست تھے۔ اس لیے انہیں مہمیز ملی اور ان کی شاعری میں نکھار آتا چلا گیا گو کہ ابتداء میں وہ اثر لکھنوی اور اختر شیرانی سے اصلاح لیتی تھیں مگر کراچی منتقل ہونے کے بعد یہ سلسلہ کم ہوتا چلا گیا۔ ان کی نمایاں کاوشوں میں "ساز ڈھونڈتی رہی" (1950ء)، شہر درد (1967ء)، غزالاں تم تو واقف ہو (1972ء)، غزل نما (1987ء)، ساز سخن بہانہ ہے (1988ء)، جو رہی سو بے خبری رہی (1995ء) اور کلیات "موسم موسم" کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات پر آدم جی ایوارڈ (1968ء)، تمغۂ امتیاز (1981ء)، کمال فن ایوارڈ اور صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

چنداماموں

منیر خان

چاند خوب صورتی کی علامت بھی ہے اور پُراسراریت کا مظہر بھی۔ اس کے متعلق ہزارہا روایت مشہور ہیں۔ چندا ماما کے بارے میں مشہور چند روایات میں سے اقتباس

دنیا بھر میں پھیلی عجیب وغریب کہانیاں

خدا نے جب کائنات تخلیق کی تو چاند اور سورج بھی وجود میں آگئے۔ سورج جو دن میں روشنی، حرارت اور قوت دیتا ہے اور چاند جو رات کے وقت سکون، ٹھنڈک اور خوبصورتی کا احساس دلاتا ہے۔

یہ سب خدا کی نشانیوں میں سے ہیں اس نے زمین، چاند سورج اور ستارے پیدا کیے جو اس کے حکم کے مطابق اپنے اپنے محوروں میں گردش کر رہے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مدار ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ نہ چاند سورج کو پکڑ



عورت، عورتوں کے حمل کی محافظ تھی۔

ایک اور قدیم تہذیب تھی ازٹیک۔ ان کے عقیدے کے مطابق چاند کی دیوی کا نام کویوتھا جو ایک جوان عورت تھی۔

اس کے برعکس افریقا کے Benin علاقے میں چاند کی دیوی ماؤ کر ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس کے شوہر کا نام لیزا تھا۔ ان دونوں نے مل کر دنیا تخلیق کی تھی۔ سورج ان دونوں کا بیٹا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق ماؤ دُران کی دیوی تھی جب کہ لیزا ان کا حاکم تھا۔ ماؤ رحم دلی، ٹھنڈک اور سکون کی علامت تھا۔ جب کہ لیزا قوت اور حرارت کا۔

چاند اور سورج کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ بہت عجیب و غریب ہے۔ ہزاروں روایات چاند سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح توہمات کی بھی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق کائنات ایک نَفَس کا نام ہے۔ یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے اور چلتا ہی رہے گا۔ یعنی ایک کائنات کے خاتمے کے بعد دوسری کائنات کا جنم ہوگا۔

آسمانوں پر ان گنت دیوی، دیوتاؤں اور ارواحوں کی حکومت ہے۔ جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک آتے جاتے رہتے ہیں۔

چاند کے خدا کا نام سوما ہے۔ سوما ایک رتھ پر سوار ہو کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتا ہے۔ اس رتھ کو سفید گھوڑے کھینچا کرتے ہیں۔

ان دیوی دیوتاؤں نے ایک طرح کا آبِ حیات پی رکھا ہے۔ جس کو پی کر یہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی چاند سورج کو جھٹکا بھی لگتا ہے۔ جیسے چاند کو ایک جھٹکا گنیش جی نے دیا تھا۔

گنیش ہندوؤں کے مشہور دیوتا کا نام ہے۔ ہاتھی کے سونڈ والا یہ دیوتا پورے ہندوستان میں پوجا جاتا ہے۔ گنیش مہاراج شیوا اور پاربتی کے بیٹے تھے۔ گنیش کو بچپن ہی سے میٹھا کھانے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار کسی نے میٹھا کھانے کی دعوت دی۔ گنیش اس کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں میٹھا کھاتے کھاتے بہت دیر ہو گئی۔ انہیں یہ فکر ہوئی کہ ان کے ماں باپ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ لہٰذا جلدی جلدی کچھ مٹھائی اپنے ساتھ رکھی اور گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ راستے میں ایک جگہ ٹھوکر لگی۔ گرے تو ساری مٹھائی بکھر گئی۔ اس وقت چاند ان کو دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ گنیش جی کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے چاند کو بددعا دی کہ جا میں نے تیری روشنی چھین لی۔ بے چارہ چندرما گھبرا کر زمین پر اتر آیا۔ اس نے اپنے قصور کی معافی مانگی۔ تب گنیش نے کہا کہ ٹھیک ہے میں اپنی بددعا تو واپس نہیں لے سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ تو ہر مہینے گھٹتا بڑھتا رہے گا۔ اس دن سے چاند ہر مہینے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ کس کس طرح کے عقیدے نہ صرف رائج تھے بلکہ ان پر یقین بھی کیا جاتا تھا۔ (اور آج بھی ایسا ہی ہے)۔

جب چاند پوری طرح روشن ہوتا ہے تو طرح طرح کے جادو جگائے جاتے ہیں۔ طرح طرح کے ٹوٹکے کیے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی عامل حضرات محبت اور کامیابیوں کے تعویذات چڑھتے چاند کی تاریخوں میں لکھا کرتے ہیں۔ جب کہ دشمنی اور کسی کی بربادی کے ٹوٹکے اور تعویذات گھٹتے ہوئے چاند میں کیے جاتے ہیں۔

چاند کے حوالے سے ایک خاص اصطلاح Lunatic ہے۔ یعنی چاند کو دیکھ کر پاگل ہو جانا۔

امو شنل انٹیلی جنس

حسن رزاقی

انسان کی ذات کو ناپنے کے لیے بے شمار پیمانے مقرر ہیں۔ طرح طرح سے امتحان لیے جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ اگلا شخص کتنا ذہین ہے۔

ذہانت کا اندازہ لگانے کے لیے مروجہ طریقہ کار

گلف ائر اور گیمکو کے آپس کے تعلقات اتنے ہی خوشگوار تھے جتنے کہ سوتیلے بھائیوں کے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گلف ائر اور گیمکو کے ارباب اختیار نے گلف ائر کے شعبہ انجینئرنگ کے سربراہ کی مرضی کے خلاف گلف ائر کے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کا کام اور اس کے ساتھ ہی ساتھ، انجینئرنگ کا زیادہ تر عملہ بحرین سے ہٹا کر گیمکو کے پاس ابوظہبی بھیج دیا تھا۔ گیمکو امارت ابوظہبی اور گلف ائر کی ہوائی جہازوں کی مرمت کی مشترکہ کمپنی ہے جس میں 60



روم میں بھی چاند کے حوالے سے کئی کہانیاں مشہور تھیں۔ قدیم اطالیہ میں ڈیانا دیوی کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ ڈیانا دیوتا اپالو کی جڑواں بہن تھی۔ اس کے ماں باپ جوپیٹر اور لاٹونا تھے۔ ڈیانا اپنے کو اتنا مقدس سمجھتی کہ کسی کو بھی دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک بار جب وہ نہا رہی تھی تو ایک بدنصیب مسافر شکاری اس طرف آنکلا۔ اس نے ڈیانا کو دیکھ لیا۔ ڈیانا نے ناراض ہو کر اسے چاند بنا دیا اور اس کی قسمت میں گردش لکھ دی۔

اس قسم کی روایات کے حوالے سے چین اور جاپان بھی کسی سے کم نہیں رہے۔ انہوں نے بھی چاند اور سورج کے حوالے سے کئی دیوی دیوتاؤں کو تخلیق کر لیا۔

قدیم جاپانی مذہب کے مطابق چاند کے خدا کا نام سوکی یومی تھا۔ یہ بھی ایک دل چسپ بات ہے کہ بہت سے دیوی دیوتاؤں کا پورا خاندان ہوا کرتا تھا۔ ماں باپ، بھائی بہن وغیرہ یا شاید خاندان کو علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو۔

سوکی یومی کا مطلب تھا "خدا تک جانے کا راستہ۔"

چاند کا خدا اپنی ماں کی آنکھ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کی ایک بہن بھی اماتیراسو۔ دونوں بھائی بہن بڑے مزے کے ساتھ جنت میں رہا کرتے تھے۔ سوکی یومی اگر چاند کا خدا تھا تو اماتیراسو سورج کی دیوی تھی۔

ایک بار اماتیراسو نے اپنے بھائی کو اپنا نمائندہ بنا کر خوراک کی دیوی سوچا کی کے پاس بھیجا۔ سوچا کی نے سوکی یومی کی خاطر مدارات کیں۔ لیکن کسی بات پر سوکی یومی خوراک کی دیوی سے ناراض ہو گئی اس نے طیش میں آ کر خوراک کی دیوی کو قتل کر دیا۔ جب اماتیراسو کو اپنے بھائی کی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے اپنے بھائی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے بعد سے چاند اور سورج ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ چاند سورج ستارے سیارے زمین سب کے سب اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ وہ مدار جو خدائے بزرگ و برتر نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے اور وہ خدا کے حکم کے مطابق اپنے اپنے راستے پر چلتے رہتے ہیں۔

چاند گرہن کے حوالے سے بھی بے شمار روایات اور کہانیاں ہیں۔ خود ہمارے یہاں بھی ہیں۔ حاملہ خواتین کو چاند گرہن کے وقت گھر سے نکلنے نہ دینا، کیوں کہ ہونے والے بچے پر اس کا اثر پڑتا ہے۔

ہمارے یہاں چاند اور سورج گرہن کی خاص دعائیں ہوتی ہیں۔

انکا قبیلے کے لوگوں کے خیال میں چاند گرہن بہت بری بات تھی۔ جب چاند کو گرہن لگتا ہے تو انکا یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھیڑیا چاند کو کھا رہا ہے۔ پھر شریر بھیڑیے کو بھگانے کے لیے پوری قوت سے چیخا چلایا جاتا ہے، ڈبے پیٹے جاتے، کتوں کو بھونکوایا جاتا تاکہ وہ بھیڑیا چاند کو چھوڑ کر بھاگ جائے۔

میسوپوٹامیا کے باشندے یہ سمجھتے تھے کہ چاند کو گرہن ان کے بادشاہ کی کھانسی سے لگا ہے۔ ایسی صورت میں یا تو بادشاہ کو کفارہ ادا کرنا پڑتا یا اسے ہٹا دیا جاتا۔

ایک امریکی قبیلے ہوپا کا عقیدہ یہ تھا کہ چاند کی بیس بیویاں ہیں اور سینکڑوں پالتو جانور ہیں۔ یہ سارے پالتو جانور خونخوار درندے ہیں۔ جیسے اژدھے، بھیڑیا، شیر، چیتا وغیرہ۔ چاند ان کی خوراک کا بندوبست کرتا رہتا ہے اور اگر کبھی چاند ان کی خوراک کا بندوبست نہیں کر پاتا تو یہ سارے جانور غصے میں آ کر چاند پر حملہ کر دیتے ہیں۔ جس سے چاند کو گرہن لگنے لگتا ہے۔ اس وقت چاند واویلا کرتا ہے۔ تو اس کی بیویاں آ کر اسے بچا لیتی ہیں۔

ایک اور جگہ چاند گرہن کا مطلب چاند کا بیمار پڑ جانا ہے۔ اس وقت سب مل کر اس کی صحت یابی کی دعا کرتے ہیں۔

یہ تو چاند کے حوالے سے چند ایسے عقیدے ہیں جو قدیم روایات اور کہانیوں پر مشتمل ہیں لیکن جدید دور کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو چاند کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوا کرتا ہے۔

پورے چاند کی رات میں ذہنی مریضوں کے جنون میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ کیا جا چکا ہے۔ لندن کا ایک شخص چارلس ہائڈ چاندنی رات میں پاگل ہو کر لوگوں کو قتل کرتا پھرتا تھا۔

رابرٹ لوئس کا مشہور ناول ڈاکٹر جیک اور مسٹر ہائڈ اسی تصور پر مبنی ہے۔

چاند چاہے کچھ بھی ہو مگر ہمارے لیے تو چاند وہی ہے، چندا ماما والا۔ یا اس بڑھیا والا جو اس میں بیٹھی چرخہ کات رہی ہے۔

تو کسی نے سمجھداری، خود آگہی، علم حاصل کرنے کی صلاحیت، منصوبہ بندی کی صلاحیت، مسائل کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت وغیرہ جانا اور مانا ہے۔ لیکن تقریباً ہر کسی کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان جس طریق سے زندگی گزارنے کے لیے اپنا ذہن اور فکر و فہم اپنے ماحول میں مسائل کو حل کرنے اور زندگی گزارنے کے لیے استعمال کرتا ہے وہ ذہانت ہے۔ ایک ذہین انسان جس احسن طریقے سے اپنی زندگی کے معاملات چلا سکتا ہے ایک کند ذہن آدمی اس کامیابی سے زندگی نہیں گزار سکتا۔ ذہانت کے پنپنے میں صرف ذہن کے خلیئے ہی کافی نہیں ہیں۔ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اس کا بھی ذہانت کے پنپنے میں بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی عوامل ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔

ایک فرد کی ذہانت کا اثر اس کی اپنی ذات کے علاوہ اس کے قریب رہنے والوں پر، اور ان لوگوں پر بھی پڑتا ہے جن میں وہ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ ان لوگوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے درمیان وہ کام کرتا ہے اور وہ ادارے بھی جو اس کو ملازم رکھتے ہیں۔ اسی لیے آج بہت سے ادارے ایسے ہیں جو کسی شخص کو ملازم رکھنے سے پہلے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ جس شخص کو وہ ملازم رکھنا چاہتے اس میں کس قدر ذہانت ہے۔ آیا وہ اپنے فرائض منصبی کو احسن طور پر سنبھالنے کا اہل ہے یا نہیں۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے وہ اس شخص کی ذہانت کا تعین کرنا چاہتے ہیں۔ اس ذہانت کا تعین عام طور سے انٹیلی جنس کوشنٹ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ جو آئی۔ کیو کہلاتا ہے۔

ذہانت ناپنے کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم برطانیہ کے مشہور ماہر شماریات سر فرانسس گالٹن نے اٹھایا جو سائیکو میٹری کے بانی تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات 1882 میں شروع کیے لیکن اپنے نظریات ثابت نہ ہو سکنے کے باعث ان کو اپنے تجربات بند کرنے پڑے۔ پھر اس کے بعد 1905 میں فرانسیسی ماہر نفسیات الفرڈ بینیٹ اور تھیوڈور سیمون نے بینیٹ۔ سیمون ٹیسٹ' کی بنیاد ڈالی جس کا بنیادی مقصد ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کی توثیق کرنا تھا۔ اس سے پہلے ان بچوں کی ذہنی سستی کو دماغی بیماری تصور کیا جاتا تھا۔ آخر کار 1916 میں امریکی ماہر نفسیات ہنری گوڈارڈ نے بینیٹ کے اصولوں پر مزید تحقیق کے بعد اسٹینفورڈ۔ بینیٹ انٹیلی جنس اسکیل بنایا جو کئی دہائیوں تک ذہانت ناپنے کا مقبول پیمانہ رہا۔ آج کی دنیا میں کئی مختلف طرح کے آئی۔ کیو ٹیسٹ مروج ہیں۔ ان سب کا

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس شعر کے صحیح خالق کی نشاندہی میں اکثر حضرات دھوکا کھا گئے ہیں، کئی قابل احترام ادیبوں اور دانشوروں نے سہواً اس شعر کو میر تقی میر سے یا پھر امیر مینائی سے منسوب کیا ہے، جب کہ کچھ نے سودا سے، جب کہ کلیات سودا، نول کشور، لکھنو، میں یہ شعر موجود نہیں ہے۔ گلستانِ ہزار رنگ، مرتبہ، سید بہاؤ الدین، لیبل لیتھو پریس، پٹنہ 1957ء، یہ شعر میر تقی میر سے منسوب ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون.... میر اور ہم.. میں اس شعر کو میر سے منسوب کیا ہے۔

یہ شعر نہ تو میر کا ہے اور نہ ہی امیر مینائی، یا سودا کا، بلکہ نواب محمد یار خان امیر، سکونت ٹانڈہ ضلع رائے بریلی، شاگرد، قائم چاندپوری، کا ہے۔ وفات جنوری 1775ء دیکھیے طبقات الشعرا، قدرت اللہ شوق، مرتبہ، نثار احمد فاروقی۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔
(ذرہ حیدر آبادی کے مضمون سے اقتباس)

بنیادی مقصد کسی شخص کی سوچ کا انداز، قوتِ فہم و ادراک اور ان کے استعمال کرنے کی صلاحیت کا تعین کرنا ہے۔

آئی۔ کیو ٹیسٹ میں جانچ کیے جانے والے شخص کی ذہانت کا موازنہ اس کے ہم پلہ لوگوں کے گروہ سے کیا جاتا ہے۔ گروہ کی اوسط صلاحیت کو 100 گنا جاتا ہے۔ تقریباً 70 فیصد لوگوں کا آئی۔ کیو 85 اور 115 کے درمیان ہوتا ہے۔ اوسط صلاحیت 95 اور 105 کے درمیان مانی جاتی ہے۔ 95 سے کم آئی۔ کیو کے حامل کو نسبتاً کم اور 105 سے اوپر والوں کو بہتر ذہنی صلاحیتوں کا حامل جانا جاتا ہے۔ 125 سے تجاوز کرنے والے غیر معمولی طور پر ذہین گردانے جاتے ہیں۔ آئن اسٹائن کا آئی۔ کیو 160 سے بھی زیادہ تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ آئی۔ کیو کی سانپ سیڑھی کی بساط کے کس پائیدان پر کھڑے ہیں؟

Good Question

اوپر کیے گئے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں اپنا آئی۔ کیو ٹیسٹ لینے سے کتراتا ہوں کہ کہیں مایوسی نہ ہو۔ راز راز رہنا چاہیے۔ خوش فہمی پر بھی آنچ آنے کا

فیصد حصہ ابوظہبی کا اور 40 فیصد حصہ گلف ائر کا ہے۔ گلف ائر بذاتِ خود اُس مظلوم شوہر کی طرح ہے جس کی چار بیویاں ہوں۔ گلف ائر میں بحرین، قطر، مسقط و عمان اور ابوظہبی کا برابر کا حصہ ہے۔ ہر حصہ دار کے ساتھ برابر کا انصاف کرکے ان کو خوش رکھنا گلف ائر کے فرائضِ زوجیت میں شامل ہے۔

جب جہازوں کی مرمت کا کام گیمکو کے سپرد کردیا گیا تو گلف ائر کے ٹیکنیکل کے شعبے کے سربراہ کے سینے پر سانپ لوٹ گیا کہ اب ان کے محکمہ کی اہمیت انتہائی کم ہوکر صرف اتنی ہی رہ گئی تھی کہ جتنی اُس عاشقِ نامراد کی رہ جاتی ہے جس کی منظورِ نظر کو کوئی اور ڈولی میں بیٹھا کرلے جاتا ہے۔ ٹیکنیکل کے شعبہ میں جو لوگ اس شعبہ کے سربراہ کے تحت باقی بچ گئے تھے اب ان کا سب سے اہم اور پسندیدہ مشغلہ گیمکو کے ہر کام میں نقص نکالنا بن گیا تھا۔ اس کارِ ثواب کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس طرح سے گیمکو کو بدنام کیا جاسکے اور ان کا چھینا ہوا محبوب (جہازوں کی مرمت کا کام اور متعلقہ عملہ) گھر واپس آجائے۔ ہائے عشق کی مجبوریاں۔

اس پس منظر میں گلف ائر نے گیمکو کے کیے ہوئے ایک بہت بڑے کام میں نقص نکال دیا۔ اس کے بعد مطالبہ کیا کہ اس کام کے لیے جو قیمت گلف ائر نے ادا کی تھی وہ گلف ائر کو واپس کی جائے۔ پیسوں کی واپسی کا یہ مطالبہ وارنٹی کے تحت کیا گیا تھا۔ وارنٹی اور کنٹریکٹ کی ذمہ داری میرے سر تھی۔ جب میں اس سارے کام کی تفصیلات میں گیا تو عقدہ کھلا کہ گلف ائر کا وارنٹی کا یہ کلیم جائز نہیں تھا۔ میں نے گلف ائر کو مطلع کردیا کہ وارنٹی اور کنٹریکٹ کی شقوں کے تحت ان کا مطالبہ جائز نہیں ہے۔ اس خط کے جواب میں انہوں نے گیمکو کے جنرل منیجر سے رجوع کیا۔ جنرل منیجر نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔

"یہ گلف ائر کے وارنٹی کلیم کا کیا معاملہ ہے؟" جنرل منیجر نے مجھ سے سوال کیا۔ جواب میں، میں نے ان کو تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔ انہوں نے میرے تجزیہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "تم میری طرف سے گلف ائر کو ارسال کرنے کے لیے ایک خط تیار کرو جس میں یہ ساری تفصیل لکھو جو تم نے ابھی مجھے بتائی ہے۔ میں اس خط پر دستخط کرکے گلف ائر کو بھیج دوں گا۔"

میں نے خط لکھ لیا اور جنرل منیجر صاحب کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا۔ میرے لکھے ہوئے خط کو پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "یہ انتہائی خشک اور روکھا خط ہے۔ اس خط کا گلف ائر پر الٹا اثر ہوگا۔ تم اسی مضمون کو دوبارہ نرم لہجے میں لکھ کر لاؤ۔" پھر اپنے احکامات میں تبدیلی کی۔ "تم رہنے دو یہ خط میں خود لکھوں گا۔"

میرے آدھے صفحہ کے خط کی جگہ انہوں نے ایک لمبا چوڑا تین صفحات کا خط لکھا جس کی ایک کاپی میری فائل کے لیے بھی بھیج دی۔ میری نگاہ میں اس طویل خط میں غیر ضروری باتیں شامل تھیں جن کا وارنٹی سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ میرا مزید یہ بھی خیال تھا کہ گلف ائر ایک دفعہ پھر وہی 'مرغے کی ایک ٹانگ' کا راگ الاپے گی۔ اس خط سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ گلف ائر کا جواب میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے جواب کو دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ نہ صرف یہ کہ گلف ائر نے اپنا کلیم واپس لے لیا تھا بلکہ بند بند الفاظ میں گیمکو کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین بات تھی۔ میں حیرت میں ڈوب گیا۔

میری اُس دن کی حیرت اس وقت ختم ہوگئی جب میرے ایک ساتھی نے مجھے 'ایموشنل انٹیلی جنس' سے متعارف کروایا۔ ایموشنل انٹیلی جنس کی بنیادی معلومات حاصل کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ جنرل منیجر نے جو خط گلف ائر کو بھیجا تھا وہ ایموشنل انٹیلی جنس کے اصولوں پر مبنی تھا۔ جس سے انہوں نے اپنا مطلوبہ مقصد حاصل کرلیا تھا۔ اس کے برخلاف میرے خط میں ان اصولوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ میرے خط میں کسی غیر ضروری بات کا ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف کھری کھری کام کی باتیں لکھی گئی تھیں۔ وارنٹی اور کنٹریکٹ کی متعلقہ شقوں کی طرف اشارہ تھا۔ اِدھر اُدھر کی کوئی بیکار بات اس خط میں شامل نہیں تھی۔ جنرل منیجر کے خط نے گلف ائر کے زخم پر پھاہے کا کام کس طرح سے کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ایموشنل انٹیلی جنس میں مضمر ہے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مختلف صلاحیتوں اور نعمتوں سے نوازا ہے۔ مثلاً طاقت، حُسن، جسامت، ذہانت وغیرہ۔ انسان کو نوازی ہوئی ان نعمتوں میں سے زیادہ تر عمر اور وقت کے ساتھ زوال پزیر ہوجاتی ہیں لیکن ذہانت ایسی نعمت ہے جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی جاتی ہے۔ اس وقت تک جب تک انسان کا ذہن صحیح طور پر کام کرتا ہے۔

ذہانت کیا ہے! اس کے متعلق مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ خاص طور سے ان لوگوں میں جو علم نفسیات اور ایسے ہی دوسرے علوم کے ماہر ہیں۔ ذہانت کو کسی نے منطق کی

مہم کے لیے تیار۔ اس کے برخلاف جن لوگوں میں اندرون نگاہی ہوتی ہے وہ اکیلا رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ زیادہ شور شرابے کی جگہوں اور محفلوں سے کتراتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان لوگوں کو محفلیں ناپسند ہوتی ہیں۔ بس یہ لوگ اپنی توانائی اپنے پسندیدہ مشاغل پر صَرف کرنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ غیر دوستانہ نہیں ہوتے ہیں بس ذرا اپنے آپ کو لیے دیے رہتے ہیں۔

دل پذیرائی (مقبولیت): یہ وہ خصوصیت ہے جس کے حامل لوگ دوسروں میں مقبول ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ دوسروں کے ساتھ مل کر چلتے ہیں۔ نرم دل، ہمدرد اور قابلِ بھروسا ہوتے ہیں اور دوسروں پر بھی جلد بھروسا کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کی خاطر اپنے مفادات کو نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ یہ زندگی سے ہمیشہ پُر امید رہتے ہیں۔ اگر یہ معاشرے میں کسی قسم کے لیڈر کی حیثیت رکھتے ہوں تو وہ اپنے معاشرے، اپنے ماحول میں تبدیلی لانے کے موجب بھی بن سکتے ہیں برعکس اُن لیڈروں کے جو موجودہ صورتِ حال برقرار رکھنے پر کاربند ہوتے ہیں۔ ”تبدیلی آنہیں رہی ہے، آ گئی ہے۔“ علامہ اقبال، قائدِ اعظم، سابق امریکی صدر ابراہم لنکن اور مارٹن لوتھر کنگ کا شمار ایسے لیڈروں میں ہوتا ہے جنہوں نے معاشرہ میں نئی سوچ کو جنم دیا۔ معاشرے کی سوچ میں تبدیلی لانے کی اعلیٰ ترین مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ انہوں نے بت پرستی کی دنیا میں، تمام تر خطرات اور مخالفتوں کے باوجود معبودِ واحد کا پرچار کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات سے تین بڑے مذاہب وجود میں آئے۔

غیر مقبول افراد کا ذاتی مفاد دنیا کی ہر دوسری چیز پر فوقیت رکھتا ہے۔ ایسے لوگ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا یقین ہوتا ہے کہ ہر کوئی ان کو نقصان پہنچانے پر تُلا ہوا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کے مسائل اور تکالیف سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔

اعصابی انتشار (نیوروٹی سزم): یہ انسانی فطرت کا وہ رجحان ہے جو ہر چیز کو منفی انداز میں دیکھتا ہے۔ اس میں غصہ، افسردگی، تردد، پریشانی، تشویش وغیرہ شامل ہیں۔ اعصابی انتشار کا حامل فرد دباؤ برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ وہ بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے لوگ معمولی حالات کو حادثات کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ زندگی کی روزمرہ کی رکاوٹیں ان کو ناقابلِ تسخیر مشکلات معلوم ہوتی ہیں جس کی وجہ سے نامساعد بلکہ عام حالات میں بھی ان کی قوتِ فیصلہ متاثر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں میں اعصابی انتشار کم ہوتا ہے وہ زندگی کو بہتر طور پر برت سکتے ہیں۔ مشکل حالات میں اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہوئے درست فیصلے کر سکتے ہیں۔ صحیح قدم اٹھا سکتے ہیں۔ نڈھال نہیں ہو جاتے۔

اوپر دیے گئے ’عناصرِ خمسہ‘ میں سے ہر ایک عنصر میں کئی انفرادی عناصر ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر متعلقہ بڑے عنصر کے نیچے کیا جا چکا ہے۔ یہ انفرادی عناصر کی مکمل فہرست نہیں ہے۔ ہر بڑے عنصر کے ذیل میں اوپر دیے گئے عناصر کے علاوہ اور بھی کئی عناصر آتے ہیں۔ ہر بڑے عنصر کے ذیل میں آنے والے عناصر میں منفی اور مثبت، دونوں طرح کے انفرادی عناصر شامل ہوتے ہیں اور ہر شخص کی شخصیت ان منفی اور مثبت دونوں اقسام کے انفرادی عناصر کا مرکب ہوتی ہے۔ مثلاً جس شخص کے ’بڑے عنصر“ ذمہ داری‘ میں مثبت انفرادی عناصر حاوی ہیں وہ شخص مجموعی طور پر ذمہ دار ہوگا۔ اس کے برعکس جس شخص میں ذمے داری کے منفی انفرادی عناصر حاوی ہوں گے وہ شخص مجموعی طور پر غیر ذمے دار ہوگا گو کہ کبھی کبھی وہ ذمے داری کا مظاہرہ بھی کرے گا۔ جس طرح ایک ذمے دار شخص بھی کبھی کبھی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اس بات کا بھی دھیان رہے کہ عناصرِ خمسہ وراثت، ماحول اور تہذیب سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھیں کہ ان عناصر کا تعلق دماغ کے مخصوص حصوں سے جڑا ہوتا ہے۔ جنس بھی ان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً ” خواتین میں دلپذیرائی، اعصابی انتشار اور بیرون نگاہی زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ جبکہ مرد حضرات میں کشادہ نگاہی زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ احساسِ ذمہ داری جنس کا احتیاج نہیں ہے۔ مگر ہر دوسری چیز کی طرح اس درجہ بندی پر بھی مختلف آراء ہیں۔ ہر کوئی ہر استنباط کو سو فیصد قبول نہیں کرتا ہے۔ بعض محققین کا کہنا ہے کہ عناصرِ خمسہ اور تعلیم میں کامیابی کی نسبت (کوریلیشن) قوی ہے جبکہ دفتری اور پیشہ وارانہ کام میں اور عناصرِ خمسہ میں نسبت کم ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ماہرینِ نفسیات نے اس معاملے میں بن مانس کو بھی نہیں بخشا۔ ان پر بھی عناصرِ خمسہ کے تجربات داغ دیے۔ بہت سے ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ عناصرِ خمسہ مکمل انسانی شخصیت کا احاطہ نہیں کر سکتے ہیں اس لیے کہ ان میں بہت سے دوسرے اہم عناصر شامل نہیں ہیں۔ مثلاً ” مذہب، جنسیات، حسِ مزاح، کفایت شعاری وغیرہ وغیرہ لیکن اس دنیا میں کون سی چیز سو فی صد مکمل ہے۔

☆☆☆

اب تک سارا زور آئی۔ کیو ٹیسٹ پر تھا۔ مگر جب بہت سے اعلیٰ آئی۔ کیو والے لڑھکے اور بہت سے معمولی آئی۔ کیو والے عملی زندگی کا میدان مار لے گئے تو ماہرین کو لوہا تقریباً نے جالیا۔ معمولی آئی۔ کیو والوں کے پاس ایسی کون سی جادو کی پڑیا تھی جو اعلیٰ آئی۔ کیو والوں کے پاس نہیں تھی؟

اس وقت تک ماہرین دو سمتوں میں کام کر رہے تھے۔ ایک گروہ ذہنی صلاحیتوں...... ذہانت ...... آئی۔ کیو پر کام کر رہا تھا اور دوسرے گروہ کے ماہرین انسانی شخصیت (عناصر خمسہ) پر اپنا وقت لگا رہے تھے۔ اموشنل انٹیلی جنس پر کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔

1985 میں نفسیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے ایک امریکی امیدوار وائین پین نے اپنا تحقیقی مقالہ تیار کیا۔ ان کی تحقیق کا موضوع تھا 'امریکی معاشرے کی بہت سی خرابیوں کی ذمے داری اس امر پر تھی کا یہ معاشرہ لوگوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع دینے کی بجائے ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کو گھونٹ لیں۔ اموشنل انٹیلی جنس کی اصطلاح سب سے پہلے استعمال کرنے کا سہرا اس مقالے کے سر باندھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی طور پر صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے 1964ء اور 1966ء میں اس اصطلاح کا استعمال ہو چکا تھا۔ وائین پین کا یہ مقالہ اموشنل انٹیلی جنس کو زبان زد عام نہیں کر سکا تھا۔ یہ اصطلاح عام گفتگو کا موضوع اس وقت بنی جب 1995ء میں امریکی ماہر نفسیات ڈینئل گولمین کی کتاب اموشنل انٹیلی جنس کے نام سے منظر عام پر آئی۔ گولمین کی اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ کتاب ایک لمبے عرصے تک مقبول ترین کتاب بیسٹ سیلر کے درجہ پر فائز رہی۔

پہلے گولمین کا خیال تھا کہ 'مقبول ترین کتاب' کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے وہ اس کتاب کو پاکستان میں ہی چھپوائیں۔ پاکستان میں یہ اعزاز حاصل کرنا آسان ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی کتاب کی پانچ ہزار کاپیاں بھی فروخت ہو جائیں تو وہ مقبول ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ امریکا میں اس اعزاز کے حصول کے لیے کئی لاکھ کاپیوں کا فروخت ہونا شرط ہے۔ اس معاملہ میں امریکا ابھی ترقی کے نچلے پائیدان پر ہے۔ ادب کی اس قدر دانی کا ایک بہت بڑا ثمر ہے۔ رسالوں اور کتابوں کے چھاپنے والوں کی آمدنی اتنی قلیل ہوتی ہے کہ اس کو ارکان پارلیمنٹ کی آمدنی کے آگے کنیز کی طرح (شرم سے) سر جھکائے رکھنا پڑتا ہے۔ اس کم آمدنی کا بھی اپنا ایک منفرد ثمر ہے۔ لکھنے والے افراد معاوضے کے گناہ کبیرہ سے بچ جاتے ہیں۔ ان کو صرف "اعزازیہ" دیا جاتا ہے، سوائے چند نامور لکھنے والوں کے۔ یہ اعزازیہ عام لکھنے والوں کے لیے ثواب دارین کا بندوبست کرتا ہے۔ وہ مجبور ہوتے ہیں کہ پر تعیش زندگی سے پرہیز کرتے ہوئے اپنی زندگی درویشانہ اقدار کے ساتھ گزاریں۔ اس طرح وہ حیات بعد الموت کے لیے توشے آگے بھیجتے رہنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ کتابیں لکھنے والوں کے درجات اور بھی بلند ہیں۔ ان کو اپنی کتاب چھپوانے کے لیے پبلشر کو پیسے دینے پڑتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کند ذہن طالبعلم پیسے دے کر پوزیشن حاصل کرتے ہیں۔ گولمین کے پاس پبلشر کو دینے کے لیے پیسے نہیں تھے اس لیے مجبوراً ان کو اپنی یہ کتاب امریکا میں ہی چھپوا کر لاکھوں کاپیوں کے فروخت ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔

اموشنل انٹیلی جنس وہ صلاحیت یا قابلیت ہے جس کو بروئے کار لا کر ایک فرد اپنے اور دوسروں کے جذبات کا ادراک کرتے ہوئے ان جذبات میں امتیاز کر کے ان کی مختلف نوع کو سمجھ سکتا ہے۔ اس سمجھ کے ساتھ وہ اپنی سوچ، اپنے رویے اور حرکات و سکنات کو درپیش صورت حال کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے صحیح اقدام اٹھا سکتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل سکتا ہے۔ اعلیٰ آئی۔ کیو رکھنے والے افراد دماغ کی کتابی صلاحیتوں میں یکتا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں اموشنل انٹیلی جنس نسبتاً کم ہے تو وہ بیشتر اوقات کم آئی۔ کیو، مگر ان سے بہتر اموشنل انٹیلی جنس رکھنے والے افراد سے زندگی کی عملی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

اموشنل انٹیلی جنس کو دو بنیادی حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے کا تعلق فرد کی اپنی ذات سے ہے دوسرے کا تعلق معاشرتی ماحول اور معاشرہ کے دوسرے افراد سے ہے۔

ذات کے ضمن میں ایک فرد کے لیے خود آگہی ضروری ہے۔ خود آگہی کے لیے لازم ہے کہ انسان کو اپنے جذبات کا ادراک ہو۔ وہ ان جذبات کو صحیح طور پر سمجھے۔ مختلف جذبات میں تفریق کر سکے۔ منفی اور مثبت جذبات کے نتائج سے آگاہ ہو۔ جذبات کو بے قابو نہ ہونے دے۔ ایک خود آگاہ شخص حالات کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جذبات اور رویے میں لچک پیدا کر کے درپیش صورت حال سے مثبت طور پر نمٹ سکتا ہے۔

اس گورکھ دھندے کا دوسرا اہم پہلو معاشرتی آگہی ہے۔ معاشرتی آگہی کے لیے ایک فرد کو دوسروں کے جذبات، احساسات اور محرکات سے اور ماحول کے تقاضوں سے آگاہ ہونا شرط ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح خود آگہی کے لیے شرط ہے۔ انسان میں خود آگہی اور معاشرتی آگہی جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر زیادہ وہ اموشنل انٹیلی جینس کا حامل ہوگا۔ زیادہ اموشنل انٹیلی جینس رکھنے والا شخص اپنے اور دوسروں کے جذبات اور محرکات کو اور ماحول کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔ وہ زندگی کی پیچیدہ راہوں کو احسن طور سے طے کرسکتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں کمتر اموشنل انٹیلی جینس رکھنے والوں سے آگے نکل سکتا ہے۔ برتر آئی۔ کیو رکھنے والوں سے بھی آگے، اگر برتر آئی۔ کیو رکھنے والا اموشنل انٹیلی جنس میں کمتر ہے۔

آئی۔ کیو کی طرح اموشنل انٹیلی جینس کے تعین کے لیے بھی مختلف ٹیسٹ بنائے گئے جن میں ایبلٹی (قابلیت) ماڈل اور ٹریٹ (رجحان، رویہ) ماڈل شامل ہیں۔ ان دونوں کو ملا کر گولمین نے ایک مخلوط ماڈل بنایا۔ مخلوط ماڈل پانچ اجزاء پر مشتمل ہے۔ خود آگہی۔ خود ضابطگی۔ معاشرتی ادراک۔ احساسِ غیر (ایمپیتھی) اور جذبہ تحریک (موٹی ویشن)۔

خود آگہی: اپنی قابلیت، صلاحیت، کمزوریوں، قوتوں اور اہداف و محرکات کو پہچاننا۔ اپنی ذات پر اور دوسروں پر ان عوامل کے اثرات اور ردِعمل کا ادراک رکھنا۔ دماغ کے ساتھ ساتھ دل سے بھی سوچنا۔

خود ضابطگی: اپنے نفس پر قابو رکھنا۔ جذبات کی رو میں بہنے سے بچنا۔ منفی جذبات کا رخ موڑنا۔ مثبت جذبات کو صحیح طور پر استعمال میں لانا۔ بدلتے وقت اور حالات میں اپنے رویہ میں لچک پیدا کرنا۔

معاشرتی ادراک: معاشرے کے تقاضوں کا فہم رکھنا۔ ان کو سمجھنا۔ معاشرتی تعلقات استوار کرنے کے لیے ان تقاضوں میں اور اپنی خود آگہی میں مطابقت پیدا کرنا۔

احساسِ غیر (ایمپیتھی): دوسروں کے جذبات، ضروریات اور محرکات کو سمجھنے کے لیے اپنے آپ کو ان کی جگہ تصور کرکے ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا۔

جذبہ تحریک (موٹی ویشن): اپنے اندر ایک جوش و ولولہ رکھنا۔ ہدف حاصل کرنے، کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھنا۔

اوپر بیان کیے گئے اجزاء میں سے ہر ایک جز کے ذیل میں کئی عناصر شامل ہوتے جن کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی گئی ہے۔ گولمین کا نظریہ ہے کہ ان عناصر کا پیدائشی طور پر کسی انسان کی شخصیت میں ہونا لازمی نہیں ہے۔ یہ سیکھے اور سکھائے جا سکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح ہر انسان کی ایک مجموعی ذہانت ہوتی ہے اسی طرح سے ہر انسان کی ایک مجموعی اموشنل انٹیلی جینس یا جذباتی ذہانت بھی ہوتی ہے۔ ہر فرد اپنی مجموعی ذہانت کے مطابق دماغی چیزیں سیکھتا ہے۔ مثلاً" کوئی بھی شخص علمِ ریاضی رکھتے ہوئے پیدا نہیں ہوتا ہے۔ وہ علم ریاضی (اور دوسری دماغی صلاحیتیں) سیکھتا ہے۔ جس گہرائی تک وہ علم ریاضی سیکھ سکتا ہے اس کا انحصار اس کی مجموعی ذہانت پر ہوگا۔ بالکل اسی طرح سے ایک انسان اپنی جذباتی ذہانت کے مطابق اموشنل انٹیلی جینس کے جز اور عناصر سیکھ سکتا ہے، سکھایا جاسکتا ہے۔ ماہرین کو گولمین کے ہر نظریہ کا ہر طرح سے اتفاق نہیں ہے۔ ماہرین ایک دوسرے کے نظریات کو بالکل اسی طرح سے سراہتے ہیں جس طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے کام کو سراہتے ہیں۔

ایک صاحب تھے جن کو ہر کوئی صاحبِ کرامات مانتا تھا۔ بیوی کے سوا۔ ایک دن بیوی گھر میں داخل ہوئیں اور برقعہ اتارنے کے بعد میاں سے مخاطب ہوئیں۔ "تم اپنے آپ کو بہت صاحبِ کرامات سمجھتے ہو۔ آج میں نے واقعی ایک صاحبِ کرامات کو دیکھا۔ وہ ہوا میں اُڑ رہے تھے۔"

میاں خوش ہو کر بولے۔ "نیک بخت اب تو تُو مجھے مان گئی۔ وہ ہوا میں اُڑنے والا شخص میں ہی تھا۔"

بیوی نے ناک چڑھا کر کہا "اچھا! جب ہی میں کہوں یہ ٹیڑھے کیوں اُڑ رہے ہیں۔" میاں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

اگر کسی پڑھنے والے کو اس واقعہ پر کوئی اعتراض ہے تو وہ اس واقعہ کے گھڑنے والے سے یا گولمین سے رجوع کریں۔

ان دونوں معاملات میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ گو کہ آئی۔ کیو، شخصیت اور اموشنل انٹیلی جینس کے ماہرین میں طرح طرح کے اختلافات موجود ہیں، یہ تمام ماہرین ایک بات پر متفق ہیں۔ یہ تینوں علوم آپس میں مل کر بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ لیکن آپ کا معاملہ اور ہے۔ آپ اپنی اموشنل انٹیلی جینس بڑھا کر، اس پر کاربند ہو کر زندگی کی دوڑ میں ہر ایک کو پچھاڑ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ مجھے اجازت دیجیے، مجھے گلف ائر کو دوسرا خط لکھنا ہے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا۔ خوابوں کے موضوع پر بہت بحث ہو چکی ہے۔ یہ کیوں دکھائی دیتے ہیں۔ انسان کی زندگی سے ان خوابوں کا تعلق کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں وہ خواب ہے یا جو نیند کے عالم میں دیکھتے ہیں وہ خواب ہے۔ ہمارے مفکروں، فلاسفرز، شاعروں اور ادیبوں نے خوابوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ ماہرین نفسیات خوابوں کا تجزیہ کرتے رہے ہیں۔

خواب کیا ہیں؟ اور بہت سے خواب سچے کیوں ہوتے ہیں؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ خواب ہمارے دن بھر کے مشاہدات اور واقعات کی ایک تصویر ہیں تو پھر آنے والے واقعات کا علم خوابوں میں کیسے ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ واقعہ تو ابھی پیش ہی نہیں آیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہر دور میں خواب ایک معما ہی رہے ہیں۔ "ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے" فیض صاحب کہتے ہیں۔ اقبال، جوش، غالب، خوابوں نے سب کو پریشان رکھا ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ خواب ہماری نا آسودہ خواہشات کی امید ہوتے ہیں۔ یعنی ایک شخص جو بے داری میں کوئی کام نہیں کر پاتا وہی کام وہ خواب میں انجام دیتا ہے۔

سگمنڈ فرائڈ اور یونگ جیسے ماہرین نے خوابوں کے موضوع پر بہت کام کیا ہے۔ ویسے ہمارے یہاں شیخ چلی کے خواب بہت مشہور ہیں۔ ہر خیالی پلاؤ کو شیخ چلی کا خواب کہہ دیا جاتا ہے۔

خوابوں سے متعلق بے شمار محاورے بھی عام ہیں۔ جیسے کھلی آنکھوں خواب دیکھنا۔ جاگتی آنکھوں کے خواب، بلی

خواب

شیراز خان

خواب کے بارے میں مفسرین کا بیان ہے کہ یہ بھی الہام کی ایک قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر خاص کرم ہے کہ خواب کے ذریعے بہت سی باتوں کا قبل از وقت پتا چلا لیتا ہے



کے خواب وغیرہ۔

خوابوں کے حوالے سے چند اشعار اور سن لیں، فانی کہتے ہیں۔ اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا۔

مومن کا ایک نازک سا شعر۔ وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے۔ خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے۔

ناصر کاظمی فرماتے ہیں۔ یہ آج راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ۔ یہ خواب میں نے رات کو دیکھا تھا خواب میں۔

ادب میں ساحر لدھیانوی کی مشہور نظم "پرچھائیاں" منظوم خواب کی بہترین مثال ہے۔ ادب میں خوابوں کا موضوع بہت طویل ہے۔

ہم نے اس مضمون میں ادب اور خوابوں کے حوالے سے بات نہیں کی ہے بلکہ دنیا کے چند مشہور لوگوں کے سچے خوابوں کو بیان کیا ہے۔ ان مشہور لوگوں نے ایسے خواب دیکھے اور بعد میں وہ خواب بالکل سچ ثابت ہوئے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

خواب ایک مکمل مضمون ہے۔ خوابوں کی تعبیر ایک بہت بڑا فن اور علم ہے۔ عام آدمی خوابوں کی تعبیر نہیں بتا سکتا۔ اس سلسلے میں حضرت دانیالؑ اور حضرت یوسفؑ کا نام آتا ہے جو خوابوں کی تعبیر بتانا جانتے تھے۔ پھر حضرت امام جعفر صادقؒ اور ابوسیرین کا نام لیا جاتا ہے جو اس فن میں طاق تھے۔ حضرت امام ابن تیمیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خوابوں کے بہت بڑے مفسر تھے۔

اس سے پہلے کہ میں خوابوں کے حوالے سے کچھ آگے چلوں یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارا اسلام خوابوں کے حوالے سے کیا کہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ خواب بھی ہماری زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا دین اس خانے کو خالی رہنے دے۔ صحیح بخاری کے مطابق حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبر خداؐ نے فرمایا۔ "اچھا خواب دیکھنا خدا کی طرف سے ہے۔ یعنی اس کے لطف و رحمت کی علامت ہے اور برے خواب دیکھنا شیطان کی طرف سے ہے کہ وہ مسلمانوں کو غم زدہ کرنے کے لیے پریشان خوابوں کو دکھانے کا سبب ہوتا ہے۔ پس تم میں سے جو ایسا خواب دیکھے جو اسے بھلا معلوم ہو تو جسے دوست رکھتا ہے اس کے سوا کسی اور سے اپنا خواب بیان نہ کرے۔ اور جب ایسا خواب دیکھے کہ اسے برا لگے تو خواب کے شر اور شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگے اور تین دفعہ تھتکار دے اور کسی سے بیان نہ کرے۔ کیوں کہ بیان نہ کرنے سے یہ خواب برا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جناب پیغمبرؐ خدا نے فرمایا۔ "جب تم میں کوئی آدمی مکروہ اور ناپسند خواب دیکھے تو اپنے بائیں جانب تھتکار دے اور تین دفعہ شیطان کی برائی سے خدا کی پناہ مانگے اور جس کروٹ پر سویا تھا اسے چھوڑ کر دوسری کروٹ بدل لے۔ (مسلم)

ابو رزین کہتے ہیں کہ جناب پیغمبر خداؐ نے فرمایا کہ ایماندار کا خواب نبوت کے 26 حصوں میں سے ایک حصہ ہے اور خواب تاوقتیکہ کسی سے بیان نہ کیا جائے اسے قرار و ثبات نہیں ہوتا (یعنی واقع نہیں ہوتا) ہاں جب بیان کر دیا جاتا ہے تو واقع ہو جاتا ہے۔ (ترمذی)

قرآن مجید میں یوں ذکر آیا ہے۔ "یعقوبؑ نے کہا بیٹا کہیں اپنے خواب کو اپنے بھائیوں سے نہ کہہ بیٹھنا کہ وہ سن پائیں گے تو تجھ کو کسی نہ کسی آفت میں پھنسانے کی تدبیر کرنے لگیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔" (یوسف: 1)

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ "اور ہم نے ابراہیمؑ سے پکار کر کہا کہ ابراہیمؑ تم نے اپنے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (اب ہم تم کو بڑے بڑے مراتب دیں گے اور) نیک بندوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔" (صفات: 4)

خواب کے حوالے سے ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ "اور خواب جو ہم نے تم کو دکھایا تو بس اس کو لوگوں کے ایمان کی آزمائش کا ذریعہ ٹھہرایا۔" (بنی اسرائیل: 6)

خوابوں کی تعبیر کا جو علیحدہ علم ہے اسے علم التعبیر کہا جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں حضرت یوسفؑ کا خواب بہت مشہور ہے۔ وہ کچھ یوں ہے۔ "جب حضرت یوسفؑ بارہ برس کے ہوئے تو ایک دن جب وہ اپنے باپ کی گود میں سوئے ہوئے تھے کہ اچانک بیدار ہو گئے۔ حضرت یعقوبؑ نے جب دریافت کیا تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا: ابا جان! میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں۔"

"باپ سمجھ گئے کہ ان کو ایک دن یہ نصیب ہوگا کہ ان کے گیارہ بھائی اور ماں باپ سجدہ کریں گے۔"

ستاروں سے بھائی اور چاند سورج سے ماں باپ کی

طرف اشارہ تھا۔
حضرت یوسف اور فرعون کے ایک خواب کا واقعہ بھی ہماری اسلامی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ فرعون نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ لب دریا کھڑا ہے اور دریا سے سات موٹی اور خوب صورت گائیں نکلیں اور چراگاہ میں چرنے لگیں۔ اس کے بعد سات عدد بدشکل اور دبلی گائیں دریا سے نکلیں اور ان سات خوب صورت گائیوں کو کھا گئیں۔
یہ قصہ تو بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت یوسف نے اس خواب کی تعبیر یوں بیان فرمائی کہ سات موٹی گائیں اچھی بارشوں اور ارزانی اور فراوانی کی ہیں۔ یعنی مصر میں سات برسوں تک اناج کی خوب فراوانی رہے گی۔
اس کے بعد کی وہ سات گائیں سات برسوں کے قحط کی ہیں۔ اس لیے خوب قحط پڑے گا۔ اس لیے دانش مندی اس میں ہے کہ فراوانی کے دنوں میں غلے کا ذخیرہ کرلیا جائے تاکہ قحط کے برسوں میں کام آئے۔
تاریخ میں اس قسم کے خوابوں کی اور بے شمار مثالیں ہیں۔
خوابوں پر باقاعدہ علمی اور سائنسی انداز سے کام کرنے والوں میں سے چند بڑے لوگ یہ ہیں۔
سگمنڈ فرائڈ۔ موراویا میں پیدا ہوا۔ چار سال کی عمر میں ویانا منتقل ہوگیا۔ اس نے اوویات کو اپنا کیریئر بنا کر کئی ذہنی بیماریوں کے علاج دریافت کیے۔
اپنے اس طریقہ علاج کو وہ سائکلو کیتھارسیس کا نام دیتا ہے۔ اس کا کلیدی کام خوابوں کی تشریح تھا۔ The interpretation of Dreams تھا۔
الفریڈ ایڈلر۔ یہ شخص ویانا میں پیدا ہوا۔ اوویات پڑھنے کے بعد سگمنڈ فرائیڈ کا پیروکار بن گیا۔
ایڈلر نے انفرادی نفسیات کو فروغ دیا۔ کارل یونگ، وہ ایک سوئز ماہر نفسیات اور ماہر دماغ تھا۔ یہ بھی فرائیڈ کا دوست تھا۔
ینگ نے انسانی شخصیت کی جانب زیادہ مذہبی، فلسفیانہ اور سری طریقہ کار اپنایا۔ ان چند مشاہیر کے تعاون کے بعد ذرا خوابوں کے رموز اور ان کی زبان کے بارے میں کچھ باتیں جان لیں۔
خواب اپنا پیغام براہ راست اور غیر زبانی طور پر دیتے ہیں۔ خواب آپ کو علامات کی زبان میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے خالی دریا میں بہتا ہوا جہاز (ترقی کی علامت) باغ بہشت (پرسکون زندگی کی علامت) سانپ (دشمن کی علامت) وغیرہ۔
اب ہم اپنے اس مضمون میں ان چند خوابوں کا ذکر کرتے ہیں جو دنیا کے مشہور لوگوں نے دیکھے اور حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوئے۔
حضرت یوسف کا خواب (جس کا ذکر ہو چکا ہے)۔
جولیس سیزر کی بیوی کا خواب جس نے اپنے شوہر کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔
Paul Mccartnay یہ شخص اپنے زمانے کا بہترین گلوکار تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور گروپ بیٹلز سے وابستہ تھا۔ موسیقی سے دل چسپی رکھنے والے لوگ اس گروپ سے اچھی طرح واقف ہیں۔
پال نے ویسے تو کئی خوب صورت گیت گائے ہیں لیکن اس کا گیت ایسٹرڈے۔Yosterday: اپنی مثال آپ ہے۔ 1965ء
میں ریلیز ہونے والے اس گیت کو بیسویں صدی کا مشہور ترین گیت کہا جاتا ہے۔
پال نے یہ پورا گیت، اس کے بول، اس کی دھن سب خواب میں دیکھے تھے۔ ہے نا حیرت کی بات۔
پال اپنے خاندان کے ساتھ لندن کے مضافات کے ایک گھر میں تھا۔ وہ اس رات جلدی سونے چلا گیا تھا۔
وہ بتاتا ہے کہ کوئی غیبی طاقت اس سے کہہ رہی تھی کہ جاؤ اپنے بستر پر جا کر سو جاؤ۔ میں اس آواز کی طاقت سے مجبور ہو کر اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں سو چکا تھا۔ پھر میں نے نیند میں دیکھا کہ کسی نے مجھے جگایا اور کچھ بول یاد کروائے۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت دھن بھی سنوائی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ تو معلوم پیانوئے کی بورڈ بھی یاد کراتا جا رہا تھا۔ پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وہ بول میرے ذہن میں تھے۔ وہ دھن مجھے یاد آ رہی تھی۔
میں نے وہ بول لکھ لیے اور پیانو پر اس دھن کی پریکٹس کرنے بیٹھ گیا۔ اس طرح ایسٹرڈے جیسا گیت سامنے آ گیا۔
ایسا ہی ایک واقعہ مشہور ناول فرینکسٹائن کی مصنفہ کے ساتھ بھی ہوا۔ یہ بات 1816ء کی ہے۔
ایک رات وہ اور اس کا شوہر پرسی شیلے لارڈ بائرن کے گھر مدعو تھے۔ لارڈ بائرن کے اسی مکان کی لائبریری میں کافی کا دور چلنے لگا اور بھوتوں کے قصے شروع ہو گئے۔
پھر میری شیلے کچھ دیر بعد سونے کے لیے اپنے کمرے

میں آگئی۔اس کمرے کی ایک دیوار پر ایک پینٹنگ تھی جس میں ایک بوڑھے شکاری کو دکھایا گیا تھا۔میری کچھ دیر بعد سو گئی۔وہ خواب دیکھتی ہے کہ وہ بوڑھا شکاری فریم سے باہر نکل آتا ہے اور پھیلنے لگتا ہے۔وہ پورے کمرے کے برابر ہو جاتا ہے۔میری نے چیخ کر آنکھیں کھول دیں۔کمرے میں کوئی نہیں تھا۔لیکن وہ شکاری اس کے خواب میں آکر ایک شاہکار ناول کا اشارہ دے گیا تھا۔میری نے اس پھیلنے والے آدمی کو بنیاد بنا کر اپنا ناول فرینکسٹائن تخلیق کرلیا۔

اوٹو لوئی وائی (Otto loe wi) ایک ماہر نفسیات گزرا ہے۔اس کی پیدائش 1873ء کی ہے۔اس کی وفات 1961ء میں ہوئی تھی۔

اوٹو نے دنیا کو میکیک سائیکالوجی کی اصطلاح دی۔اوٹو نے 1936ء میں نوبل پرائز بھی حاصل کیا تھا، اس کے نوبل پرائز حاصل کرنے کی بنیاد ہی ایک خواب تھا۔

اس نے اس خواب میں کچھ نفسیاتی پے چیدگیوں کو حل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔اس نے یہ خواب 1903ء میں دیکھا تھا۔اس نے اس خواب کی بنیاد پر اپنے کام کو آگے بڑھایا اور 1936ء میں نوبل پرائز حاصل کرلیا۔

بہت سے لوگوں کو ان کی آنے والی موت کا ادراک ہو جاتا ہے۔ان کی چھٹی حس کسی بھی انداز سے انہیں بتا دیتی ہے کہ اب اس دنیا میں تمہاری ضرورت ختم ہو گئی۔تمہیں واپس جانا ہے۔

امریکا کے مشہور صدر ابراہام لنکن نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔وہ خواب کچھ یوں تھا۔''میں (ابراہام لنکن) اپنے بستر پر لیٹا ہوں۔اچانک ہر طرف سے کچھ لوگوں کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔وہ رونے والے میرا نام لے لے کر رو رہے ہیں۔میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔میں کمرے سے نکل کر باہر آتا ہوں۔ہر کمرے میں جا کر دیکھتا ہوں۔کوئی بھی نہیں ہے۔پھر میں اپنے کمرے میں واپس آجاتا ہوں۔

رونے کی آوازیں ابھی بھی آرہی ہیں۔کمرے میں ایک سنگھار میز ہے۔جس میں ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا ہے میں اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر چونک جاتا ہوں۔میرا پورا لباس خون سے سرخ ہو رہا ہے۔میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔میں اتنا خوف زدہ ہوتا ہوں کہ چیخنے لگتا ہوں اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

ابراہام لنکن نے اپنا یہ خواب کئی لوگوں کو بتایا اور تاریخ گواہ ہے کہ ابراہام لنکن کو گولی مار کر قتل کردیا گیا تھا اور یہ گولی اس کے سر پر ہی ماری گئی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے بھید ہیں یہ کیسے خواب ہیں اور ایسے بچے خواب کس مزاج کے لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں۔

میڈم سی جی واکر۔اس خاتون کا زمانہ 1867ء سے 1919ء تک کا ہے۔یہ امریکا کی پہلی ارب پتی خاتون تھیں۔پہلے وہ غریب لڑکی تھی۔کاسمیٹکس بنانے کی ایک فیکٹری میں کام کرنے والی۔پریشانیاں اس کے ساتھ تھیں۔سب سے کوفت دینے والی پریشانی یہ تھی کہ اس کے بال بہت تیزی سے گر رہے تھے۔پھر ایک حیرت انگیز خواب نے اس کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔اس نے دیکھا کہ وہ ایک گھنے جنگل سے گزر رہی ہے۔بہت خوف زدہ بھی ہوئی۔ہر طرف سے جنگلی درندوں کی آوازیں آرہی ہیں۔

وہ محسوس کرتی ہے کہ کوئی درندہ اس کے قریب بہت قریب آگیا ہے۔وہ گھبرا کر ایک درخت کے پیچھے چھپ جاتی ہے اور اس وقت ایک سیاہ فام اس کے ساتھ آجاتا ہے۔وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہتا ہے۔''گھبراؤ نہیں میرے ساتھ آؤ۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ سیاہ فام اسے ایک کیبن میں لے آتا ہے۔اس سے کہتا ہے کہ میں تمہیں چند افریقی جڑی بوٹیوں کے نام بتا رہا ہوں۔اچھی طرح یاد کرو۔تمہارے بال ٹھیک ہو جائیں گے۔

سی واکر ان جڑی بوٹیوں کے نام یاد کرلیتی ہے (یہ سب خواب ہی میں ہو رہا ہے) پھر وہ سیاہ فام طریقہ بھی بتاتا ہے اور خواب ختم ہو جاتا ہے۔

سی واکر کو وہ سارے نام یاد رہتے ہیں۔وہ یہ سارے نام کاغذ پر اتار لیتی ہے اور بعد میں کسی طرح وہ یہ جڑی بوٹیاں منگوا کر خواب میں بتائے ہوئے طریقے سے استعمال کرتی ہے اور اس کے بالوں کی بیماری حیرت انگیز طور پر ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اب یہاں سے اس کے عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔اس نے وہ نسخہ اپنے طور پر بنانا شروع کردیا اور اس کو یہاں تک ترقی ہوئی کہ امریکا کی پہلی ارب پتی خاتون بن گئی۔

ادب سے دل چسپی رکھنے والے بے شمار لوگوں نے مشہور ناول ''ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائڈ'' ضرور پڑھا ہوگا۔

یہ ایک ہارر اور اسرار سے بھرا ہوا ناول ہے۔اس کے مصنف کا نام رابرٹ لوئس ہے۔اس کا زمانہ 1850ء سے 1894ء تک کا ہے۔

اپنے اس ناول کے بارے میں اس کا یہ کہنا ہے کہ یہ کامیاب ترین ناول اس نے لکھا نہیں بلکہ اس سے لکھوایا گیا ہے۔

خواب میں اسے اس ناول کے سارے مناظر یکے بعد دیگرے دکھائے گئے تھے اور وہ صبح ان مناظر کو لکھ لیا کرتا۔ اس طرح یہ یادگار ناول وجود میں آ گیا۔

سری نواس راماچندرن۔

ہندوستان کا مشہور و معروف ریاضی دان یہ شخص 1827ء میں پیدا ہوا۔ اس کا انتقال 1920ء میں ہوا تھا۔

یہ ایک مکمل ریاضی دان تھا۔ تین ہزار تھیوریز اس کے نام سے منسوب ہیں۔ بہت دنوں تک کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھاتا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی بہت سی کامیابیاں اس کے خوابوں کے ایک سلسلے کی وجہ سے ہیں۔

اس کے بیان کے مطابق وہ اس طرح کے خواب دیکھتا۔ "وہ کسی جگہ بیٹھا ہے کہ اچانک اس کے آگے اسکرین تن جاتی ہے اور وہ غیبی ہاتھ اس اسکرین پر وہی فارمولے حل کرنے لگتے ہیں جس فارمولے نے اسے الجھا رکھا تھا اور جس کا حل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔"

وہ کہتا ہے کہ وہ غیبی ہاتھ کالی دیوی ہوا کرتے تھے (اس کے عقیدے کے مطابق) وہ پہلے ان کو اپنی ڈائری میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اس طرح اسے کامیابیاں ملتی چلی گئیں۔

اب یہاں ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ عقیدہ چاہے جو بھی ہو۔ فیلڈ چاہے جو کچھ بھی ہو۔ قدرت ان کی ضرور مدد کرتی ہے جو اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔

آپ نے اسٹیفن کنگ کو تو ضرور پڑھا ہوگا۔

یہ شخص واقعی ہارر اور مسٹری کا کنگ ہے۔ اس کی کتاب بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہے۔

اس نے اپنے ایک مشہور ناول کا آئیڈیا اپنے ایک خواب سے لیا تھا۔ بہت عجیب خواب تھا اس کا۔ اس نے خواب میں خود کو اور ایک عورت کو دیکھا۔ وہ عورت اتنی طاقت ور تھی کہ وہ اسے اغوا کر کے لے گئی۔ اس عورت نے اسے ایک کیبن میں رکھا۔ وہ کنگ کی دیکھ بھال بھی کرتی رہی اور ساتھ ساتھ اس نے اپنی ڈائری بھی لکھ لی اور جب وہ اس ڈائری کا آخری صفحہ لکھ چکی تو اس نے کنگ کو مار کر اس کی کھال اتار لی اور اس کی کھال سے اپنی ڈائری کی جلد بنائی۔

کنگ کا کہنا ہے کہ بہت ہی بھیانک خواب تھا لیکن پلاٹ شاندار تھا اور اسی پلاٹ پر اس نے اپنا ناول لکھ لیا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں کو اپنی ایجادات کا آئیڈیا بھی خوابوں سے ملا ہے۔

اس سلسلے میں جیمز ہارر کا خواب قابل غور ہے۔

اس نے خواب دیکھا کہ وہ کہیں چلا جا رہا ہے کہ ایک آدمی اسے گھیر لیتا ہے۔ اس آدمی کے پاس ایک چاقو ہے وہ جیمز ہارر کے جسم میں جگہ جگہ چاقو مارتا ہے اس طرح جیمز ہارر کے جسم میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔

اور جب وہ شخص چاقو اس کے جسم سے باہر کھینچتا ہے تو جیمز ہارر کی آنتیں بھی اس چاقو سے لپٹی ہوئی باہر آ جاتی ہیں۔

جیمز ہارر کے اس بھیانک خواب نے اسے ایک ایجاد کا آئیڈیا دے دیا۔ جانتے ہیں وہ ایجاد کیا ہے۔ "سلائی مشین۔"

جی ہاں وہی سلائی مشین جس کے بغیر لباس کا تصور محال ہے۔

تو آپ نے دیکھ لیا کہ خواب کیا ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے لیے ان کی کیا اہمیت ہے۔ یہ خواب ہمارے اندر کی گھٹن کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔

ابھی بھی سائنس خوابوں کے بھید تلاش کرنے کی کوششیں کر رہی ہے۔ خوابوں کا معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ آپ رات کو بستر پر لیٹے، آپ نے کوئی خواب دیکھا اور صبح کو اٹھ کر بھول گئے۔ نہیں۔ خواب اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتے ہیں۔

اب خوابوں کے حوالے سے چند بڑے لوگوں کے اقوال سن لیں۔ روز ویلٹ نے کہا ہے۔ "مستقبل ان ہی کا ہے جو اپنے خوابوں کی خوب صورتی پر یقین رکھتے ہیں۔"

ایڈگر ایلن کا خیال ہے۔ "آج کے خواب آنے والے کل کے سوالوں کے جواب ہیں۔"

آسکر وائلڈ نے بھی بہت اچھی بات کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا نقطہ نظر کچھ اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "خواب دیکھنے والے کی سزا یہ ہوتی ہے کہ صبح ہوتے ہی اس کے خوب صورت خواب ختم ہو جاتے ہیں۔"

خلیل جبران کا قول بھی کمال کا ہے۔ "گزرا ہوا کل آج کی یاد ہے اور آنے والا کل آج کا خواب۔"

اور آخر میں یہ قول ہر کسی کو بھی عملی زندگی اور جدوجہد کے لیے تیار کر سکتا ہے۔ "اپنے خوابوں کو سچی تعبیر دینے کا طریقہ یہ ہے کہ بس جاگ جاؤ۔"



سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 96

وہ سدا ایسی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پکارتی تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی



(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو نگی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکرٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو نگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو نگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی ... والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی شنی کی تھی، زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ ... تو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ نائیک اور راشن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا ''شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔'' میں نے بروقت راج کنور ... ہمارا پستول نکال کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکہ بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی جیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں جیتو کو لے کر ڈاکٹر چیتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے ہراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے ہاتھ میں واکی ٹاکی سے منشی رام جی کی آواز سنائی دی ''شاہ جی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔'' ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ ابھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ''کنور ہوشیار'' سادی کو لے کر چیمبر..... '' مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی رام نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی، اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضل

کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنا لیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرنے تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہیں آیا جہاں گاڑی کھڑی کی تھی وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں [illegible] رہا تھا کہ پولیس والے آ گئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ زنی کی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔

(اب آگے پڑھیں)

میں دم بخود تھا کیونکہ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ڈیوڈ شا اور زینی میں کوئی رشتہ ہوگا اسے ڈیوڈ شا کے گلے لگتے دیکھ کر میں غلط فہمی کا شکار ہوا تھا کہ شاید زینی اور ڈیوڈ شا میں کوئی اور رشتہ ہے مگر زینی کے الفاظ نے میری غلط فہمی دور کر دی تھی۔ مگر زینی کی گرم جوشی اور پاپا کے لفظ پر بھی ڈیوڈ شا کے سپاٹ چہرے پر جذبات یا گرم جوشی کی ہلکی سی رمق بھی نہیں آئی تھی۔ اس نے صرف سر ہلایا اور بولا۔ "ویل ڈن۔"

غالباً زینی کو اس سے اتنے سرد رویے کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ خفیف ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں اپنی جگہ بے پروائی سے ساکت اور خاموش کھڑا رہا اور آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ اگرچہ ڈیوڈ شا کو دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی تھی مگر میں نے اس کا اظہار ضروری نہیں سمجھا۔ پیلس پرانے طرز تعمیر کا مگر بہت عالی شان تھا۔ اس میں بیک وقت تحی اور مغلئی طرز تعمیر جھلک رہا تھا۔ سرخ اینٹوں یا پتھروں سے اس کی دو منزلہ مرکزی میں یقیناً بہت سے کمرے ہوں گے اور وہ احاطے کی سب سے بلند سطح پر ایستادہ تھا۔ اس کے عقب میں بلند ہوتے پہاڑ اور ان پر بے حد گھنے جنگلات تھے۔ زمین کی ساخت کے لحاظ سے اونچی نیچی ہوتی چار دیواری تھی جس پر لوہے کی حفاظتی جالی کے ساتھ ساتھ ہر بیس فٹ کے بعد پول لائٹس نصب تھیں۔ یہ خاص متعدد سطحوں والا پہاڑی پیلس تھا۔ اس میں مرکزی پیلس کے علاوہ بھی کوئی نصف درجن عمارات تھیں۔ لان کے آس پاس صرف دو مقامی افراد تھے جو خدام کی وردی میں تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ یہاں کا حفاظتی نظام سخت ہوگا۔ ڈیوڈ شا کسی معمولی سکیورٹی والی جگہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا نے کہا۔

"بیٹھو شہباز، تمہیں ٹھیک دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

"میں پہلے بھی ٹھیک تھا۔" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کیا تھا۔ "مبارک ہو تم پھر کامیاب رہے۔ ویسے مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا جب آنکھ کی پتلی سے میری شناخت کی گئی تھی۔ یہ کام ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

"تم جانتے ہو مجھے زبردستی پسند نہیں ہے لیکن حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ مجھے تم کو بلوانا پڑا۔"

"اتنے لمبے پلان کے ساتھ؟" میں نے کسی قدر چبھتے لہجے میں پوچھا۔ "تم نے خاصا پہلے زینی کو بھیج دیا تھا۔"

"ہاں لیکن تمہیں لانے کا مشن چند دن پہلے دیا تھا۔"

"او کے میں مان لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ سابق ملاقات کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہے۔"

"میں نے کہا نا حالات کچھ بدلے ہیں۔" ڈیوڈ شا نے اپنا گلاس اٹھا لیا اور میز پر وہی ایک گلاس تھا اس کے علاوہ صرف ایک چوکور بوتل تھی جس میں سبزی مائل شراب تھی۔ یہ اس کی محفل تھی اور میں ایک قیدی تھا۔ زینی اور کرنل ذرا فاصلے پر کھڑے تھے۔ ڈیوڈ شا نے ان کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں تھک گئے ہو میرا خیال ہے آرام کرو۔"

وہ خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔ میں نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "اگرچہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ تم لاولد نہیں ہو۔"

اس نے چسکی لے کر سر ہلایا۔ "زونیا کے بارے میں مجھے دیر سے علم ہوا۔"

میں چونکا۔ ''اس کی ماں تمہاری بیوی نہیں تھی؟''

''نہیں جارجیا میں قیام کے دوران میں میرے اس عورت سے تعلقات رہے تھے اور یہ بس چند دن کی بات تھی۔ پھر میں وہاں سے نکل گیا۔ یہ سوویت یونین کے آخری دنوں کی بات ہے۔''

''یقیناً تم مرحوم کی آخری رسومات کو یقینی بنانے کے لیے وہاں موجود ہو گے؟''

اس نے میرا سوال نما تبصرہ نظر انداز کیا اور بولا۔ ''اس کے بعد میں پلٹ کر وہاں نہیں گیا۔ اب وہ عورت بھی زندہ نہیں ہے۔''

''تب تمہیں زینی کا علم کیسے ہوا؟''

''اس نے خود مجھے تلاش کیا۔'' ڈیوڈ شا نے بے نیازی سے کہا۔

''اس نے مجھے اپنے بارے میں جو بتایا ہے اگر وہ سچ ہے تو اس نے خاصی مشکل زندگی گزاری ہے۔ اسے لوگوں کے ہاتھوں خاصے ناگفتہ بہ حالات سے گزرنا پڑا ہے اور ایسا کرنے والوں میں سے اب کوئی اس دنیا میں نہیں ہے۔'' ڈیوڈ شا نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اب اس موضوع سے جان چھڑانا چاہ رہا ہو مگر میں جان بوجھ کر زینی پر بات کر رہا تھا۔

''جب اسے پتا چلا کہ اس کا باپ دنیا کی کتنی بڑی شخصیت ہے، بے شک وہ اس کا ناجائز باپ ہے اور تب وہ بہت متاثر ہوئی ہوگی۔''

''میں نے کبھی اس کے تاثرات جاننے کی کوشش نہیں کی۔'' ڈیوڈ شا کے لہجے میں کسی قدر جھنجھلاہٹ آ گئی۔ میں نے مصنوعی بے یقینی سے کہا۔

''ٹھیک ہے تم انگریز رشتوں کے معاملے میں جذباتی نہیں ہوتے ہو لیکن ایسی بھی کیا بے نیازی اپنی اکلوتی بیٹی سے۔''

ڈیوڈ شا کا چہرہ سرخ ہوا تھا اور اس نے دوسرا گلاس بھی ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ ''وہ صرف خونی لحاظ سے میری بیٹی ہے لیکن میں نے اسے نہ تو قانونی لحاظ سے اپنایا ہے اور نہ ہی وہ میری وارث ہے۔''

''یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔''

''کیسی زیادتی؟''

''اسے دنیا میں لانے کے ذمے دار تم ہو اس لیے تم کس طرح اس کی قانونی حیثیت اور وراثت سے انکار کر سکتے ہو؟''

اس بار اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ''میں نے تمہیں اپنے خاندانی معاملات پر بات کرنے کے لیے نہیں بلایا ہے اس لیے......''

''میں دعوت نامے پر نہیں آیا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم مجھے جبراً بلوا سکتے ہو لیکن کیا مجھ سے جبراً اپنے ایجنڈے پر بات کر سکتے ہو۔''

''اگر تم اس وقت بات نہیں کرنا چاہتے تو ٹھیک ہے۔'' وہ زبردستی نارمل ہوتے ہوئے بولا۔ ''مگر مجھے یوں زچ کرنے کی کوشش مت کرو۔''

میں ہنسا۔ ''ڈیوڈ شا میں جانتا ہوں تم اس مزاج کے آدمی نہیں ہو مگر میں عادت سے مجبور ہوں۔ خیر تم اپنی بات کر سکتے ہو میں سن رہا ہوں۔''

''ہم اس وقت بھارتی ریاست اروناچل پردیش کے ایک علاقے میں ہیں۔ یہ علاقہ انڈیا بننے سے پہلے ایک ریاست کا حصہ تھا اور یہ پیلس اس ریاست کے راجا کا تھا۔ ہمالیائی وادی یہاں سے صرف ڈھائی سو کلومیٹرز کی مسافت پر ہے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''تم اندازہ کر سکتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلوایا ہے؟''

جولائی کے آغاز میں یہاں موسم نہایت شاندار تھا۔ شاید ایک دو دن پہلے کھل کر بارش ہوئی تھی اور اس کی خنکی اور تازگی زمین اور پودوں میں سمائی تھی۔ یہاں بلندی کم سے کم سات ہزار فٹ ضرور تھی اس لیے دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ ڈیوڈ شا صرف برمودا شارٹ اور شرٹ میں تھا۔ میں نے تو اسلام آباد میں مئی جون میں گوروں کو سن باتھ لیتے دیکھا تھا جب مقامی دھوپ سے بچتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں تو موسم خوشگوار تھا۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے تمہارے ذہن میں وہی خناس سمایا ہوا ہے جو راجا عمر دراز کے ذہن میں ہے۔''

''راجا عمر دراز۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا۔''

''اگر تم جانتے ہو تب بھی یہ میرا اور راجا عمر دراز کا معاملہ ہے۔'' اس بار میں سپاٹ ہو گیا۔ ''بائی دی وے کیا تم نے مہم کی تیاری مکمل کر لی ہے؟''

''تقریباً۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''تمہارے علاوہ کچھ افراد کا اور انتظار ہے وہ آ جائیں تو پھر ہم روانہ ہو سکیں گے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے میں اس مہم کے لیے راضی ہوں؟''

''تم ہو جاؤ گے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جب تم حالات سے پوری طرح باخبر ہو گے۔''

''جب میں راجا کے محل سے روانہ ہوا تو تمہارے آدمیوں کو اس کا علم کیسے ہوا؟''

''میں نے کہا نا کچھ صبر کرو اور فی الحال آرام کرو۔ جلد سب تمہارے سامنے آجائے گا۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں ایک شخصیت تمہاری منتظر ہے۔''

''کون؟''

''جلد تم اس سے مل لو گے۔ تم نے اسے چھوڑ دیا تھا مگر میں نے بلوا لیا ہے۔''

ڈیوڈ شا نے مجھے تجسس میں ڈال دیا تھا کہ ایسی کون سی شخصیت تھی جسے میں نے چھوڑ دیا تھا اور ڈیوڈ شا نے اسے بلوا لیا تھا۔ ''میرے ساتھیوں میں سے......؟''

''پاکستان سے کوئی نہیں آیا ہے۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''اس معاملے میں تم بے فکر رہو۔''

''تم نے کہا کہ تم مجھے زبردستی نہیں لے جانا چاہتے تھے مگر حالات اچانک بدل گئے ہیں یعنی اب تم مجھے زبردستی لے جا رہے ہو؟''

''تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔ مگر تم چاہو تو اس کام کے بدلے مجھ سے کچھ بھی طلب کر سکتے ہو جو میرے بس میں ہو۔ اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے سے لے کر سات فگر زوالی رقم میں معاوضہ لے سکتے ہو۔ ڈالرز، پاؤنڈز یا یورو میں۔''

''تم جانتے ہو میں دشمنوں سے خود نمٹتا آیا ہوں اور جہاں تک دولت کی بات ہے تو میں نے اس کی پروا بھی نہیں کی۔''

''تب تم سمجھ لینا تم اس ہستی کے لیے یہ کام کرو گے جسے میں نے یہاں بلوایا ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے ہاتھ بلند کیا تو دور کھڑے خادموں میں سے ایک ہماری طرف آیا۔ ''اس کے ساتھ چلے جاؤ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کہاں ہو اور تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اس جگہ سے نکلنا ممکن نہیں ہے۔''

''اتنی سمجھ رکھتا ہوں۔'' میں نے بدمزگی سے کہا اور خادم کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میری زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔ حالات مجھے بار بار ان ہی منزلوں پر لے آتے تھے جہاں سے میں پہلے بھی کئی بار گزر چکا تھا اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی انڈین سرزمین پر تھا۔ آخری بار جب میں نے سرحد عبور کی تھی تو سوچ لیا تھا کہ اب اس زمین پر قدم نہیں رکھوں گا مگر میں ایک بار پھر بے بس ثابت ہوا تھا۔ جب میں نے راجا عمر دراز سے ملاقات کا ارادہ کیا تو اس کے بعد واقعات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے اور میں تبدیلیوں سے گزرتا ہوا بالآخر ڈیوڈ شا کے قبضے میں آگیا تھا۔ میرے لیے یہی انکشاف کم نہیں تھا کہ زونیا عرف زینی ڈیوڈ شا کی دخترِ نیک اختر تھی اور مزید یہاں کوئی میری جانی پہچانی ہستی موجود تھی۔ ڈیوڈ شا نے جس طرح سے بلوانے کا لفظ استعمال کیا تھا اس سے لگ رہا تھا میری طرح اسے بھی جبراً لایا گیا تھا۔

احاطے میں مرکزی پیلس کے ساتھ کئی اور عمارتیں بھی تھیں۔ یہ خادم مجھے ایسی ہی ایک عمارت میں لے آیا۔ یہ شاید مہمانوں کے لیے مخصوص تھی۔ خادم مجھے ایک کمرے تک لایا اور ادب سے بولا۔ ''آپ یہاں قیام کریں گے۔''

کمرا انتہائی حد تک عالی شان فرنیچر اور سامان سے آراستہ تھا۔ جہازی سائز آرام دہ بیڈ کے ساتھ وہاں چھوٹا صوفہ سیٹ اور چھوٹی ڈائننگ ٹیبل بھی تھی۔ ساتھ ہی اٹیچ باتھ تھا۔ ناشتا کب کا ہضم ہو گیا تھا مگر میں نے لنچ سے پہلے شاور لینے کا فیصلہ کیا۔ میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے ایک دن سے پہنا ہوا تھا۔ میں نے خادم سے لباس کا کہا تو اس نے وارڈ روب کھول کر دکھائی تو اس میں میرے ناپ کے کئی سوٹ اور دوسرے لباس تھے۔ میں نے ایک ٹراؤزر اور شرٹ لی اور واش روم میں آیا۔ میں شاور کے ارادے سے اندر آیا تھا مگر جہازی سائز ٹب دیکھ کر میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے اس میں پانی بھرا۔ یوڈی کلون اور نیکو بیڈ واش ڈال کر جھاگ بنایا اور ٹب میں گھس گیا۔ یہ پرتعیش باتھ تھا۔ شاید میں کچھ دیر سکون سے سوچنا چاہتا تھا۔ اس لیے ٹب کا انتخاب کیا۔ اوپر سے پرسکون ہونے کے باوجود میں اندر سے ٹینس تھا۔ نیم گرم خوشبودار پانی نے مجھے پرسکون کرنا شروع کیا اور میں نے غور کیا تو مجھے اب تک پیش آنے والے حالات میں کئی قابلِ وضاحت سقم نظر آئے تھے۔

اوّل راجا عمر دراز کے محل میں میرے ساتھ جو ہوا اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آئی۔ سیکریٹری بیگ نے میرے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کیا اور اس کے بعد اس نے

معذرت بھی کی۔ پھر زینی اینڈ کمپنی جو پہلے شیر خان اینڈ کمپنی تھی عین موقع پر نمودار ہوئی اور مجھے اٹھا کر یہاں انڈیا تک لے آئی۔ آخر ان لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ میں راجا عمر دراز کے محل سے روانہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی ایک توجیہہ ہوسکتی تھی کہ جیسے فتح خان کو علم ہوا تھا کہ میں کہاں تھا اسی طرح شیر خان اور اس کے ساتھیوں کو بھی علم ہوسکتا تھا مگر نہ جانے کیوں یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی بلکہ سوچی سمجھی منصوبہ بندی تھی۔ میں سوچ میں گم تھا کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور میں سمجھا کہ خادم ہوگا مگر وہ زینی تھی۔ اگرچہ میں پوری طرح جھاگ اور پانی میں چھپا ہوا تھا مگر اسے دیکھ کر کچھ بوکھلایا اور پھر اسے ہنستے دیکھ کر خفگی سے کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ ٹھیک ہے میں تمہارے باپ کا قیدی ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میرے واش روم میں گھس آؤ۔''

''میں تو سوچ رہی ہوں کہ ٹب میں آجاؤں۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ وہ اسی لباس میں تھی۔ جس میں یہاں آئی تھی۔ ''کیا خیال ہے مل کر نہاتے ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے پریشان ہوکر کہا۔ وہ ایسی ہی عورت تھی کہ اپنے الفاظ کو عملی جامہ بھی پہنا سکتی تھی۔ ''یہاں سے جاؤ۔''

''کیا تم سچ مچ ایسا چاہتے ہو۔'' اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے روکھے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ میں ایسی تفریح کا قائل نہیں ہوں۔ پلیز گو ناؤ۔''

باول ناخواستہ وہ باہر نکلی تھی اور میں نے اٹھ کر سب سے پہلے دروازہ اندر سے لاک کیا اس کے بعد شاور لے کر غسل مکمل کیا اور جسم خشک کرکے، کپڑے پہن کر باہر آگیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنے اسمارٹ فون پر کچھ دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے موبائل واپس رکھ دیا۔ اس وقت وہ سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اب تم جان گئے ہو کہ میں کس کے لیے کام کررہی ہوں؟''

''مجھے شبہ تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا تمہارا باپ ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ نظر آئی۔ ''نام نہاد ...... جس وقت میری ماں ہڈیوں کی ٹی بی کی وجہ سے مر رہی تھی تو میں صرف بارہ سال کی تھی۔ اس نے میرے سامنے دم توڑا اور اس کے بعد میں تین سال دربدر رہی۔ تیرہ سال کی عمر میں میں عورت بن چکی تھی۔''

''تم اس کا ذمے دار ڈیوڈ شا کو سمجھتی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے یوں انکار کیا کہ اس میں اقرار چھپا ہوا تھا۔

میں نے طنزاً کہا۔ ''بائی دی وے مغرب میں اسی فیصد لڑکیاں اسی عمر میں عورت بن جاتی ہیں اور یہ وہاں کا رواج ہے۔ ویسے ڈیوڈ شا کا کہنا ہے کہ یہ تعلق صرف چند دن کا تھا اور اس کے بعد وہ جارجیا نہیں گیا اور نہ ہی اسے تمہاری ماں کے بارے میں علم تھا۔''

''سوال یہ ہے کہ پاپا کو تمہیں وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت تو نہیں ہے۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''لیکن وہ مجھے کئی بار ایسی وضاحتیں دے چکا ہے جس سے لگتا ہے کہ وہ میرے سامنے اپنا تاثر بہتر کرنا چاہتا ہے۔''

''آخر وہ تمہارے لیے اتنا بے تاب کیوں ہے؟''

''کیا تم نہیں جانتی ہو؟'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پاپا نے صرف یہ بتایا ہے کہ تم ان کے لیے ناگزیر ہو۔''

''یہ ایک احمقانہ خیال ہے جس کی توقع میں ڈیوڈ شا جیسے شخص سے نہیں کرسکتا۔''

''کیسا احمقانہ خیال؟'' وہ صوفے پر ذرا سرک کر میرے سامنے جھکی اور اس کی بلاوز نما شرٹ کا گلا کچھ زیادہ ہی وسعت اختیار کرگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا باپ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس نے وادی کا سن کر سر ہلایا۔

''پاپا نے اس کے بارے میں بتایا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہاں داخلہ تمہاری وجہ سے ہوگا۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''لیکن اب مجھے یقین ہے کہ پاپا ایسا ہی سمجھتے ہیں۔''

میں فی الحال وادی پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے موضوع بدل دیا۔ ''تم ڈیوڈ شا سے محبت کرتی ہو؟''

''ہاں کیونکہ وہ میرا باپ ہے۔''

''لیکن میرا نہیں خیال کہ اس نے تمہیں بیٹی کے طور پر قبول کیا ہے۔''

''ابھی نہیں کیا ہے لیکن جلد کرلے گا۔'' زینی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے آخر

میں ہوں اس کا خون، وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا ہے۔"

مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں تھی کہ ڈیوڈ شا اسے بیٹی کی حیثیت سے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے جس کے بارے میں ڈیوڈ شا نے کہا تھا اور وہ یہیں موجود ہے۔ اسی لمحے باہر سے کسی نے زور سے کہا۔ "ہٹ جا آگے سے......"

"ابھی تم اندر نہیں جا سکتی ہو۔" خادم کی آواز آئی۔

"ہمیں شہباز سے ملنا ہے وہ یہاں ہے ہم نے خود اسے آتے دیکھا ہے۔"

زینی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں بے ساختہ کھڑا ہو گیا کیونکہ آواز اوشا کی تھی۔ خادم اسے روک رہا تھا اور وہ غصے میں آجاتی تو اسے کاٹ سکتی تھی اور اس کا کاٹا ہوا مشکل سے بچتا۔ اس لیے میں تیزی سے دروازے تک آیا اور بروقت آیا کیونکہ اوشا اس کے پاس آ گئی تھی۔ خادم نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ آگے کیا تھا اور اوشا کے سفید چمکیلے دانت جھلکنے لگے تھے۔ میں نے کہا۔ "اسے آنے دو...... راستے سے ہٹ جاؤ۔"

خادم نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ادب سے بولا۔ "میم اندر ہیں کوئی اور اندر نہیں جا سکتا۔"

"یہ میم کا نہیں میرا کمرا ہے۔" میں نے بدمزگی سے کہا۔ "اسے اندر آنے دو، یہ میری ساتھی ہے۔"

اوشا مجھے دیکھ کر کھل اٹھی تھی جیسے ہی خادم نے ہاتھ ہٹایا وہ اڑ کر میری طرف آئی اور یوں لپٹی کہ ایک لمحے کو میں بھی بوکھلا گیا تھا۔ وہ شروع سے بے باک اور کسی کی پروا نہ کرنے والی تھی۔ میں نے تو اسے اس حال میں بھی دیکھا تھا جب اس کے کمان کی طرح کسے بدن پر ہمہ وقت صرف ایک منی ساڑی ہوتی تھی جس کے نیچے بلاؤز بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت اس نے ڈھنگ سے مکمل ساڑی معہ بلاؤز پہنی ہوئی تھی مگر اس کی فطرت تو تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی شاخ سی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور چہرہ میرے چہرے کے سامنے لا کر بولی۔ "تو کیسا ہے رے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کسمسا کر کہا۔ "ذرا دور رہ کر بات نہیں کرسکتیں۔"

وہ شوخی سے ہنسی۔ "اب دور نہیں جاؤں گی رے تجھ سے ایسی ہی لپٹی رہوں گی۔"

"خدا کے لیے میرا تماشا بناؤ گی اور میں دور نہیں بھیج سکتا میں تو خود یہاں قیدی ہوں۔"

"تو قیدی نہیں ہو سکتا۔" وہ الگ ہوئے بغیر بولی مگر اس نے دباؤ ختم کر دیا تھا۔ خادم غور سے سن رہا تھا اور کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اندر ہی لے جاؤں۔ مگر اندر زینی موجود تھی۔ اوشا اسے دیکھ کر چونکی اور کسی قدر بدلے لہجے میں بولی۔ "یہ کون ہے؟"

زینی نے میری طرف دیکھا۔ "اسے بتاؤ میں کون ہوں۔"

"فی الحال ...... ہی اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "پلیز کیا تم ہمیں اکیلے چھوڑ دو گی؟"

زینی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے غصہ آیا تھا مگر فوراً ہی وہ مسکرانے لگی۔ "کیوں نہیں۔"

وہ دروازے کی طرف بڑھی اور جان بوجھ کر خود کو مجھ سے مس کرتی گئی تھی۔ اوشا دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر طیش دکھائی دے رہا تھا اس نے زینی کے جانے کے بعد اسے ایک کلاسیکل گالی دی۔ "یہ حرامجادی کون ہے؟"

"ڈیوڈ شا کی بیٹی۔" میں نے کہا۔ "وہی جس نے تمہیں راناویس کے محل سے اٹھوایا ہے۔"

"مجھے کسی نے نہیں اٹھوایا۔" اس نے تردید کی۔ "ایک آدمی نے تجھ سے ملوانے کا بولا ہم اس کے ساتھ چلے آئے۔"

"ایسے ہی چلی آئی تجھے ڈر نہیں لگا۔" میں نے اسے صوفے پر بٹھایا کیونکہ وہ سچ مچ الگ ہونے کو تیار نہیں تھی مجھ سے چپکی جا رہی تھی۔ جب تک وہ اپنے باپ کے ساتھ غریبانہ زندگی گزارتی رہی اس کا بدن نہایت چھریرا رہا تھا مگر پہلے کنور محل اور پھر راناویس کے محل میں اچھی زندگی نے اسے بدل دیا تھا، اس کا بدن بھر گیا تھا۔ جلد میں ملاحت سی آگئی تھی۔ اس نے سلک جیسے کپڑے کی سادہ سفید ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اسی رنگ کا بلاؤز تھا۔ میری بات پر وہ ہنسی۔

"تو نہیں جانتا کیا؟ مجھے کس سے خطرا ہو سکتا ہے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ اس کی نسوانیت کو کسی سے خطرہ نہیں تھا۔ اس ارادے سے اس کے پاس آنے والے کو موت ہی نصیب ہوتی۔ "تو ٹھیک کہہ رہی ہے پر خطرہ جان کو بھی تو ہوتا ہے۔"

"اس کی پروا کسے ہے رے۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "جندگی میں بس ایک ہی آدمی کی پروا ہے اور وہ تو ہے۔"

"تو نے بے وقوفی کی ہے اس طرح راناکے محل سے نکل کر۔ وہاں تو محفوظ تھی۔"

میری بات سن کر وہ جذباتی ہو گئی۔ "اگر تیرا نام لے کر ہمیں یم دوت بھی لے جاتا تو ہم چلے جاتے۔"

اب میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا نے یہ نیا حربہ استعمال کیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میرے کسی دوسرے ساتھی کو اٹھوائے گا اور اسے یرغمال بنا کر اپنا کام نکلوانے کی کوشش کرے گا تو میں مزاحمت کروں گا۔ اس لیے اس نے اوشا جیسے کسی قدر نرم کارڈ کو استعمال کیا تھا۔ اوشا میرے لیے دوسرے ساتھیوں کی طرح اہمیت نہیں رکھتی تھی مگر میں اس کی پروا ضرور کرتا اور ڈیوڈ شا اسی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کر میری گود میں بیٹھ گئی اور میرے سینے سے سر لگا لیا۔ وہ بوجھل لہجے میں بولی۔ "شہباز تو جانتا ہے نا کہ تو ہمارے لیے کیا ہے رے؟"

میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اوشا کا لمس کسی زاہد خشک کو بھی بیدار کر سکتا تھا۔ میں تو جوان اور گناہ گار انسان تھا۔ میں نے التجا کی۔ "تو اپنی جگہ بیٹھ کر بات نہیں کر سکتی۔"

اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "شہباز ہم تیرے لیے بہت تڑپے ہیں رے، اب دور نہ کر، بھلے پیار نہ کر مگر خود سے جدا نہ کر۔"

میں نے اس آزمائش کا بوجھ ذرا کم کرنے کے لیے اسے اٹھا کر صوفے کی ہتھی پر بٹھایا۔ "اوشا سمجھنے کی کوشش کر میں بہت مشکل میں ہوں۔ ٹھیک ہے تو میرے لیے تڑپی ہے مگر یہاں تیری موجودگی میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔"

"ایسا نہ بول۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "اوشا تیرے لیے مشکل بننے سے پہلے مر جانا چاہے گی رے۔ ابھی آزما لے۔"

شیشے کی میز پر پھلوں کی ٹوکری اور اس کے ساتھ ہی پھل کاٹنے والی چھری رکھی تھی۔ اوشا نے وہ اٹھا کر اپنے سینے میں اتارنے کی کوشش کی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی کوئی کوشش کرے گی۔ اس لیے جب تک میں اس کا ہاتھ پکڑتا چھری اس کے سینے کو چھو چکی تھی۔ اس نے پورا زور لگایا تھا۔ مجھے بھی روکنے کے لیے پورا زور لگانا پڑا تھا۔ جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ خود کو چھری کی طرف لائی اور مجھے دوسرے ہاتھ سے اسے روکنا پڑا۔ وہ تقریباً میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اس کی انتہائی کوشش تھی کہ چھری اس کے سینے میں اتر جائے۔ بہ مشکل چھری اس سے دور کر کے میں نے چھین کر پھینک دی اور اسے دبوچ لیا۔ "یہ کیا حرکت تھی؟"

اب وہ پُرسکون تھی۔ اس نے کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے رے، اوشا بس جبانی پریم کرتی ہے۔ ایک لمحے کو چھوڑ تجھے مر کر دکھاتی ہوں رے۔"

سچی بات ہے اس کی حرکت نے مجھے دہلا دیا تھا۔ چھری بے شک پھل کاٹنے والی تھی مگر اوشا نے جتنی قوت سے اسے سینے پر مارا تھا اگر وہ لگ جاتی تو دستے تک اندر گھس جاتی۔ اس نے دل پر وار کیا تھا۔ وہ لمحوں میں مر جاتی۔ لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں اور بلاشبہ میرے لیے جان قربان کر سکتے ہیں۔ بیتو نے کر کے بھی دکھایا۔ وسیم، سفیر، عبداللہ اور ایاز سب جانثار تھے۔ سویرا دیوانی تھی مگر اوشا نے جو کیا تھا وہ شاید کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے اسے چھوڑا تو وہ پھر چھری نہ اٹھا لے۔ مگر ابھی وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی اور کسی ننھی سی بچی کی طرح میرے بازوؤں میں دبکی ہوئی تھی۔ "تو پاگل ہے۔"

"ہاں تیری پاگل ہوں۔" اس نے اقرار کیا۔

میری نظر اس پر گئی تو اس کا سفید بلاؤز سرخ ہو رہا تھا۔ "یہ کیا خون نکل رہا ہے؟"

اس نے دیکھا اور بے پروائی سے بولی۔ "لگ گئی ہو گی چھری۔"

جب اس نے چھری سینے میں اتارنے کی کوشش کی تو میں نے اسے روک لیا تھا اور اس وقت میرا خیال تھا کہ اسے کٹ نہیں لگا تھا۔ مگر اب چھلکتا خون بتا رہا تھا کہ اسے چھری لگی تھی۔ "مجھے دکھاؤ۔"

"دیکھ لے سب تیرا ہی تو ہے۔" اس نے ساڑی کا پلو گرا دیا۔

"لاحول ولا۔" میں نے کہا اور بالشت بھر کے بلاؤز کا ایک حصہ سرکا کر زخم کا جائزہ لیا۔ معمولی سا زخم تھا مشکل سے نصف انچ کا کٹ تھا۔ چھری کی نوک لہرا کر گئی تھی ورنہ اتنا بھی نہ ہوتا۔ "ایک منٹ۔" میں نے کہا اور واش روم میں آیا جہاں ایک عدد میڈیکل بکس موجود تھا۔ میں نے اوشا کا زخم صاف کیا۔ اس نے بلاؤز کے اوپری بٹن کھول لیے تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ زخم تقریباً کھلی جگہ تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی تھی۔ زخم صاف

کر کے میں نے اسے تیار گول پٹی لگا دی۔ وہ ساکت اور تن کر بیٹھی رہی۔ "اب بلاؤز بدل لو۔"

"بدل لوں گی۔" وہ بولی۔ "پر ابھی نہیں۔ میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی رے۔"

"میں کہیں نہیں جا رہا۔"

"ہم نہیں جانتے۔" اس نے انکار کیا اور پھر مجھ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"اوشا تو مجھے جانتی ہے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ میں ایسی حرکت ناپسند کرتا ہوں۔ میرے مذہب میں خودکشی حرام ہے۔ مجھ سے وعدہ کر اب ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی؟"

"تو چاہتا ہے کہ ہم زندہ رہیں؟" اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"تب خود سے دور مت کرنا ورنہ ہم مر جائیں گے۔"

"منظور ہے خود سے الگ نہیں کروں گا۔" میں نے وعدہ کیا۔ "ہاں تقدیر کے آگے بے بس ہوں۔"

"اس کا الزام تجھے نہیں دوں گی رے۔" اس نے کہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا مگر وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر چپکی رہی اور شرارت سے بولی۔ "ایسے مزا آ رہا ہے۔"

"آرام سے یہاں بیٹھو۔" میں نے اسے دوسرے صوفے پر بٹھا دیا۔ "رانا ویاس کے ہاں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟"

"ہوا تھا اس کا ایک پوتا میرے لیے پاگل ہو گیا تھا۔" وہ مزے سے بولی۔

"پھر ٹھیک کیسے ہوا؟"

"میں نے اس کے کتے کو کاٹ لیا۔ بہت بھونک رہا تھا۔ وہ مرا تو اس کا مالک ٹھیک ہو گیا۔"

میں مسکرا دیا۔ "تجھے تو کسی نے کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں رانا جی کو پتا چلا تو انہوں نے پوتے کو بہت ڈانٹا تھا اور پھر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں تھی تو خادمہ پر بیٹی سمان سمجھتے تھے۔ تیرے کارن میرا بہت خیال رکھا۔"

"تجھے خیال نہیں آیا کہ اس طرح وہاں سے نکلے گی تو وہ پریشان ہوں گے۔"

"میں چٹھی چھوڑ آئی تھی۔"

"کیسے، تجھے تو لکھنا پڑھنا نہیں آتا؟"

وہ ہنسی۔ "ایک ملازم سے لکھوائی تھی وہ بھی بہت میرے آگے پیچھے پھرتا تھا۔"

"پھر بھی وہ پریشان ہوں گے کیونکہ میں نے تجھے ان کے پاس بھیجا تھا۔"

"تو پلٹ کر ایسا گیا کہ کبھی یاد بھی نہیں کیا۔" اس نے شکوہ کیا۔ "میں انتجار کرتی رہی رے۔"

"تو جانتی ہے میری جان کتنے سارے چکروں میں پھنسی رہتی ہے۔ ایک لمحے کو سکون نہیں ہے۔ ابھی ایک دشمن سے پیچھا نہیں چھوٹتا ہے کہ دوسرا آ جاتا ہے۔ یہاں بھی سمجھ لے کہ قیدی بن کر آیا ہوں۔"

"یہ گورا کیوں تیرا دشمن ہے؟"

"دشمن نہیں ہے مجھ سے ایک کام ہے اور میں تیار نہیں ہوں اس لیے زبردستی بلوایا ہے۔ اسے معلوم ہے وہ مجھ سے میری جان کی دھمکی پر کچھ نہیں کروا سکتا اس لیے تجھے بھی بلوا لیا۔"

"تو بھاگ نہیں سکتا یہاں سے مجھے لے کر؟"

"بہت مشکل ہے ہاں موقع ملے تو ایسا کر سکتا ہوں۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"جب موقع ہوگا تب بتاؤں گا۔"

"یہ عورت کون ہے رے؟" بالآخر اس نے وہ سوال کیا جو اسے سب سے پہلے کرنا تھا مگر وہ دوسرے چکر میں پڑ گئی۔

"بتایا تو ہے ڈیوڈ شا کی بیٹی ہے۔"

"بھلے کسی کی بیٹی ہو میں پوچھ رہی ہوں تیری کیا لگتی ہے؟"

"میرے دشمن کی بیٹی ہے تو میری کیا لگے گی؟"

"تب ایسے کیوں پوچھ رہی تھی میرا؟"

میں نے شانے اچکائے۔ "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"شہباز میں عورت ہوں اور عورت کا انداز جانتی ہوں۔ وہ تیرے چکر میں ہے۔"

"مگر میں اس کے چکر میں نہیں ہوں۔"

"چھوڑ اسے۔" وہ بولی۔ "یہ بتا میں کیسی لگ رہی ہوں۔"

"اچھی لگ رہی ہے۔"

"کتنی اچھی؟"

"بہت اچھی۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ "تو جانتی ہے میں ایسا مرد نہیں ہوں جو عورتوں پر غور

کرتا پھروں۔"

"اچھا کرتا ہے پر مجھ پر تو کیا کرتا۔" اس نے کھڑے ہوکر اپنا سراپا دکھایا۔ "دیکھ مجھے اب یوں ساڑی پہننا آگئی ہے۔"

"اور کیا آیا ہے؟"

"مجھے رسوئی میں جانے کی اجاجت نہیں تھی۔ سب ڈرتے تھے کہ میرا اوش نہ مل جائے بھوجن میں، اس لیے بھوجن بنانا نہیں آتا۔ میں صفائی کرتی تھی اور راناجی کے کام کرتی تھی۔"

میں سوچ میں تھا اور اوشا تاڑ گئی کہ میں فکر مند ہوں۔ "کیا مجھے دیکھ کر اچھا نہیں لگ رہا کیا؟"

"اوشا میں اس وقت دشمن کے پاس ہوں اور ایسے میں مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ میرا کوئی ساتھی بھی دشمن کے ہاتھ لگ جائے۔"

"پر میں تیری ساتھی تو نہیں ہوں۔" اس نے اپنے بکھر جانے والے سیاہ لمبے بال سمیٹے جو چھری کی کشمکش میں بکھر گئے تھے۔ پہلے اس کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے مگر اب کمر کے خم سے نیچے آرہے تھے۔

"تو میری ساتھی ہے۔"

"جیون ساتھی نہیں ہوں۔" اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ "مجھے پتا ہے تو میرا نہیں ہے میرا اپنا بھی چاہے تو نہیں بن سکتا۔ میرے لیے دیوتا سمان ہے۔ میں تیری پجارن ہوں۔ تیری پوجا کرسکتی ہوں پر تجھ سنگ رہ نہیں سکتی۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ یہ اچھی بات تھی کہ وہ مجھ سے کچھ مانگ نہیں سکتی تھی ورنہ مجھے انکار کرنا پڑتا۔ لیکن اس کے ساتھ ظلم تو ہوا تھا اس کے باپ نے اسے زہریلی بناتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اپنی واحد اولاد کو فطرت کی خوشی سے محروم کر رہا ہے۔ وہ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس آنے والا مرد اس کے زہر کی نذر ہوجاتا۔ زہریلی ہونے کے باوجود وہ عورت کی فطرت سے محروم نہیں تھی۔ اس کے اندر چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش موجود تھی اور شاید عام لڑکیوں سے زیادہ تھی۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔ اس نے بچپن سے جوانی تک اپنے باپ کو پاس دیکھا تھا۔ پھر میں اس کی زندگی میں آیا تو وہ مجھ سے منسلک ہوگئی۔ جب تک ساتھ رہی وہ مجھ سے جسمانی قربت کی کوشش کرتی رہی اور جب مجھ سے جدا ہوئی تو اس پسند میں محبت کا پاگل پن شامل ہوگیا۔ میں نے اسے راناویاس کے پاس بھیجا تو میرے ذہن میں تھا کہ وہی اس کے لیے محفوظ ٹھکانا تھا اور وہ ساری عمر وہاں آرام سے رہ سکتی تھی مگر ڈیوڈ شا نے اسے وہاں سے بلوا کر نہ صرف میرے بلکہ اوشا کے لیے مسئلہ کھڑا کردیا تھا۔

اوشا یقیناً میرے معاملے میں صبر سے کام لے رہی تھی اور تبھی وہ ایک نارمل زندگی کی طرف آگئی تھی۔ اسے امید ہوگی کہ شاید کبھی میرا اس سے سامنا ہو مگر وہ میرے لیے پاگل ہوکر راناویاس کے محل سے نکلی نہیں تھی۔ ممکن ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری یاد دھندلی پڑ جاتی۔ تب شاید وہ اتنی بے چین نہ رہتی۔ مگر ڈیوڈ شا نے اسے یوں میرے سامنے لاکر اس کے دبے جذبات بھڑکا دیے تھے اور اب میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اوشا کا ردعمل بتا رہا تھا کہ اب وہ اتنی آسانی سے میری جان نہیں چھوڑے گی۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا کبھی وہ صاف ہندی میں بات کرتی تھی اور کبھی اپنے پرانے انداز پر اتر آتی۔ کبھی ہم کرکے بات کرتی اور کبھی میں کہتی تھی۔ خادم نے دروازے پر دستک دی اور میری اجازت پر اندر آیا۔ اس نے لنچ کا پوچھا اور میں نے اسے یہیں لانے کو کہا۔ اس کے جانے کے بعد اوشا نے کہا۔

"میرا من کرتا ہے تیرے ایک ایک دشمن کو ڈس کر مار ڈالوں۔ تیری کوئی مجبوری باقی نہ رہے۔"

میں مسکرایا۔ "حالانکہ تم سے جتنی بار ملا ان دشمنوں کے طفیل ہی ملا۔ ورنہ تم کہیں رہتی تھیں اور میں کہیں تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک ویرانے میں ہماری ملاقات ہوگی۔"

"ہاں یہ تو ہے پر تیری مشکل ہمیں بے چین رکھتی ہے۔"

"میری مشکلیں آسان ہوں گی۔" میں نے یقین سے کہا۔ "مجھے اللہ پر بھروسا ہے۔"

"جیتو کا دکھ ہوا۔" اوشا نے کہا تو میں حیران ہوا۔

"تم جانتی ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "راناجی تک تمام خبریں آتی تھیں اور وہ ہمیں بتاتے تھے۔"

راناویاس باخبر آدمی تھا۔ مگر میرے لیے یہ تعجب انگیز تھا کہ وہ اوشا کا اس حد تک خیال رکھتا تھا کہ اسے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں تازہ ترین خبروں سے باخبر

رکھتا تھا۔ بیتو کے ذکر پر میرے دل سے آہ نکل گئی۔ میں نے اوشا کو مختصراً بتایا کہ بیتو نے کس طرح مجھ پر جان وار دی۔ اوشا نے کہا۔ "تو ہے ہی ایسا کہ جان وارنے کو جی کرتا ہے۔"

"میں نے بھی خود کو اس قابل نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔ "تم نہیں جانتی کہ بیتو میرے لیے کیا تھا اور اس کا نقصان میرے لیے کیا حیثیت رکھتا ہے۔"

بیتو کے ذکر پر میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ اوشا نے میرا دکھ محسوس کیا اور اٹھ کر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے انداز میں محبت تھی، سستا پن نہیں تھا اس لیے مجھے سچ مچ سکون ملا اور میرے اندر کا بوجھل پن کم ہونے لگا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ خادم کھانا لے آیا تھا۔ وہ میز پر لگانے لگا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں اوشا کچھ بے چین نظر آنے لگی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تجھ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہو۔"

"یہاں نہیں رے۔" وہ بولتے بولتے رک گئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خدشہ ہے یہاں ہماری بات سنی جا رہی ہوگی اور ایسا لازمی تھا۔ ڈیوڈ شا اس قسم کا آدمی تھا جو کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور وہ بہر صورت میری نگرانی کر رہا ہوگا۔ کھانے کے بعد میں نے خادم سے کہا۔ "اگر میں یہاں سے باہر جانا چاہوں تو....."

"کوئی پابندی نہیں ہے سرکار۔" اس نے ادب سے کہا۔ "آپ پیلس میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ "کہیں بھی جانے کے لیے؟"

"جی سرکار۔" اس نے سر ہلایا۔

میں اوشا کے ساتھ باہر نکلا۔ اس کے سفید بلاؤز پر سرخ دھبا بہت نمایاں تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ لباس بدل لے مگر پہلے میں جاننا چاہتا تھا کہ اوشا مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ ہم باہر آئے اور ایک کھلی جگہ جہاں سوائے گھاس کے اور کچھ نہیں تھا میں نے اوشا سے کہا۔ "تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"شہباز تجھے دیکھ کر میں بھول گئی تھی۔ اب یاد آیا۔ دو دن پہلے ایک میم رانا جی سے ملنے آئی تھی۔ وہ انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے پر وہ بار بار تیرا نام لے رہی تھی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایسی کون سی سفید فام عورت ہو سکتی تھی جو رانا ویاس سے ملنے آئی ہو اور اس سے میرے بارے میں بات کی ہو۔ "حلیہ بتا سکتی ہو دیکھنے میں کیسی لگتی تھی؟"

"پیاری تھی۔" اوشا نے رشک سے کہا۔ "گوری سی اور خوب صورت۔"

اوشا کو حلیہ بتانا نہیں آ رہا تھا اس کے نزدیک وہ میم تھی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس لیے میں نے سوال شروع کیے اور چند سوالوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ممکنہ طور پر ایمن شا تھی۔ اس کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ، چہرے کے نقوش اور جسمانی ساخت وہی تھی۔ اوشا نے تجسس سے پوچھا۔ "یہ کون ہے رے؟"

"ایمن شا۔" میں نے کہا۔ "ڈیوڈ شا کے بھائی کی بیٹی، لیکن اس کی دشمن اور....."

"تیری دوست۔" اوشا بولی۔ "میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب وہ تیرا نام لیتی تو اس کا انداز ہی بدل جاتا تھا۔"

"وہ میری ہمدرد ہے کیونکہ ڈیوڈ شا اس کا بھی دشمن ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں۔" وہ میرے قریب ہو کر بولی۔ "سب سمجھتی ہوں وہ بھی تجھ پر مرتی ہے۔"

"میرے خدا۔" میں نے منہ اوپر کر کے فریاد کی۔ "میں دشمنوں کے چکر سے نہیں نکل پاتا اور یہ لڑکیاں بھی مرنے سے باز نہیں آتی ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "تو ہے ہی ایسا..... عورت کی فطرت نہیں سمجھتا کہ اس سے بھاگے گا تو وہ تیرے پیچھے بھاگے گی۔"

"ٹھیک ہے آج سے میں عورتوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اس صورت میں تو تم دور بھاگو گی نا؟"

وہ پھر ہنسی۔ "دوسروں کا پتا نہیں رے پر میں نہیں بھاگوں گی۔ یہ بتا تجھے وہ میم کیسی لگتی ہے؟"

"جیسی تو لگتی ہے، دوست اور ساتھی، میں نے کچھ اور نہیں سوچا اور نہ ہی سوچوں گا۔"

"تو ہے ہی ایسا کٹھور۔" اس نے خفگی سے کہا۔

"اوشا بلاؤز بدل لو۔"

"میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔" اس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ میرا بازو پکڑ لیا۔ "تو چلے گا تو جاؤں گی۔"

"چلو بابا۔" میں نے مجبوراً کہا۔ اوشا ایک اور چھوٹی مگر معمولی نظر آنے والی عمارت میں ٹھہرائی گئی تھی۔ یہاں

اسے معمولی سا کمرا ملا ہوا تھا جہاں اس کا ایک عدد بیگ بھی موجود تھا۔ کمرے میں معمولی سا بیڈ اور دوسرا سامان تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا جب ڈیوڈ شا جانتا تھا کہ وہ میری ساتھی ہے تو اسے اسی لحاظ سے اوشا کا خیال رکھنا چاہیے تھا اس نے اسے معمولی نوکروں کی طرح اس جگہ ٹھہرایا تھا۔ اوشا نے بیگ سے ایک اور ساڑی نکالی اور اپنی ساڑی کھولنے لگی۔ میں نے کہا۔ ”میں باہر موجود ہوں۔“

”تو نہیں جائے گا۔“ اس نے ضد کی۔

”اوشا بچہ مت بنو کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟“

”تجھ پر ہے پر اپنے مقدر پر نہیں ہے۔ ڈر لگتا ہے تو آنکھوں سے دور ہوا تو پھر نہیں چلا جائے گا۔“

”تقدیر کے آگے میں اور تم دونوں بے بس ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”میں باہر ہوں تم لباس بدل کر آجاؤ۔“

”تو مجھ سے بھاگ رہا ہے۔ مجھے دیکھنا نہیں چاہتا۔“ اس نے شکوہ کیا تو میں مسکرا کر باہر آگیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر رانا دیاس سے ملاقات کرنے والی بچ مچ ایمن ہی تھی تو وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ بہ ظاہر اس کا رانا دیاس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور پھر اوشا کا کہنا تھا کہ دوران گفتگو بار بار میرا نام آرہا تھا۔ یہ دو دن پہلے کی بات تھی جب میں یقینی طور پر زینی کے قبضے میں آچکا تھا۔ کیا ایمن میری گم شدگی اور اس حقیقت سے واقف تھی کہ میں اصل میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں جا چکا ہوں جب کہ اس وقت میں بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کس کے قبضے میں ہوں۔ مگر ایمن کی یہاں موجودگی ذاتی طور پر نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا امکان تھا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر یہاں آئی ہو اور اسے میرے بارے میں علم ہوا ہو۔ زینی اور پھر اوشا کی آمد سے پہلے میں سوچ رہا تھا کہ میں جس طرح ڈیوڈ شا کے قبضے میں آیا تھا اس کا کوئی نہ کوئی سرا راجا عمر دراز کے محل سے ملتا تھا۔ بیگ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے شبہ مزید بڑھ رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ اس چکر میں بیگ یا عمر دراز ملوث تھے؟

مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ راجا عمر دراز یا بیگ یوں مجھے دشمن کے حوالے کر سکتے ہیں۔ بیگ نے جس طرح مجھ سے معافی چاہی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی وجہ سے مجبور ہے تبھی اس نے یہ سب کیا۔ شاید راجا عمر دراز کی ضد ختم کرنے کا واحد طریقہ یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اگرچہ پہلے بھی میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے ساتھ وادی تک جاؤں مگر اب بیگ کے طرزِ عمل نے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ڈیوڈ شا کے حوالے کرنے میں اس کا کردار مجھ سے بالاتر تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈیوڈ شا میرا ایسا دشمن نہیں ہے۔ اسے مجھ سے اتنی غرض تھی کہ وہ مجھے وادی تک لے جائے تاکہ اسے اندر جانے کا پروانہ مل سکے۔ اس کے بعد میں اس کے لیے بے مقصد ہو جاتا اور وہ شاید مجھے چھوڑ دیتا۔ شاید اسی لیے اس نے مجھے ڈیوڈ شا کے حوالے کیا۔ ایک تو میں راجا عمر دراز سے دور ہو جاؤں اور دوسرے ڈیوڈ شا بھی پیچھا چھوڑ دے۔ مگر یہ سب میرے قیاس تھے شاید ایسا نہ ہو اور شاید ایسا ہو۔ اچانک اوشا کی آواز آئی۔

”شہباز کیا کہہ رہا ہے؟“

میں چونکا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“

وہ ساڑی بدل کر آگئی تھی۔ اس بار اس نے نیلی زمین والی ساڑی پہنی تھی جس پر پیلے اور نارنجی رنگ کے پھول بنے تھے۔ البتہ بلاؤز سفید ہی تھا اور پہلے کے مقابلے میں خاصا مختصر تھا۔ اسے دیکھ کر احساس ہوا کہ اس کا بدن بھر آیا ہے ورنہ پہلے وہ چھریری سی تھی۔ اس نے کہا۔ ”تو بات کر رہا تھا خود سے؟“

”اچھا۔“ میں نے حیران ہو کر گہری سانس لی۔ ”مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“

”اچھا چھوڑ یہ بتا کہ اب کیسی لگ رہی ہوں؟“ اس نے رقص کے انداز میں گھوم کر دکھایا۔

”تو ہر حال میں اچھی لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بیگ کہاں ہے؟“

”وہ اندر ہے۔“

”اسے لے آؤ اب تم میرے ساتھ رہو گی۔“

”سچ۔“ وہ خوش ہو گئی اور لپک کر اپنا بیگ لے آئی۔ ”تیرے ساتھ تیرے کمرے میں؟“

”نہیں لیکن اسی عمارت میں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ جگہ تیرے لیے اچھی نہیں ہے۔“

”تو جانتا ہے میں کہاں سے بنے جھونپڑے میں رہی ہوں۔ مٹی پر سوتی تھی یہ الگ بات ہے کہ رانا جی کے محل کے جس کمرے میں رہتی ہوں وہ رانا جی کے کمرے سے کم نہیں ہے اب یہاں رہی تو کیا بگڑ گیا ہے۔ پر شہباز سچی بات یہ ہے کہ تو نرک میں بھی رکھے تو خوشی سے رہوں۔“

مگر میرا نرک میں رہنے یا اسے رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں

تھا۔ ہم باہر آئے اس بار بھی نہ تو کسی نے روکا اور نہ ہی کوئی نظر آیا۔ مجھے حیرت ہوئی یہاں بہ ظاہر کوئی سیکیورٹی نہیں تھی۔ ملازم اور ملازمائیں تھیں مگر وہ عام سے تھے۔ سامنا ہونے پر ایک طرف ہو کر اس وقت تک ادب سے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے جب تک ان کے پاس سے گزر نہ جایا جائے۔ مگر ایسا بھی ممکن نہیں تھا کہ یہاں سرے سے کوئی سیکیورٹی ہی نہ ہو۔ یقیناً یہاں اعلیٰ درجے کی الیکٹرونک سیکیورٹی ہوگی جس کے ہوتے ہوئے بہ ظاہر عام گارڈز کی ضرورت نہیں تھی اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ عام گارڈز بھی ہوں لیکن سامنے نہ ہوں بلکہ جب ان کی ضرورت ہو سیکنڈوں میں کہیں سے نمودار ہوجائیں۔ مگر سامنے کوئی نہیں تھا۔ بنا کسی روک ٹوک کے ہم واپس آگئے۔ مگر میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک گئے۔ وہاں زیٹی موجود تھی۔ وہ بے تکلفی سے صوفے پر موجود تھی اور اس نے معنی خیز نظروں سے ہمیں دیکھا۔

''کہاں تھے اس کے ساتھ اور اس نے اتنی جلدی کپڑے بھی بدل لیے۔'' وہ انگریزی میں بولی اس لیے اوشا نہیں سمجھی تھی۔ البتہ اس نے اپنی زبان میں کہا۔

''شہباز یہ کتیا کیوں آئی ہے؟''

''اپنی حد میں رہو۔'' زیٹی غرائی۔

''پلیز۔'' میں نے ہاتھ اٹھایا اور زیٹی سے کہا۔ ''تم کام کی بات کرو۔''

''شہباز.....'' اوشا نے کہنا چاہا۔

''تم وہاں بیٹھو۔'' میں نے سخت لہجے میں اوشا سے کہا اور بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اس طرف بڑھ گئی میں نے زیٹی سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

زیٹی نے جان بوجھ کر اوشا کو چڑانے والے انداز میں دیکھا اور میرے ساتھ باہر آگئی۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے جان بوجھ کر اونچی آواز میں کہا۔ ''تمہیں اس میں کیا نظر آیا؟''

''مجھے تو تم میں بھی کچھ نظر نہیں آتا ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں باپ بیٹی میرے سر کا درد بن گئے ہو۔''

حسب توقع وہ غصے میں آگئی۔ ''تم اس کا مقابلہ مجھ سے نہیں کرسکتے۔''

''ہاں وہ باآبرو لڑکی ہے۔''

''باآبرو؟'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اس کا

کترن

فرعونوں نے مصر پر تین ہزار تین سو سال تک حکومت کی۔ تاریخ میں 33 فرعون گزرے ہیں۔ ہر فرعون کو تقریباً 100 سال تک اقتدار ملا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ آخری فرعون کا مقابلہ ہوا۔ یہ پانی میں ڈوبا اور اس کے ساتھ ہی فرعون کا اقتدار بھی ڈوب گیا۔ فرعون ختم ہوگئے اور ریت نے ان محلات کو ڈھانپ لیا۔ یہ ریت کے چھوٹے بڑے ٹیلے بن گئے۔ ان ٹیلوں کے اردگرد لکسر کا شہر آباد ہوگیا۔ ان ٹیلوں میں سے کسی ایک ٹیلے پر ایک چھوٹی سی مسجد بنادی گئی۔ 1900ء کے شروع میں جب کھدائی شروع ہوئی تو فرعون کا محل ریت سے برآمد ہوا، پتا چلا کہ یہ مسجد فرعون کے خصوصی دربار کے اوپر بن گئی تھی۔ یہ مسجد آج تک قائم ہے، اوپر مسجد اور نیچے فرعون کا دربار ہے۔ کل شام ہم فرعون کے محل کے ستونوں کے درمیان کھڑے تھے سورج کی سرخ شعاعیں نیل کے پانیوں میں غسل کررہی تھیں۔ میں پانچ ہزار سال پرانے محل کی کھڑکی میں کھڑا ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی سرخی نیل کے پانیوں میں گھل گئی اور اس کے ساتھ ہی فرعون کا محل اذان کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے زندگی میں ہزاروں اذانیں سنی ہیں لیکن فرعون کے محل میں اذان کی آواز کا اپنا ہی سرور تھا۔ موذن کی آواز کا اتار چڑھاؤ محل کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور دیواروں پر لکھی تحریروں کو پیغام دے رہا تھا کہ دنیا کے ہر فرعون کو زوال ہے لیکن اللہ کا پیغام دائمی ہے۔ دکھائی دیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے فرعون کا مجسمہ اپنے گزرے تکبر پر نوحہ کناں ہو۔

(جاوید چودھری کے ''نیل کے ساحل سے'' اقتباس)

مرسلہ: رضوان تنولی گریڈوی۔ کراچی

انداز ہوتا ہے......"

"کیا تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "جب کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔"

"تم اس کی اتنی سائیڈ کیوں لے رہے ہو؟"

"اگر میں اس کی سائیڈ لے رہا ہوں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"

"مجھے مسئلہ یہ ہے کہ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔"

"افسوس کہ تم مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"

"کیوں؟" وہ جذباتی ہو گئی۔ "کیا کمی ہے مجھ میں؟"

"تم میں عورت کی کمی ہے۔ عورت صرف ایک مخصوص جسمانی ساخت کا نام نہیں ہے اور تم صرف نسوانی ساخت کی حامل ہو۔" میں نے نرمی سے بہت سخت بات کہی۔ وہ مجھے گھورنے لگی۔

"تم میری توہین کر رہے ہو۔"

"میرے نزدیک تو تمہارا وجود ہی عورت کی توہین ہے لیکن تم اپنے نقطۂ نظر میں آزاد ہو۔"

اس کی آنکھوں میں غیظ و غضب کی جھلک دکھائی دی تھی۔ مگر پھر وہ نارمل ہو گئی۔ "جلد تم صرف میرے ہو گے۔"

اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے انداز سے میں فکرمند ہو گیا۔ چند لمحے کو مجھے لگا کہ میں نے اسے چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ بہرحال میں ان لوگوں کا قیدی تھا مگر مجھے یہ فکر اپنے لیے نہیں بلکہ اوشا کے لیے تھی۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر اوشا کے خلاف کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے کمرے میں آکر خادم کو طلب کرنے والا بٹن دبایا۔ یہ لمبی مونچھوں اور خاص راجستھانی اسٹائل کے لباس والا نوجوان آدمی تھا۔ سیاہی مائل رنگت کے ساتھ اس کے نقوش تیکھے اور دلکش تھے۔ جسامت کسرتی مگر کسی قدر چھریری تھی۔ اس نے اندر آکر ادب سے سر جھکایا۔ "جی سرکار؟"

"مجھے ڈیوڈ شا سے ملاقات کرنی ہے۔"

"میں آپ کا پیغام پہنچا دیتا ہوں سرکار۔" اس نے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اوشا کا منہ پھولا ہوا تھا اور وہ بستر پر کروٹ لے کر نیم دراز تھی مگر منہ دوسری طرف کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھیڑنے سے گریز کیا۔ سچی بات ہے مجھے بیزاری سی ہو رہی تھی۔ عورت کبھی میری زندگی کا مقصد نہیں رہی۔ صنف نازک سے فطری دل چسپی اور احترام اپنی جگہ مگر اپنے آس پاس ان کی ضرورت سے زیادہ موجودگی مجھے بور کر دیتی ہے۔ میں عام حالات میں جینے والا فرد نہیں ہوں۔ گزشتہ ایک سال سے زندگی بہت خاص حالات میں گزر رہی ہے اور اکثر مجھے مشکلوں کا سامنا رہتا ہے۔ میں جدوجہد کر رہا ہوں اور ایسے میں اپنی ساری توجہ صرف اپنے مقصد پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں مگر یہ خواتین مجھے بخشنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب اوشا نے دیکھا کہ میں توجہ نہیں دے رہا ہوں تو وہ بالآخر اٹھی اور میرے پاس آ گئی۔ اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "اسے باہر کیوں لے گیا تھا؟"

"تو کیا اسے بھی یہیں رکھ لیتا؟" میں نے ہنس کر کہا۔

"اسے دفع کرتا۔" اوشا بولی۔ "اب وہ یہاں آئی تو میں اسے کاٹ لوں گی۔"

"تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیوں تجھے اس کی بہت پروا ہے؟" وہ جذباتی ہو گئی۔ "وہ تجھے پسند ہے۔"

"لاحول ولا۔" میں نے بدمزگی سے کہا۔ "وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔"

"تب اس کی اتنی پروا کیوں کر رہا ہے؟"

"مجھے اس کی نہیں تیری پروا ہے۔ اسے کچھ ہوا تو یہ تجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

"نہ چھوڑیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "مجھے پروا نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو تیری پروا ہے۔"

میری بات پر اس کے چہرے پر ناقابل بیان خوشی اور رونق آ گئی تھی لمحوں میں اس کے تاثرات ہی بدل کر رہ گئے۔ اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور چہک کر کہا۔ "سچ تجھے میری اتنی پروا ہے۔"

"کیا تجھے اندازہ نہیں ہے؟"

"نہیں ہے نا...... تو تو سب کی اتنی ہی پروا کرتا ہے۔"

"دیکھ کچھ لوگوں کی میں اوپر سے پروا کرتا ہوں اور کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی دل سے پروا کرتا ہوں اور تو ان میں سے ایک ہے۔"

"سچ۔" اس بار اس نے خوش ہو کر ایک غیر پارلیمانی حرکت کی اور بدقسمتی سے اسی وقت خادم اندر آیا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھ لیا۔ اوشا کو رتی بھر پروا نہیں تھی وہ سرِعام بھی اس حرکت کا اعادہ کر سکتی تھی۔ مگر میں شرمندہ ہو گیا تھا۔ وہ بدستور میرے ساتھ لگی ہوئی تھی اور مجھے اسے الگ کرنا پڑا۔ دوسری طرف خادم کے لیے اس قسم کے منظر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے بنا کسی تاثر کے کہا۔

"سرکار صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

شکر ہے اوشا نے بے رنگ لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی ورنہ اس کے کیے کا نشان میرے چہرے پر رک جاتا۔ پھر بھی میں نے باہر نکل کر احتیاطاً چہرہ صاف کر لیا۔ اوشا خوش تھی کہ وہ اب میرے ساتھ رہے گی اور اپنی من مانیاں کرتی رہے گی مگر میں اسے کھلی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اسے کمرے سے رخصت کرنا بھی مناسب نہیں تھا کہ وہ برا مان جاتی اس لیے میں نے خادم سے کہا۔ "مجھے کوئی دوسرا کمرا دے دو۔"

"کوئی غلطی ہو گئی سرکار؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "کوئی کمی ہے یہاں؟"

"نہیں یہاں اوشا رہے گی۔"

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ٹھیک ہے آپ برابر والا کمرا دیکھ لیں پسند آئے تو اس میں رہیں۔"

ڈیوڈ شا مرکزی پیلس میں موجود تھا۔ وہ سوٹ پوش اور کسی قدر فکرمند لگ رہا تھا۔ دوسرے اس کے تاثرات سے اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ فکرمند ہے لیکن میں اسے اچھی طرح جان گیا تھا۔ میں اس کے سپاٹ چہرے سے بھی اس کے تاثرات بھانپ لیتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "اینی پرابلم؟"

"تمہاری صاحبزادی۔" میں نے بھی بلا تمہید کہا۔ "وہ بلاوجہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔"

"اگر وہ تم سے فری ہو رہی ہے تو تمہیں کیا اعتراض ہے؟" اس نے مغربی روایات کے عین مطابق سوال کیا۔

"تم جانتے ہو میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔"

"او کے میں اس سے کہہ دوں گا مگر یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ بات کسی ٹینشن تک نہ پہنچے۔ اوشا میری ساتھی ہے اسے کسی قسم کا نقصان نہیں ہونا چاہیے۔"

اس بار ڈیوڈ شا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ "یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن میں کہوں گا کہ اوشا تمہارا غلط انتخاب ہے۔"

میں نے اسے گھورا۔ "تبھی تم نے اسے رانا دیاس کے محل سے یہاں بلوایا ہے۔"

اگر وہ کھسیایا تھا تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا۔ "ٹھیک ہے زینی ایک حد سے آگے نہیں بڑھے گی۔"

"ڈیوڈ شا بہتر ہوگا کہ تم اب کھل کر بات کر لو۔ بقول تمہارے حالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے لیکن جہاں تک میری نظر اور عقل کام کر رہی ہے مجھے کوئی تبدیلی نظر نہیں آرہی۔"

"اب زیادہ وقت نہیں ہے جلد تمہارے سامنے سب آجائے گا۔"

"او کے میں اپنی بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ میں تمہارے ساتھ کیوں جاؤں۔ یعنی شرافت سے کیوں جاؤں؟"

"تمہاری یہ ساتھی اوشا ہمارے ساتھ ہو گی اور تم اس کی وجہ سے مجبور ہو گے۔" ڈیوڈ شا نے کھل کر کہا۔

"گویا تم مجھے مجبور کر کے لے جاؤ گے۔ لیکن کیا میں واقعی مجبور ہو جاؤں گا؟"

"جب حالات کی تبدیلی تمہارے علم میں آئے گی تب تم دل سے اس مہم میں شامل ہو جاؤ گے۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔"

"شہباز اتنی جلدی فیصلہ مت کرو۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اگر تم ذرا صبر سے کام لو تو یقین کرو تم پچھتاؤ گے نہیں۔"

ڈیوڈ شا کی بات سے زیادہ اس کے لہجے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا اور میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "او کے میں فی الحال تمہاری بات مان لیتا ہوں مگر مہربانی کر کے تم زینی کو مجھ سے اور اوشا سے دور رکھو۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "کیا زینی بھی اس مہم پر جائے گی؟"

"بالکل، میں کم سے کم غیر متعلقہ افراد لے جانا چاہتا ہوں۔"

"زینی متعلقہ ہے؟"

"ہاں وہ بہرحال میری بیٹی ہے۔" ڈیوڈ شا نے مختصر لیکن مکمل جواب دیا۔

"کہیں اس عجلت کی وجہ موسم تو نہیں ہے۔" میں نے دریافت کیا کیونکہ مجھے خیال آیا کہ پہاڑوں میں جانے کا یہی سب سے بہتر وقت ہے ورنہ شاید ایک مہینے بعد بھی موسم اس قابل نہیں رہے گا۔ یہ جولائی کا پہلا ہفتہ تھا۔ اگست کے آخر تک موسم خراب ہو جاتا ہے اور پھر بلند پہاڑوں میں سفر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ برف باری اور طوفانوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سردی حد سے بڑھ جاتی ہے جس میں انسان کا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔

"ایک وجہ یہ بھی ہے۔"

"یعنی اصل وجہ اس کے سوا ہے؟"

ڈیوڈ شا نے میرا سوال نظر انداز کیا اور کلائی پر موجود قیمتی گھڑی دیکھی۔ "تمھیں کچھ اور کہنا ہے؟"

"نہیں بس یہی بات کرنی تھی۔"

"ٹھیک ہے تم آرام کرو ہمیں شاید ایک یا دو دن میں یہاں سے روانہ ہونا ہے۔"

ڈیوڈ شا کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس کا پروگرام طے شدہ نہیں ہے۔ کسی وجہ سے اس میں ایک دو دن کی تاخیر ہو سکتی تھی۔ یہ بہرحال ایک دشوار اور خفیہ مہم تھی جسے سر کرنا تو ایک طرف رہا شروع کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ کیونکہ معاملہ بین الاقوامی سرحدوں کا تھا اور سرحد بھی چین اور بھارت جیسے پرانے حریفوں کی تھی۔ ان دنوں یہاں دونوں طرف سے سرحد پر فوجی نقل و حرکت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایسے میں سویلین مہم جوئی آسان نہیں تھی خاص طور سے اس صورت میں جب کہ اس میں دوسرے ملکوں کے لوگ بھی شامل تھے اور اگر ہم پکڑے جاتے تو جاسوسی سے لے کر دہشت گردی تک بہت سے الزامات لگ سکتے تھے۔ ڈیوڈ شا تو اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر بچ جاتا لیکن میں اور دوسرے لوگ مارے جاتے۔

ڈیوڈ شا اپنی بات مکمل کرتے ہی وہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔ خادم مجھے یہاں تک پہنچا کر واپس چلا گیا تھا اور اب میں خود واپس جاتا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پیلس میں گھومنے پھرنے کی کوشش کی مگر اس کمرے کے علاوہ باقی تمام کمرے لاک نکلے تھے۔ صرف اس راہداری سے باہر نکلنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یعنی مجھے باہر جانا تھا۔ پیلس کے باقی حصوں کو لاک کر کے میری رسائی سے دور کر دیا گیا تھا۔ مجبوراً میں نے باہر کا رخ کیا جہاں خادم میرا منتظر تھا۔ اس نے کہا۔ "سرکار میم صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

شاید زینی تک اطلاع پہنچ گئی تھی کہ میں نے اس کے سلسلے میں اس کے باپ سے بات کی ہے اس لیے اب وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ انکار کر دوں مگر پھر مان گیا۔ میرا خیال تھا کہ زینی مرکزی پیلس میں ہوگی مگر خادم مجھے عقبی سمت میں ایک چھوٹی سی عمارت تک لایا جو بہ ظاہر رہائشی نہیں تھی۔ تقریباً پچاس فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی یہ عمارت بنا کھڑکیوں کے تھی اور اس کے اوپر ترچھی چھت تھی۔ یہ رہائش کی بجائے کسی اور کام کے لیے تھی۔ خادم دروازے پر رک گیا اور مجھ سے کہا۔ "میں اندر نہیں جا سکتا سرکار آپ کو خود جانا ہوگا۔"

میں اندر داخل ہوا اور تب پتا چلا کہ خادم کیوں اندر نہیں آیا تھا۔ عمارت اصل میں انڈور سوئمنگ پول اور چھوٹے سے جم پر مشتمل تھی۔ اس قسم کے محلات میں یہ سہولتیں بھی ہوتی ہیں۔ خادم اس لیے نہیں آیا تھا کہ زینی سوئمنگ میں مصروف تھی وہ جس حلیے میں سوئمنگ کر رہی تھی اسے دیکھ کر انسان مستقل لاحول کا ورد ہی کر سکتا تھا۔ اس کے حلیے میں لباس نام کی چیز شامل نہیں تھی۔ میں دروازے پر رکا تو اس نے آواز دی۔ "آ جاؤ شہباز ملک۔"

اس کے انداز میں چیلنج تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ آؤ اور میرا سامنا کرو۔ میں آگے آیا اور نارمل انداز میں پول اور آس پاس کا جائزہ لیا۔ "کیا تم نے اپنا تیراکی کا انداز دکھانے کے لیے بلایا ہے تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کتنی اچھی تیراک ہو۔"

وہ کنارے کی طرف آئی۔ "نہیں میں نے تمھیں بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

"کہو۔"

"تم بھی آ جاؤ پول میں پانی گرم ہے۔" اس نے دعوتی لہجے میں۔

"میرا فی الحال تیراکی کا موڈ نہیں ہے۔" میں نے انکار کیا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا مگر اس طرح کہ اسے احساس نہ ہو۔

"او کے۔" وہ اچک کر کنارے بیٹھی تو میں نے نزدیک رکھا تولیہ اسے تھما دیا۔ مگر اس نے تولیہ اپنے پیروں پر رکھ لیا۔ "تم نے پاپا سے کیا بات کی ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔" میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔ میں نے خود کو اندر سے اس حد تک مضبوط کر لیا تھا کہ

اب اس کا عریاں جسم مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں تمہیں اس جنگلی لڑکی کی فکر ہے۔'' اس کے لہجے میں حسد آ گیا۔

''تم نے درست کہا کہ مجھے اس کی فکر ہے لیکن وہ جنگلی نہیں ہے۔''

''تم اسے پسند کرتے ہو؟''

''ایک ساتھی کی حیثیت سے..... میرا کچھ وقت اس کے ساتھ گزرا ہے۔''

''لیکن وہ تم پر مرتی ہے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں نے شانے اچکائے۔ ''اگر کوئی تہذیب یافتہ عورت جس نے ساری دنیا دیکھی ہو کسی جاہل جنگلی لڑکی کی طرح میرے پیچھے پڑ جائے تو اس میں میرا قصور یقیناً نہیں ہوگا۔ نہ میں آگے بڑھا اور نہ ہی میں نے کوئی دل چسپی ظاہر کی۔''

وہ کھسیائی تھی۔ ''تم غلط سمجھ رہے ہو۔''

''یہ تو خوشی کی بات ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں۔ اب تم صحیح سمجھا دو تا کہ میں اپنے اصل مقصد پر توجہ دے سکوں۔''

''اصل مقصد؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اس قید سے چھٹکارا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مجھے تو شبہ ہونے لگا ہے کہ ڈیوڈ شا نے اسی لیے اوشا کو یہاں بلوایا ہے کہ میں اس کے اور تمہارے چکر میں پورا پڑ جاؤں۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہو سکتا ہے کیونکہ پاپا بہت دور کی سوچتے ہیں۔''

''اس لیے تمہاری محدود سوچ دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ دنیا ایک آدمی کا نام نہیں ہے۔''

اس بار وہ سنجیدہ ہو گئی کیونکہ اس نے تولیہ کھول کر اپنے جسم کے خاص حصوں کی ستر پوشی کر لی تھی۔ ''شہباز میں پاپا کے مشن کے بارے میں جان گئی ہوں۔''

''ڈیوڈ شا تمہیں بھی لے کر جا رہا ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں اس مہم میں شامل ہوں اگرچہ اسے پاگل پن سمجھتی ہوں۔''

''گویا تم مجھ سے متفق ہو؟''

''اس حد تک کہ انسان کو اپنی جان اتنے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ یہ مہم بہت زیادہ رسکی ہے۔''

''صرف تمہارا باپ نہیں اور لوگ بھی اس پاگل پن میں شامل ہیں۔'' میں نے راجا عمر دراز کا نام لیے بغیر کہا۔

''میں راجا عمر دراز کے بارے میں بھی جان گئی ہوں۔''

''وہ کینسر کے مرض کے ہاتھوں اپنے محل میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔''

''آخر ان لوگوں نے وہاں ایسا کیا دیکھا ہے جس کے لیے پاگل ہو رہے ہیں؟''

''کچھ تو ہے۔'' میں نے تسلیم کیا۔ ''کیونکہ جو میں نے سنا ہے اسے ہمارے ہاں طلسم ہوش ربا اور مغرب میں فیری ٹیل کہتے ہیں۔''

''میرا نہیں خیال کہ یہ سب سچ ہے۔''

''باوجود اس کے کہ تمہارے باپ جیسا عقلیت پسند اس میں شامل ہے اور اس پر پوری طرح یقین رکھتا ہے۔''

''میرے باپ جیسے بہت سے لوگ چڑیلوں اور بھوتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔''

''ان کا وجود ثابت نہیں ہوا ہے لیکن اس وادی کا ایک حقیقی وجود ہے۔''

''ناقابلِ یقین۔'' اس نے کہا۔ ''ہمالیہ کے برف زار کے عین وسط میں ایک ایسی وادی موجود ہے جہاں انسان اور دوسرے جاندار رہتے ہیں اور موسم ان پر اثر نہیں کرتا ہے۔''

''کسی ممکنہ زلزلے سے ہمالیہ کے وسط میں یہ وادی وجود میں آئی اور اس کی گہرائی خاصی زیادہ ہے تم اسے کنویں جیسا سمجھ لو۔ اس کی زمین کی بلندی بہ قول راجا عمر دراز کے سات آٹھ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہے اور وہاں سال میں صرف چار پانچ مہینے برف ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں معمولی بلند پہاڑی علاقوں میں پڑتی ہے۔ گرمیوں میں خاصی گرمی بھی پڑتی ہے۔''

''وہاں تک رسائی بہت بلند پہاڑوں سے گزر کر ہوتی ہے؟''

''یہ درست ہے ممکنہ طور پر بائیس ہزار فٹ کی بلندی سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔''

''دنیا کا کوئی ہیلی کاپٹر اس بلندی تک نہیں جا سکتا ہے۔'' زینی نے ٹھنڈی سانس لی تو شاید انجانے میں تولیہ نیچے سرک گیا۔ اس نے اسے واپس اوپر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ''یعنی سارا راستہ پیدل طے کرنا پڑے گا؟''

''میرا خیال ہے ڈیوڈ شا اس کا کچھ بندوبست کرے

گا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''وقت کم ہے اور ہمیں جا کر واپس بھی آنا ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو راستہ بند ہو جائے گا۔''

''پاپا کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں روانگی ہو سکتی ہے۔''

''اتفاق سے مجھ سے بھی یہی کہا ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''کیا تم اپنی مرضی سے جا رہے ہو؟''

''نہیں اور یہ بات میں نے ڈیوڈ شا سے بھی کہہ دی ہے۔''

اس نے مجھے گھورا۔ ''میں نے پاپا سے کہا تھا کہ تمہیں انجکشن دے کر لے جائیں مگر وہ نہیں مانے۔''

''وہ عقل مند آدمی ہے جانتا ہے کہ کوئی چیز بھی مجھ جیسے آدمی کو زیادہ دیر اپنے اثر میں نہیں رکھ سکتی ہے۔''

''شاید اسی لیے پاپا نے اس لڑکی کو یہاں بلایا ہے۔'' زینی کے لہجے میں ناپسندیدگی آگئی تھی اوشا کا ذکر کرتے ہوئے۔ دوسری طرف وہ بھی اس سے خار کھائے ہوئے تھی اور مجھ سے کہہ چکی تھی کہ وہ زینی کو کاٹ لے گی۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میرا خیال ہے تم جان گئی ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اس لیے تم بے فکر رہو، میں اوشا یا تمہارے چکر میں نہیں آؤں گا۔''

''تب اسے یہاں کیوں رکھا ہے؟''

''ڈیوڈ شا اسے ساتھ لے جانا چاہ رہا ہے؟''

''اسے بھی۔'' زینی چونکی۔ ''کیا تم راضی ہو؟''

''میرے راضی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس وقت تو ڈیوڈ شا گیم ماسٹر ہے۔'' میں نے کہا اور مجھے خیال آیا کہ بہ ظاہر تو ڈیوڈ شا اسے مجھے قابو رکھنے کے لیے ساتھ لے جا رہا ہے لیکن اس کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے ورنہ اوشا کی مدد سے مجھے قابو کرنا تھا تو وہ اوشا کو یہیں قید میں چھوڑ کر جا سکتا تھا۔ مگر وہ اسے لے کر جا رہا تھا تو کیا اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا؟ اوشا عام انسان نہیں تھی۔ وہ کسی زہریلے سانپ سے بھی زیادہ زہر رکھتی تھی، اور اگر وہ کسی کو کاٹ لیتی تو متاثر فرد دس منٹ میں دنیا سے گزر جاتا۔ میں نے زینی کی طرف دیکھا۔ ''تم جانتی ہو اوشا زہریلی ہے؟''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ ''کیا مطلب کہ زہریلی ہے؟''

''اس کے جسم میں زہر ہے اور وہ کسی کو کاٹ لے تو وہ مر سکتا ہے۔''

''اب تم کہانی سنا رہے ہو۔'' وہ ہنسی تو تولیہ مزید سرک گیا اور مجھے نظریں چرانا پڑیں۔ ''تم مجھے اس سے ڈرا رہے ہو۔''

''یہ حقیقت ہے اور اب مجھے خیال آرہا ہے کہ تمہارے باپ نے اسے ایسے ہی یہاں نہیں بلایا ہے اور اسے بلاوجہ ساتھ لے کر نہیں جا رہا ہے۔''

''پاپا اسے زہریلی ہونے کی وجہ سے ساتھ لے جا رہے ہیں؟'' اس نے شک سے کہا۔ ''اوّل تو مجھے شک ہے کہ وہ زہریلی ہے۔''

''تم ڈیوڈ شا سے پوچھ سکتی ہو۔''

''مگر کیسے، ایک انسان کیسے زہریلا ہو سکتا ہے۔ زہر نے اسے ہلاک کیوں نہیں کیا؟'' سوال سے زیادہ یہ اس کی خواہش لگ رہی تھی۔ میں نے اسے مختصراً بتایا کہ اوشا کی پرورش کیسے ہوئی تھی اور اس کا باپ نہ صرف حکیم بلکہ سانپوں کا بھی ماہر تھا اس نے اپنی اکلوتی اولاد کو بچپن سے جڑی بوٹیوں کے ساتھ زہر دے کر بڑے ہونے تک بے انتہا زہریلا بنا دیا تھا۔ زینی خاموشی سے سنتی رہی مگر اس کے تاثرات میں شک بہت نمایاں تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ اٹھی اور تولیہ وہیں چھوڑ کر ایک طرف موجود اپنے لباس کی طرف بڑھی۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ بہت عجیب سی چال چلتی میری گاڑی کی طرف آرہی تھی۔ مگر وہ خاص چال تھی۔ اس وقت وہ نارمل انداز میں چل رہی تھی مگر اس کی یہ چال بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں فتنہ بدن قرار دیا جاتا ہے، ان کے بدن کی ہر جنبش مرد کے ہوش اڑا سکتی تھی۔ اس نے کسی قدر سستی سے کپڑے پہن کر میری طرف دیکھا۔

''چلو مجھے ثبوت کے ساتھ دکھاؤ۔''

میں نے انکار کیا۔ ''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں ثبوت دینے کی۔''

''لیکن میں تو ثبوت چاہتی ہوں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ''تم نے کہا نا کہ وہ کسی انسان کو کاٹ لے تو وہ مر سکتا ہے۔''

''تمہارا دماغ درست ہے، کیا تم ثبوت کے لیے کسی کی جان لوگی؟''

"نہیں مگر تم نے ہی......"

"وہ کوئی تماشا نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آخر تم احمقانہ ضد کیوں کررہی ہو۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "او کے تم مجھے مت دکھاؤ مگر میں تصدیق کر کے رہوں گی۔"

اس سے بحث بیکار تھی اس لیے میں نے بات بدل دی۔ "جب تم مجھ سے ملی تھیں اور شیر خان اور کمپنی کے ساتھ تھیں تو تم روسی لہجے میں انگریزی بول رہی تھیں اور جب تم افغانستان پہنچیں تو یک دم تمہارا لہجہ مغربی ہو گیا اور تم ٹی اور تی میں واضح فرق کرنے لگیں۔"

"کیونکہ میں شیر خان کو بھی تاثر دے رہی تھی کہ میرا تعلق مشرقی یورپ سے ہے۔"

"تو کیا نہیں ہے؟"

"بالکل ہے میں جارجین ہی ہوں لیکن اب میں اپنی حقیقت جان گئی ہوں اور میں نے بہت عرصہ امریکا میں گزارا ہے۔"

وہ دیکھنے میں چوبیس پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی مگر اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ اس کے تجربات اس کی عمر سے کہیں زیادہ تھے۔ "تمہیں کب علم ہوا کہ ڈیوڈ شا تمہارا باپ ہے؟"

"تین سال پہلے۔" اس نے کہا۔ "اس وقت میں یورپ میں تھی اور اس کی تلاش میں تھی۔"

"اگر تمہاری زندگی کے ابتدائی واقعات درست ہیں تو تم نے قابلِ رشک حد تک اپنی شخصیت بنائی ہے۔"

"میں نے سب اسی دوران میں سیکھا ہے اور یقین کرو دنیا سے بڑھ کر کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ میں انگریزی، روسی اور جارجین کے علاوہ فرنچ، اردو اور جرمن زبان بھی جانتی ہوں۔ اردو تم دیکھ چکے ہو باقی زبانوں میں بھی تقریباً ماہر ہوں۔ اسلحے کے استعمال کی ماہر ہوں۔ سیلف ڈیفنس جانتی ہوں۔ میں نے اس مشکل دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"درحقیقت اب تم نے مجھے متاثر کیا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"رئیلی۔" وہ خوش ہو گئی۔

"ہاں لیکن اس انداز میں نہیں جس انداز میں تم اب تک مجھے متاثر کرنے کی کوشش کرتی آئی ہو۔ میں خود سیلف میڈ ہوں اور ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو سیلف میڈ ہوں اور دنیا کی مشکلات سے ہار نہ مانتے ہوں، چاہے وہ میرے مخالف گروہ سے کیوں نہ ہوں۔"

"یقین کرو میں تمہاری مخالف نہیں ہوں بلکہ جب سے میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے میں تم سے اپنائیت محسوس کرنے لگی ہوں۔"

اس کا تو میں بھی گواہ تھا کہ اس نے یہ احساس دلانے کی پوری کوشش کی تھی۔ شاید یہ اس ابتدائی ناکامی کا ردعمل تھا جب اس نے مجھے رجھانے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہی تھی۔ "تم نے کیا سنا ہے؟"

"پاپا سے...... تم یقین کرو وہ تمہیں بہت اہم آدمی سمجھتے ہیں صرف اس لیے نہیں کہ تم اس مہم کے لیے ضروری ہو وہ اس سے ہٹ کر بھی تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں اور تمہیں اسپیشل پرسن قرار دیتے ہیں۔"

"وہ صرف "اسپیشل پرسن" قرار نہیں دیتے ہیں بلکہ انہوں نے مجھے بنانے کی بھی پوری کوشش کی۔"

وہ ہنسی۔ "تمہاری یہ بات بھی اچھی لگتی ہے کہ تم کسی حال میں ٹینس نہیں ہوتے۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ میں ٹینس نہیں ہوتا، ہاں ظاہر نہیں کرتا اور بعض اوقات ہنسی اور استہزا میں اپنی ٹینشن چھپاتا ہوں۔"

"میں سمجھتی ہوں آدمی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ بولی اور پھر انجان بن کر کہا۔ "تم اس لڑکی کو......"

"اس کا نام اوشا ہے۔"

"او کے اوشا کو اپنے ساتھ لے گئے ہو اب وہ تمہارے پاس رہے گی؟"

"میرے پاس رہے گی لیکن دوسرے کمرے میں۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے اگر وہ میرے کمرے میں رہے تب بھی تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"کوئی نہیں۔" اس نے فراخ دلی سے کہا۔ "تم اپنے معاملات میں آزاد ہو۔"

"تھینک یو۔" میں نے سادہ طنز کے ساتھ کہا۔ "کیا خیال ہے باہر نہ چلیں۔"

"اگر تم چاہو تو یہ پول اور جم استعمال کر سکتے ہو۔"

"میرا خیال ہے اتنا وقت نہیں ہے۔" میں نے انکار کیا۔ "ڈیوڈ شا پہلے ہی ایک دو دن کا کہہ چکا ہے۔"

میں اس کی چالاکی سمجھ رہا تھا، وہ جاننا چاہتی تھی کہ میں اوشا کو کیوں ساتھ لایا تھا اور اسے یہ جان کر اطمینان ہوا

تھا کہ وہ الگ کمرے میں رہے گی۔ زینی اتنا تو سمجھتی ہوگی کہ وہ زہریلی تھی اور کوئی مرد اس کے پاس نہیں آ جا سکتا تھا۔ جو ایسی جسارت کرتا وہ موت کے گھاٹ اتر جاتا۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے پاس اوشا کا وجود بہ مشکل ہی برداشت کر رہی تھی۔ اگرچہ میں ڈیوڈ شا کو خبردار کر چکا تھا اور زینی کو بھی سمجھا دیا تھا کہ اوشا میری ساتھی ہے اس کے باوجود میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ وہ بہت شاطر عورت تھی جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی تھی اور اس کے ظاہر سے اس کے باطن کا درست اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ پھر وہ ڈیوڈ شا جیسے شخص کی بیٹی تھی اس کی کچھ نہ کچھ فطرت اس میں آئی ہوگی۔ اس لیے میں نے سرسری سے انداز میں اسے بتا دیا کہ اوشا میرے لیے جنس سے قطع نظر صرف ایک ساتھی تھی اور مجھے اسی لحاظ سے اس کا بہت زیادہ خیال تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کو اہمیت دینے والا شخص ہوں۔ میں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کو معاف کر سکتا ہوں لیکن اگر کوئی میرے ساتھی کو نقصان پہنچائے تو میں اسے کسی صورت معاف نہیں کرتا۔

ہم باہر آئے تو سورج ڈھل رہا تھا۔ دن کے وقت یہاں کسی قدر گرمی تھی مگر اب ہوا خنکی لیے ہوئے اور مخصوص پہاڑی نباتات اور پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ زینی نے چائے کی دعوت دی مگر مجھے اوشا کی فکر ہو رہی تھی کہ وہ میری غیر موجودگی سے پریشان ہو کر باہر نہ نکل آئے اور اگر اسے روکا گیا تو وہ غصے میں بھی آ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے انکار کیا اور روانہ ہو گیا۔ زینی شاید میرے ساتھ مزید وقت گزارنا چاہتی تھی مگر میں نے روانہ ہوتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ بھی ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے معاملے میں کبھی ہار نہیں مانتی ہیں اور اپنی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ مجھے اس سے پہلے بھی ایسی عورتوں سے واسطہ پڑ چکا تھا اور میں ان کو ہینڈل کرنا جانتا تھا۔ اس لیے پہلے میں نے اس سے بے تکلفانہ رویہ رکھا مگر جب اس کے پاس سے روانہ ہوا تو اسے بالکل نظر انداز کر دیا اور وہ میرے پیچھے نہ آ سکی اور نہ ہی مجھے روک سکی۔ وہ مجھے گھورتی رہ گئی تھی اور مجھے اس کی نظروں کا دیر تک احساس ہوتا رہا تھا۔ حسب توقع اوشا بے تاب اور کسی قدر غصے میں تھی مجھے دیکھتے ہی لپکی اور میرا بازو پکڑ لیا۔

''کہاں تھا رے؟''

''ڈیوڈ شا سے بات کر رہا تھا۔'' میں نے نرمی سے کہا اور بازو چھڑا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

''وہ چڑا جادی تو نہیں ملی؟''

''ملی تھی۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ تم سے دور رہے۔''

''مجھ سے نہیں تجھ سے دور رہے۔'' وہ بولی۔ ''میرے پاس آئی تو ماری جائے گی۔ میں اسے کاٹ لوں گی۔''

میں نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ ''تم کوئی غلط حرکت نہیں کرو گی اس سے میرے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔''

وہ فرش پر میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور اپنا سر میرے گھٹنوں پر ٹکا لیا۔ ''شہباز کوئی تیرے پاس آئے ہم سے برداشت نہیں ہوتا ہے۔''

''تم جانتی ہو میں کس قسم کا آدمی ہوں اس لیے فکر مت کیا کرو۔''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''جانتی ہوں رے پر تو عورت کا چلتر نہیں جانتا۔''

''جان گیا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم عورتوں نے بتا دیا ہے کہ ایک مرد کے پیچھے تم لوگ کتنی دور تک جا سکتے ہو۔''

''تو مجھے دوسری عورتوں کی طرح سمجھتا ہے رے؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''نہیں ورنہ تو میرے پاس نہ ہوتی۔''

''شہباز میں یہاں تیرے ساتھ رہوں گی نا؟''

''نہیں اس کمرے میں تم رہو گی میں برابر والے کمرے میں رہوں گا۔''

''یہاں کیوں نہیں رے؟'' وہ بے چین ہو گئی۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' میں نے سمجھایا۔ ''تو جانتی ہے مرد اور عورت کا پاس رہنا ایسا ہی ہے جیسے آگ اور پیٹرول ایک جگہ ہوں۔''

وہ افسردہ ہو گئی۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے...... میں وِش کنیا ہوں۔''

میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''شہباز باہر چل میرے ساتھ۔''

''آؤ موسم بھی اچھا ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے یوں سکون سے بیٹھنے کی بجائے اس جگہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ ٹھیک ہے میں باہر نہیں جا سکتا تھا مگر مجھے

کسی بھی ہنگامی حالت کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ ہم باہر آئے۔ لان، پھولوں کے تختوں اور روشوں پر ٹہلتے ہوئے ہم پورے پیلس میں گھومنے لگے۔ اوشا نے میرا مقصد بھانپ لیا تھا اس لیے وہ ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز ادھر کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔''

''یہاں دوسرے طریقے سے نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ دیکھو دیواروں پر تاریں لگی ہیں۔ ان میں کرنٹ ہوگا۔ دیواریں بھی اونچی ہیں۔ ان پر کیمرے بھی لگے ہیں۔ یہاں یقیناً ٹریپ بھی ہوں گے۔''

''وہ کیا ہوتے ہیں؟''

میں اسے سمجھانے لگا کہ ٹریپ کیا ہوسکتے ہیں اور آدمی بے خبری میں ان کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ ڈر گئی اس نے سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ ''اتنے خطرناک ہوتے ہیں رے۔''

''اس لیے بہت احتیاط کرنا۔ یاد رکھنا اگر میں کہیں چلا جاؤں اور تمہیں میرے بارے میں معلوم نہ ہو تب بھی تم اپنے طور پر باہر نکلنے کی کوشش نہیں کروگی۔''

''تو تم ہوا تو میں رہ نہ سکوں گی۔'' اس نے انکار کیا۔ ''میں آگ کے دریا میں کود جاؤں گی۔''

''ایسا ہوگا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں صرف ایک امکان کا کہہ رہا ہوں۔''

اس نے چلتے ہوئے ایک جھاڑی سے پھولوں کا گچھا توڑا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ''میرے بالوں میں لگا دو۔''

میں نے لے کر اس کے بالوں میں اٹکا دیا۔ سرخ رنگ کے پھول اس کے بالوں میں اچھے لگ رہے تھے مگر میری توجہ اوشا کی بجائے ایک جھاڑی کے عقب میں موجود شخص کی طرف گئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی۔ میں جھاڑی کی طرف بڑھا تو اس کے پیچھے کوئی نہیں تھا مگر کسی کی جھلک پھر دکھائی دی اور اس بار وہ شخص ایک دیوار کے عقب میں غائب ہورہا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگرچہ مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ ہماری نگرانی نہیں ہورہی ہے اور ہمیں ایسے ہی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ اس کا امکان تھا کہ دور سے ہماری آلات کی مدد سے نگرانی ہورہی ہو۔ مگر اب تک مجھے کوئی نظر نہیں آیا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی کو براہِ راست نگرانی کرتے پایا تھا۔ وہ سیاہ بالوں اور چھوٹے قد والا شخص تھا میں اس کے نقوش تو نہیں دیکھ سکا تھا مگر مجھے لگا کہ وہ نیپالی نقوش کا حامل شخص ہے۔ اوشا پیچھے رہی تھی اس نے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''ہماری نگرانی ہورہی ہے۔'' میں نے واپس آتے ہوئے کہا۔

''قید کیا ہے تو نگرانی تو کریں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''تو اندر چلتے ہیں۔'' میں نے واپسی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ہم عمارت میں واپس آئے۔ مجھے کچھ بے چینی سی ہورہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس شخص نے جان بوجھ کر خود کو نمایاں کیا تھا۔ جیسے وہ جتانا چاہ رہا ہو کہ ہم کھلے نہیں چھوڑ دیے گئے ہیں بلکہ ہماری نگرانی ہورہی ہے۔ ورنہ اسے یوں اپنی جھلک دکھانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے خادم سے کچھ ہلکی پھلکی چیزیں لانے کو کہا۔ اس کے جانے کے ایک منٹ بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ خادم اتنی جلدی واپس نہیں آسکتا تھا میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کون ہے کہ دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک چھوٹے قد کا اور نیپالی نقوش والا شخص کھڑا تھا جس کے بال سیاہ تھے۔ میں بے ساختہ کھڑا ہوگیا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا تھا تاکہ اس کی آہٹ بھی نہ ہو۔ میں چوکنا تھا اور اوشا بھی ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تھا مگر میں نے نفی میں سر ہلا کر اسے بتایا کہ میں بھی نہیں جانتا ہوں۔ اس شخص کا انداز مشکوک تھا مگر مجھے اس سے خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ آگے آیا تو میں اس کے اور اوشا کے درمیان میں آگیا۔ نزدیک آکر اس نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں ایک چھوٹا اور نارمل بٹن والا موبائل تھا۔ اس کی اسکرین آن تھی اور اس پر میسج لکھا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے کہا کہ میں میسج پڑھوں، میں نے لے کر پڑھا۔

''یہ میرا آدمی ہے اور میں نے اسے خاص طور سے تم سے رابطے کے لیے بھیجا ہے۔ اس سے یہ موبائل لے لو اور اپنے پاس چھپا لو موقع پاکر مجھ سے رابطہ کرنا۔ اے شاہ۔''

میں نے حیرت سے اس شخص کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا کر پیغام کی تصدیق کی تھی۔ اے شاہ سے سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ یہ پیغام اور آدمی ایمن کی طرف سے آیا تھا۔ اس دوران میں کسی نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس شخص نے ایک

مختصر سا چارجر نکال کر میرے حوالے کیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے اجازت لی اور میں نے سر ہلایا تو وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔ اس نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور بند کیا تھا۔ اس کے جاتے ہی اوشا میری طرف آئی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اشارے سے منع کیا کہ اس بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ وہ سمجھ گئی اور سر ہلایا تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا۔ میں نے وہ نمبر دیکھا جس سے پیغام آیا تھا اور اسی پر جوابی میسج کیا۔ ''کیا ثبوت ہے کہ تم ایمن ہو اور یہ آدمی تمہارا بھیجا ہوا ہے؟''

چند لمحے بعد جواب آیا۔ ''تم کال کرو مگر بولنا مت میری آواز سننا، میری آواز تو نہیں بھولے ہوگے۔''

میں نے والیوم کم کر کے اس نمبر پر کال کی اور ایمن نے کال ریسیو کی اور بولی۔ ''شہباز کیسے ہو...... کتنا عرصہ ہو گیا تم سے بات کیے اور تمہیں دیکھے بغیر...... مگر میں یہیں ہوں اور تم سے زیادہ دور نہیں ہوں...... مجھے معلوم ہے تم کہاں ہو اور کس کے قبضے میں ہو...... مگر اطمینان رکھو جلد تم آزاد ہو گے...... شہباز ڈیوڈ شا کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا وہ صرف تمہیں استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد وہ تمہارا نشان مٹانے کی پوری کوشش کرے گا۔''

میں نے کال کاٹ دی اور اسے میسج کیا۔ ''اب مجھے یقین آ گیا۔ لیکن تمہیں یہاں میری موجودگی کا کیسے علم ہوا؟''

''مجھے مائی نے بتایا ہے۔'' ایمن کے جواب نے مجھے حیران کیا۔

''مائی جو میرا ساتھی ہے؟''

''ہاں اسی نے مجھے تلاش کیا اور پھر رابطہ کیا۔ میں ان دنوں اپنی ہمالیہ سیریز کے شوٹ کے لیے یہاں انڈیا آئی ہوں۔''

''تم نے راناویاس سے بھی رابطہ کیا تھا؟''

اس بار وہ حیران ہوئی۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اوشا میرے پاس ہے اسے میں نے راناویاس کے پاس بھیج دیا تھا مگر اسے میرے نام کا دھوکا دے کر ڈیوڈ شا نے وہاں سے نکلوالیا اب وہ بھی یہاں قید ہے۔''

''میں اس کے بارے میں جانتی ہوں، راناویاس نے بتایا تھا لیکن مجھے یہ علم نہیں کہ وہ تمہارے پاس پہنچ گئی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں کہاں ہوں اور ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں۔''

''میں نے ڈیوڈ شا کو تلاش کیا اور اسے تلاش کرنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میڈیا میں ہونے کی وجہ سے میری یہاں واقفیت ہے اور میں نے اسے استعمال کیا۔''

''تم نے اس آدمی کو اندر تک کیسے بھیجا؟''

''یہ اصل میں اندر کا آدمی ہے اور برسوں سے اس پیلس میں ملازم ہے۔ میں نے اسے استعمال کیا ہے۔''

''تم نے اسے استعمال کیا ہے اور اگر اس نے اپنے مالکوں کو بتا دیا تو؟''

''نہیں بتائے گا۔ وہ اپنے مالکان سے نفرت کرتا ہے۔ انہوں نے اس کی اکلوتی بیٹی کے علاج کے لیے مدد دینے سے انکار کر دیا اور وہ مر گئی۔ اسی لیے وہ اتنی آسانی سے ہمارے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا۔''

میرا ذہن اتنی آسانی سے ایمن کی بات تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ میں بہت عرصے سے اس وحشت کی سیاحی میں تھا اور مجھے معلوم تھا یہاں سراب زیادہ تھے اور حقیقت بہت کم۔ عین ممکن ہے ایمن جس شخص کو اپنا آدمی سمجھ کر استعمال کر رہی ہو وہ اصل میں ڈیوڈ شا کا آدمی ہو اور وہ اس کے جال میں آ رہی ہو۔ اگر وہ سچ مچ بھی اپنے مالکان سے غداری کر رہا تھا تب بھی اس کا چھپنا قرین قیاس نہیں تھا۔ وہ پکڑا جا سکتا تھا اور اس کے بعد اسے حقیقت اگلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو ایمن نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو میں نے پکا کام کیا ہے۔''

''کیا تمہیں راناویاس کی مدد حاصل ہے؟''

''نہیں میں نے اس بارے میں کسی پر اعتبار نہیں کیا ہے تم جانتے ہو یہاں تم کتنے شدید خطرے میں ہو۔ اگر تم پکڑے گئے تو بچنا بہت مشکل ہوگا۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے جواب لکھا۔

''اسی لیے میں نے تمہارے معاملے میں کسی مقامی شخص پر اعتماد نہیں کیا ہے۔''

''اس شخص کو تو معلوم ہے جس نے مجھے موبائل لا کر دیا ہے۔''

''اسے صرف اتنا معلوم ہے کہ اسے یہاں قید شخص کو موبائل لے جا کر دینا ہے وہ تمہاری شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہے۔''

''جو تمہاری مدد کر رہے ہیں؟''

"وہ بھی نہیں جانتے ہیں صرف میں اور میرا ایک ساتھی جانتا ہے۔ وہ میری ٹیم کا حصہ ہے۔"

"تم جانتی ہو ڈیوڈ شا کا کیا پلان ہے؟"

"ہاں میں جانتی ہوں۔ وہ ہمالیائی وادی کی طرف جانے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"وہ تیاری کر چکا ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "ایک یا دو دن میں وہ روانہ ہونے والا ہے۔"

"شہباز۔" وہ بے چین ہو گئی۔ "تم اس کے ساتھ نہیں جاؤ گے۔ یہ خودکشی ہوگی۔"

"میں مجبور ہوں اور اس کے قبضے میں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں جس جگہ قید ہوں یہاں بہ ظاہر کوئی سیکیورٹی نہیں ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ میں یا کوئی بھی یہاں سے آسانی سے نکل سکتا ہے۔ دوسرے میں انڈیا میں ہوں اور یہاں مجھے زیادہ خطرات ہیں۔ میں اندھا دھند یہاں سے نکل کر بھارتیوں کو اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی اس بات کو سمجھتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں کوشش کر رہی ہوں کہ تمہارے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کروں اور اس کے بعد تمہیں آزاد کرانے کی کوشش کروں۔"

"تم زونیا عرف زینی کے بارے میں جانتی ہو؟"

"نہیں یہ کون ہے؟"

"تمہاری کزن اور ڈیوڈ شا کی ناجائز بیٹی۔" میں نے انکشاف کیا۔ "اس کی ماں ایک جارجین عورت تھی جس سے ڈیوڈ شا کے تعلقات مختصر مدت کے لیے رہے اور اس کے نتیجے میں زینی وجود میں آئی۔"

ایمن حیران ہوئی تھی۔ "تم اس سے ملے ہو؟"

"وہی تو مجھے اغوا کر کے لائی ہے۔" میں نے کہا اور مختصراً ایمن کو بتایا کہ مجھے کس طرح پاکستان سے پہلے افغانستان اور پھر انڈیا لایا گیا۔ اس میں ڈیوڈ شا نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا تھا۔ ایمن نے نفرت سے لکھا۔

"آخر ہے نا ڈیوڈ شا کی اولاد۔"

ایمن کے ایموشن کا مجھے یوں پتا چل رہا تھا کہ وہ میسج میں سائن بھی بنا رہی تھی۔ میں نے آخر میں پوچھا۔ "کیا تمہارا میرے ساتھیوں سے رابطہ ہے؟"

"بالکل ہے۔" اس نے کہا۔

"تب انہیں میرے بارے میں بتا دو اور یہ نمبر دے دو۔" میں نے کہا۔ "مگر لوکیشن بتا دینا۔"

"میں ایسا ہی کروں گی۔" ایمن نے کہا۔

"اس موبائل میں بیلنس ہے؟"

"تم اس کی فکر مت کرو، اس کی بیٹری بہت چلتی ہے اور جلدی چارج ہو جاتی ہے۔ میں نے خاص طور سے اسی لیے یہ سیٹ بھیجا ہے۔" اس نے کہا۔ "اب تم موبائل بند اور ٹونز آف کر کے کہیں چھپا دو اسے زیادہ استعمال کرنا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"اوکے بائے۔" میں نے کہہ کر موبائل جیب میں رکھ لیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور خادم اجازت لے کر ٹرالی سمیت اندر آیا۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنی ہوئی چیزیں تھیں۔ وہ ٹرالی رکھ کر سرو کرنے لگا تو اوشا نے اس سے کہا۔

"تو جا رے۔ میں دیکھ لوں گی۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا اور اوشا چائے بنانے لگی اور پھر اس نے چیزیں نکالیں۔ وہ جتنے سلیقے اور طریقے سے یہ کام کر رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس نے بھوکے ہونے کے باوجود پہلے سب میرے سامنے رکھا اور پھر اپنے لیے نکالنے لگی۔ میں رکا ہوا تھا تو اس نے کہا۔ "تو کھا رے۔"

"تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔" میں نے کہا تو وہ خوش نظر آنے لگی۔ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی مگر اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ممکنہ طور پر ہماری باتیں سنی جا رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے ساتھیوں سے کیسے رابطہ کروں۔ خادم کے جانے کے بعد میں نے موبائل نکال کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ کچھ دیر بعد میسج آیا تو میں نے کھولا۔ میسج وسیم کی طرف سے تھا۔

"اف آپ پھر دشمن دیس پہنچ گئے۔"

میں نے جواب دیا۔ "بس یار قسمت۔ باقی سب خیر ہے نا؟"

"کیسی خیر جناب، ہمارا تشویش سے اور خواتین کا رو رو کر برا حال ہے۔"

"ان کو تسلی دے یار۔" میں نے کہا۔

"میں تو خود کو تسلی نہیں دے پا رہا تھا انہیں کہاں سے دیتا۔ اب ذرا اطمینان ہے مگر آپ ہیں کہاں؟"

"میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں اور وہ مجھے وادی کی

طرف لے جانے پر تلا ہوا ہے اس بار کوئی راہ مفر نظر نہیں آ رہی۔"

"آپ فکر نہ کریں جناب وہ اتنی آسانی سے کامیاب نہیں ہوگا۔ اب ہم بے خبر نہیں ہیں۔"

"کیا ارادہ ہے؟"

"ظاہر ہے ہم آپ کو اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔"

"وہی میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا ارادہ ہے؟"

"آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔"

"میں اس کی تائید نہیں کروں گا۔ کم سے کم تم یہاں جانے پہچانے فرد ہو میری طرح۔"

"ہم فی الحال سوچ رہے ہیں اور راستے تلاش کر رہے ہیں۔ سفیر اور میں کل ہی واپس آئے ہیں۔ عبداللہ پہلے سے یہاں موجود تھا۔ اسی کی چھٹی حس تھی کہ اس نے ماتی سے کہا کہ وہ ایمن شا کو تلاش کرے کیونکہ شبہ ڈیوڈ شا پر جا رہا تھا اور اس کا پاکستان میں کوئی سراغ نہیں لگ رہا تھا۔ ایمن نے بتایا ہے کہ آپ وہاں تک کیسے پہنچے؟"

"ڈیوڈ شا کی دختر بد اختر نکل آئی ہے اور اسی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ کہتے ہیں ناپوت کے پاؤں پالنے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں بچی نے ثابت کیا کہ وہی ڈیوڈ شا کی وارث ہے۔"

"یقیناً آپ کے چکر میں بھی ہوگی۔" وسیم نے لکھا تو میں جھینپ گیا۔

"یار ان خواتین نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ ڈیوڈ شا نے اوشا کو بھی یہیں بلوا لیا ہے۔" میں نے فریاد کی۔

"اس نے آپ کو صحیح زنجیریں ڈالی ہیں۔" وسیم نے لکھا اور آگے ہنسنے کا سائن بنایا۔

"اوشا کے حوالے سے مجھے لگ رہا ہے ڈیوڈ شا کسی اور چکر میں ہے کیونکہ وہ اسے وادی کی طرف لے جا رہا ہے۔"

"وہ جائے گی؟"

"اس کا تو کہنا ہے کہ میرے ساتھ نرکھ میں بھی ہنسی خوشی جائے گی۔"

"ہاہاہا، آپ ٹھیک چکر میں پڑے ہیں۔ اللہ رحم کرے۔"

"بہت شوخیاں سوجھ رہی ہیں بیٹے خود اس چکر میں پڑو گے تب پتا چلے گا۔"

"سچی بات ہے چند گھنٹے پہلے تک تشویش سے برا حال تھا۔ ہنسنا تو دور کی بات ہے مسکرا بھی نہیں رہا تھا۔ اب آپ کی خیریت کی اطلاع ملی ہے تو جان میں جان آئی ہے۔"

"حالانکہ تم لوگوں کو اب تک عادی ہو جانا چاہیے۔"

"نہیں ہو سکتے جناب، آپ کی طرف سے ہمیشہ تشویش رہتی ہے۔"

"مرشد اینڈ کمپنی کا کیا حال ہے؟"

"اس محاذ پر مکمل خاموشی ہے۔"

"اندرونِ خانہ کوئی کھچڑی پک رہی ہے؟"

"نہیں میں نے آدمی لگائے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ فی الحال سب امن وسکون ہے۔ فتح خان کا پتا چلا تھا۔ آپ نے بالآخر اپنی زندگی کا مشکل ترین فیصلہ کر لیا۔"

"ہاں یار۔" میں نے جواب دیا۔ "میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا اور کال مت کرنا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں جناب، آپ بھی محتاط رہیں اور اپنا خیال رکھیں۔"

میں نے وسیم، سفیر اور دوسرے لوگوں کے انڈیا آنے یا نہ آنے پر زیادہ بات اس لیے نہیں کی کہ ابھی تو ان کو علم ہوا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بیگ اٹھا کر انڈیا کا رخ کرتے۔ سیدھے راستے سے آنا مشکل اور رسکی تھا اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار میں وقت لگتا۔ حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے اور میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ شاید ان لوگوں کے یہاں آنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ میں نے موبائل واپس رکھا تو اوشا اب بے چین لگ رہی تھی اس نے اشارے سے کہا کہ میں اسے بھی صورت حال سے آگاہ کروں۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے اس نے اب تک غیر معمولی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے سوچا اور اس سے کہا۔ "کیا خیال ہے باہر کا ایک چکر اور نہ لگائیں؟"

"میں بھی یہی کہہ رہی ہوں رے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "اندر دم گھٹ رہا ہے۔"

ہم باہر آئے جہاں سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی اپنا پر پھیلا چکی تھی اور اب ہوا میں خنکی تھی۔ روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ میں اوشا کو ایک ایسی جگہ لایا جہاں کسی قدر فاصلے تک نہ تو کوئی تعمیر تھی اور نہ ہی کوئی درخت یا جھاڑی تھی جہاں مائیک کی موجودگی کا شبہ کیا جا سکے۔ اس کے باوجود

میں نے تقریباً زیرِلب اور مبہم الفاظ میں اوشا کو بتایا کہ مجھ سے میرے ساتھیوں نے رابطہ کیا تھا۔ جب ایمن بات کر رہی تھی تو اوشا فاصلے پر تھی اور اس نے اس کی آواز نہیں سنی تھی اور نہ ہی وہ میسج پڑھ سکتی تھی۔ اس لیے اسے ایمن کے بارے میں علم نہیں تھا اور نہ ہی میں نے مناسب سمجھا کہ اسے ایمن کے بارے میں بتاؤں۔ وہ پہلے ہی زینی سے بھڑکی ہوئی تھی ایمن کے بارے میں پتا چلتا تو نہ جانے اس کا ردِعمل کیا ہوتا؟ وہ خوش ہوگئی کہ میرے ساتھیوں نے مجھے تلاش کرلیا ہے۔ ''وہ تجھے یہاں سے نکال سکتے ہیں؟''

''ہاں لیکن ابھی وہ یہاں نہیں ہیں اور جب تک وہ یہاں آئیں گے پتا نہیں ہم یہاں ہوں گے بھی یا نہیں۔''

اوشا سنجیدہ ہوگئی۔ ''شہباز ایک وعدہ کر۔''

''کیسا وعدہ؟''

''یہی کہ اگر یہاں سے بھاگنے کا موقع آیا تو تو میری پروا نہیں کرے گا اور یہاں سے نکل جائے گا۔''

''تم مجھے بے غیرت سمجھتی ہو۔'' میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ''تم میری پناہ میں ہو اور میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں اس کے بعد کیا میں بھی خود کو غیرت مند سمجھ سکوں گا۔''

''میں سمجھتی ہوں رے......''

''جب سمجھتی ہو تو ایسی فضول بات کیوں کی۔ ہمارے ہاں عورتوں کی عزت کے لیے مرنا مارنا بہت آسان سمجھا جاتا ہے۔''

مجھے حقیقت میں غصہ آگیا تھا۔ اوشا میرے تاثرات سے ڈر گئی۔ ''مجھے شما کر دے۔''

''اب ایسی بات مت کہنا۔''

''بالکل بھی نہیں رے۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''تو ایسا نہ ہوا کر مجھے ڈر لگتا ہے رے۔''

''تب میری بات مانا کر۔'' میں نے کہا اور نارمل ہوا تو اوشا کی جان میں جان آئی تھی۔ ہم کچھ دیر ٹہلتے رہے اور اس بار بھی ہمیں کوئی نظر نہیں آیا۔ حالانکہ اس بار ہم نے تقریباً پیلس گھوم لیا تھا مگر اِکا دُکا گھومتے خادموں کے سوا کوئی نظر نہیں آیا۔ البتہ جب مین گیٹ کے پاس آئے تو وہاں پہلی بار سیکیورٹی گارڈز دیکھے اور یہ بڑے مستعد قسم کے کمانڈوز اسٹائل کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔ دو سامنے تھے اور یقیناً کئی اس چوکی میں تھے جو گیٹ کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ عجیب بات تھی کہ پورا پیلس دیکھنے کے دوران میں مجھے کہیں کوئی گاڑی نظر نہیں آئی یقیناً گاڑیاں کسی جگہ رکھی جاتی تھیں جہاں ہر ایک کی ان تک رسائی نہیں تھی۔ پیلس کی چار دیواری کم سے کم بارہ فٹ بلند تھی اور اس پر مزید چار سے پانچ فٹ تک اینگل پر تین قطاروں میں خاردار باڑ لگی تھی۔ دیوار کے آس پاس کوئی ایسا درخت یا چیز نہیں تھی جس کی مدد سے دیوار پر چڑھا جا سکتا۔ تمام عمارات احاطے کے تقریباً وسط میں تھیں۔ پھر پوری دیوار کھلی ہوئی اور دور سے بھی صاف نظر آتی تھی۔ یقیناً اس طرح سے کیمروں سے نگرانی آسان ہو جاتی تھی۔

میں جتنا پیلس دیکھ رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں حفاظت اور نگرانی کا نہایت جدید اور فول پروف نظام کام کر رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ تمام سسٹم مکمل طور پر پوشیدہ تھا اور یہ اندازہ لگانا نہایت دشوار تھا کہ حفاظتی نظام کیا ہے اور کہاں کہاں تھا؟ اس صورت میں فرار کی کوئی کوشش بہت مشکل سے ہی کامیاب ہو سکتی تھی۔ لازمی بات ہے جب تک میں یہ نہیں جان لیتا کہ سسٹم کیا ہے اور اسے کس طرح بریک کرنا ہے میں یہاں سے کیسے نکل سکتا تھا؟ اب تک میں نے جتنا دیکھا تھا اس سے صاف لگ رہا تھا کہ یہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ میں اوشا کے تجسس کا شکر گزار تھا کہ اس کی وجہ سے مجھے پیلس کے حفاظتی نظام کو جانچنے کا موقع ملا تھا۔ اوشا نے ساڑھی کا پلو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''شہباز اندر چل نا مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

''حالانکہ تیرے اندر تو آگ بھری ہوئی ہے۔'' میں نے اسے چھیڑا۔ ''یاد ہے ایک وقت کتنی چھوٹی سی ساڑھی میں ایسے ہی رہتی تھی اور زمین پر چٹائی پر سوتی تھی۔''

''ہاں رے پر اب عادت نہیں رہی ہے۔ اب تو کسی سخت جگہ بیٹھ جاؤں تو شریر دکھنے لگتا ہے۔ میں پہلی جیسی نہیں رہی ہوں رے۔'' اس نے چلتے ہوئے میرا بازو تھام کر اس سے سر ٹکا دیا۔ ''تیری جدائی نے مجھے بہت کمزور کر دیا ہے رے۔''

''تو جانتی ہے میں دھوپ سائے کی طرح ہوں ابھی ہوں اور اب نہیں۔''

''میں بتا رہی ہوں اب تو جدا ہوا تو میں جیتی نہیں رہوں گی رے۔''

میں نے ملائمت سے کہا۔ ''اوشا خود کو سنبھالو تم جانتی ہو میں دوسری دنیا کا آدمی ہوں میں یہاں تیرے ساتھ نہیں

رو سکتا۔"

"میں جانتی ہوں رے، خود کو سمجھاتی ہوں مگر یہ من ہے نا۔" اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "مانتا نہیں ہے تیرے لیے مچلتا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر ڈیوڈ شا کو سنائیں کہ اس نے اوشا کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ صرف اپنے مقصد کے لیے اس نے اوشا کو اس کی پناہ گاہ سے نکالا تھا۔ مگر یہ بھی کم تھا ورنہ وہ تو انسانوں کو ٹشو پیپر سمجھنے والا شخص تھا۔ اوشا نے میرا بازو ہلایا۔ "کیا سوچ رہا ہے رے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"شہباز تو مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا؟" اس نے اُمید سے پوچھا۔ "بے شک داسی بنا کر رکھ لینا تیری اور تیری عورت کی خدمت کروں گی۔"

"ایسا مت کہو میں نے کبھی کسی انسان کو اپنا ملازم نہیں سمجھا۔ میں تم سے وعدہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں کہ ساتھ رکھوں گا۔ شاید اللہ کوئی ایسا راستہ نکال دے کہ میں تمہیں ساتھ رکھ سکوں۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر ہنس دی۔ "میں پاگل ہوں تجھے پریشان کر دیا۔"

وہ کہتے ہی پلٹ کر تیز قدموں سے عمارت کی طرف بڑھ گئی اور میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں اوپر والے نے میرے مقدر میں یہ کیوں لکھا تھا؟ وہ جانتا تھا کہ میں اتنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوں۔ مگر اس نے جب مقدر میں لکھا تھا تو وہی اس کا کوئی حل بھی نکالتا۔ اوشا میری مجبوری سمجھتی تھی مگر اس کا دل نہیں سمجھتا تھا۔ میں سوچ میں گم تھا کہ پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا میں نے دیکھا وہ خادم تھا جو یوں مجھے گم صم پا کر کسی قدر تشویش زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے چونکتے پا کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا اور میں بھی بوجھل قدموں سے اندر آیا۔ خادم نے برابر والا کمرا کھول دیا تھا۔ مگر میں اپنے یعنی اوشا کے کمرے میں آیا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھی اور اس کا لرزتا بدن بتا رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ مجھے اس طرح روتی خواتین کو منانے کا اور انہیں چپ کرانے کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اور میں جوانی کے شہد سے بھرے اس چھتے کو چھیڑتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس لیے خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ خود اٹھ گئی اور واش روم کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا چہرہ صاف تھا مگر آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر زبردستی مسکرائی تو میں نے بھی باچھیں پھیلا دی تھیں۔ موبائل پر کئی میسجز آئے ہوئے تھے یہ ایمن اور وسیم کی جانب سے تھے۔ میں ان کے جواب دینے لگا۔ وسیم نے کسی آدمی سے بات کی تھی۔ اس کے پاس یورپی پاسپورٹس تھے اور ان کی مدد سے وہ بھارت آسکتے تھے۔ مگر میں نے منع کر دیا کہ اس میں رسک بہت زیادہ تھا۔ ایمن نے بتایا تھا کہ وہ وکرو نامی شہر میں ہے جو آسام میں ہمالیائی ریاست اروناچل پردیش کے پاس تھی یہ جگہ چین اور برما کی سرحدوں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں جس پیلس میں تھا وہ اسی ریاست میں ذرا اوپر پہاڑوں کے ساتھ تھا اور اس سے آگے ہمالیہ کا وہ حصہ تھا جس میں وادی تھی۔ ڈیوڈ شا کو یہیں سے جانا تھا اس لیے وہ یہاں موجود تھا۔ پُراسرار وادی اس جگہ سے سو کلومیٹرز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

یہ جگہ بھارت کے دور دراز خطوں میں شمار ہوتی ہے اور یہاں آبادی زیادہ نہیں ہے۔ مگر یہاں بھارتی فوج ایجنسیوں کی موجودگی بہت زیادہ ہے کیونکہ چین اور تبت یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اروناچل پردیش کی ریاست پر چین کا دعویٰ ہے کہ یہ اصل میں تبت کا حصہ ہے اور اس پر انگریزوں نے غیر قانونی قبضہ کر کے اسے برصغیر کا حصہ بنا دیا تھا۔ یہ انگریز کی اسی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا بنیادی حصہ ہے جس کا مقصد اپنے مقبوضات کو اس طرح چھوڑ کر جانا تھا کہ وہاں کبھی پائیدار امن قائم نہ ہو سکے۔ انہوں نے برصغیر اور عرب خطے سمیت دنیا کے کئی حصوں میں یہی گندہ کھیل کھیلا اور آج بھی یہ خطے بد امنی کا شکار ہیں۔ ملکوں اور قوموں کے درمیان تصادم نے کروڑوں انسانوں کی زندگی کا چراغ گل کیا اور اربوں انسانوں کو مستقل خطرے میں ڈال ہوا تھا۔ اروناچل پردیش میں بھی ان دونوں طاقتور ملکوں کے درمیان مفادات کی کشمکش جاری تھی۔ اگرچہ یہ تصادم ابھی سرد ہے لیکن آنے والے وقتوں میں گرم بھی ہو سکتا ہے۔

"شہباز تو دکھی نہ ہو جو میرا بھاگیہ۔" اوشا نے کہا تو میں سوچوں سے چونکا اور پھر شرمندہ ہو گیا میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا اور وہ سمجھی کہ میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔

"بھوک لگی ہے؟" میں نے پوچھا تو اس نے نفی میں جواب دیا۔

''ابھی کھانے کو من نہیں کر رہا۔''

''ٹھیک ہے کچھ دیر بعد منگوا لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ ''شہباز اب میں سوچ رہی ہوں کہ اس گورے نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ میرا بھلا کیا کام ہے۔''

''یہی میں سمجھنے سے قاصر ہوں آخر وہ تمہیں کیوں لے جانا چاہتا ہے اس سفر پر جب کہ وہ گنے چنے افراد لے کر جا رہا ہے اگر اس کا مقصد تمہاری مدد سے مجھے قابو میں رکھنا ہے تو اس کے لیے تمہیں پیچھے رکھا جا سکتا ہے۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے رے۔'' وہ بولی۔ ''پر مجھے اچھا لگے گا کہ میں تیرے ساتھ رہوں۔''

''اوشا میں نے بھی وہ علاقہ خود نہیں دیکھا ہے مگر ایک جانے والے سے سنا ہے وہاں زندگی مشکل اور موت آسان ہے۔''

''تیرے سنگ تو موت بھی قبول ہے۔'' وہ والہانہ انداز میں بولی تو میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا کہ میرا کیا قصور ہے؟ اس کی بجائے میں نے پوچھا۔

''پھر بھی میں تمہیں اس سفر پر ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔''

اوشا نے تعجب سے مجھے دیکھا۔ ''تو تو ایسے کہہ رہا ہے جیسے جائے گا۔''

''ہاں میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اب مجھے اس سفر پر جانا ہی ہوگا اور میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھیوں کو میری وجہ سے مشکل ہو۔ ان میں تو بھی شامل ہے۔''

''پر وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''

''میں اس سے بات کروں گا۔'' میں نے کہا۔

جب خادم رات کے کھانے کا پوچھنے آیا تو میں نے اس سے ڈیوڈ شا کا پوچھا۔ حسب توقع اس نے لاعلمی ظاہر کی کہ وہ ڈیوڈ شا کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تب تم کرنل جیمو تک میرا پیغام پہنچا دو کہ میں ڈیوڈ شا سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔''

''میں کہہ دیتا ہوں سرکار۔''

ابھی ہم ڈنر سے فارغ ہوئے تھے کہ کرنل جیمو آ گیا۔ وہ مہمان خانے کی نشست گاہ میں میرا منتظر تھا۔ رسمی باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''میں ڈیوڈ شا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں میری موبائل یا فون پر بات کرا دو۔''

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''ایسی ایمرجنسی بھی کیا ہے؟''

''میں اس لڑکی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا بات کرنا چاہتے ہو؟''

''کیا اسے لے جانا ضروری ہے؟''

''یہ تو ڈیوڈ شا ہی بتا سکتا ہے۔''

''اسی لیے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''اوکے میں ٹرائی کرتا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا اس نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ وہ کس طرح ڈیوڈ شا سے میری بات کرائے گا۔ اس کے جانے کے بعد میں واپس اوشا کے پاس آیا۔

''تم اسی کمرے میں رہو گی۔'' میں نے کہا۔

وہ بے قرار ہو کر میرے پاس آ گئی۔ ''اور تو؟''

''میں برابر والے کمرے میں ہوں۔''

''تو یہاں رہ لے۔''

''یہ مناسب نہیں ہے۔'' میں نے نرمی سے سمجھایا۔ ''میں اس مزاج کا نہیں مگر ہوں تو مرد اگر بہک گیا تو اپنی نظروں میں گرنے سے پہلے مر جاؤں گا اور تو یہ کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

وہ لرز گئی۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے رے۔''

''میں زیادہ دور نہیں ہوں ایک لمحے میں تمہارے پاس آ سکتا ہوں اگر تمہیں خوف ہو تو دروازہ اندر سے بند کر لینا۔''

''میں بند کر لوں گی۔''

''اگر خطرہ محسوس ہو تو مجھے آواز دینا اور جب تک میں نہ کہوں دروازہ مت کھولنا۔''

اس نے سر ہلایا تو میں باہر آ گیا اور دوسرے کمرے میں آیا۔ یہ تقریباً ویسا ہی کمرا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ کارنر نہیں تھا اور اس میں صرف ایک طرف کھڑکی تھی۔ مجھے ایمن اور وسیم سے بات کرنی تھی۔ مگر مجھے شبہ تھا کہ شاید یہاں مائیک کے ساتھ کیمرا بھی نہ لگا ہو اس لیے میں نے ہلکا

کمبل سر تک اوڑھ لیا اور اس کے اندر موبائل نکالا۔ مجھے ہنسی آئی آج کل کے ٹین ایج نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جیسے گھر والوں سے چھپ کر موبائل استعمال کرتے ہیں میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا مگر گھر والوں سے نہیں بلکہ دشمنوں سے چھپ کر۔ اس بار بھی کئی ایس ایم ایس آئے ہوئے تھے۔ ایمن نے مجھے خبردار کیا تھا کہ آنے والے چوبیس گھنٹے میں ڈیوڈ شا کسی لمحے بھی سفر پر روانہ ہو جائے گا اور ظاہر ہے میں اس کے ساتھ ہوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے اس صورت حال میں کیا مدد دے سکتی ہے۔ ایمن نے جواب دیا۔ ''اگر میں فوری طور پر کچھ نہ کر سکی تو میں تمہارے پیچھے آؤں گی۔''

''اس خطرے میں؟''

''ہاں شہباز میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

''لیکن میں تمہیں اس خطرے میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''بالکل اسی طرح میں تمہیں یوں خطرے میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔''

میں سمجھ رہا تھا اس کی جگہ کوئی اور میڈیا پرسن ہوتا تو اس جگہ کا سن کر ہی پاگل ہو جاتا اور اسے دریافت کر کے اور دنیا کے سامنے پیش کرنے کے خواب دیکھنے لگتا۔ مگر ایمن ان لوگوں میں سے تھی جو تیز رفتار ترقی پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی خوابوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ وہ صرف میرے لیے فکرمند تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کچھ اندازہ ہے کہ ڈیوڈ شا سفر کے لیے کیا طریقہ اختیار کرے گا؟''

''میری معلومات کے مطابق وہ ابتدائی سفر ہیلی کاپٹر میں کرے گا اور جہاں تک ممکن ہوا اسی سے رسائی حاصل کی جائے گی۔ ایک ائر فیلڈ پر دو عدد بڑے ہیلی کاپٹر اس مقصد کے لیے تیار کھڑے ہیں۔''

''جب تم اتنا جانتی ہو تو یہ بھی معلوم کراؤ کہ اس کی روانگی کس وقت ہے؟''

''میرا ساتھی ان ہیلی کاپٹرز کے پائلٹس تک رسائی کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کام یوں بھی آسان ہو گیا ہے کہ میں خود اپنے لیے ایک ہیلی کاپٹر بک کرا رہی ہوں۔''

''پیچھے آنے کے لیے؟''

''بالکل ورنہ ان پہاڑوں پر دس منٹ کا فضائی سفر دو دن کا ہو جاتا ہے۔''

''ایمن میں تمہیں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم پیچھے آنے سے گریز کرنا میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم یا کوئی بھی مشکل میں پڑے۔''

''میں نے کہا نا میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس نے جواب دیا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے کمبل سے سر نکال کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''سرکار۔'' باہر سے خادم کی آواز آئی۔

''آجاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ اندر آیا اور ادب سے بولا۔

''آپ کو کرنل صاحب نے یاد کیا ہے۔''

''تم چلو میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس کے جانے کے بعد موبائل اپنی جیب میں رکھ کر باہر آیا۔ کرنل نشست گاہ میں موجود تھا اور کسی قدر فکرمند لگ رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے اشارہ دیا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تم نے بلایا ہے۔''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''میری ڈیوڈ شا سے بات ہوئی ہے اس نے کہا ہے کہ لڑکی بہر صورت جائے گی۔ اسے پیچھے نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔''

''اس صورت میں وہ مجھ سے تعاون کی توقع نہ رکھے۔''

''وہ تم سے ایسی کوئی توقع رکھ بھی نہیں رہا ہے۔'' کرنل کا لہجہ روکھا تھا۔ ''پیلس کا ایک ملازم اس عمارت میں آیا تھا کیا اس نے تم سے ملاقات کی یا تمہیں کچھ کہا ہے۔''

میں چونکا۔ ''کون ملازم؟...... یہی جو یہاں......''

''یہ نہیں۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ''میں اس کی بات کر رہا ہوں۔''

اس نے کہتے ہوئے اپنا ٹیب میری طرف کیا اور اس کی اسکرین پر اسی ملازم کی تصویر تھی جس نے مجھ تک موبائل پہنچایا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ مجھ سے نہیں ملا اور نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔''

''یہ چند گھنٹے پہلے یہاں آیا تھا جب کہ دوسرے ملازمین کو یہاں آنے سے منع کیا گیا ہے۔''

''تم اس سے ہی پوچھو کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

''ہم پوچھ رہے ہیں۔'' کرنل کھڑا ہو گیا۔ ''میں بتا

وہ شاید صبح ہماری روانگی ہے اس لیے تم رات کو ٹھیک سے نیند پوری کرلو، آگے آرام کا موقع بہت کم ملے گا۔"

کرنل کے انداز اور اس کے جواب سے واضح تھا کہ ڈیوڈ شا اب مجھے راضی کرکے لے جانے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتا تھا۔ میں اس کے قبضے میں تھا اور شاید مجھے قابو میں رکھنے کے لیے اس نے اوشا کو ساتھ رکھا تھا۔ یہ بات خطرے کی گھنٹی سے کم نہیں تھی کہ ان لوگوں نے نیپالی نقوش والے کی یہاں آمد جان لی تھی اور اب وہ اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ لازمی بات ہے وہ اس پر تشدد کا حربہ آزماتے اور اس صورت میں وہ زیادہ دیر اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتا تھا۔ کرنل کے جاتے ہی میں اپنے کمرے کی طرف لپکا اور دروازہ اندر سے بند کرکے غسل میں گھس کر موبائل نکالا اور تیزی سے اس پر ایمن کے لیے مسیج لکھا۔ "پول کھلنے والا ہے تم نے جس شخص کو بھیجا تھا وہ جلد حقیقت اگل دے گا اور اس کے بعد وہ مجھ سے موبائل حاصل کرلیں گے۔ اگر وہ شخص تمہارے بارے میں جانتا ہے تو پہلی فرصت میں جگہ بدل دو اور میں یہ موبائل ضائع کرنے والا ہوں۔ کل صبح روانگی ہے۔"

اسی لمحے دروازے پر تیز دستک ہوئی اور میں نے اگلا مسیج وسیم کے لیے لکھا۔ "بھانڈا پھوٹ گیا ہے میں موبائل ضائع کر رہا ہوں۔ اب رابطہ نہیں کرسکوں گا۔ کل صبح روانگی ہے۔ پھر ملیں گے اگر اللہ نے ملایا تو۔"

دروازے پر دستک تیز ہوتی جا رہی تھی میں اس طرف توجہ دیے بغیر واش روم میں آیا اور موبائل فرش پر ڈال کر اسے فلش ٹینک کے ڈھکن سے ضرب لگا کر توڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی سم نکالی اور اسے انگلیوں سے دبا کر دو ٹکڑے کیا اور آخر میں اس سارے ملبے کو کموڈ میں ڈال کر فلیش ٹینک چلا دیا۔ باہر دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دوبارہ فلیش ٹینک چلا کر میں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ سب بہہ کر آگے چلا جائے۔ پھر میں ہاتھ گیلے کرکے باہر آیا اور اسی لمحے ایک دھماکے سے دروازہ کھلا۔ سامنے باسو کھڑا تھا۔ یہ اسی کی جناتی قوت نے یہ مضبوط دروازہ توڑ دیا ورنہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اصل میں صرف کنڈی ٹوٹی تھی اور یہ بھی خاصی مضبوط قسم کی تھی۔ باسو اندر آیا اور اس نے اجنبی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں مسکرایا۔ "کیا حال ہیں تمہارے...... پھر دیکھ کر خوشی ہوئی مگر تم نے میرا واش روم میں بیٹھنا حرام کردیا تھا۔"

باسو کے پیچھے کرنل تھا اور اس نے اندر آتے ہی چاروں طرف دیکھا اور مجھ سے پوچھا۔ "تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے؟"

"میں واش روم میں تھا۔"

کرنل کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ "یہاں کیمرے لگے ہیں۔"

"لگے ہوں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"جلد حقیقت سامنے آجائے گی۔ موبائل کیا کیا ہے تم نے؟"

"فلیش میں بہا دیا۔" میں نے اس بار حقیقت بیان کردی۔ "اس کے ٹکڑے مل سکتے ہیں۔"

کرنل کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ "تم نے کس سے رابطہ کیا؟"

"اگلوا سکتے ہو تو اگلوا لو۔ ویسے میں نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔" میں نے ڈھٹائی سے کام لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ پر تشدد نہیں کر سکتے تھے۔ کرنل کا چہرہ سرخ تھا مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"شہباز تم اپنے لیے مشکل پیدا کر رہے ہو۔"

"میں اس کا عادی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے قید بھی آسان نہیں ہوتی ہے۔"

"اتنا یاد رکھنا ڈیوڈ شا کی تحویل سے باہر تم انڈیا میں انتہائی غیر محفوظ ہوگے اور ایک بار تم انڈیا کی کسی ایجنسی کے ہاتھ آگئے تو تمہاری گلو خلاصی ممکن نہیں ہوگی۔" کرنل کے انداز میں واضح دھمکی تھی۔

باسو تنا کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ توڑنے کے بعد اس نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا تھا۔ اس نے حسب معمول بڑی سی نیکر اور اوپر بنیان پہنی ہوئی تھی۔ کرنل کچھ دیر اپنے ہونٹ کاٹتا رہا پھر اس نے باسو کو حکم دیا۔ "اسے چار نمبر میں لے جا کر بند کردو۔"

باسو نے میرا بازو پکڑا اور بولا۔ "چلو۔"

سرتابی کی مجال نہیں تھی باسو کی جناتی گرفت اور قوت کے مقابلے میں میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ کھنچا چلا گیا۔ راہداری میں اوشا میری ہدایت کے برخلاف دروازہ کھول کر باہر جھانک رہی تھی مجھے باسو کی گرفت میں دیکھ کر وہ بے تابی سے باہر نکل آئی۔ اس کے باہر آتے ہی کرنل نے چوکنا ہوکر پستول نکال لیا۔ مگر وہ اسے نظرانداز کرکے میرے پاس آئی۔ "شہباز تجھے کہاں لے جا

رہے ہیں؟"

"نہیں ایک اور جگہ۔" میں نے کہا۔ "تو اندر جا۔"

اوشا نے خطرناک نظروں سے باسو کی طرف دیکھا اور ایسا لگا جیسے وہ اسے کاٹنے کا سوچ رہی ہو۔ اس کی آنکھیں اس وقت کسی ناگن کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "اوشا اندر جا یہ میرا حکم ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر سر ہلاتی ہوئی پیچھے ہٹی اور کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور کرنل کی طرف دیکھا۔ "تم اسے خود ہینڈل نہیں کر سکو گے۔ یہ خطرناک ہوئی تو مرنے مارنے پر تل جائے گی۔"

"فکر مت کرو۔" اس نے پستول رکھ لیا۔ ہم عمارت سے باہر آئے۔ ایمن نے یہاں کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ اسی وجہ سے نیپالی نقوش والا پکڑا گیا۔ اب مجھے ایمن کی فکر تھی کہ وہ ڈیوڈ شا کی دست رس سے دور رہے۔ وہ اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا کیونکہ وہ اس کے لیے بیکار تھی۔ ڈیوڈ شا ذرا بھی احساس کیے بغیر اسے مروا سکتا تھا۔ ایک چھوٹی عمارت جو پول اور جم کی عمارت کے پاس تھی مجھے وہاں ایک سادہ سیل نما کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اس کا دروازہ فولادی تھا اور ایک طرف چھوٹا سا روشن دان تھا۔ ایک سادہ بستر تھا اور ایک طرف کموڈ اور واش بیسن لگا ہوا تھا۔ گویا یہ ایک مکمل سیل تھا جہاں کسی کو قید رکھا جا سکتا تھا۔ کرنل ساتھ تھا اور دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے کہا۔ "شہباز آرام کرو اور بھول جاؤ کہ یہاں کوئی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

"تم بھی بھول جاؤ کہ میں بے یار و مددگار ہوں۔ جلد تم دیکھ لو گے۔" میں نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا تھا پھر دروازہ بند کر کے باہر سے لاک کر دیا۔ چھت پر ایک چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ اس کا سوئچ یہاں نہیں تھا اس لیے میں اسے اپنی مرضی سے آن آف نہیں کر سکتا تھا۔ دروازے کے اوپری حصے میں چند انچ کا حصہ جالی پر مشتمل تھا میں نے اس سے باہر جھانکا اور پھر آ کر بستر پر دراز ہو گیا۔ حالات ایک بار پھر بدل گئے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میرا اپنوں سے رابطہ ہوا تھا اور اب میں دوبارہ مکمل طور پر ڈیوڈ شا کے قبضے میں تھا۔ اگر ایمن نے نیپالی نقوش والے شخص پر اعتبار کیا تھا تو یہ اس کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے بہتر ہوتا کہ وہ اب اس معاملے سے دور رہے۔ ڈیوڈ شا جیسے لوگوں سے نمٹنا اس کے بس سے باہر تھا۔

بالآخر حالات اسی طرف جا رہے تھے جس طرف میں لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ یعنی پُراسرار وادی کی طرف اور میں مجبور تھا۔ بستر پر دراز ہونے کے باوجود آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور دماغ آنے والے حالات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا وادی تک رسائی کے بعد میرے اور اوشا کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ بظاہر ہم اس کے لیے بیکار ہو جائیں گے اور وہ بیکار چیزیں رکھنے والے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ وہ پہلی فرصت میں ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ باسو کی یہاں موجودگی چونکانے والی تھی مگر میرے ذہن میں کہیں تھا کہ ڈیوڈ شا اسے اس مہم میں استعمال کرے گا اور اسی لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ باسو کا رویہ میرے ساتھ سخت نہیں تھا اور وہ غرا کر بات نہیں کر رہا تھا جیسا کہ وہ عام طور سے کرتا تھا۔ اسی طرح اس نے میرا بازو تھامتے ہوئے گرفت بھی بہت مضبوط نہیں رکھی تھی مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ میں اس انسان نما حیوان کے اندر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب رہا تھا مگر میرے لیے اس کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔

ان ہی خیالوں میں نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور پھر آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا میں نے اٹھ کر وضو کیا اور بستر کی چادر نیچے بچھا کر نماز پڑھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ شاید میری آخری نماز ہے اور میرے لیے آخری موقع ہے کہ میں اللہ کے حضور سر جھکا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ لوں۔ شاید اسی وجہ سے میں نے بہت دل سے نماز پڑھی اور دعا کی کہ اگر میری زندگی ہے تو مجھے میرے پیاروں سے ملائے اور اگر میری زندگی کا آخری وقت آگیا تھا تو اللہ مجھے ایمان کی سلامتی کے ساتھ اٹھائے۔ نماز پڑھ کر میں ٹہلتا رہا اور تھوڑی بہت ورزش بھی کی لیکن میرا دل نہیں لگ رہا تھا۔ باہر سورج نکل آیا تھا اور کچھ دیر میں خاصی تیز روشنی ہو گئی تھی۔ دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ آنے والا باسو تھا اس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس نے وہ نیچے فرش پر رکھ دی اور بولا۔ "تمہارے پاس آدھا گھنٹا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ وہ چلا جائے گا مگر اس کی بجائے اس نے باہر سے ایک درمیانے سائز کا بیگ پیک اٹھا کر اندر رکھا۔ "اس میں سب کچھ ہے تیار ہو جاؤ۔"

وہ چلا گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے پہلے ناشتے سے انصاف کیا۔ یہ دلیہ، شہد اور دودھ پر مشتمل تھا۔ ایک بیک مگ میں چائے بھی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آگے سفر میں اسی قسم کے ناشتے سے واسطہ پڑے گا اس لیے آج سے اس کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے بیگ کھولا تو اس میں سے ایک عدد بہت گرم والا سوٹ نکلا تھا۔ یہ بہت موٹے اور گرم ترین میٹریل سے بنی پتلون اور جیکٹ تھی۔ اس کے ساتھ اندر پہننے والی گرم جرسی، گرم پاجامے اور موزے تھے۔ ایک عدد بہت اعلیٰ درجے اور خاص میٹریل سے بنے ہوئے جوتوں کا سیٹ تھا۔ ان کے علاوہ بھی کچھ چیزیں تھیں مگر فوری استعمال کی چیزیں یہی ہو سکتی تھیں۔ میں نے اپنے کپڑے اتار کر پہلے گرم پاجامہ اور جرسی پہنی۔ یہ جسم سے بالکل چپک جانے والی ہائی نیک جرسی تھی۔ اس کے اوپر میں نے پتلون پہن لی مگر اس موسم میں جیکٹ پہننے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ میں نے بیگ میں رکھ لی اور ساتھ ہی اپنے اتارے کپڑے بھی رکھ لیے۔ میرے پیروں میں سلیپرز تھے جو اس سفر میں بیکار ہوتے مگر میں نے وہ بھی رکھ لیے۔ جوتے پہن کر میں بالکل تیار تھا۔ اب مجھے انتظار تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہوا میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا اور پھر ہیلی کاپٹر کی آواز واضح ہونے لگی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا ہم سفر کا آغاز ہیلی کاپٹر سے کرتے اور جہاں ہیلی کاپٹر پارٹی کو ڈراپ کرتے وہاں سے پیدل سفر کا آغاز ہوتا۔ مگر یہ ایک ہیلی کاپٹر تھا جب کہ ایمن نے دو کے بارے میں بتایا تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور باسو نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا میں اپنا بیگ اٹھا کر باہر آیا اور باسو کی رہنمائی اور نگرانی میں روانہ ہوا۔ ہیلی پیڈ پیلس کے نچلے حصے میں ایک کھلی جگہ تھا۔

باسو نے اس وقت پوری گرم پتلون اور اوپر میری طرح ہائی نیک جرسی پہنی ہوئی تھی اس کے پیروں میں اس کے سائز کے جوتے تھے۔ ہم ہیلی پیڈ پہنچے تو وہاں کرنل جیمز کے ساتھ اوشا بھی تھی اور اس کا حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ اوشا کو آج تک میں نے ساڑھیوں میں دیکھا تھا اور اکثر اوقات وہ بہت مختصر سے لباس میں ہوتی تھی جس میں جسم کا بیشتر حصہ جھلک رہا ہوتا تھا مگر اس وقت وہ سر سے پاؤں تک لباس میں پوشیدہ تھی۔ اس نے جیکٹ بھی پہن لی تھی۔ مگر اس کا ہڈ ابھی سر پر نہیں تھا۔ یہ سارا لباس بھاری ہونے کے باوجود اس کی جسامت خاصی چھریری سی لگ رہی تھی۔ میں ہنسا تو وہ جھینپ گئی۔ ''ہنس کیوں رہا ہے رے کیا اچھی نہیں لگ رہی۔''

''تم ہر لباس میں اچھی لگتی ہو لیکن میں نے کبھی تمہیں اتنا زیادہ پہنے اوڑھے نہیں دیکھا۔''

''مجھے گرمی لگ رہی ہے رے پر اس نے کہا کہ سب پہننا ہے۔'' اوشا نے باسو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''کچھ دیر بعد تمہیں اس میں بھی سردی لگ رہی ہو گی۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' کرنل جیمز نے کہا۔ ''آگے بہت سردی ہو گی۔ ابھی ہیلی کاپٹر جب بلند ہو گا تب ہی سردی لگے گی۔''

''بس ہم چار افراد جائیں گے۔ ڈیوڈ شا اور اس کی صاحبزادی کہاں ہیں؟''

''ڈیوڈ شا یہاں نہیں ہے زونیا ہمارے ساتھ جائے گی۔''

اسی لمحے زینی ایک طرف سے نمودار ہوئی۔ اس نے بھی گرم لباس پہنا ہوا تھا مگر جیکٹ نہیں تھی اور جرسی اس کے جسم پر یوں چپکی ہوئی تھی کہ ایک ایک انگ نمایاں تھا۔ یہ بالکل لاحول کا موقع تھا مگر میں عادی ہو گیا تھا۔ وہ مخصوص چال چلتی آئی اور اس نے مجھ سے اور کرنل سے ہاتھ ملایا۔ اوشا اور باسو کو نظر انداز کر دیا۔ اوشا اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس نے اپنا بیگ اتار کر باسو کو دیا جسے اس نے ہیلی کاپٹر کے سامان والے خانے میں ڈال دیا۔ وہ پیچھے ہٹی تو اوشا جلدی سے میرے پاس آ گئی۔ زینی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی تھی مگر اس نے سوائے ہیلو ہائے کے اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ گویا کل پانچ افراد تھے اور دو ہیلی کاپٹر کے پائلٹس تھے۔ ہم عقبی حصے میں سوار ہوئے۔ آمنے سامنے دو عدد بینچ نما نشستوں کے ساتھ عقب میں سامان رکھنے والا خانہ بھی تھا مگر اس میں سامان باہر سے رکھا اور نکالا جاتا تھا۔ جب ہم بیٹھنے لگے تو اوشا جلدی سے میرے ساتھ والی نشست پر آ گئی جیسے اسے خطرہ ہو کہ زینی نہ برابر میں آ جائے۔ زینی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ہم نے سیٹ بیلٹس باندھیں۔ ہیلی کاپٹر کے انجن اسٹارٹ ہوئے۔ یہ دو انجنوں والا بڑا ہیلی کاپٹر تھا۔ ہلکے سے دھچکے سے وہ ہوا میں بلند ہوا اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ پیلس سے اتنا اوپر

جا چکا تھا کہ سارا پیلس دکھائی دینے لگا۔

میں اپنی نشست پر اس طرح بیٹھا تھا کہ مجھے سامنے انسٹرومنٹ پینل صاف دکھائی دے رہا تھا اور آلٹی میٹر کے مطابق یہاں بلندی دو ہزار دو سو میٹرز تھی۔ تقریباً تین ہزار میٹرز کی بلندی پر آ کر ہیلی کاپٹر نے شمال مشرق کا رخ کیا اور اس کی رفتار تیز ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایمن نے دو ہیلی کاپٹرز کا ذکر کیا تھا اور یہ ایک تھا تو دوسرا ہیلی کاپٹر یقیناً ڈیوڈ شا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو لے جانے کے لیے کہیں موجود ہوگا۔ جیسے جیسے ہم آگے جا رہے تھے زمین پر برف کی سفیدی نمایاں ہو رہی تھی اور ہیلی کاپٹر کی بلندی بڑھتی جا رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم پانچ ہزار میٹرز کی بلندی پر تھے اور یہاں ہوائی دباؤ اتنا کم تھا کہ ہیلی کاپٹر ہموار پرواز سے قاصر تھا اور بلندی کی وجہ سے ہیلی کاپٹر کے پر ہوا کاٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس چکر میں پورا ہیلی کاپٹر لرز رہا تھا۔ اب نیچے مکمل سفید منظر تھا۔ ہم ٹنڈرا کے خطے میں داخل ہو گئے تھے جہاں سارے سال برف جمی رہتی ہے۔ اوشا میرے ساتھ بیٹھی تھی اور کسی بچے کی طرح جھک جھک کر باہر کے مناظر دیکھ رہی تھی اسی نے پہلے دوسرے ہیلی کاپٹر کو دیکھا اور پھر مجھے متوجہ کیا۔

''شہباز ادھر دیکھو۔''

میں نے تقریباً ایک کلومیٹر کی دوری پر اسی جیسے دوسرے ہیلی کاپٹر کو دیکھا جو اتر رہا تھا اور اس کے آس پاس برف کا طوفان سا آیا ہوا تھا۔ ہمارا ہیلی کاپٹر بھی اسی سمت بڑھ رہا تھا جب تک وہ وہاں پہنچا پہلا ہیلی کاپٹر لینڈ کر چکا تھا مگر اس کے پنکھے بدستور گھوم رہے تھے اور برف کا طوفان جاری تھا۔ اتنی بلندی پر انجن بند کرنے کا مطلب تھا کہ ہیلی کاپٹر یہیں رہ جاتا کیونکہ اس کا انجن پھر اسٹارٹ نہیں ہوتا۔ ہمارا ہیلی کاپٹر ذرا فاصلے پر اترا تھا اور کسی قدر مشکل سے اترا تھا کیونکہ تیز ہوا کے باعث وہ ڈول رہا تھا اور اس کے اسکیر ذرا دقت سے برف پر ٹکے تھے۔ ہیلی کاپٹر کے ٹکتے ہی ہاسو نے دروازہ کھولا اور سرد ترین ہوا کے ساتھ برف کے ذرات مع شور اندر گھس آئے تھے۔ میرے پیک میں ایک اسنو گلاس بھی تھا جو میں نے کچھ دیر پہلے گلے میں ڈال لیا تھا اور اترتے ہی آنکھوں پر لگا لیا تھا میری دیکھا دیکھی اوشا نے بھی یہ کام کیا تھا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھنے کے قابل رہے۔ یہاں ہوا بہت ہلکی تھی اور سانس لینے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ ٹھنڈ ایسی تھی کہ سب ہی کانپ اٹھے تھے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ممتاز ادیب اور معلم، وہ کنیاں کلاں، تحصیل نکودر، ضلع جالندھر میں میاں محمد مقبول کے ہاں پیدا ہوئے۔ ایم اے فارسی (1954ء) پنجاب یونیورسٹی سے درجۂ اوّل میں پاس کیا۔ اس دوران میں جرنلزم میں ڈپلوما بھی کیا۔ 1963ء میں پی ایچ ڈی کی سند لی۔ 1954ء میں اقبال اکیڈمی کراچی کے علامہ اقبال پر کل پاکستان انعامی مضامین کے مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ فیروز سنز کی اردو انسائیکلو پیڈیا کے دوسرے ایڈیشن میں فارسی زبان و ادب کے بارے میں نوٹس لکھے۔ ان کی منظر عام پر آنے والی کتابوں کے نام یہ ہیں: افقالیز، لائف اینڈ ورکس (1963ء)، بولان نامہ، بلوچستان میں فارسی شاعری، بلوچستان میں اردو، مقدمہ جوہر معظم دیوان، ناطق مکرانی، منتخبات از شعرائے فارسی گوئی، ارمغان کوثر، شعر فارسی در بلوچستان، سنگی کی کلیاں، گلمپسز آف پرشین پوئٹری، تذکرہ صوفیائے بلوچستان، کلیات محمد حسین براہوی، بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات، علامہ اقبال اور بلوچستان، جدوجہد آزادی میں بلوچستان کا کردار، اقبال شناسی اور بلوچستان کے کالج میگزین (جلد اوّل۔ دوم)، اقبال شناسی اور ادبائے بلوچستان کی تخلیقات (دو جلدیں)، مکاتیب یوسف عزیز مگسی، اقبالیات کے چند خوشے، بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ، قرارداد پاکستان صحافتی محاذ پر، سیرت پاک کی خوشبو، بلوچستان میں تحریک تصوف۔ 1968ء میں بلوچستان میں اردو پر رائٹرز گلڈ انعام ملا۔ وہ متعدد ادبی انجمنوں کے سرپرست بھی رہے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مرسلہ: احمد جاوید۔ کوئٹہ

باسو اور کرنل نیچے اتر گئے تھے۔ میں نے اوشا کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ پائلٹ چلا چلا کر سامان جلدی اتارنے کو کہہ رہے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ کسی خرابی کی وجہ سے انجن بند ہو گئے تو وہ اسی برف زار میں پھنسے رہ جائیں گے اور یہاں سے واپسی کا زمینی راستہ تین دن کا تھا۔ راستے میں مجھے جو گلیشیر اور پہاڑی سلسلے نظر آئے انہیں سر کرنا آسان نہیں تھا۔ باسو اور کرنل ہیلی کاپٹر کے عقبی حصے سے سامان نکال رہے تھے اور اسے اٹھا کر ہیلی کاپٹر سے دور لے جا رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی اور دوسرے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا جہاں ڈیوڈ شا ہمارے جیسے لباس میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور تھے جو سامان اتار کر ہیلی کاپٹر سے دور لے جا رہے تھے۔ سارا سامان بڑے سائز کے بیگز میں پیک تھا اور اسے پشت پر لاد کر سفر کرنا تھا۔ میرے پاس آتے ہی ڈیوڈ شا چوکنا ہو گیا اور اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی ایک جیب میں چلا گیا تھا۔ ہیلی کاپٹرز اور ہوا کا شور اتنا تھا کہ کسی قسم کی گفتگو خارج از امکان تھی۔

جو لباس پیلس میں ہمیں گرم لگ رہا تھا وہ یہاں آتے ہی جیسے ململ کا ہو گیا اور جنہوں نے جیکٹ نہیں پہنی تھی انہوں نے فوری جیکٹ پہن لی۔ مشکل سے پانچ منٹ میں سارا سامان اتار لیا گیا اور ہم بھی دور ہٹ گئے۔ ہیلی کاپٹر بلند ہوئے اور جس سمت سے آئے تھے اسی سمت پرواز کر گئے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ ناقابلِ شناخت باریک نقطوں میں بدل گئے اور پھر نظروں سے اوجھل گئے۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ ہم اس ویرانے میں رہ گئے تھے۔ تہذیب اور آبادی دنیا سے دور ایک ایسا ویرانہ جہاں تا حد نگاہ سوائے برف کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس احساس نے چند لمحے کے لیے مجھ سمیت سب کا دل سہما دیا تھا۔ اوشا میرے بازو سے چپک گئی تھی اور باقی سب اپنی اپنی جگہوں پر گم صم سے کھڑے تھے۔ پھر ڈیوڈ شا کی سرد آواز نے سب کو چونکا دیا۔ ''میرا خیال ہے اب ہمیں حرکت میں آ جانا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے اوشا کو ساتھ لا کر اچھا نہیں کیا ہے۔ یہ نازک عورت ہے اس سفر کی صعوبتیں کیسے برداشت کرے گی۔''

''کر لے گی۔'' ڈیوڈ شا نے سکون سے جواب دیا۔ ''تم اسے نہیں جانتے یہ بہت باہمت ہے جہاں دوسرے لڑکھڑا جائیں گے یہ وہاں بھی ثابت قدم رہے گی۔ تم بھول رہے ہو اس سفر میں زینی بھی ساتھ ہے اور وہ نازک عورت ہے۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ زینی سمیت شوق سے جہنم میں جائے لیکن اس کی بجائے میں نے کہا۔ ''ڈیوڈ شا یہ بہت مشکل مہم ہے اور اوشا کو پہاڑوں پر سفر کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

میری بات کا ڈیوڈ شا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ویسے بھی مزید بحث بیکار تھی کیونکہ اوشا یہاں آ چکی تھی۔ ڈیوڈ شا نے بھی مجھ سے کل ہونے والے واقعات پر کوئی بات نہیں کی کیونکہ اب ہم ان باتوں سے بہت دور آ چکے تھے۔ ہم کل آٹھ افراد تھے۔ ڈیوڈ شا کے دونوں ساتھی سفید فام اور تنومند تھے۔ سامان کے کل سات بڑے بیگز تھے۔ ان میں پانچ بڑے بیگ تھے اور دو چھوٹے تھے۔ چھوٹے بیگز میرے اور ڈیوڈ شا کے حصے میں آئے۔ دو بڑے بیگز باسو نے اپنی پشت پر لاد لیے جب کہ باقی تین بیگز، کرنل، اور دونوں سفید فاموں کے حصے میں آئے۔ اوشا کے پاس اپنے بیگ کے ساتھ میرا ایک بیگ بھی تھا جب کہ زینی نے اپنا بیگ خود اٹھایا ہوا تھا۔ سامان سے جوڑ کر بنائی جانے والی اسٹک نکالی گئیں۔ برف پر سفر کرنے کے لیے یہ لازمی تھیں۔ ان کے نچلے نوکیلے حصے میں ذرا اوپر ایک گول ڈسک لگی ہوئی تھی جو چھڑی کو برف میں دھنسنے سے بچانے کے لیے تھی۔ جیسی کہ برف پر پھسلنے والوں کی اسٹک میں لگی ہوتی ہیں۔ ڈیوڈ شا نے روانگی سے پہلے کہا۔

''اب ہم ایک ٹیم ہیں اور ہمارا ایک دوسرے سے واقف ہونا ضروری ہے۔ سب اپنا اپنا تعارف کرا دیں۔''

''میں مارک رائٹ ہوں۔'' ایک سفید فام نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ چھبیس ستائیس برس کا نوجوان تھا۔ ''میں پیشہ ور کوہ پیما ہوں۔''

''سین بائڈن۔'' دوسرے نے کہا۔ ''میں بھی کوہ پیما ہوں لیکن پیشہ ور نہیں۔ میں اس مہم کا آفیشل کک ہوں۔''

باقی سب کے بارے میں، میں جانتا تھا۔ اپنی باری آنے پر میں نے اپنا اور اوشا کا تعارف کرایا۔ باسو، سین اور مارک صرف انگریزی جانتے تھے باقی سب اردو یا ہندی سے واقف تھے۔ صرف اوشا انگریزی سے نابلد تھی۔ اوشا میرے ساتھ ہوتی اس لیے آپس میں گفتگو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر تعارف کے بعد ڈیوڈ شا نے اوشا کی طرف اشارہ

کیا۔" یہ باسو کے ساتھ رہے گی۔"

"یہ میرے ساتھ رہے گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔"ڈیوڈ شا تم ہمیں یہاں تک لے آئے ہو جہاں سے واپسی کا راستہ بہت مشکل ہے اور ہمیں تمہارا ہی ساتھ دینا ہے اس لیے سفر کو اپنے اور میرے لیے مشکل مت بناؤ۔"

ڈیوڈ شا کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔"اوکے اس صورت میں تم دونوں کے ساتھ باسو رہے گا۔"

میرا بھی یہی خیال تھا کہ باسو کو میری اور اوشا کی نگرانی کے لیے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس کا اضافی فائدہ اس کی طاقت تھی۔ وہ زیادہ سامان اٹھا سکتا تھا اور جہاں ضرورت پیش آتی اور جو کام دوسرے نہ کر پاتے وہ اپنی جناتی قوت سے کر جاتا۔ یہاں اترتے ہی سب نے گرم جیکٹس اور دستانے پہن لیے تھے اس کے باوجود سردی ایسی غضب کی تھی کہ اب تک ہمارے بدن لرز رہے تھے۔ ٹھنڈ ایسی تھی جیسے ہم بے لباس ہی اس برف زار میں نکل آئے ہوں۔ دن کا وقت تھا اور سورج نکلا ہوا تھا مگر درجۂ حرارت شاید منفی میں تھا۔ اور پھر شمال کی طرف سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ اوشا نے دستانوں میں ملفوف ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔"بہت سردی ہے رے۔"

"یہ تو آغاز ہے۔" میں نے خبردار کیا۔"آگے موسم اس سے بھی زیادہ خراب ملے گا۔"

مگر جب ہم نے چلنا شروع کیا تو جسم ذرا گرم ہوئے اور کپکپاہٹ میں کمی آئی تھی۔ ہم نے گروپ بنا لیے تھے اور آپس میں رسیوں سے منسلک تھے کیونکہ اس جگہ برف میں دراڑوں کی موجودگی عین ممکن تھی اور اگر کوئی کسی دراڑ میں گر جاتا تو رسی اسے بچا سکتی تھی۔ مزید احتیاط کے طور پر ہم ایک دوسرے سے کم سے کم دس فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اس وقت کمانڈر مارک تھا اور وہی فیصلہ کر رہا تھا کہ ہمیں کس راستے سے آگے جانا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل میپ تھا اور اس پر راستے کا تعین تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ہم تقریباً سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور یہاں سے ڈیتھ زون کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سردی، آکسیجن کی کمی اور معمولی سا حادثہ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ہمیں ممکنہ مشکلات اور ان سے بچنے کی تدابیر سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ ہم غور سے اس کی بات سن رہے تھے۔ سفر کا آغاز ہوا تو پتا چلا کہ عملی مشکلات کیا ہیں؟

میرا پیشہ ہی ٹورزم تھا اور میں سیاحوں اور ٹریکرز کے بے تعداد ٹرپس ترتیب دے چکا تھا اس لیے مجھے معلوم تھا کہ بلندی کی طرف جاتے ہوئے ٹریکرز یک دم زیادہ بلندی کی طرف جانے سے گریز کرتے ہیں اور وہ پہلے خود کو بلندی کا عادی بناتے ہیں اور اس کے لیے وہ اصل ٹریک سے ذرا کم بلند مقامات پر کچھ وقت گزارتے ہیں مگر یہاں ہم براہِ راست ہی سات ہزار فٹ سے سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر آ گئے تھے۔ ہمارے جسم اور پھیپھڑے اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے سب ہی دقت سے سانس لے رہے تھے۔ روانگی سے پہلے سین نے سب کو جوس کی صورت میں مخصوص منرلز اور ایسے سپلی منٹس دیئے تھے جو بلندی کا موسم سہارنے کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ شا نے غیر معمولی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا۔ پہلے دو دن بعد روانگی تھی اور اچانک ہی ڈیوڈ شا نے پلان بدلا تھا۔ شاید میرے پاس موبائل کی موجودگی اور اپنے ساتھیوں سے رابطے نے ڈیوڈ شا کو مجبور کیا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ کوئی مسئلہ ہو اور اس کا سفر پھر کھٹائی میں پڑ جائے۔

سفر بلندی کی طرف تھا اور ہم سر جھکائے اٹھتے قدموں سے چل رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں سب کے سانس پھول گئے اور اب بلا ضرورت بات نہیں کر رہے تھے۔ مارک نے بتا دیا تھا کہ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد دس منٹ کا وقفہ ہوگا اور اگر کوئی مسئلہ محسوس کر رہا ہے تو بتائے تاکہ اس کا حل نکالا جا سکے۔ اگر کوئی حادثے کا شکار ہو کر شدید یا ایسا زخمی ہو جائے جس میں وہ پارٹی کا ساتھ نہ دے سکے تو مجبوراً اسے یہیں چھوڑ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ پارٹی کسی ایک فرد واحد کے لیے نہیں رکے گی۔ یہ ڈو اور ڈائی کا کھیل تھا۔ اس میں کوئی تیسری راہ نہیں تھی۔ ایک گھنٹے بعد جب مارک نے رکنے کا اعلان کیا تو جو جہاں تھا وہیں بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اوشا کی حالت سب سے خراب ہوگی مگر وہ ٹھیک دکھائی دے رہی تھی اور اس کا سانس بھی ہموار تھا۔ میری سانس تیز تھی البتہ میں اتنی تھکن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ سب سے بری حالت ڈیوڈ شا کی تھی۔

ایک بار اس نے بتایا تھا کہ اسے دمے کا پرانا مرض تھا جو حکیم قادس نے علاج سے ٹھیک کیا تھا مگر دمے کا مریض ٹھیک ہو جائے تب بھی اس کے پھیپھڑے اس بلندی پر ٹھیک سے سانس لینے کے قابل نہیں رہتے ہیں مجھے حیرت تھی کہ وہ یہاں سانس کیسے لے رہا تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک

چھوٹی بوتل نکال کر نتھنوں سے لگاتے ہوئے اس کا اسپرے دبایا اور واپس رکھ لی۔ اسپرے کے بعد اس کی حالت کسی قدر بہتر نظر آنے لگی تھی۔ یہ شاید آکسیجن یا کسی دوا کا اسپرے تھا۔ دس منٹ کے وقفے کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے۔ سب کے پاس گھڑیاں تھیں جن میں وقت اور دوسری کئی چیزیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ میری گھڑی کے مطابق سوا گیارہ بج رہے تھے۔ اب تک ہم کسی قدر ہموار جگہ سفر کرتے آئے تھے مگر اب دشوار علاقہ شروع ہوا تھا۔ یہ کوئی گلیشیر تھا جس کے دونوں طرف اونچے پہاڑ تھے اور ہمیں اس کی نرم پڑتی برف پر سفر کرنا تھا۔ دن کی تیز دھوپ میں برف نرم پڑ جاتی ہے اور رات میں یہ جمتی ہے۔

اس پگھلنے اور جمنے کے عمل سے گلیشیر میں دراڑیں جنم لیتی ہیں اور اب ہمیں دراڑوں کے اوپر سفر کرنا تھا۔ اس لیے سب میں کوہ پیمائی کے اوزار تقسیم کر دیئے گئے۔ ان میں نوکدار کلہاڑیاں، کلپس اور اضافی رسے تھے۔ کسی حادثے کی صورت میں یہ چیزیں جان بچانے میں معاون ثابت ہوتیں۔ مارک نے ان کا استعمال بھی بتایا تھا۔ خاص طور سے اگر کوئی فرد کسی دراڑ میں گر جائے اور اس کے رسے سے منسلک افراد بھی کھنچ رہے ہوں تو وہ فوراً برف میں کلہاڑی گاڑ دیں۔ ورنہ کھنچنے والا فرد بھی دراڑ میں جا گرے گا۔ رسیاں بھی ایک حد تک تحفظ دے سکتی تھیں۔ گلیشیر پر سفر کے آغاز پر میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ ”باسو بہت وزنی ہے اور اس کی وجہ سے برف ٹوٹنے کا خطرہ بھی زیادہ ہے گویا یہ گرے گا اور ہمیں بھی لے جائے گا۔ ہم کسی صورت اس کا وزن نہیں سہار سکتے ہیں۔“

میرے اعتراض نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے باسو سب سے الگ سفر کرے گا۔“

اگرچہ یہ خود غرضی تھی مگر باسو حکم کا غلام تھا اگر اسے خودکشی کا حکم دیا جاتا تو وہ سوچے سمجھے بغیر اس پر عمل کرتا۔ ڈیوڈ شا کے حکم پر اس نے خود کو میری اور اوشا کی رسی سے الگ کر دیا۔ ڈیوڈ شا کے ساتھ کرنل رسی سے منسلک تھا جب کہ مارک، امیت اور سین ایک رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ مگر جب باسو ہم سے الگ ہوا تو ڈیوڈ شا نے کرنل کو حکم دیا اور وہ ہمارے ساتھ رسی سے منسلک ہو گیا۔ باسو کو مارک اور سین کے ساتھ رہنے کو کہا تاکہ وہ پہلے ممکنہ دراڑ کو بھانپ لیں۔ اب زیبی اور ڈیوڈ شا ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دوسری بار ہم پندرہ منٹ کے لیے رکے تو حالت زیادہ خراب تھی کیونکہ اب ہم تقریباً سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر آ گئے تھے۔ یہاں سردی زیادہ اور آکسیجن مزید کم تھی۔ ناکوں سے جیسے جان نکل گئی تھی اور ہم جو ہوا سینے میں بھرتے تھے اس سے برائے نام ہی آکسیجن مل رہی تھی۔ ہم تین سانس لیتے تو آکسیجن ملتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس سفر کے آغاز میں یہ حال ہے اس میں آگے جا کر کیا ہو گا۔ میں ڈیوڈ شا سے ذرا فاصلے پر جا بیٹھا جس کا چہرہ کسی قدر عنابی ہو رہا تھا اور وہ لرزتے ہاتھوں سے نتھنوں میں اسپرے لے رہا تھا۔ اسپرے لے کر وہ قدرے نارمل ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”ڈیوڈ شا تم نے خود کو اور سب کو کس مصیبت میں پھنسا لیا ہے۔“

”بڑے مقصد کے لیے تکلیفیں سہنا پڑتی ہیں۔“

”بھاڑ میں گیا تمہارا بڑا مقصد۔“ میں نے کسی قدر بھنا کر کہا۔ ”ہمارا کیا قصور ہے؟“

”تم لوگ مجبور ہو۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”اسی وجہ سے میرے ساتھ ہو۔“

”تمہیں معلوم ہے وادی یہاں سے کتنی دور ہے اور ہمیں کتنے دن لگ سکتے ہیں؟“

”اس بار ہم نے ممکنہ حد تک سفر فضا میں طے کیا ہے اور یہاں سے وادی صرف تین دن کی مسافت پر ہے۔ اگر ہم آسام کی فضائی اسٹرپ سے سفر کا آغاز کرتے تو یہاں تک آنے میں مزید چار دن اور لگ جاتے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم نے سفر کا ساٹھ فیصد حصہ کم کر لیا ہے۔“

”مگر تین دن بھی بہت ہوتے ہیں مجھے راجا عمر دراز نے بتایا ہے کہ راستے میں بائیس ہزار فٹ بلند پہاڑ بھی آتے ہیں۔“

”یہ درست ہے ان پہاڑوں کو سر کرنا لازمی ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم شام تک ان پہاڑوں تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں اپنی اور اوشا کی بات نہیں کرتا لیکن کیا تم پہاڑوں کو سر کر سکو گے؟“

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے تردد آیا مگر اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں اس کا تجربہ رکھتا ہوں۔“

یہ سارا دن ہم اسی گلیشیر پر سفر کرتے رہے تھے۔ بلند پہاڑ اس گلیشیر کے آخری سرے پر تھے۔ ہم شام تک ان کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ چھ بجے جب ہم نے پڑاؤ ڈالا تو

سب ابتر حالوں میں تھے۔ تھکن، سردی اور مختلف حصوں میں درد کی کیفیت تھی۔ دوپہر کا کھانا بس ایسے ہی کھایا تھا اس میں گوشت کے ابلے ٹکڑے اور آلو کے قتلے تھے۔ یہ سب ٹن بند خوراک تھی۔ کیونکہ گرم نہیں کیا گیا تھا اس لیے سب کو یخ بستہ کھانا پڑا تھا۔ ڈیوڈ شا نے میری وجہ سے خاص طور سے حلال گوشت کے ٹن لیے تھے۔ سین گگ کے فرائض انجام دیتا اور اس نے جھٹ پٹ کچن کا خیمہ لگایا اور اس میں اسٹوو آن کر لیا۔ اس کی گرمائش کے لیے سب ہی اس کے خیمے میں گھس آئے تھے۔ سفر میں پہلی بار حرارت ملی تھی اور سب اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سین نے سب سے پہلے ہمیں نوڈلز سوپ پیش کیا اس کی گرمائش نے ہمیں جیسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد چائے اور کافی سرو ہوئی۔ ساتھ میں خستہ ویفر بسکٹ تھے۔ اس کے بعد وہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

مارک نے کہا۔ ''کل ہمیں پہاڑوں کو سر کرنا ہے۔''

''کیا ہم کل کے دن میں سر کر سکتے ہیں؟'' ڈیوڈ شا نے پوچھا۔

''لازمی کرنے ہوں گے ورنہ اگر پہاڑوں پر رات گزارنی پڑ گئی تو سب کے لیے بہت مشکل ہو گا۔ میرا خیال ہے اکثر لوگ اس کے عادی نہیں ہیں۔ کوئی بیمار پڑ گیا تو اس کے لیے یہاں ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے ہمیں رسک نہیں لینا ہو گا۔'' مارک نے ہماری طرف دیکھا۔ ''مجھے تو حیرت ہے کہ تم لوگوں نے آج کا دن کیسے گزار لیا۔''

''کیونکہ ہم عام لوگ نہیں ہیں۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو ہم میں سے کوئی نہ تو بیمار پڑے گا اور نہ ہی ہماری رات پہاڑوں پر بسر ہو گی۔ ہم کل شام انہیں عبور کر چکے ہوں گے۔''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کل صبح سویرے روانہ ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم زیادہ لوگ ہیں اور سامان بھی زیادہ ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مارک نے تائید کی۔ ''ہمیں ذہن بنا لینا ہے کہ کل ہم ان دو پہاڑوں کے دوسری طرف ہوں گے۔''

باسو کی خیمے میں گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اور اسے کھانا پیالوں میں سپلائی کیا جا رہا تھا۔ کھا پی کر ذرا جان آئی تو سب کے خیمے لگائے جانے لگے۔ سب سے پہلے زینی اپنے خیمے میں گھسی تھی۔ اس کی حالت ٹھیک تھی مگر وہ اس سفر کے دوران میں چپ رہی تھی اور اس نے مجھ سے یا اوشا سے چھیڑ چھاڑ بھی نہیں کی تھی۔ درحقیقت اس سفر میں کسی کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی جو جسمانی طور پر ٹھیک تھے وہ ذہنی لحاظ سے پریشان تھے۔ یہ سب ہائی آلٹی ٹیوڈ اور بہت گرم میٹریل سے بنے ایسے خیمے تھے جن میں منفی تیس درجۂ حرارت میں بھی رات گزاری جا سکتی تھی۔ ان میں ہمارے سلیپنگ بیگز رکھے گئے تھے یہ بھی بہت گرم میٹریل سے بنے ہوئے تھے اس کے باوجود لگ رہا تھا کہ اس برف خانے میں ہماری پہلی رات ہرگز سکون سے نہیں گزرے گی۔ شام ہوتے ہی درجہ حرارت یک دم خاصا گر گیا تھا اور تھرمامیٹر کا پارہ منفی سات تک آ گیا تھا۔ رات میں اس میں مزید کمی کا پورا امکان تھا۔ خیمے لگا کر سب اپنے اپنے خیموں میں گھس گئے تھے سوائے اوشا کے جو میرے خیمے میں آ گئی تھی اور یہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ہم ذرا فاصلے پر ہو کر بیٹھ سکتے۔ وہ مجھ سے چپک کر بیٹھی تھی۔ مگر درمیان میں ہمارے اتنے موٹے لباس تھے کہ مجھے اس کے یوں پاس بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اوشا نے کہا۔

''شہباز یہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟''

اگرچہ میں اسے کسی قدر بتا چکا تھا کہ ڈیوڈ شا کی منزل کہاں ہے؟ مگر اب موقع ملا تو میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ ہم کہاں جا رہے تھے اور وہاں کیا کیا تھا۔ اگرچہ میں خود سنی سنائی باتیں بتا رہا تھا مگر یہ بھی اتنی حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھیں کہ اوشا کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔

''شہباز کیا سچ میں ایسی چیزیں ہیں؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے کیونکہ میں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ کوئی لڑکی اتنی زہریلی ہو کہ جسے کاٹ لے وہ منٹوں میں مر جائے۔''

''شہباز میرا من چاہتا ہے کہ تیرے سارے دشمنوں کو مار دوں۔'' اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''یہ تجھے کتنا تنگ کرتے ہیں۔''

''قسمت کی بات بھی ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مگر تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی۔ مجھے تیری زندگی اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ اپنی زندگی ہو سکتی ہے۔ پھر ہم یہاں عام حالات سے کٹ گئے ہیں یہاں سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔''

''بس یہی سوچ کر رہ جاتی ہوں کہ تجھے ٹھیک نہ لگے۔ مگر تو صرف ایک بار اشارہ کر دے تو.....''

''اوشا تو سوچ سکتی ہے کہ میں کبھی تجھے استعمال کروں گا؟'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اس قسم کا آدمی ہوتا تو کیا اتنے لوگ مجھ سے یوں بے لوث محبت کرتے؟''

اس نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے میں اور دوسرے تجھ سے اسی لیے تو محبت کرتے ہیں کہ تو دوسروں کو اپنے جیسا سمجھتا ہے۔''

باہر کی فضا کے مقابلے میں خیمے میں موسم بہت بہتر تھا اس لیے جب رات کے کھانے کے لیے بلایا گیا تو دل پر جبر کرکے باہر نکلنا پڑا تھا۔ کچن تک جاتے جاتے برا حال ہوگیا تھا۔ مگر وہاں کی گرم فضا اور گرما گرم کھانے میں مزہ آیا۔ سب ایک جگہ ہوکر بیٹھے تھے اس لیے جسموں کی گرمی سے بھی ماحول بہتر ہوا تھا۔ سین نے اگرچہ پہلے سے تیار کھانا ہی گرم کرکے پیش کیا تھا مگر وہ بھی مزے کا لگا۔ نو بجے ہم واپس اپنے خیموں میں جاچکے تھے۔ اوشا کا خیمہ میرے خیمے کے پاس تھا اور اس کے پاس ہی ڈیوڈ شا اور باسو کے خیمے تھے۔ دوسری چیزوں کی طرح باسو کا خیمہ بھی خاص تھا۔ یہ سائز میں بڑا تھا اور اس کا سلیپنگ بیگ بھی اس کی جسامت کے لحاظ سے تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسروں کے مقابلے میں اسے سردی نے اتنا متاثر نہیں کیا تھا اور وہ آرام سے تھا جب کہ ہم کانپتے تھے اور سردی سے بچنے کی کوشش کرتے تھے شاید اس کی قوت اور جسامت نے اسے سردی سے بھی محفوظ رکھا تھا۔ ڈیوڈ شا اور باسو کے ہمارے پاس رہنے کا مقصد ہماری نگرانی بھی تھا۔

حسب توقع رات بہت دیر سے نیند آئی کیونکہ سردی مزاج پوچھ رہی تھی۔ بہت گرم خیمہ اور سلیپنگ بیگ بھی سردی روکنے میں ناکام ثابت ہورہے تھے۔ جس وقت کچن سے نکل کر خیموں میں آئے تو موسم خطرناک ہو چلا تھا اور ہوا میں بہت تندی اور خنکی آگئی تھی۔ یہ ہوا اوپر پہاڑوں سے اتر رہی تھی اور کسی دریا کی طرح مسلسل بہہ رہی تھی۔ اس کے دباؤ سے خیمے کی دیوار دبتی تھی۔ اس کا شور کانوں میں چبھتا تھا۔ ہمارے خیمے گلیشیر کے اوپر تھے اور نیچے سے مسلسل چٹخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی کبھی ایسی آواز آتی جیسے پانی بہہ رہا ہو اور یہ ساری آوازیں حقیقی تھیں کیونکہ گلیشیر کے سرکنے سے اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔ دن میں جب دھوپ تیز ہو تو برف پگھل جاتی ہے اور گلیشیر کے اندر ندیاں رواں ہوجاتی ہیں رات میں یہ ندیاں جم جاتی ہیں مگر پورے طور پر نہیں بلکہ نیم پگھلی ہوئی حالت میں۔ اگلے دن گرمی سے یہ پھر پگھل کر رواں ہو جاتی ہیں۔ کئی بار ایسی آوازوں سے آنکھ کھلی اور میں دوبارہ سونے کی کوشش کرتا رہا۔ حقیقی نیند کا دورانیہ بہت کم رہا مگر جسم کو آرام مل گیا تھا۔ صبح کے قریب نیند آئی تھی کہ اٹھنے کا وقت ہو گیا۔

ڈیوڈ شا کا کہنا تھا کہ وادی یہاں سے اب صرف دو دن کی مسافت پر تھی اور جب ہم پہاڑ سر کر لیتے تو اس کے بعد ایک دن کا سفر اور تھا جس کے بعد ہم وادی کے کنارے تک پہنچ جاتے۔ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی سب اٹھ گئے تھے۔ یہاں منہ ہاتھ دھونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سب نے تھوڑے سے گرم پانی سے چھوٹے تولیے لگا کر منہ صاف کر لیے اور برش کرکے کلی کر لی۔ اس کے بعد ناشتا ہوا اور میرا اندازہ درست نکلا جب ناشتا گرم دلیے، ابلے انڈوں اور شہد پر مشتمل نکلا۔ یہ قوت بخش ناشتا تھا جو ہمیں یہاں توانائی بھی دیتا اور سردی کا مقابلہ کرنے کے قابل بناتا۔ جب تک سورج طلوع ہوا سامان پیک کیا جاچکا تھا۔ صبح کے وقت شمال سے نہایت سرد ہوا بہہ رہی تھی اور جسم کے کھلے حصوں پر یوں لگ رہی تھی جیسے بچھو ڈنک مار رہے ہوں۔ سامان باندھ کر ہم آگے روانہ ہوئے کیونکہ مارک پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ اگر ہم رات سے پہلے پہاڑوں کے دوسری طرف نہ پہنچے تو رات بہت خوفناک گزرے گی۔ یہاں سردی ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ ڈیوڈ شا، زیلی، مارک اور باسو ساتھ تھے۔ میں، اوشا، کرنل، اور سین دوسرے گروپ میں تھے۔ مگر ہمیں ایک ہی راستے سے اور پاس پاس رہتے ہوئے سفر کرنا تھا۔ گزشتہ شام تک ہم تقریباً پہاڑ کے پاس پہنچ گئے تھے اس لیے صبح جب آغاز کیا تو فوراً ہی کوہ پیمائی شروع ہوگئی تھی۔

اگر ہمالیہ سلسلے کے دوسرے پہاڑ دیکھے جائیں تو یہ دو چوٹیاں ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھیں۔ ماہر کوہ پیما ہنستے کھیلتے انہیں سر کر لیتے۔ میرے، سین، مارک، باسو اور کرنل کے لیے بھی زیادہ مشکل نہیں تھیں۔ مگر زیلی، اوشا اور سب سے بڑھ کر ڈیوڈ شا کے لیے یہ بہت ہی مشکل تھیں۔ ہمارے گروپ میں سین سب سے آگے تھا اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے اوشا تھی سب سے آخر میں کرنل تھا۔ زیلی کے بارے میں میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ وہ ماہر کوہ پیما نہیں ہے۔ چڑھائی کے آغاز میں اس کی مہارت

سامنے آنے لگی۔ وہ بہت مشکل راستوں سے بھی با آسانی گزر رہی تھی اور اس نے ثابت کیا تھا کہ وہ اس سفر کا اہل ہے۔ کرنل سب سے آخر میں تھا میں نے اس سے کہا۔ "تم اوشا کا خیال رکھنا یہ ماہر کوہ پیما نہیں ہے۔"

"تم فکر مت کارو۔" کرنل نے اردو بگھارنے کی کوشش کی۔ "میں کماری جی کا خیال رکھے گا۔"

اوشا اس کی بات پر ہنسی۔ "میں کہاں سے کماری ہو گئی رے۔"

آج بھی اوشا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے انداز میں ذرا بھی کمزوری نہیں تھی۔ ڈیوڈ شا کا کہنا درست ثابت ہو رہا تھا کہ وہ مردوں سے زیادہ ہمت والی تھی کم سے کم ڈیوڈ شا سے زیادہ ہی ہمت تھی جسے اس سفر کے آغاز میں ہی باسو کے سہارے کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ باسو اسی مقصد کے لیے اس کے ساتھ تھا۔ جہاں کوئی مشکل مرحلہ آتا ڈیوڈ شا اس کی مدد سے آگے بڑھتا تھا۔ اس کے برعکس اوشا اب تک بغیر سہارے کے اوپر چڑھ رہی تھی اور اس نے کہیں بھی کسی کی مدد نہیں لی تھی۔ ڈیوڈ شا کا گروپ آگے تھا اس لیے میں انہیں بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اصل چڑھائی شروع ہوئی تھی اب تک ہم پہلے پہاڑ کی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ہمیں ہاتھ اور اوزار استعمال کرنے پڑے تھے مگر اب تک رسوں کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ مگر ایک گھنٹے بعد رسوں کی ضرورت پیش آ گئی۔ یہاں سے ٹیمیں بدل گئیں۔ سب سے آگے مارک اور سین ہو گئے۔ وہ راستہ دیکھ رہے تھے اور کیلیں لگا کر رسیاں باندھ رہے تھے تاکہ باقی ان کی مدد سے اوپر چڑھ سکیں۔ دوسرے ان کی طرح اوپر نہیں جا سکتے تھے۔

جیسے جیسے بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ موسم خراب اور راستہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ راستے تنگ اور پیچیدہ ہو گئے تھے اور دونوں ٹیمیں پاس پاس تھیں۔ پہلے ڈیوڈ شا کی ٹیم گزرتی تھی اور پھر ہماری ٹیم جاتی تھی۔ مگر پاس ہونے سے ہم تقریباً ایک ہی ٹیم ہو گئے تھے۔ زینی باسو کے تقریباً پیچھے تھی اور اس کے پیچھے میں تھا۔ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہوا تیز اور برف کے باریک ذرات اڑ رہے تھے۔ درجۂ حرارت منفی پندرہ تک چلا گیا تھا اور ہماری سانسوں کے ساتھ منہ و ناک سے جو نمی خارج ہو رہی تھی وہ برف بن کر مونچھوں اور شیو پر جم رہی تھی۔ پہلے سانس لینا دشوار تھا اور اب دشوار تر ہو گیا تھا۔ ہوا جیسے خالی تھی اور ہمارے سینے دھونکنی کی طرح چل رہے تھے۔ ہر چند قدم کے بعد رک کر ہمیں سانس ہموار کرنا پڑتا تھا تب کہیں مزید آگے جانے کی ہمت پیدا ہوتی تھی۔ میری حالت بری تھی مگر مجھے اوشا کا خیال تھا اور میں بار بار مڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں جب بھی اسے دیکھتا تو وہ ہونٹ پھیلا کر بتاتی کہ وہ ٹھیک ہے اور مسکرا رہی ہے۔

ایک بار میں نے مڑ کر اوشا کی طرف دیکھا اور پھر پلٹنے والا تھا کہ مجھے اوپر سے چیخ کی آواز سنائی دی اور میں برفانی دیوار سے چپک گیا۔ اسی لمحے میرے پاس سے باسو گزرا۔ وہ گر رہا تھا مگر اس کی بیلٹ سے رسا بندھا ہوا تھا۔ یہ رسی اوپر ڈیوڈ شا، مارک اور سین سے بھی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے خطرہ بھانپ لیا اور چلا کر کہا۔ "سب اپنی جگہ چپک جائیں۔"

میں نے کلہاڑی کی نوک برف کی دیوار پر ماری تھی اور وہ اس میں گھس گئی۔ باسو کی رسی کی حد ختم ہوئی تو ڈیوڈ شا کھنچا آیا تھا۔ زینی محفوظ رہی تھی اس لیے میں نے برف سے کلہاڑی نکال کر اس رسی پر ماری جس سے ڈیوڈ شا بندھا ہوا تھا۔ وہ ابھی گرنے سے بچا ہوا تھا کیونکہ سین اور مارک نے برف میں اپنی کلہاڑیاں گاڑھ دی تھیں۔ باسو ایک شیلف سے لٹک رہا تھا جس کے نیچے کئی سو فٹ کی گہرائی تھی اور اگر وہ گر جاتا تو اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری چلائی کلہاڑی نے رسی کاٹ دی اور ڈیوڈ شا گرتے گرتے رک گیا۔ مگر باسو کو رسی کا جو سہارا تھا وہ اچانک ختم ہو گیا۔ ایک لمحے کو لگا کہ وہ گر گیا ہے۔ مگر جب میں نے چت کر نیچے دیکھا تو وہ کئی گز نیچے ایک ہاتھ سے شیلف سے لٹکا ہوا تھا۔ وہ راستے سے ہٹ گیا تھا اس لیے نیچے اوشا اور کرنل کو اس سے خطرہ نہیں تھا کہ وہ گرتے ہوئے انہیں بھی لپیٹ میں لے جائے گا۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

"اپنی رسی دو۔"

مگر وہ ساکت رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس کی رسی باسو تک پہنچا کر اسے محفوظ کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر باسو کا ہاتھ اس شیلف سے چھوٹ جاتا تو وہ گرتے ہوئے دوسروں کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا اس کے تقریباً پونے دو سو کلوگرام وزن کو سہارنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے پھر رسی دینے کو کہا تو ڈیوڈ شا نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے بچانا مشکل ہے۔"

"کوشش تو کی جا سکتی ہے۔" میں نے چلا کر کہا۔ یہاں ہوا کا شور اور دباؤ بہت زیادہ تھا اس لیے چلا کر بات

کرنی پڑ رہی تھی اور ایک بار چلانے کی صورت میں سانس خلاص ہو جاتی اور دوبارہ بولنے کے لیے کم سے کم دو سانس پڑتے تھے۔ میرے دوسرے بار کہنے پر بھی جب ڈیوڈ شا نے رسی نہیں دی تو میں نے اسے دل ہی دل میں سنائیں۔ اگر میں رسی نہ کاٹتا تو اچھا تھا باسو اسے بھی ساتھ لے جاتا۔ مگر ایک تو اسے سنانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور دوسرے اس میں بھی مشقت لگتی۔ میں پلٹا تو زیبی نے بے چین لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کر رہے ہو اسے بچانا بہت مشکل ہے۔"

میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور نیچے اترنے لگا۔ اس طرف راستہ نہیں تھا اور واحد چھجا تھا جس پر باسو لٹکا ہوا تھا۔ میں نے اترتے ہوئے برف میں کیلیں گاڑنا شروع کیں اور رسی کو ان سے منسلک کرتا رہا۔ تین کیلوں کے بعد میں نے رسی باسو کی طرف اچھال دی۔ "اسے پکڑ لو مگر ابھی اوپر چڑھنے کی کوشش مت کرنا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے سر ہلایا اور رسی تھام لی مگر دوسرے ہاتھ سے چھجا نہیں چھوڑا تھا وہ دونوں پر زور دیتے ہوئے خود کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ یہاں برف کی تہ تھی اور اس میں لگی کیل ایک حد سے زیادہ وزن برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے میں زیادہ سے زیادہ کیلیں لگا رہا تھا کہ جب باسو چھجے سے اوپر آنے کی کوشش کرے تو یہ کیلیں اس کا وزن برداشت کر سکیں۔ اوشا بھی دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ "شہباز اگر یہ گیا تو سب کو لے جائے گا۔"

"یہ تم نے اچھا یاد دلایا۔" میں نے کہا اور خود کو اس رسی سے الگ کر لیا جس سے زیبی، اوشا اور کرنل بندھے ہوئے تھے۔ اوشا چلائی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"اب تم تینوں کو خطرہ نہیں ہے۔" میں نے رسی کے سہارے نیچے جاتے ہوئے کہا۔ اب پاؤں لگانے کی جگہ نہیں تھی اور میں پہاڑ سے لپٹا ہوا تھا۔ میرے پاس کل چھ کیلیں تھیں۔ یہ سات آٹھ انچ لمبی تھیں۔ ان کے سروں پر رنگ بھی لگے تھے جن سے رسی یا کلپ منسلک کیے جا سکتے تھے۔ اوشا چلا چلا کر مجھے واپس آنے کو کہہ رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو رسی سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر کرنل نے اسے روک لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اوشا زہریلی ہے اور اسے غصہ آ گیا تو وہ اسے ہی کاٹ لے گی اس لیے اس نے حکمت عملی کا مظاہرہ کیا اور اسے سمجھانے لگا کہ وہ اپنی جگہ رہے کیونکہ وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ کرنل میری مدد کر سکتا تھا اس لیے وہ میری مدد کو جائے گا۔ اوشا مان گئی اور کرنل رسی سے الگ ہو کر آگے آیا۔ اس دوران میں باسو کوشش کر کے اپنا دوسرا ہاتھ بھی چھجے تک لے آیا تھا۔ اب وہ کسی قدر محفوظ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "جب میں کہوں تم اوپر آنے کی کوشش کرو گے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ رسی کو تھامے رکھوں۔"

باسو نے سر ہلایا۔ اس مشکل ترین صورت حال میں بھی اس کا چہرہ جیسے جذبات سے عاری تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی جان کو خطرہ نہ ہو۔ بلکہ یہ سب کسی کھیل کا حصہ ہو۔ جسمانی برتری نے اسے ذہنی طور پر پیچھے کر دیا تھا اور وہ صرف حکم ماننے اور سمجھنے والا روبوٹ بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے آخری کیل چھجے سے کوئی چار گز اوپر لگائی اور رسی ان سات کیلوں سے منسلک تھی جو یکے بعد دیگرے بندھی تھیں۔ بظاہر یہ خاصا مضبوط سہارا تھا مگر جب میں باسو کے وزن کو دیکھتا تو میرا اعتماد ڈانواں ڈول ہو جاتا کہ یہ کیلیں میرا اور باسو کا بوجھ برداشت کر سکیں گی؟ میں بہت بڑا رسک مول لے رہا تھا۔ آخری کیل لگانے کے بعد میں ایک چھوٹی سی جگہ کھڑا تھا یہاں سے نیچے دائیں طرف چھجا تھا اور میرے قدموں تلے لامتناہی خلا تھا۔ میں نے ایک بار رسی کو کھینچ کر کیلوں کی جانچ کی اور پھر باسو سے کہا۔ "اوپر آ جاؤ۔"

اس نے سر ہلایا اور اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی غلطی تھی اسے چھجا چھوڑ کر پہاڑ کی دیوار سے چپک جانا چاہیے تھا اور پھر رسی کے سہارے اوپر آنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے چھجے پر چڑھنے کی کوشش کی جب تک میں اسے خبردار کرتا۔ اس کے وزن سے برف کا چھجا خوفناک آواز کے ساتھ ٹوٹا اور باسو جھٹکے سے نیچے گیا۔ اس کا پورا وزن رسی پر آیا تھا اور رسی کھنچی۔ اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک لگی کیل برف سے نکل گئی۔ پھر دوسری اور تیسری کیل بھی نکل گئی۔ اس دوران میں جھٹکے کا زور ختم ہو گیا تھا اس لیے باقی کیلیں پوری طرح باہر تو نہیں آئیں لیکن وہ بھی نکلنے لگی تھیں۔ اولین جھٹکے نے میرے قدم بھی اکھاڑ دیے تھے اور میں اس جگہ کھڑا ہوا ڈگمگا رہا تھا۔ اگر میں گر جاتا تو میرا اور باسو کا مشترکہ وزن لازماً باقی کیلوں کو بھی نکال دیتا۔ میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرا توازن درست نہیں تھا اور میں آگے کی طرف جا رہا تھا۔ بالآخر میرا توازن مکمل طور پر خراب ہوا اور میں آگے کی سمت گیا تھا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(محمد فرقان، ملانگہ سوداگر پورہ کا جواب)

انعم جمال.........لاہور

اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

رملا یونس.........کراچی

اٹھتی ہیں کبھی دل سے غموں کی جو گھٹائیں
احساس کا دریا بھی بہا دیتی ہیں آنکھیں

ارشد خان.........ڈی آئی خان

اک بار گلاب عارض و لب کے ترے مہکیں
اک برق تبسم پھر جو چمک جائے تو اچھا

امتیاز حسین.........میرپور خاص

اہلِ دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

پرویز ادخان.........ویہہ

اجنبی لگتا ہے سارا منظر
اف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ

(انعم شہزاد خانپور کا جواب)

مبارک حسن.........جہلم

غم تھے جتنے وہ تسکینِ جاں بن گئے
زندگی رفتہ رفتہ بسر ہو گئی

(احمد ترین چنیوٹ کا جواب)

ذاکر علی.........بدین

روح قائد دیکھ تیرا قافلہ
ٹولیوں میں ٹکڑیوں میں بٹ گیا

محمد آصف.........شکارپور

رنگ لائیں گی اک دن یہ خوش فہمیاں
آپ کے راز داروں سے ڈرتے ہیں ہم

نورین فاطمہ.........سکھر

ریت کے ذرّے بن کر چمکے
کتنے موتی رُلتے رُلتے

(نگار اکبر گجرات کا جواب)

نزہت افشاں مہورہ.........فتح جنگ

اک شام وہ آئے تھے اک رات فروزاں تھی
وہ شام نہیں لوٹی وہ رات نہیں آئی

(قمر الحسن ساہیوال کا جواب)

عنایت مسیح.........کراچی

انتظارِ دوست کتنا انتشار انگیز ہے
جانبِ در دیکھتے آنکھیں مری پتھرا گئیں

نادرہ اسلم خان.........لاہور

اربابِ اقتدار کی مٹھی میں اہلِ فن
بے لاگ تبصرے ہیں نہ آزادیٔ خیال

میمونہ سلطان.........کراچی

اذیتوں میں بھی ذوقِ طلب نہیں مرتا
یہ عظمتِ طلبِ غم کسی کو کیا معلوم

منیر احسن.........خانپور

اف غضب ہے تغافل تمہارا
ہم نہ تم کو کبھی یاد آئے

سلمٰی حیا.........کراچی

اپنے دامن پہ وہ اک قطرۂ اشک
اک شکستہ ساگر یاد آیا

(فدا حسین طوری پاراچنار کا جواب)

عباس علی.........سکرنڈ

یقین ہے لے گیا ہو گا وہ اپنے گھر مجھ کو
میں چھوڑ آیا تھا کل رات خود کو میلے میں

فتح خان.........راولپنڈی

یہ مانا ضبطِ غم میں گریہ و زاری نہ کر پائے
چھپایا گل مگر خوشبو کی نہ داری نہیں کر پائے

سلمٰی ممتاز.........لاہور

یہ دل کہیں کا نہ رکھے گا اعتبار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

(امجد اکرام بہاولپور کا جواب)

نسیم منظر........ کراچی

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

(نگار اسلم ملک لاہور کا جواب)

احمد جاوید........لاہور

زندگی میں درسِ عبرت لے ثباتِ گل سے تو
شب کو چٹکا صبح مہکا دن ڈھلے مرجھا گیا

فصیح بخاری........ملتان

زندگی ایک نئی راہ میں رکھتی ہے قدم
موت انجام نہیں ہے مرے افسانے کا

آزر سلطان........ کراچی

زندگانی کی شام ہو تو سہی
یہ کہانی تمام ہو تو سہی

آصف احمد........ کراچی

زندہ دلوں کو فکرِ غم یہ زندگی نہیں
جنت اسے بناتے ہیں دوزخ بھی گر ملے

نازش ملک........لاہور

زلزلے سہم گئے آندھیاں گھبرا سی گئیں
کیا قیامت ہے وہ نظروں کا خفا ہو جانا

(شگفتہ مشتاق لاہور کا جواب)

نیلم مشتاق........اسلام آباد

نازک لطیف سانچے میں دل میرا ڈھال کے
آماجگاہ رنج و الم کیوں بنا دیا

روفی بانو........بالا

نازاں تھے کہ اس شوخ نے پھر یاد کیا ہے
محفل سے اٹھائے گئے توقیر تو دیکھو

(جاوید الحسن مظفر گڑھ کا جواب)

گنیش دیو ریہ........حیدرآباد

ویرانوں کو اوڑھ کے سوئے ہوئے ہیں آج
جب تک مکیں تھے گھر میں تو گھر جاگتے رہے

فلک شیر........حاصل پور

وہ جب احسان کی عقیدت جتانے پر اتر آیا
رہے خاموش ہم، لہجے کو بازاری نہ کر پائے

(نعمہ تحریم کراچی کا جواب)

ندرت فیاض........ کراچی

یاد میں کس کس کی اشکِ خوں نہ برسانا پڑے
کیسی کیسی ہستیاں اس خاک میں آباد ہیں

اشرف سعید........ شیخوپورہ

یثرب کے بادشاہ کی ہے جستجو مجھے
پھرتی ہے اس کی یاد لیے کو بہ کو مجھے

(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

صدیق عثمانی........ڈی آئی خان

نہیں ہے سے نہ سہی چشمِ التفات تو ہے
نئی ہے بزم طریقِ کہن کی بات کرو

وحید قیصر بھٹی........جھنگ

نہ منزلوں کا نشاں ہے نہ رہبروں کا پتا
غبارِ راہ پریشاں ہے کارواں کے لیے

(ایم افضل کھرل ننکانہ صاحب کا جواب)

نیم امتیاز بھوبھوروی........ سمندر

برس گئی تو یقیناً ڈبو کے چھوڑے گی
یہ بھیگی بھیگی ہوئی سر پہ جو گھٹا ہے بہت

نازش ممتاز........حیدرآباد

بند دروازے کھولیے صاحب
گھر میں تازہ ہوا ضروری ہے

نعمان مصطفیٰ........جہلم

بھولے سے ربطِ خاص کا اظہار کر گیا
ورنہ وہ اپنا طرزِ ادا بھولتا کبھی

نصیر اوریس........اسمن (یو اے ای)

بصد خلوص و محبت بحسرت و ارماں
تم اہلِ بطن کو سلام کہہ دینا

نزہت پروین........حیدرآباد

بڑی مدت سے قسمت آزمانے کی تمنا ہے
کسی کو خفتہ دل میں بسانے کی تمنا ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ______ ہے۔

علمی آزمائش
113
30 اپریل 2015ء

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی [ ] سسپنس [ ] پاکیزہ [ ] سرگزشت [ ] بھجوایا جائے
کسی ایک پر ✓ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اپریل 2015ء تک علمی آزمائش 113 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
73

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 113

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان سے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 مارچ 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

14 فروری کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے وقت اسٹاف کالج کے واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے مگر بعد میں وہ تاریخ پاکستان کے سب سے متنازع کردار قرار دیے گئے۔

علمی آزمائش 110 کا جواب

مولانا غلام رسول مہر 15 اپریل 1895ء میں پھول پور جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ گیارہ برس کے سن میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم سے خصوصی دلچسپی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ اپنی عمر پر پہنچتے پہنچتے کافی نام پیدا کر لیا اور صحافت کی آبرو کے خطاب سے نوازے گئے۔

انعام یافتگان

1- عنایت علی۔ لاڑکانہ 2- وسیم باری۔ چنیوٹ 3- انعام الحق جاوید۔ سکھر
4- زاہدہ ادریس۔ میرپور آزاد کشمیر 5- نیاز کھوکھر۔ لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نعمان اشرف، رسول بخش بلیجو، ارباب حسین ہارون صدیقی، اسرار احمد، باسط فاروقی، علی زبیر سید، زاہد حیات، نصرت گل، منبرین احمد، کلیم صدیقی، عنایت گجر، یاسین خان، مختار بٹ، کاوش ارشد، صدف فاطمہ، انعام حیات، خاقان احمد، فرحت عباس نقوی، علی نظیر، نیاز احسن، اکبر حسین، اشرف اللہ خان، نذر حسین، سبطین سید، طفیل احمد، غلام حسن، مولا بخش بٹ، نجمل اختر، الیاس محمد، قیام الدین انصاری، توصیف احمد انصاری، عنایت مسیح، صباحت مرزا،

سہیل احمد کھتری۔ سید توفیق امداد امام رضوی' مسز زبیدہ خاتون مسکین کاروانی' محمد فیضان' نیاز احمد' ثناء اللہ فاروقی' فتح احسان' آسی محمد' محسن اختر بلوچ' احمد اعزاز' اختیار الدین صدیقی' سلیم عمار' ثنا بتول' امجد سعید عطاری' عاصم ملک' شکیلہ فاروقی' خالدہ ادریس سلفی' شوکت علی' تسلیم ضیا' کوثر جہاں' آفتاب منصور' ملک غلام علی' سنجیدہ احمد' حسن خان اچکزئی' سید عزیز الدین' پروین کنول' جمیل عثمانی' نعمت مرزا' اختر عباس' اطہر حسین' تانیہ احسن' امیر الاسلام' زبیر ملک' جینا کوثر' نوید حسن' زبیر اختر' جاوید اقبال' توقیر حسین، غلام شبر عابدی، خاقان خان، نرجس فاطمہ، وردہ بتول، انیس احمد چاؤلہ، محمد فتح یاب خان اچکزئی، محمد فیضان، محمد سلیم کھوکھر، ہارون محمد، سعید الدین مروت، فہیم بٹ، خواجہ خیر محمد۔ خیر پور سے احمد علی زیدی، نورین اصغر، قیام الدین، ارشاد العصر۔ گجرات سے ذیشان علی سید، محمد طاہر، واثق علی، ارشاد زیدی، نعمان فاروق۔ شادی پور سے احمد علی، نسیم نیازی، ہارون اشرف، نیاز بٹ۔ خانیوال سے ارشد علی، تنویر حسین، عابد سلطان، عمران حیات خان، ڈی آئی خان سے یاور حسین، زاہد علی، اللہ بخش، سلمان اشرفی۔ ڈی جی خان سے یونس احمد، نذر علی سید، خاقان اشرف، نصیر علی نصیر۔ جھنگ سے نورین ملک، التماس عباس، کائنات فاطمہ، زاہد علی، وقار علی۔ تلہ گنگ سے فصیح الدین، مرزا انعام، کلیم الدین، اختر عباس، توصیف حسین سید۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن، عباس حیدر، نجیل خان، جنید علی صدیقی۔ چنیوٹ سے فتح یاب خان، ماہا زیدی، فرمان علی، صولت حیات، اشرف علی خان، سرگودھا سے محمد یامین، الیاس صادق بٹ، انعام حسین، محمد سلیم الدین۔ حاصل پور سے فرمان الیاس، فرہین، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ لندن سے انیس احمد، غیاث الدین۔ سیالکوٹ سے شفق شیکی۔ بھکر سے محمد عارف قریشی، نرگس خان۔ میر پور خاص سے نوشین فاطمہ زیدی، علی عباس، حیات محمد، رخسانہ چانڈیو، فرحین رضا، نعمان قائم خانی، شبر حسن۔ حسین فرحت الاسلام' محمد عاقل' ارشد سیم' شاہد اسلام خان' غزالہ شاہین' عبدالقیوم' شہزاد بھٹو' صنوبر جونیجو' فرحت اللہ بھٹو' انجم خورشید' فاضل جتوئی' نعمت جوکھیو' محمد عماد' طہٰ یاسین' نسرین اشرف' نزہت پروین' زینب فریدا صفہانی' کوکب نسیم۔ سوئی بلوچستان سے: محمد اکمل قمر۔ فیصل آباد سے: عتیق اسلم' منور سیم' نصرت جہاں' عباس علی اصفہانی' خاقان خان ڈرائیور' ولاور حسن' دلدار بھٹی' کاشف' شفیق خاقان' عرفان مروت' ثمین اختر' زیب علی' ملک شفیق' ہمایوں حسن' شازیہ احسن۔ رحیم یار خان سے: ظہور الامین بٹالوی' زیبو' کاشان لاشاری' فاطمہ فرحت' نصرت اسماعیل' شبیر حسین شبیری' اسماعیل اچانک' امتیاز احمد' نازش' عمار یاسر' محمد عابد' کیف سرمدی' گل باز خان' زیب النساء۔ بدین سے: عباس علی' سائرہ' شاہد علی۔ چکوال سے: عارف احمد' احمد جاوید' وسیع احمد' صاحب جان' سلمیٰ ممتاز۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، سرفراز خان، قیام الحسن، کاظم جعفری، حیات محمد، یاسین محمد، قیوم الحسن، انصار الدین، احسن ممتاز، فرحان جعفری، صدف حسن، عنبرین عنایت علی، ذیشان مصطفیٰ، طفیل احمد، محمد ذیشان، رفیق مصطفیٰ، نظیر حسین، انیسہ جعفری، نیاز علی، گل فراز، کلیم رئیسانی، سلمان توقیر، ارباز خان، وردہ علی سید۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین۔ لاہور سے مسرت اسلم ملک۔ ظفر الحسنین، عباس علی سید، فیضان بٹ، عارف صدیقی، رشید علی، محمد یاسین، کائنات بٹ، نیاز چوہان، متین لاہوری، سلمان احمد بٹ، اشرف علی، تاثیر احسن، رحیم بخش، فہیم احمد۔ علی مصطفیٰ' میاں ساجد دوکھری (گوجرہ) محمد نوید اختر' عبدالجبار (کمالیہ) خان بیلہ سے: عائشہ عبدالرشید۔ مسلم باغ (بلوچستان) سے: رحمت اللہ باغ۔ قصور سے: رائے عبدالوحید کھرل (پتوکی) میر پور آزاد کشمیر سے: محمد حسین۔ ساہیوال سے ارباز خان، زوبیا بتول۔ شیخوپورہ سے انیس احمد۔ پشاور سے عباس طوری، الیاس گل، فرحان خان، نوازش کاظمی، فصیح الدین، کبیر الحسن، رحیم اللہ، نجم الدین، نوشین ملک، ارشد مہدی، نیاز کھوسو، فرقان سید، مظہر حسین بھیکو، شاہد خان آفریدی، سلمان اچکزئی، سلمان محمد، احمد شاہین خٹک، فرزانہ ملک، نعیم الحسن۔ پشاور خان گل عزیز، سرفراز گل۔ بہاولپور سے کاظم علی، ثنا کوثر، رحیم داد چودھری، نور الٰہی فضل، فیضان مصطفیٰ، عباس علی، منظر حسین، کاظم علی، انیس احمد صدیقی، ماہا نیازی، بلو نیازی، ثنا نیازی۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)

بیرون ملک سے احمد خان، یاسین گل، احمد صدیقی (شارجہ)، اشرف علی خان (دبئی)، اسلم شاہد (جرمنی)، محمد اسرائیل (مسقط)، ارباز خان (ٹوکیو جاپان)، گل صنوبر (بحرین)

ضدی

جناب معراج رسول
السلام علیکم
سرگزشت میرا محبوب رسالہ ہے۔ اسے میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس بار میں نے بھی ایک سچ بیانی بھیجی ہے۔ یہ میری آپ بیتی ہے۔ قسمت نے مجھے میری محبت کس طرح لوٹائی اسے میں نے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔ میرے چھوٹے بھائی نے مجھے کس کس طرح چکر دیے یہ بھی بیان کردیا ہے۔ اگر میری کاوش پسند آجائے تو کسی نزدیکی اشاعت میں اسے جگہ دے دیں۔

عمران
(دبئی یو اے ای)

"زینت مجھے پسند ہے۔"

کامران کی زبانی یہ جملہ سن کر یوں لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو اگر اس کی جگہ کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا لیکن کامران کے ساتھ ایسا کچھ نہ کرسکا۔ وہ میرا چھوٹا بھائی تھا۔ گھر بھر کا لاڈلا اور انتہائی ضدی۔ جس چیز کے پیے مچل جاتا اسے لے کر ہی چھوڑتا۔ اس کی ہر فرمائش اور ضد پوری کی جاتی جب کہ دوسرے بہن بھائی اس نوازش سے محروم تھے۔ حالانکہ گھر میں بڑے بھائی نعمان کا سکہ چلتا تھا اور ان کی بات کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ بچپن میں انہوں نے کوئی فرمائش کی ہو یا ضد کرکے اپنی کوئی بات منوائی ہو۔ وہ سب بہن بھائیوں میں بڑے تھے۔ اس لیے شروع سے ہی ان میں ایک خاص قسم کی بردباری، سنجیدگی اور متانت آگئی تھی۔ ان سے چھوٹی رامنہ باجی تھیں جب کہ میرا نمبر تیسرا تھا۔ میرے بعد رابعہ اور پھر کامران پیدا ہوئے اس طرح وہ گھر بھر کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

نعمان بھائی شروع سے ہی پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ اس لیے ابو نے ان سے بہت سی امیدیں وابستہ کرلی تھیں۔ وہ خود ایک دواساز کمپنی میں درمیانہ درجہ کی پوسٹ پر فائز تھے اور ان کی خواہش تھی کہ نعمان بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے کسی اچھی پوسٹ سے اپنا کیریئر شروع کریں۔ اسی لیے وہ شروع سے ہی ان کی تعلیم پر خاص توجہ دے رہے تھے۔ رابعہ، رامنہ اور میں اوسط درجے کے طالب علم تھے اور ہر سال امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوکر اگلی کلاس میں پروموٹ ہوجاتے۔ ابو کے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا۔ انہوں نے کبھی ہم تینوں سے یہ نہیں پوچھا کہ ہمارے مضامین کیا ہیں۔ آگے چل کر کس فیلڈ میں ڈگری حاصل کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کامران کو تو انہوں نے بالکل ہی آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اسے پڑھنے سے بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی اور اس کا زیادہ وقت کھیل کود یا ٹی وی دیکھنے میں گزر جاتا۔ البتہ وہ بہت ذہین تھا اور سال کے آخری مہینوں میں تیاری کرکے امتحان پاس کرلیتا۔ اس لیے ابو اس کی جانب سے بھی مطمئن تھے۔

گھر والوں کے لاڈ پیار نے کامران کو حد درجہ ضدی اور خودسر بنادیا تھا۔ وہ ہم بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین اور خوب صورت تھا۔ اس لیے شروع سے ہی سب لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ خاص طور سے امی تو اس پر وارے صدقے جاتی تھیں۔ اسے میرا شہزادہ کہہ کر بلاتیں اور اس کی ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کرنے کے لیے تیار رہتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے



کہ ایک دفعہ رات کے دو بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے امی کو بھی سوتے سے جگا دیا اور ان سے پراٹھا کھانے کی فرمائش کی۔ امی نے فوراً بستر چھوڑ دیا اور کچن میں جا کر اس کے لیے پراٹھا تیار کرنے لگیں۔ اس طرح کی فرمائشیں وہ اکثر و بیشتر کیا کرتا اور امی خوشی خوشی انہیں پورا کرتی رہتیں۔

کامران کچھ بڑا ہوا تو اس نے مجھے تختہ مشق بنانا شروع کر دیا۔ میری جو چیز اسے پسند آجاتی۔ مجھ سے پوچھے بغیر ہی لے لیتا۔ میری کتابیں، کاپیاں، قلم غرض ہر چیز اس کی دسترس میں تھی۔ پھر اس نے میرے کپڑوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ کبھی میری قمیص پہن لیتا تو کبھی سوئیٹر۔ ایک دو مرتبہ میں نے منع کیا تو وہ لڑنے مرنے پر اتر آیا اس نے مجھے خوب سنائیں اور الٹا امی سے جا کر میری شکایت لگا دی کہ چھوٹے بھائی نے مجھے گالی دی ہے۔ وہ تو شکر ہوا کہ نعمان بھائی یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے امی کے سامنے ہی کامران کو جھوٹ بولنے پر ڈانٹا تو میری گلوخلاصی ہوئی ورنہ امی بھی مجھے ہی برا بھلا کہتیں۔ اس کے باوجود وہ کامران کی حمایت کرنے سے باز نہ رہ سکیں اور منہ بناتے ہوئے بولیں۔

"کیا ہوا، اگر اس نے تمہاری قمیص پہن لی۔ چھوٹا بھائی ہے۔ اس کا بھی تمہاری چیزوں پر تھوڑا بہت حق بنتا ہے۔"

اس کے بعد میں نے کامران کے معاملے میں بولنا چھوڑ دیا کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سب گھر والے اس کی سائیڈ لیا کرتے تھے۔ البتہ اب میں نے اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا شروع کر دی تھی۔ کپڑوں کی الماری میں تالا ڈال دیا اور قیمتی ضروری اشیاء بھی اس میں رکھ دیں لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا کہ میری تمام چیزیں اس کی دسترس سے محفوظ رہتیں۔ آئے دن وہ کسی نہ کسی چیز پر ہاتھ صاف کر لیتا اور میں دل مسوس کر رہ جاتا لیکن ایک مرتبہ اس نے وہ حرکت کی جس کا مجھے کئی دنوں تک افسوس رہا۔

ہوا یوں کہ میٹرک کے امتحان میں پاس ہونے پر ابو اور دوسرے رشتے داروں نے مجھے انعام کے طور پر جو پیسے دیے ان سے میں نے ایک اچھا سا کرکٹ بیٹ خریدا جس کی مجھے ایک عرصے سے خواہش تھی کیوں کہ جب پریکٹس کے لیے جاتا تو کچھ لڑکے اپنے بیٹ ساتھ لے کر آتے اور انہی سے کھیلا کرتے۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں بھی اپنے بیٹ کی خواہش جاگی لیکن میں کس سے کہتا۔ ابو کی تو اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مجھے دو تین ہزار کا بیٹ لا کر دیتے۔ اگر میں اپنے جیب خرچ سے کچھ بچانے کی کوشش کرتا تب بھی اتنے پیسے جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ قسمت اچھی تھی کہ امتحان میں پاس ہونے پر اتنے پیسے مل گئے کہ میں آسانی سے اپنی پسند کا بیٹ خرید سکتا تھا۔

یوں لگا جیسے مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ میں بڑی شان سے بلا لہراتا ہوا میدان میں پہنچا۔ اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھ کر فخریہ انداز میں مسکرایا۔ سب نے ہی اس بیٹ کی دل کھول کر تعریف کی۔ ایک دو نے تو اسے ہاتھ میں

لے کر دیکھا اور فرضی انداز میں اس سے کھیلنے لگے۔ جب میری بیٹنگ کی باری آئی تو اپنے بیٹ سے کھیلتے ہوئے مجھے بہت بڑا اعتماد لگ رہا تھا۔ اس روز میں نے تقریباً ہر بال پر آگے بڑھ کر زوردار شاٹ لگائے اور خوب جم کر کھیلا۔ سب نے ہی میرے جارحانہ انداز کی تعریف کی اور اس روز معلوم ہوا کہ اپنے بیٹ سے کھیلنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

اب یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ میں بلا ناغہ پریکٹس کے لیے جانے لگا۔ اپنے بیٹ سے کھیلتے ہوئے میرے اعتماد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا تھا اور میں باری آنے پر خوب دل کھول کر ساتھی بالرز کی پٹائی کرتا۔ ٹیم کا کپتان بھی میری کارکردگی سے بہت خوش تھا اور اسے اُمید تھی کہ میں آنے والے میچ میں کوئی بڑا اسکور کرنے میں کامیاب رہوں گا لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی اور چند روز بعد ہی میں اپنے اس عزیز از جان بلے سے محروم ہو گیا۔ حسبِ عادت کامران نے میری غیر موجودگی میں اپنا کام دکھایا۔ اس کی ٹیم کا کوئی میچ تھا اور وہ مجھ سے پوچھے بغیر وہ بلا لے کر میچ کھیلنے چلا گیا۔ جب میں پریکٹس پر جانے کے لیے تیار ہوا تو مجھے اپنا بیٹ نہیں نظر نہیں آیا۔ بڑے بھائی نعمان اپنے کمرے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے اور ویسے بھی انہیں کرکٹ وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا ان سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ البتہ کامران مجھے نظر نہیں آیا تو امی سے اس کے بارے میں پوچھا اور انہوں نے تصدیق کر دی کہ وہ میرا بیٹ لے کر میچ کھیلنے گیا ہے۔ یہ سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا اور سوچنے لگا کہ نہ جانے وہ اس بلے کا کیا حشر کرے گا۔ امی نے میرے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے اور ہمیشہ کی طرح اس کی طرف داری کرتے ہوئے بولیں۔ ''اب اسے کچھ مت کہنا۔ بڑے شوق سے میچ کھیلنے گیا ہے۔ بلاوجہ ہی اس کا دل خراب ہوگا۔''

''لیکن امی اسے کم از کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا۔'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''اوہو، تو کون سی قیامت آگئی۔ بھائی کی چیز پر اتنا حق تو اس کا بھی ہے۔''

اس کے بعد امی سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں صبر کر کے بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں اپنے بلے کی بحفاظت واپسی کی دعائیں مانگنے لگا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے کامران کی واپسی ہوئی تو وہ خالی ہاتھ تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ بلا کہاں ہے تو اس نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔ ''کھو گیا۔''

''کھو گیا۔'' میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''کیسے کھو گیا؟ کیا میدان میں چھوڑ آئے؟''

''نہیں وہاں سے چلتے وقت تو میرے ہاتھ میں تھا۔ راستے میں ایک ہوٹل میں رک کر ہم لوگوں نے چائے پی تھی۔ بس وہیں رہ گیا۔''

میرا دل چاہا کہ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں لیکن کچھ بھی نہ کر سکا کیوں کہ ایسی صورت میں میرا اپنا حلیہ بگڑ جانے کا اندیشہ تھا کیوں کہ سب گھر والے میرے پیچھے پڑ جاتے اور وہ مظلوم بن جاتا لہٰذا بڑی مشکل سے اس خواہش کو دبایا اور بولا۔ ''چلو میرے ساتھ، شاید وہ بلا ابھی وہیں ہو۔''

''بے کار ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب تک وہ بیٹ کسی دکان پر پہنچ چکا ہوگا۔ ایسی چیز کون چھوڑتا ہے۔''

''پھر بھی ایک دفعہ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو!''

بادلِ نخواستہ وہ میرے ساتھ ہو لیا لیکن ہماری یہ کوشش رائیگاں گئی۔ وہ ہوٹل گاہکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے ایک ایک میز پر جا کر دیکھا لیکن وہ بلا کہیں نظر نہ آیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص اور بیروں سے بھی پوچھا لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ کسی نے وہ بلا دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں انہیں کچھ علم تھا۔ میں شدید مایوسی کے عالم میں وہاں سے آگیا لیکن کامران کو اس کا کوئی ملال نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح نارمل اور پُرسکون نظر آرہا تھا۔ ابو کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے خوب ڈانٹا اور تنبیہ کر دی کہ آئندہ وہ اجازت کے بغیر میری کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ نعمان بھائی نے بھی اس کی کلاس لی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ ڈھیٹ بنا سب کی سنتا رہا۔ وہ حد درجہ خودسر اور ضدی ہو چکا تھا اور ہمیشہ اپنی من مانی کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے امی اور بہنوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس واقعے پر بھی رافعہ باجی نے مجھے ہی قصوروار گردانا اور یہاں تک کہہ دیا کہ میں نے ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیا جس کی وجہ سے کامران کو ابو اور نعمان بھائی کی ڈانٹ سننا پڑی۔

یہ اور اس قسم کے دیگر واقعات روزمرہ زندگی کا معمول بنتے جا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کامران میں سنجیدگی اور بردباری آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی عادتیں پختہ ہوتی چلی گئیں۔ سب سے زیادہ اس نے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ میں نے انٹر سائنس کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

ابو ریٹائر ہونے والے تھے اور میں ان پر کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ لہٰذا ٹیوشن کرکے اپنے تعلیمی اخراجات پورا کرنے لگا۔ اگر کبھی کچھ پیسے بچ جاتے تو ان سے اپنے لیے کپڑے بنوا لیتا لیکن انہیں پہننا بہت کم نصیب ہوتا۔ کامران کا جب دل چاہتا وہ میری کوئی بھی شرٹ نکال کر پہن لیتا اور اس کے بعد وہ میرے استعمال کے قابل نہیں رہتی۔ تنگ آکر میں نے نئے کپڑے بنانا ہی چھوڑ دیے۔

نعمان بھائی کو ایم بی اے کرنے کے بعد بینک میں اچھی ملازمت مل گئی تو ہمارے گھر کے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے اور کامران کی بھی لاٹری نکل آئی۔ ابو سے تو اسے لگا بندھا جیب خرچ ہی ملتا تھا لیکن نعمان بھائی سے وہ بلا تکلف پیسے مانگ لیتا اور انہوں نے بھی اس کی فرمائش رد نہیں کی لیکن اس کے باوجود کامران کی دست درازیوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح میری چیزوں پر ہاتھ صاف کرتا رہتا تھا۔ میرے کیلکولیٹر، کمپیوٹر اور موبائل۔ سب چیزوں تک اس کی رسائی تھی۔ وہ میرا کمپیوٹر استعمال کرتا تو میری کئی فائلیں ڈیلیٹ ہو جاتیں۔ موبائل کا بیلنس ختم ہو جاتا لیکن مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں تھی۔ امی اور بہنیں اس کی حمایت میں بولنا شروع کر دیتیں اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

امی نعمان بھائی کی شادی کرنا چاہ رہی تھیں لیکن ابو نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے رافعہ باجی کے فرض سے فارغ ہو جائیں پھر نعمان بھائی کے بارے میں سوچیں گے۔ رافعہ باجی کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ ان کا شمار ہر سال پاس ہونے والے طالب علموں میں کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح وہ گرتے پڑتے یونیورسٹی تک پہنچ گئی تھیں اور ابو کا خیال تھا کہ ماسٹرز کرنے کے بعد ان کی شادی کر دی جائے اس سلسلے میں رشتہ کروانے والی عورت سے بھی کہہ دیا گیا تھا اور وہ بڑے زور و شور سے رافعہ باجی کے لیے مناسب لڑکا تلاش کر رہی تھیں۔ اس کی کوششیں رنگ لائیں اور رزلٹ آنے کے چند روز بعد ہی رافعہ باجی کا رشتہ فرخ بھائی سے طے پا گیا۔

رافعہ باجی کی شادی میں ہی میں نے پہلی بار زینت کو دیکھا۔ وہ میری خالہ زاد تھی اور وہ لوگ لاہور میں رہا کرتے تھے۔ خالو کا اپنا کاروبار تھا لہٰذا وہ مصروفیت کی وجہ سے کبھی کراچی نہیں آئے۔ البتہ خالہ دو تین مرتبہ امی سے ملنے آ چکی تھیں۔ میں نے زینت کو سات آٹھ سال پہلے دیکھا تھا۔

اس وقت وہ مجھے ایک معمولی سی اسکول گرل نظر آئی تھی لیکن جوانی میں اس نے خوب روپ نکالا تھا گو کہ یونیورسٹی میں بھی کئی لڑکیاں میرے ساتھ پڑھتی تھیں لیکن میں نے زینت جیسی خوب صورت لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے تو وہ کسی اور ہی سیارے کی مخلوق لگی۔ گورا رنگ، بیضوی چہرہ، ستواں ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، تراشیدہ لب اور لمبے گھنے سیاہ بال۔ قدرت نے اسے بھرپور حسن سے نوازا تھا اور شاید اسے بھی اپنے حسین ہونے کا احساس تھا۔ اسی لیے بہت لیے دیے رہا کرتی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی بھی ساتھ آئے تھے لیکن ہمارے گھر میں ان کے ساتھ کا کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں کامران سے چند برس ہی چھوٹے ہوں گے۔ اس لیے انہیں گھمانے پھرانے کی ذمے داری اسے ہی لینا پڑی۔ نعمان بھائی صبح کے گئے شام کو واپس آتے۔ میں بھی یونیورسٹی سے آنے کے بعد ٹیوشن پڑھانے چلا جاتا اور میری واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی۔ اس طرح ہماری ملاقات رات کے کھانے پر ہی ہوتیں اور کبھی مجھے زینت سے دو چار باتیں کرنے کا موقع ملتا۔

مجھے پہلی ہی نظر میں وہ بہت اچھی لگی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ سامنے بیٹھی رہے اور میں اس سے خوب باتیں کرتا رہوں لیکن عملاً یہ ممکن نہیں تھا کیوں کہ میری مصروفیات ہی اس نوعیت کی تھیں کہ مجھے گھر میں بیٹھنے کا بہت کم موقع ملتا۔ دوسرے وہ انتہائی کم گو اور الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی اور خاص طور پر لڑکوں سے بے تکلف ہونے میں بے آرامی محسوس کرتی تھی۔ کم از کم میرے ساتھ تو اس نے بہت ہی سرد مہری کا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ میں اس سے چار باتیں کرتا تو وہ جواب میں ایک آدھ جملہ کہہ دیتی ورنہ عموماً ہوں ہاں پر ہی اکتفا کرتی۔

وہ لوگ رافعہ باجی کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی آ گئے تھے اور ان کی وجہ سے ہمارے گھر میں خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔ ابو کا خاندان بہت مختصر تھا۔ صرف ایک بڑے بھائی تھے جو ہم لوگوں سے بہت کم ملتے تھے۔ اسی طرح امی کا بھی کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس لیے ہم لوگ خالہ کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتے تھے اور وہ بھی ہم لوگوں سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ زینت میں بھی اپنی ماں کا کچھ اثر آیا ہوگا اور وہ ہم لوگوں سے تھوڑی بہت انسیت کا اظہار کرے گی لیکن وہ خاصی مختلف نظر آتی۔ اس کا رویہ دیکھ کر میں یہی سمجھا کہ شاید وہ لڑکوں سے بات کرنے میں جھجک محسوس کرتی

ہے لیکن جب ایک روز میں نے اسے کامران کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے دیکھا تو مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

اس دن میں یونیورسٹی سے جلد ہی واپس آگیا تھا۔ سب لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ امی اور خالہ کمرے میں جا چکی تھیں اور لاؤنج میں کامران، رافعہ باجی، رابعہ، زینت اور اس کے دونوں بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ کامران نے نہ جانے ایسی کیا بات کہہ دی کہ سب ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے اور ان میں زینت کا قہقہہ سب سے زوردار تھا۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ میں نے غور سے زینت کی طرف دیکھا۔ وہ کامران کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کامران کی کمپنی کو خوب انجوائے کر رہی ہے۔ اس روز پہلی بار مجھے کامران سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ یوں لگا کہ ہمیشہ کی طرح اس بار وہ زینت کو بھی مجھ سے چھین لے گا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا لیکن کسی نے میری جانب توجہ نہیں دی چنانچہ مایوس ہو کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

زینت اور کامران کے درمیان بڑھتی ہوئی بے تکلفی دیکھ کر میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے زینت سے محبت ہو گئی تھی لیکن وہ مجھے پہلی ہی نظر میں پسند آگئی تھی اور میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ اسے شریکِ زندگی بناؤں گا لیکن ابھی یہ منزل دور تھی۔ مجھ سے پہلے بڑے بھائی نعمان کا نمبر تھا۔ اس کے بعد ہی ممکن تھا کہ امی ابو، رابعہ کو رخصت کرنے کے بارے میں سوچتے اور پھر میری باری آتی۔ گویا اگلے پانچ سال تک میری شادی کا کوئی امکان نہ تھا۔ ویسے بھی میں ابھی پڑھ رہا تھا۔ ضروری نہیں کہ ڈگری ہاتھ میں آتے ہی مجھے نوکری مل جائے۔ کیا زینت اتنا عرصہ میرے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے ہی اس کی شادی ہو جائے۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ اگر امی، خالہ سے میرے اور زینت کے رشتے کی بات کریں اور وہ مان جائیں تو اس طرح زینت کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو سکتے تھے لیکن اس سے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ کیا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں منت سماجت کر کے امی کو رشتے کی بات کرنے کے لیے آمادہ کروں اور وہ انکار کر دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو یا اس کا رشتہ کہیں طے ہو گیا ہو۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ رافعہ باجی کی رخصتی کے بعد میں کسی نہ کسی طرح زینت کا عندیہ لینے کی کوشش ضرور کروں گا۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو خالہ نے بھی واپس جانے کا قصد کیا لیکن امی نے اصرار کر کے انہیں مزید ایک ہفتے کے لیے روک لیا۔ اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے میرے اور زینت کے درمیان فاصلہ کچھ کم ہو گیا۔ ہوا یوں کہ سب لوگ رافعہ باجی کے ولیمے میں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک رابعہ میرے پاس آئی اور بولی۔

”چھوٹے بھائی، ایک کام کر دو۔“

میں خود اس وقت اپنے سوٹ کے لیے ہم رنگ ٹائی تلاش کر رہا تھا لیکن وہ نہیں مل رہی تھی اور اس کی وجہ سے مجھ پر بھی تھوڑی سی جھنجلاہٹ سوار ہو گئی تھی۔ میں نے بے زاری سے کہا۔ ”کیسا کام؟“

”زینت نے ولیمے میں پہننے کے لیے ایک بہت ہی خوب صورت جوڑا بنوایا ہے لیکن اس سے میچنگ چوڑیاں لینا بھول گئی۔ ویسے تو اس کے پاس بہت سی چوڑیاں ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میچ نہیں کر رہی۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”ابھی تو روانگی میں کچھ وقت ہے تم اسے بازار لے جاؤ۔ تاکہ وہ اپنے لیے میچنگ چوڑیاں خرید سکے۔ کامران نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ورنہ وہ چلا جاتا۔“

میرے دل میں خوشیوں کے چراغ جلنے لگے۔ یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زینت میرے ساتھ بازار جائے گی۔ وہ تو سیدھے منہ مجھ سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ بات زینت نے کہی ہے؟“

”ظاہر ہے۔ میں اپنی طرف سے تو نہیں کہہ سکتی۔ بھائی جلدی کرو۔ وہ بہت پریشان ہے اور کہہ رہی ہے کہ اگر چوڑیاں نہ ملیں تو وہ ولیمہ میں نہیں جائے گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم اسے بھیج دو۔ میں بائیک نکالتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی زینت بھی آگئی۔ اس نے باہر جانے کے لیے لباس تبدیل نہیں کیا بلکہ گھر کے کپڑے ہی پہنے ہوئی تھی۔ البتہ اس نے پورے جسم کے گرد ایک سیاہ چادر لپیٹ رکھی تھی اور اس کے ایک کونے سے چہرے کو نقاب کی مانند ڈھانپ لیا تھا۔ میں اس کا یہ روپ دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔ ”آپ تو پردہ نہیں کرتیں۔“

”ہاں لیکن گھر سے باہر نکلتے وقت اپنا چہرہ ضرور ڈھانپ

لیتی ہوں۔ میں کسی غیر مرد کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتی۔"

"میں بھی تو غیر ہوں۔" میں نے تھوڑا سا شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں آپ گھر کے فرد ہیں۔ اس لیے آپ کا شمار غیروں میں نہیں ہوتا۔"

میں نے موٹر سائیکل اسٹینڈ سے اتارتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلیں۔ بیٹھ جائیں۔ دیر ہو رہی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

مجھے لگا کہ وہ میرے ساتھ بائیک پر بیٹھتے ہوئے کچھ ہچکچا رہی تھی۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بحالت مجبوری اسے بیٹھنا پڑا۔ میری بائیک میں کیریئر نہیں تھا اس لیے میں نے کہا۔ "ذرا سنبھل کر بیٹھیں۔"

وہ میرا مطلب سمجھ گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ لیے پھر کہنے لگی۔ "ذرا آہستہ چلائیں مجھے بائیک پر بیٹھنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"بے فکر رہیں۔ انشاء اللہ آپ کو بحفاظت واپس لے کر آؤں گا۔"

میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی تو وہ مجھ سے اور قریب ہوگئی۔ اس کے جسم کے لمس سے میرے پورے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ زندگی میں پہلی بار کسی عورت کی قربت کا نشہ محسوس کیا تھا۔ مجھ پر سرشاری کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس لمحے ایک عجیب سی خواہش میرے اندر ابھری۔ کاش وہ اسی طرح ہمیشہ میرے ساتھ چپک کر بیٹھی رہے اور میں بائیک چلاتا رہوں۔ اگر واپس آنے کی جلدی نہ ہوتی تو میں پورے شہر کی سڑکوں پر بائیک دوڑاتا رہتا۔

اس نے خریداری کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم گھر واپس آگئے۔ البتہ اس دوران ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میرے دل میں اُمیدوں کے چراغ روشن کردیے۔ ہوا یوں کہ جب وہ دکان پر چوڑیاں دیکھ رہی تھی تو میری نظر شوکیس میں رکھی ہوئی ٹائیوں پر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے میں اپنے لیے سوٹ سے ہم رنگ ٹائی تلاش کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ مزید وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ایک نئی ٹائی خرید لوں۔ میں نے دکان دار سے ٹائیاں دکھانے کے لیے کہا تو اس نے پورا ڈبہ میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت ٹائی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کروں۔ میں نے زینت کی طرف دیکھا۔ وہ چوڑیاں خرید چکی تھی اور میرے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا۔

"کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟"

"کیسی مدد؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"دراصل مجھے آج ولیمہ میں بلیک سوٹ پہننا ہے۔ اس کے لیے ایک ٹائی لینا چاہ رہا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس رنگ کی ٹائی کا انتخاب کروں۔"

"یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ سیاہ سوٹ پر تو ہر طرح کی ٹائی چل جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈبے میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرمئی رنگ کی ٹائی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ ٹھیک رہے گی۔"

واقعی بہت خوب صورت ٹائی تھی۔ میں اس کے ذوق کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے ٹائی کی قیمت ادا کی اور بولا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے۔ سب لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اس نے دکان سے باہر آکر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی۔ "یہاں کہیں کولڈ ڈرنک مل جائے گی۔ پیاس سے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔"

"کولڈ ڈرنک کا تو پتا نہیں۔ البتہ سامنے ایک آئس کریم پارلر نظر آرہا ہے۔ اگر آئس کریم کا موڈ ہو تو وہاں چلتے ہیں۔"

"اس وقت کچھ بھی مل جائے سب چل جائے گا۔"

میں نے اسے بائیک پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں پارلر میں چلے گئے۔ وہاں بیٹھنے کا بھی انتظام تھا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ہم نے کھڑے کھڑے ہی آئس کریم ختم کی اور جب میں نے پیسے دینے کے لیے جیب سے بٹوہ نکالا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ "یہ نہیں ہوسکتا۔ پے منٹ میں کروں گی۔"

"جی نہیں آپ ہماری مہمان ہیں اور آپ کی خاطر کرنا ہمارا فرض ہے۔"

وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔"

"اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے۔ جب ہم لاہور آئیں تو حساب برابر کر دیجیے گا۔"

"آپ ایک دفعہ آئیں تو سہی پھر دیکھیں آپ کی کیسی خاطر ہوتی ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا تھا لیکن اتنی جلدی کوئی نتیجہ اخذ کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے

کہ اس نے رسماً ایسا کہہ دیا ہو۔

گھر پہنچے تو رابعہ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن زینت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''اتنی دیر لگادی۔ یہاں سب لوگ جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بس جلدی سے کپڑے پہن کر آجاؤ۔''

وہ تیار ہونے چلی گئی تو میں بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ جلدی سے شاور لیا اور سوٹ پہن کر باہر آیا تو سب لوگ گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ میری نظر زینت پر پڑی اور میں دل تھام کر رہ گیا۔ اس کی سج دھج سب سے نرالی تھی۔ دوسری لڑکیاں بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی تھیں جب کہ اس نے گھر پر ہی ہلکا سا میک اپ کیا تھا اور اس میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ اس نے شاکنگ پنک کلر کا گھیر دار کرتہ اور اسی رنگ کا چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا اور کندھوں سے ڈھلکتا ہوا ہم رنگ دوپٹا خوب سج رہا تھا۔ دونوں کلائیاں چوڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھا تو ایک ادا سے دونوں ہاتھ میرے سامنے لہرا دیے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کے قریب جا کر کہا۔

''بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

''کون؟ میں یا چوڑیاں۔'' وہ انجان بنتے ہوئے بولی۔

''دونوں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ''آپ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس سوٹ پر یہ ٹائی خوب جچ کر رہی ہے۔''

''واقعی۔ آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی۔ رابعہ آگئی اور تنک کر بولی۔ ''چلو بھئی گاڑی میں بیٹھو۔ دیر ہو رہی ہے۔''

ولیمہ کی تقریب بڑی کلر فل رنگ تھی۔ دولہا والوں نے ہمیں ایک علیحدہ میز پر بٹھا دیا۔ مجھے زینت کے سامنے والی نشست ملی۔ اس طرح وہ مکمل طور پر میری نظروں کے حصار میں تھی۔ وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی کہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ شاید اس نے بھی میری نگاہوں کی تپش محسوس کر لی تھی۔ وہ جھینپتے ہوئے بولی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں کیا میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں؟''

''ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ کی شان میں گستاخی نہ ہو جائے۔ اس لیے زبان سے تعریف کرنے کی بجائے آنکھوں کا سہارا لے رہا ہوں۔''

''آپ کو جو کہنا ہے کہہ دیں۔ میں دوستوں کی باتوں کا برا نہیں مانتی۔''

''گویا آپ نے مجھے دوست کا درجہ دے دیا۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''ہمارے درمیان دشمنی کب تھی؟'' وہ شوخ لہجے میں بولی۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب تک آپ کا جو رویہ رہا، اسے دیکھ کر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ آپ الگ تھلگ رہنا پسند کرتی ہیں اور کسی سے بے تکلف نہیں ہوتیں۔''

''دراصل میری عادت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ اپنی طرف سے پہل نہیں کرتی۔ اسی لیے لوگ مجھے مغرور، بدتمیز اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے ہیں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے اگر کسی سے دوستی کرلوں تو حتی الامکان اسے نبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''آپ تو مجھ سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھیں پھر یہ انقلاب کیسے آگیا؟''

''اس کی تھوڑی بہت ذمے داری آپ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ آپ کی مصروفیت دیکھ کر میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ہمیں کمپنی دینے کے لیے آپ کے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ اس لیے میں نے بھی آپ سے بے تکلف ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن آج آپ نے جس طرح میرا مسئلہ حل کیا اس کے بعد میری رائے بدل گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ دوسروں کے کام آنا سب سے بڑی نیکی ہے۔''

''کیا میں اُمید کروں کہ یہ دوستی آگے چل کر مزید مستحکم ہو سکتی ہے۔''

''کیوں نہیں، میں ہمیشہ آپ کو سچا اور مخلص دوست سمجھتی رہوں گی۔''

مجھے یوں لگا جیسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہو۔ کہاں تو وہ مجھ سے بات کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی اور اب اس نے مجھے دوست بنا لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے اور عین ممکن ہے کہ کسی وقت یہ دوستی محبت میں بدل جائے۔ اُمید پر دنیا قائم ہے۔ میرے دل نے تسلی دی اور میں مطمئن ہو کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے سات دنوں میں وہ بڑی تیزی سے میرے قریب آئی۔ میں نے بھی اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کے لیے اپنی مصروفیات میں کمی کر دی تھی۔ پہلے یونیورسٹی میں خالی پیریڈ کے دوران لائبریری چلا جاتا تھا لیکن اب گھر آنے لگا۔ ٹیوشن سے بھی ایک ہفتہ کی چھٹی کر لی تھی۔ اس طرح میں یونیورسٹی سے آنے کے بعد گھر میں ہی

رہتا۔ میں اور زینت خوب باتیں کرتے۔ کیرم کھیلتے۔ ایک دو مرتبہ میں اسے اور رابعہ کو آئس کریم کھلانے بھی لے گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کامران بھی کباب میں ہڈی بننے کی کوشش نہ کرے لیکن وہ گھر میں بہت کم نظر آتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ہی گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ وہ روزانہ ہی زینت کے بھائیوں کو گھمانے چلا جاتا اور ان کی واپسی رات گئے ہوتی۔

جس دن زینت کی روانگی تھی۔ اس رات میں اور زینت بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بار بار میرے دل میں ایک ہی خواہش سر ابھار رہی تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی روانگی ملتوی ہو جائے لیکن اس کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے بے حد جذباتی انداز میں زینت سے کہا۔

”آپ لوگوں کے آنے سے بڑی رونق ہو گئی تھی۔ میں آپ کو بہت مس کروں گا۔“

”جانا تو ہے آج نہیں تو کل۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ کی باری ہے۔ چھٹیوں میں لاہور ضرور آئیں۔“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اگر حالات نے اجازت دی تو ضرور آؤں گا لیکن یہ آنا جانا کب تک لگا رہے گا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمیشہ کے لیے کراچی آ جائیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”ہونے کو تو سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہو۔“

اس کا جواب سن کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں دل کی بات کہی تھی اور اس نے بھی اسی انداز میں جواب دے کر مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اگر اس کے لیے میرا رشتہ گیا تو وہ انکار نہیں کرے گی۔

اس زمانے میں موبائل فون کی سہولت نہیں تھی۔ ٹیلی فون بھی چند گھروں میں ہوتا تھا۔ میں نے اس سے گھر کا فون نمبر مانگا تو وہ اس شرط پر تیار ہوئی کہ میں وقت بے وقت اسے فون نہیں کروں گا۔ خالو بے حد سخت گیر اور قدامت پسند انسان تھے اور انہیں پسند نہیں تھا کہ لڑکیاں نامحرموں سے بات کریں۔ ہمارے درمیان یہ طے پا گیا کہ وہ موقع دیکھ کر خود ہی مجھے فون کیا کرے گی۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ وہ کم از کم مجھ سے فون پر بات کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

اگلے چند ماہ بڑی بے کیفی میں گزرے۔ امتحان سر پر آ گئے تھے۔ اس لیے میں سب کچھ بھول کر پڑھائی میں لگ گیا۔ یہ میرا فائنل ایئر تھا اور اس میں اچھے نمبروں سے پاس

ہونا بہت ضروری تھا۔ زینت بہت محتاط لڑکی تھی۔ اس نے یہاں سے جانے کے بعد صرف دو یا تین مرتبہ فون کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ امتحان کے دنوں میں وہ مجھے بالکل ڈسٹرب نہیں کرے گی۔ اس کی طرف سے ناامید ہو کر میں نے اپنا دل پوری طرح پڑھائی میں لگا لیا۔ میں نے خوب محنت کی تھی۔ اس لیے اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا اور تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے جاب بھی مل گئی۔ اب میں شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ نعمان بھائی کی شادی ہو تا کہ اس کے بعد میں بھی امی سے زینت کے رشتے کی بات کرنے کے لیے کہوں لیکن ایسا لگتا تھا کہ نعمان بھائی کو شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ابو کی ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے پورے گھر کی ذمے داری اپنے سر لے لی تھی اور اسی وجہ سے شاید انہیں اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔

میں نے فون پر زینت کو اپنی کامیابی اور ملازمت ملنے کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر اصرار کر کے مجھے لاہور آنے کی دعوت دی لیکن میرے لیے فوری طور پر لاہور جانا ممکن نہ تھا کیوں کہ نئی نئی ملازمت تھی اور چھ ماہ کی آزمائشی مدت کے دوران میں کوئی چھٹی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی تو وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی پھر اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں موقع ملتے ہی لاہور کا چکر ضرور لگاؤں گا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے دل میں یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے گو کہ وہ ٹیلی فون پر بہت کم گفتگو کرتی تھی لیکن اس کا ایک ایک لفظ مجھ سے چاہت کی گواہی دیتا تھا۔ پہلے کی نسبت اس کے لہجے میں شیرینی آ گئی تھی اور وہ اس انداز میں مجھ سے بات کرتی جس میں اپنا پن جھلکتا تھا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ کھل کر اپنا مدعا بیان کر دوں اور اس کے دل کا حال جاننے کی بھی کوشش کروں لیکن پھر خیال آیا کہ جب کہے بغیر ہی سب کچھ ظاہر ہو گیا ہے تو بے وقت کی راگنی چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

مجھے رہ رہ کر یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں زینت کے والدین اس کا رشتہ کسی اور سے نہ کر دیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس وقت کے آنے سے پہلے ہی زینت کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو جائیں۔ اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ نعمان بھائی تھے۔ جب تک ان کی شادی نہ ہو جاتی میں اپنی بات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے نعمان بھائی کو شادی کے لیے آمادہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور ایک دن ہمت

کر کے ان سے کہہ ہی دیا۔

''بھائی! آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟''

وہ رات کو کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بستر پر لیٹے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ میرا سوال سن کر چونک گئے اور بولے۔ ''تمہیں میری شادی کی فکر کیوں ہے؟''

''صرف میں ہی نہیں بلکہ سب لوگ اس بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ رافعہ باجی کے جانے کے بعد امی کتنی تنہا ہو گئی ہیں۔ رابعہ کالج چلی جاتی ہے اور ویسے بھی اسے گھر کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سب کچھ امی کو ہی کرنا پڑتا ہے اگر آپ کی شادی ہو جائے تو ان کی تنہائی دور ہو جائے گی اور انہیں تھوڑی بہت مدد بھی ملتی رہے گی۔''

''اگر تمہیں امی کی اتنی فکر ہے تو خود شادی کیوں نہیں کر لیتے مجھے کیوں پھنسا رہے ہو؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ سے پہلے میری شادی ہو جائے۔ آپ آگے بڑھیں گے تو میرا نمبر آئے گا۔''

''میں خود تو امی سے نہیں کہہ سکتا کہ میری شادی کر دیں اگر تم چاہو تو بات کر کے دیکھ لو۔''

نعمان بھائی سے مطمئن ہونے کے بعد میں سوچنے لگا کہ امی سے کس طرح بات کی جائے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں جواب میں ڈانٹ سننے کو نہ مل جائے کیوں کہ میں بچپن سے ہی ان کی جھڑکیاں سنتا آیا تھا۔ لاڈ پیار تو درکنار انہوں نے کبھی سیدھے منہ مجھ سے بات بھی نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے میں ان کا سوتیلا بیٹا ہوں۔ ان کی ساری محبت دونوں بیٹیوں اور کامران کے لیے وقف تھی۔ پہلے وہ نعمان بھائی کو بھی زیادہ لفٹ نہیں کرواتی تھیں۔ البتہ جب سے وہ کماؤ پوت ہوئے تو گھر میں ان کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والے انسان تھے اور ابو بھی انہیں بہت چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے امی کے رویے کی کبھی پروا نہیں کی۔ اس کے برعکس میں بہت حساس واقع ہوا تھا اور ذرا سی بات میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی۔

بہت سوچنے کے بعد میں نے کامران کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ امی کا انتہائی چہیتا اور لاڈلا بیٹا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر وہ نعمان بھائی کی شادی کی بات کرے گا تو وہ ضرور مان جائیں گی۔ اس رات جب ہم سونے کے لیے لیٹے تو میں نے موقع محل دیکھ کر بات چھیڑ دی۔ شاید میں بتانا بھول گیا کہ ہم دونوں کا ایک ہی کمرہ تھا۔ نعمان بھائی نے اپنے لیے اوپر ایک کمرا بنوالیا تھا۔ کامران سونے سے پہلے کمرے کی لائٹ بند کرنے کے لیے اٹھا تو میں نے کہا۔

''ایک منٹ، مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔''

اس نے چونکتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''مجھے نیند آرہی ہے کیا وہ بات صبح نہیں ہو سکتی۔''

''نہیں صبح مجھے جلدی آفس جانا ہے۔ اس لیے یہی وقت مناسب ہے۔''

''اچھا کہو۔ کیا بات ہے؟'' وہ بستر کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اب نعمان بھائی کی شادی ہو جانی چاہیے۔''

''خیریت تو ہے۔ تمہیں ان کی شادی کی فکر کیوں ہو رہی ہے۔ کہیں اپنا راستہ تو سیدھا نہیں کرنا چاہ رہے؟''

''نہیں یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ رافعہ باجی کے جانے کے بعد گھر بہت سونا ہو گیا ہے اور گھر کے کام کا سارا بوجھ امی پر آ گیا ہے۔ نعمان بھائی کی شادی ہو جائے تو گھر میں رونق ہو جائے گی اور امی کو تھوڑا بہت سہارا ملے گا۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن یہ تو امی اور ابو کو سوچنا چاہیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''ان کی خاموشی میری سمجھ سے باہر ہے۔ نعمان بھائی کو تو تم جانتے ہو۔ وہ کبھی اپنے منہ سے نہیں کہیں گے۔ اس لیے ہمیں ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم امی سے بات کر کے دیکھو۔''

''تم خود یہ نیک کام کیوں نہیں کر لیتے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم ان سے کہو۔ وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔''

''واقعی کچھ کرنا پڑے گا۔ اگر ہم لوگ اسی طرح بیٹھے رہے تو ساری اچھی لڑکیاں ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ میں امی سے بات کر لوں گا لیکن ایک شرط پر۔''

''دیکھو میری شادی میں ابھی دیر ہے۔ پہلے نعمان بھائی پھر تم اور اس کے بعد میرا نمبر آئے گا اگر بیچ میں رابعہ کا سلسلہ چل نکلا تو مزید تاخیر ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ نعمان بھائی کی شادی کے فوراً بعد امی میرا رشتہ بھی طے کر دیں ورنہ وہ لڑکی ہاتھ سے نکل جائے گی اور اس سلسلے میں تم اور نعمان بھائی میری مدد کرو گے۔''

اب میرے چونکنے کی باری تھی۔ کامران تو چھپا رستم

نکلا۔ بڑے بھائیوں کی شادی کا دور دور تک پتا نہیں تھا اور اس نے لڑکی بھی پسند کرلی۔ میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے پوچھا۔

''کون ہے وہ خوش نصیب؟''

وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''زینت مجھے پسند ہے۔ میں اسی سے شادی کروں گا۔''

اس کے بعد مجھ سے کچھ نہ سنا گیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میرے کان بند ہو چکے تھے۔ میں نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ اب میرے پاس کہنے سننے اور سوچنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ کامران نے ہمیشہ کی طرح سب سے قیمتی متاع مجھ سے چھین لی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسے جو چیز پسند آجائے وہ اسے حاصل کرکے چھوڑتا ہے۔ اب میرے پاس خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کامران کی پسند پر میں اپنا حق جتا سکوں۔ مانا کہ زینت کوئی بے جان چیز نہیں بلکہ ایک جیتا جاگتا وجود تھی اور عین ممکن تھا کہ وہ کامران کا پروپوزل قبول نہ کرتی لیکن اب میں اپنے بھائی کے مقابلے پر نہیں آسکتا تھا۔ مجھے اس کا رقیب بننا گوارہ نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی سے شکست تسلیم کرلی۔

وہ رات میں نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزاری۔ اچھا ہوا کہ زینت سے دل کی بات نہیں کہی تھی اور معاملہ اشاروں کنایوں تک ہی محدود تھا۔ اس طرح میں بے وفائی کا طعنہ سننے سے بچ گیا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زینت کے دل میں میرے لیے کیا جذبات تھے۔ آیا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے یا محض دوست سمجھ کر حسن سلوک سے پیش آرہی تھی۔ اگر وہ مجھے چاہتی ہے تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب علی الاعلان کامران نے اس کے بارے میں اپنی پسندیدگی ظاہر کردی تھی اور ہمیشہ کی طرح سب گھر والے اسی کا ساتھ دیتے۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ راستے سے ہٹ جاؤں۔ اب یہ زینت اور اس کے گھر والوں پر منحصر ہے کہ وہ کامران کا پروپوزل قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

دوسرے دن میں نے ایک اچھی شہرت رکھنے والے ریکروٹنگ ایجنسی سے رابطہ کیا اور بیرون ملک ملازمت کی خواہش ظاہر کی۔ میں مشرق وسطیٰ کے کسی ملک میں سیٹل ہونا چاہ رہا تھا کہ گھر والوں سے زیادہ دور نہ جاؤں اور سال میں کم از کم ایک مرتبہ پاکستان آسکوں حالانکہ میرے کئی دوست امریکا جا چکے تھے اور مجھے بھی بلانا چاہ رہے تھے لیکن میں کئی وجوہات کی بنا پر امریکا، کینیڈا یا یورپ کے کسی ملک میں رہنے کے خلاف تھا۔ جس ایجنسی سے میں نے بات کی تھی ان کے پاس خلیجی ریاستوں کی جاب آتی رہتی تھیں۔ چند ہفتوں کے اندر ہی مجھے بھی دبئی میں ملازمت مل گئی جس میں معقول تنخواہ کے علاوہ رہائش، ٹرانسپورٹ اور میڈیکل بھی کمپنی کے ذمے تھا۔

جونہی گھر والوں کو میرے باہر جانے کی خبر ہوئی۔ ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ابو کے جھکے ہوئے کندھے پھر سیدھے ہو گئے جیسے ان کی جوانی پھر لوٹ آئی ہو۔ امی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ میری بلائیں لیتے نہیں تھک رہی تھیں۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ اب وہ رابعہ کی شادی دھوم دھام سے کرسکیں گی۔ رابعہ بھی میرے آگے پیچھے چکر لگا رہی تھی۔ کامران ہمیشہ کی طرح اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اس نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ نعمان بھائی نے کھل کر میرے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ انہوں نے کہا۔ ''کیا ضرورت ہے دربدر ہونے کی۔ تم کوالیفائیڈ انجینئر ہو۔ اچھی خاصی جاب ہے۔ آگے بھی ترقی کے امکانات ہیں پھر کیوں جا رہے ہو؟''

''یہاں کے پانچ سال اور وہاں کی ایک سال کی کمائی کے برابر ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی شادی ہوگی تو ذمے داریاں بھی بڑھ جائیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پُرسکون ہو کر نئی زندگی کا آغاز کریں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔ کامران کی جاب لگ جائے گی تو ہم تینوں مل کر بآسانی یہ بوجھ بانٹ سکتے ہیں۔''

''بھائی مجھے جانے دیں۔ ایک موقع ملا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں روکوں گا نہیں لیکن مجھے تمہاری فکر رہے گی۔''

میں نے دبئی جانے کی تیاری شروع کردی۔ اچانک ہی مجھے زینت کا خیال آیا۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ فون کرکے اسے اپنے دبئی جانے کی اطلاع دوں لیکن ایسا نہ کرنا غیر اخلاقی ہوتا۔ وہ یہی سوچتی کہ شاید میں نے اسے غیر سمجھا۔ اسی لیے بتانا ضروری نہ سمجھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اسے فون کیا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ریسیور اسی نے اٹھایا۔

''کیا حال ہے؟'' میں نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔ ''خیریت تو ہے اس وقت کیسے فون کرلیا؟''

"یہ بتانے کے لیے کہ مجھے دبئی میں ملازمت مل گئی ہے اور اسی ہفتے میری روانگی ہے۔"

"واؤ یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔" اس نے چہکتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ بڑے آدمی ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں جا کر ہم غریبوں کو بھول جائیں۔"

اس کی بات سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح مادی انداز میں سوچ رہی تھی جب کہ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ یہ خبر سن کر اس کا دل بجھ جائے گا اور وہ کچھ اس طرح کا تاثر دے گی۔ جیسے اسے میرے جانے کا سن کر دکھ ہوا ہو۔ لیکن وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "ٹھہریں میں امی کو بلاتی ہوں۔ آپ یہ خوش خبری انہیں بھی سنا دیں۔"

دل چاہا کہ فون بند کر دوں لیکن اب خالہ سے بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئیں اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں لیکن میرے سینے میں ایک پھانس سی چبھ کر رہ گئی تھی۔ زینت کی لاتعلقی اور بے رخی نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کیا وہ مجھے ایک دوست اور کزن سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ شاید ایسا ہی ہے۔ ورنہ اس کا لہجہ جذبات سے خالی نہ ہوتا۔ اسے مجھ سے کوئی انسیت نہیں تھی۔ میں ہی بلاوجہ خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔

میں ٹوٹے ہوئے دل اور ناکام آرزو کا ماتم کرتے ہوئے دیارِ غیر میں آ گیا۔ شروع کے چند دن تو بہت سخت گزرے۔ اپنا گھر، محلہ، شہر، سب کچھ بہت یاد آ رہا تھا پھر آہستہ آہستہ ماحول کا عادی ہوتا گیا۔ میں سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے آپ کو پوری طرح مصروف کر لیا۔ صبح سے شام تک کام کرتا اور رات کا کھانا کھا کر سو جاتا۔ کوئی دوست تھا نہ ہم راز۔ جس سے دل کی بات کہہ سکتا۔ کبھی کبھی نعمان بھائی کو فون کر کے گھر کے حالات معلوم کر لیتا۔ وہ بے چارے میری طرف سے بہت فکرمند تھے۔ ہمیشہ مجھے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کرتے۔ میں نے پہلا ڈرافٹ انہی کے نام بھیجا تو وہ بہت حیران ہوئے اور بولے۔

"یہ پیسے میرے پاس تمہاری امانت ہیں۔ جب تم آؤ گے تو لوٹا دوں گا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ پیسے میں نے رکھنے کے لیے نہیں بلکہ خرچ کرنے کے لیے بھیجے ہیں۔ آپ میری فکر نہ کریں میرے پاس اپنے گزارے کے لیے بہت کچھ ہے۔"

چھ ماہ بعد معلوم ہوا کہ نعمان بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے میں نے امی سے کہا کہ شادی کی تاریخ آگے بڑھا دیں کیوں کہ میں سال پورا ہونے پر وطن واپس آ سکتا تھا لیکن وہ بولیں کہ ایسا ممکن نہیں کیوں کہ لڑکی کے والدین کینیڈا شفٹ ہو رہے ہیں۔ اس لیے شادی اسی تاریخ پر ہو گی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ ایک بار پھر گھر والوں نے مجھے غیر اہم ہونے کا احساس دلا دیا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ انہیں صرف میرے پیسے سے دلچسپی تھی۔ میں شادی میں شرکت کروں یا نہیں، اس سے انہیں کوئی فرق نہ پڑتا۔

ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ کیوں کہ شادی میں خالہ کا خاندان بھی ضرور شرکت کرتا اور میں زینت کا سامنا کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اب کامران نے کھل کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اس لیے یقیناً وہ زینت کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا اور شاید وہ بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ میری آنکھیں یہ منظر کیسے دیکھ سکتی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امی دستِ سوال دراز کرتیں اور شاید خالہ خالو کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ کامران گھر کا لڑکا تھا اور غیروں کو اپنی شخصیت سے متاثر کرنے کا فن جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ زینت بھی ماں باپ کی مرضی کے آگے سر جھکا دے گی۔

نعمان بھائی کی شادی ہو گئی۔ اس موقع پر کسی کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی۔ صرف نعمان بھائی نے ایک مرتبہ فون کر کے کہا تھا کہ میں کسی طرح بھی دو تین دن کے لیے پاکستان آ جاؤں جو عملاً ممکن نہ تھا۔ وہ لوگ میری خاطر کمپنی کا قانون نہیں توڑ سکتے۔ میں نے اپنے باس سے بات کی تو اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بغیر شادی ہو سکتی ہے لیکن خدانخواستہ نوکری چلی گئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ایسی ملازمت قسمت سے ملتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ بھائی کی شادی کو بھول کر کام پر توجہ دو۔"

پندرہ دن بعد کامران کا فون آیا۔ وہ خوشی سے بے حال ہو رہا تھا۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بتایا۔

"چھوٹے بھائی، خالہ مان گئی ہیں۔ انہوں نے زینت کا رشتہ مجھ سے طے کر دیا ہے۔ خالو نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور زینت...... میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے گو کہ میری اس سے براہ راست بات نہیں ہو سکی لیکن اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ اس نے مجھے قبول کر لیا ہے۔ البتہ خالہ نے شرط لگا دی ہے کہ وہ شادی اس وقت کریں گی جب میری جاب ہو جائے گی۔ اس کے لیے وہ سال دو

سال انتظار کر سکتی ہیں۔ چھوٹے بھائی میرا رزلٹ آنے والا ہے تم میرے لیے دبئی میں کوشش کرو۔ یہاں کی ملازمت میں تو میرا گزارہ نہیں ہوگا۔‘‘

وہ بولے جا رہا تھا اور میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پہلے میں نے کامران کی بات کو سنجیدگی سے سن لیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس نے یونہی کہہ دیا ہے لیکن اب تو اس نے امی کو بیچ میں ڈال کر زینت کا ہاتھ مانگ لیا اور یہ رشتہ قبول بھی کر لیا گیا۔ اس طرح اس نے اپنی ڈگر پر چلتے ہوئے میری عزیز ترین متاع مجھ سے چھین لی یہ اس کا ہمیشہ کا وتیرہ تھا۔ میری جو چیز اسے پسند آجائے میری قمیص، کوٹ، ٹائی، کتابیں، پین، گھڑی، کیلکولیٹر اور لیپ ٹاپ غرض ہر چیز اس کی دسترس میں تھی لیکن زینت کوئی چیز نہیں ایک جیتا جاگتا وجود تھی لیکن اس نے اسے بھی نہیں بخشا اور ہمیشہ کی طرح اسے بھی مجھ سے چھین لیا۔

’’کیا ہوا چھوٹے بھائی؟ تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں۔ کیا تمہیں یہ خبر سن کر خوشی نہیں ہوئی؟‘‘

وہ مسلسل میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا تھا۔ میں نے دماغ میں اٹھنے والی ٹیسوں کو دباتے ہوئے کہا۔ ’’نہیں بہت خوشی ہوئی۔ خدا تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔‘‘

’’پھر مجھے کب بلا رہے ہو؟‘‘

’’تمہارا رزلٹ آجائے تو اپنے کاغذات بھیج دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں جلد بلا لوں۔‘‘

’’صرف کوشش نہیں تمہیں ہر قیمت پر یہ کام کرنا ہے۔ ورنہ خالہ یہ رشتہ ختم بھی کر سکتی ہیں۔ چھوٹے بھائی اچھی طرح سن لو۔ اگر زینت نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔‘‘

’’مریں تمہارے دشمن۔‘‘ میں نے پورے خلوص سے کہا۔ ’’فکر نہ کرو۔ میں تمہیں جلد ہی بلا لوں گا۔‘‘

انسان سوچتا کچھ ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ کامران کا رزلٹ آتے ہوئے ایک مہینا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ شدید بیمار ہو گیا۔ اسے ہیپاٹائٹس سی ہو گیا تھا۔ پہلے تو اسے معمولی یرقان سمجھ کر جھاڑنے والے بابا کے پاس لے جایا گیا پھر حکیم کی باری آئی لیکن یہ کوئی معمولی بیماری نہیں تھی جو جھاڑ پھونک اور حکیم کی دوا سے ٹھیک ہو جاتی جب مرض حد سے بڑھ گیا تو فیملی فزیشن کے کہنے پر اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اس کے مختلف ٹیسٹ ہوئے لیکن جب مرض کی تشخیص ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے علاج تو شروع کر دیا لیکن وہ اس کی صحت یابی کے بارے میں کچھ بتانے سے گریز کر رہے تھے۔

جب مجھے اس کی بیماری کی اطلاع ملی تو رہا نہ گیا۔ سال پورا ہونے میں ابھی ایک مہینا باقی تھا اس کے بعد ہی مجھے چھٹی ملتی لیکن جب میں نے باس کو کامران کی حالت سے آگاہ کیا تو اس کا دل پسیج گیا اور اس نے انسانی ہمدردی کے پیش نظر افسران بالا سے میری چھٹی کی سفارش کی اور اس طرح میں کامران سے ملنے پاکستان آگیا۔ اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا تھا۔ پورے چہرے، جسم اور آنکھوں پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ خالہ، خالو اور زینت بھی آئے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے سب لوگوں کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نحیف آواز میں بولا۔

’’اچھا ہوا چھوٹے بھائی کہ تم آگئے۔ میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے تم سے بہت باتیں کرنی ہیں۔‘‘

’’فی الحال تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ پہلے ٹھیک ہو جاؤ پھر جتنی چاہے باتیں کر لینا۔‘‘

’’میرے بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ ڈاکٹرز نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن میں ان کے چہرے پڑھ سکتا ہوں، وہ میری طرف سے نااُمید ہو چکے ہیں۔ پھر نہ جانے یہ موقع ملے یا نہیں۔ زینت کو بھی بلا لو۔ اس کی موجودگی میں یہ بات ہو جائے تو اچھا ہے۔‘‘

میں جلدی سے باہر گیا اور زینت کو لے کر آگیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولا۔ ’’زینت مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں اور چھوٹے بھائی کو ان جانے میں بڑا دکھ دیا ہے۔ خدا کی قسم اگر یہ معلوم ہوتا کہ تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو کبھی تمہاری گردن میں اس رشتے کا طوق نہ ڈالتا۔‘‘

’’خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ کامران۔‘‘ زینت بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ’’اس وقت ہم سب کے لیے تمہاری زندگی سے زیادہ اہم کچھ نہیں۔‘‘

’’مجھے مت روکو زینت، ورنہ میری روح ہمیشہ بے چین رہے گی۔ چھوٹے بھائی اگر یہ معلوم ہوتا کہ تم زینت کو پسند کرتے ہو تو کبھی اس کا نام بھی زبان پر نہ لاتا۔ میں نے جب پہلی بار تمہارے سامنے زینت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تو تم ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئے اور میں یہی سمجھا کہ تم میری خوشی میں خوش ہو۔ جب میں نے

امی سے بات کی۔ اس وقت بھی مجھے اس حقیقت کا علم نہیں تھا اور شاید اب بھی نہ ہوتا اگر میں تمہاری ڈائری نہ پڑھ لیتا۔''

میں اور زینت دونوں ہی چونک گئے۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میری چوری پکڑی گئی تھی۔ یہ بتانا بھول گیا کہ مجھے ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ زینت سے پہلی ملاقات کے بعد دبئی جانے تک مجھ پر جو گزری۔ وہ سب ڈائری میں لکھ رکھا تھا۔ البتہ دبئی جاتے وقت اپنے سامان میں یہ ڈائری رکھنا بھول گیا پھر نہ جانے یہ کس طرح کامران کے ہاتھ لگ گئی اور اس نے وہ سب کچھ پڑھ لیا جسے میں نے ساری دنیا سے چھپایا ہوا تھا۔

''چھوٹے بھائی تم جانتے ہو مجھے ہمیشہ سے تمہاری چیزوں میں گھسنے کی عادت تھی۔ ایک دن کچھ لکھنے کے لیے رائٹنگ پیڈ کی ضرورت پڑی تو تمہاری الماری کھول کر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی پرانا پیڈ پڑا ہوا ہو۔ میری مطلوبہ چیز تو نہیں ملی لیکن تمہاری ڈائری پر میری نظر پڑی تو یہ سوچ کر اسے اٹھالیا کہ اس میں سے ایک خالی صفحہ پھاڑ کر اپنا کام چلا لوں گا لیکن ڈائری کے تمام صفحات بھرے ہوئے تھے۔ میں نے مارے تجسس کے انہیں پڑھنا شروع کیا اور ایک صفحے پر زینت کے بارے میں تمہارے احساسات و جذبات جان کر ایک جھٹکا سا لگا مزید صفحات پڑھ کر احساس ہوا کہ مجھ سے انجانے میں کتنی بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ میں نے اپنے ہی بھائی کی محبت پر ڈاکا ڈالا تھا۔ آفرین ہے زینت پر کہ اس نے بھی والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا اور اپنی محبت کی قربانی دے دی لیکن پچھتاوے کا احساس ناگ بن کر مجھے ڈس رہا تھا اور اس غلطی کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ کئی بار سوچا کہ اس رشتے سے انکار کردوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ انکار کی وجہ کیا بتاؤں گا۔ انہی دنوں اس بیماری کا انکشاف ہوا اور میں وقتی طور پر اپنے علاج میں مصروف ہو گیا لیکن اب مجھے اپنے بچنے کی کوئی اُمید نہیں آرہی۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنی غلطی کی تلافی کردوں اور اس کی یہی ایک صورت ہے کہ تمہاری امانت واپس لوٹا دوں۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میرے بھائی۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میری ڈائری پڑھ لی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ میں اسی روز تمہارے حق میں دستبردار ہو گیا تھا جب تم نے کہا کہ زینت کو پسند کرتے ہو۔ میں نے بھی مزاحمت نہیں کی اور ہمیشہ تمہاری خواہش کے سامنے سر جھکا دیا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بھائی کا ہی رقیب بن جاتا۔ میں جانتا تھا کہ تم انتہائی ضدی، سرکش اور ہٹ دھرم ہو۔ جو چیز پسند آجائے اسے حاصل کر کے ہی دم لیتے ہو اسی لیے میں نے تمہاری خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔''

''یہ میری آخری خواہش ہے چھوٹے بھائی۔'' اس کی نقاہت بڑھتی جارہی تھی۔ ''آج کے بعد تم سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ کسی چیز پر زبردستی قبضہ نہیں جماؤں گا۔'' اس نے تکیے کے نیچے سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا۔ ''میں نے وصیت لکھ دی ہے۔ میرے مرنے کے باوجود زینت اسی گھر میں آئے گی اور تم اسے اپنی دلہن بنا کر لاؤ گے۔ میں نے ہمیشہ اپنی بات منوائی ہے اور تمہیں میری یہ ضد بھی پوری کرنا ہوگی ورنہ تم جانتے ہو کہ میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔''

یہ آخری الفاظ تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے۔ اس نے زور کی ہچکی لی اور اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ میں اور زینت دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ ہماری آہ و بکائیں سن کر دوسرے لوگ بھی اندر آگئے اور کسی کو بھی اپنے آنسوؤں پر اختیار نہ رہا۔ ہمارے لیے وہ قیامت کی گھڑی تھی۔ گھر بھر کا لاڈلا میرا خودسر اور ضدی بھائی دنیا سے چلا گیا لیکن جاتے جاتے بھی اپنی ضد پوری کر گیا۔

چالیسویں کے بعد میں نے بجھے ہوئے دل کے ساتھ وہ لفافہ امی کے حوالے کیا تو وہ اس میں رکھا ہوا خط پڑھ کر رونے لگیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں خاموش کروایا تو وہ بولیں۔ ''میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کئی دنوں سے بے چین تھا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ یہ میرے بیٹے کی آخری خواہش ہے جو ضرور پوری ہوگی۔''

امی نے ایک بار پھر خالہ کے سامنے دامن پھیلا دیا۔ وہ اتنی سنگ دل نہ تھیں کہ غمزدہ بہن کی بات نہ مانتیں میرا رشتہ قبول کرلیا گیا اور کچھ عرصہ بعد زینت میری زندگی میں آگئی۔ ضروری کارروائی مکمل ہونے کے بعد میں اسے اپنے ساتھ دبئی لے گیا۔ اب میں اور زینت خوش گوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں لیکن کامران کی یاد اکثر ہمیں بے چین کردیتی ہے پھر ہم گھنٹوں اس کی یاد میں آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ اگر کامران کو پہلے روز ہی بتا دیتا کہ میں اور زینت ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو اس سے یہ غلطی سرزد نہیں ہوتی اور وہ بعد میں پچھتاوے کی آگ میں نہ جلتا۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔

''شہریار!'' امجد نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اس بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان سے ملو یہ ہیں انکل حشمت، یہ برٹش آرمی میں کرنل ہوا کرتے تھے۔ آج کل جنوبی افریقہ میں رہتے ہیں۔''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے بھی بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ''مسٹر! ذرا اپنے بارے میں بھی بتاؤ۔ کہاں سے تعلق ہے۔''

''میرے دادا برٹش آرمی میں میجر ہوا کرتے تھے۔'' میں نے بتایا۔

''برٹش آرمی میں میجر!'' وہ بوڑھا چونک گیا تھا۔

''کیا نام تھا تمہارے دادا کا؟''

''دلدار حسین۔'' میں نے بتایا۔

''دلدار حسین۔'' وہ پھر سوچنے لگا تھا۔ ''تمہارے دادا رہتے کہاں تھے؟ کچھ معلوم ہے تمہیں؟''

''کیوں نہیں جناب، اپنے باپ دادا کی شاندار روایات کے بارے میں جاننا تو بہت ضروری ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ اچھی بات ہے۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''انسان کو اپنی بیک گراؤنڈ یاد رکھنا چاہیے۔ ویسے تم نے بتایا نہیں کہ ان کی رہائش کہاں تھی۔''

''کرشن نگر میں ان کی بہت بڑی حویلی تھی جناب۔'' میں نے فخریہ طور پر بتایا۔

شناخت

محترم ایڈیٹر
سلام مسنون

لوگ دوسروں کی کہانیاں سناتے ہیں، میں خود بیتی کے ساتھ حاضر ہوا ہوں، مجھے شناخت کا کون سا مسئلہ درپیش تھا یہی کچھ بیان کیا ہے۔ دراصل یہ واقعہ ہر ایک کے لیے سبق کا درجہ رکھتا ہے۔

شہریار
(لاہور)



''کرشن نگر۔ دلدار حسین۔'' وہ بڑبڑانے لگا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''کہیں تم اس کی بات تو نہیں کر رہے جس کے ماتھے پر زخم کا ایک نشان تھا۔''

''جی جناب میں ان ہی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ نشان کسی جنگ میں لگا تھا؟''

''جنگ میں نہیں تمہارے دادا کپڑے دھوتے ہوئے دھوبی گھاٹ میں گر پڑے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''ماتھے پر زخم آ گیا تھا۔''

''کپڑے دھوتے ہوئے!'' میں بھڑک اٹھا تھا۔ ''وہ کپڑے کیوں دھونے لگے۔''

''اس لیے کہ تمہارے دادا ہماری چھاؤنی کے دھوبی تھے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا بات کر رہے ہیں وہ دھوبی کیوں ہونے لگے۔''

''ارے بھائی! اس میں ناراض ہونے والی کون سی بات ہے۔ وہ ایک محنت کرنے والا انسان تھا۔ پورے شہر میں اس سے بہتر کپڑے دھونے والا کوئی نہیں تھا اور ہاں اس کا ایک شوق بھی تھا ہم فوجیوں کی وردیاں دھلنے کے لیے اس کے پاس جایا کرتی تھیں وہ وردیاں پہن پہن کر تصویریں کھنچوایا کرتا۔ کبھی کرنل کی وردی پہن لی کبھی میجر بن گیا۔''

اس سے زیادہ سننا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی ہنس رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں میری عزت خاک میں مل کر رہ گئی تھی۔

وہ معززین میں شامل تھا۔ وہ لوگ جن کا ماضی تابناک رہا ہو۔ جن کے باپ دادا شاندار روایات کے امین رہے ہوں۔ جو کسی بڑے عہدے پر فائز رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کے درمیان دھوبی کے پوتے کی کیا قیمت ہو سکتی تھی۔

میں بھنا کر باہر آیا تھا۔ میرے جاننے والے مجھے آوازیں دیتے رہ گئے۔ لیکن میں ان کو نظر انداز کرتا ہوا کلب سے باہر آ گیا۔ ایسی توہین میری پہلے کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔

میرے ڈرائیور نے مجھے دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہ اپنی گاڑی لے کر میرے پاس آ گیا۔ کیا شاندار گاڑی تھی میری۔ لیکن اب ایسی چیزیں کیا فائدہ دے سکتی تھیں۔ میری عزت تو تباہ ہو چکی تھی۔

میں گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔ ''شہریار صاحب ایک منٹ۔''

میں رک کر اس شخص کو دیکھنے لگا جو تیز تیز چلتا ہوا میرے پاس آ رہا تھا۔ وہ ایک عام سا آدمی تھا جس طرح عام سے لوگ ہوا کرتے ہیں۔

اس کا لباس بھی بس یوں ہی سا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''شہریار صاحب مجھے صفدر مرزا کہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''تو پھر۔''

''آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا بات ہے۔''

''جناب! میں اس وقت وہیں پر تھا جب اس بوڑھے نے آپ کے دادا کی شان میں گستاخی کی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اس وقت میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ اس سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیں۔''

''اوہ، وہ کیسے؟'' میں اس کی باتوں میں دل چسپی لینے لگا تھا۔ ''میں بدلہ کیسے لے سکتا ہوں۔''

''جناب! اب یہاں کھڑے کھڑے تو بات نہیں ہو سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''ہم کہیں بیٹھ جائیں تو میں آپ کو پوری تفصیل بتا دوں۔''

''ہاں ہاں تم ایسا کرو..... تمہارے پاس گاڑی ہے؟''

''نہیں جناب! میرے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے۔''

''تو پھر تم میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ گھر چل کر بات ہو گی۔''

وہ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسی باتیں ڈرائیور بھی سن لے۔

میں نے اس آدمی کو اپنے شاندار مکان کے شاندار ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دیا۔ وہ احساس کمتری کی وجہ سے اس طرح سکڑ کر بیٹھا ہوا تھا جیسے ایسے قیمتی صوفوں پر بیٹھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا ہو۔

''ہاں اب بتاؤ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب! پہلے تو میں اپنا تعارف کروا دوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا تعارف ضروری ہے؟'' میں نے خشک لہجے میں

پوچھا۔

"جی جناب! بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر میں آپ کے کام نہیں آسکوں گا۔"

"چلو بتاؤ۔ کیا ہے۔"

"جناب میرا نام صفدر مرزا ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں ایک وکیل ہوں۔ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کی توہین ایک وکیل کے سامنے ہوئی اور وکیل بھی ایسا جو اس قسم کے کیسز کا خاصا تجربہ رکھتا ہے۔ وہ توہین کرنے والے کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔"

"کیا واقعی تم ایسا کر سکتے ہو۔" میں اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"جناب میرے باپ دادا بھی یہی کرتے تھے۔" اس نے بتایا۔ "آپ نے نواب رام پور اور مہاراجا بڑودہ والا کیس تو ضرور سنا ہوگا۔"

"نہیں، میں نے نہیں سنا۔"

"اس میں بھی ایسا ہی ہوا تھا جناب، مہاراجا بڑودہ نے نواب رام پور کی توہین کر دی تھی۔ جس پر نواب صاحب نے اس پر کیس کر دیا تھا اور نواب صاحب وہ کیس جیت گئے تھے۔ وہ کیس میرے دادا ہی نے لڑا تھا۔"

"واہ! یہ تو بہت زبردست کہانی ہے۔"

"جی جناب! ذرا آگے بھی سن لیں۔" اس نے کہا۔ "آپ کو مشہور صنعت کار خان زادہ اور مشہور شاعر فیروز اداس پوری کا کیس یاد ہے۔"

"نہیں تو، مجھے تو یاد نہیں ہے۔"

ہوا یہ تھا جناب کہ خان زادہ نے ایک محفل میں اداس پوری کو دو کوڑی کا انسان کہہ دیا تھا۔ بے چارے اداس پوری کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اتفاق سے میرے والد صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ جس طرح آج میں آپ کی توہین کے وقت موجود تھا۔ خیر تو والد صاحب نے فیروز اداس پوری کی طرف سے عزت ہتک کا کیس لڑا اور خان زادہ کو اس کیس میں پچاس لاکھ کا جرمانہ ہوا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ تم میرا کیس جیت لو گے؟"

"سو فیصد جناب، لیکن شرط یہ ہے کہ کیس کرنے والا اپنی توہین کا بدلہ لینے میں دل چسپی رکھتا ہو۔ مدعی سست اور گواہ چست والی بات نہیں ہونی چاہیے۔"

"کیسی بات کر رہے ہو میں تو اپنے پورے وجود میں سلگ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر میرا بس چلے تو میں جان سے مار دوں اس کو۔"

"نہیں نہیں ایسا نہ کریں۔ اگر اس کو مار ہی دیا تو یہ کوئی بدلہ تو نہیں ہوا نا۔"

"تو پھر کیا کروں؟"

"اس کو سسکا سسکا کر ماریں۔ کوڑی کوڑی کو محتاج کر دیں۔ اس کو ایسا کر دیں کہ ہر کوئی اس کے حال پر افسوس کرے۔" اس نے کہا۔

"لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے یہ بتائیں کیا آپ اس وقت پیچھے تو نہیں ہٹ جائیں گے جب یہ معاملہ چل پڑا ہو۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تو پھر بسم اللہ کریں۔ بلکہ ایسا کریں آپ کل میرے دفتر تشریف لے آئیں۔" اس نے کہا۔ "وہیں وکالت نامے پر سائن ہو جائے گا اور دیگر معاملات بھی طے ہو جائیں گے۔"

اس کے جانے کے بعد میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر وہ ٹھیک کہہ رہا تھا پھر تو میں واقعی اس کم بخت بوڑھے سے اپنی توہین کا بدلہ لے سکتا تھا۔

اس نے تو مجھے سوسائٹی میں حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ کلب والے جو کل تک مجھے بہت معزز سمجھتے تھے اس کی بکواس سننے کے بعد کیا سوچ رہے ہوں گے۔

بات عزت کی آگئی تھی۔ اس لیے ہر حال میں مجھے اس وکیل کی خدمات حاصل کرنی تھیں۔ جو نیکی کے کسی فرشتے کی طرح اچانک میرے سامنے آگیا تھا۔

دوسرے دن مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ اتنی جلدی ہو رہی تھی کہ میں دس بجے ہی اس کے دفتر پہنچ گیا تھا۔ اچھا خاصا دفتر تھا اس کا۔

مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ "ارے شہریار اتنے سویرے۔ لگتا ہے رات میں آپ کو نیند نہیں آئی۔"

"ہاں ٹھیک کہتے ہو تم۔" میں نے کہا۔ "رات بھر بدلہ لینے کے لیے بے چین رہا ہوں۔ جتنی جلدی ہو یہ کام کر جاؤ۔"

"یہ لیں وکالت نامے پر سائن کر دیں۔" اس نے میز کی دراز سے ایک وکالت نامہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے سائن کر کے وکالت نامہ واپس کر دیا۔

''اب جناب میری فیس پانچ لاکھ کا چیک دے دیں۔'' اس نے کہا۔

''پانچ لاکھ!'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری فیس پانچ لاکھ ہے؟''

''جی جناب! کیوں کہ یہ معمولی کیس نہیں ہے۔ یہ آپ جیسے معزز آدمی کی توہین کا کیس ہے اور جس نے یہ توہین کی ہے وہ بھی کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ اس کے خلاف پورا جال بچھانا ہوگا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' میں نے کچھ سوچ کر گردن ہلا دی۔ ''دے رہا ہوں چیک لیکن کام کب سے شروع ہوگا۔''

''کل ہی سے شروع ہو جائے گا۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر اس نے پریس کانفرنس کر کے آپ سے معافی نہیں مانگی تو میرا نام بدل دیجیے گا۔''

''ہاں یہ بات ہوئی ناں۔'' میں خوش ہو گیا تھا۔ ''اب اس کا حل پریس کانفرنس ہی ہے۔'' میں نے اس کو پانچ لاکھ کا چیک دے دیا۔

اس شام ایک ہوٹل میں اپنے ایک ہم مرتبہ دوست سے باتیں کرتے ہوئے میں نے بتایا۔ ''میں نے اس بوڑھے کا علاج ڈھونڈ لیا ہے تم دیکھ لینا میں اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔''

''یار تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' دوست نے کہا۔ ''اس نے تمہارے دادا کے بارے میں جو بھی کہا ہوگا سوچ کر ہی کہا ہوگا۔''

''بکواس کی ہے اس نے۔'' میں نے برا سا منہ بنایا۔

''بہرحال تمہاری پلاننگ کیا ہے۔ کیا سوچا ہے تم نے؟''

''یہ تم خود ہی دیکھ لینا۔ وہ باقاعدہ پریس کانفرنس کر کے مجھ سے معافی مانگے گا۔''

دوست کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں خاموش ہو گیا۔

دو دنوں کے بعد وکیل کا فون آ گیا۔ ''شہریار صاحب مبارک ہو آپ کے کیس کو مضبوط کرنے کا راستہ سامنے آ گیا ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''اس کے لیے دس لاکھ کی ضرورت ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا بے کار کی بات کر رہے ہو۔ کس بات کے دس لاکھ؟''

''جناب! اپنے دو آدمیوں کو انڈیا بھیج رہا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''سارا بندوبست ہو گیا ہے۔''

''وہ کیا کریں گے انڈیا جا کر؟''

''وہ وہاں سے آپ کے دادا کو تلاش کریں گے۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو۔ میرے دادا کو تو مرے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا۔ اب کہاں سے تلاش کریں گے۔''

''آپ نہیں سمجھے جناب! انتقال آپ کے ان دادا کا ہوا ہے جو دھوبی تھے یہ دونوں برٹش آرمی انڈین آرمی سے آپ کے دادا کے جعلی کاغذات بنوائیں گے۔ جعلی ثبوت اور گواہیاں ہوں گی۔ جو یہ ثابت کر دیں گی کہ آپ کے دادا میجر رہ چکے ہیں۔ ان کے دھوبی ہونے کا سارا ثبوت مٹا دیا جائے گا۔ وہ باقاعدہ سرٹیفکیٹ لے کر آئیں گے۔''

''کیا واقعی؟'' میں خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ ''کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''

''میرا تو کام ہی یہی ہے جناب۔ اگر آپ قیمت ادا کریں تو میں آپ کے دادا کو نپولین کا داماد بھی ثابت کر سکتا ہوں۔''

''نہیں نہیں اتنا ہی کافی ہے۔ تم انہیں میجر ثابت کر دو اور دس لاکھ کی کوئی بات نہیں ہے۔ لے جانا دس لاکھ۔''

میں نے مزید دس لاکھ ادا کر دیے۔ لیکن یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں تھا۔ جب منزل قریب ہو تو ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے۔

دس بارہ دنوں کے بعد وکیل خود میرے پاس آ گیا۔ وہ بہت خوش اور پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''آپ کی منزل اب پوری طرح آپ کے سامنے ہے۔''

''کوئی پروگریس ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ویسی ہم اصل بندوں تک پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''برٹش آرمی کا ریکارڈ بدلا جا رہا ہے۔ جس کے مطابق آپ کے دادا کا میجر ہونا ثابت ہو جائے گا۔''

''یہ تو بہت زبردست پروگریس ہوئی۔''

''اتنا ہی نہیں جناب۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوا ہے۔ ہمارے آدمی برٹش آرمی کے ریٹائرڈ بندوں سے انٹرویو کرتے پھر رہے ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''ہم ایک طرف تو آپ کے دادا کو میجر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور دوسری طرف اس شخص کے دادا کا

سراغ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یعنی تمہارا مطلب ہے حشمت کے دادا کا سراغ۔"

"جی ہاں۔ یہ تو پتا چل چکا ہے کہ اس کا دادا حجام تھا۔" وکیل نے بتایا۔ "لیکن اب مجھے مکمل پروف چاہیے۔ دستاویزی ثبوت۔ میرے آدمی آج کل یہی کر رہے ہیں۔"

"واہ تم نے تو دل خوش کر دیا۔" میں چہک اٹھا۔ "اگر یہ ثابت ہو جائے تو میں اس کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔"

"ہو جائے گا ثابت۔ بس میرے بندوں کو کام کرنے دیں۔"

"اور ہاں اگر کچھ اور پیسوں کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔" میں نے کہا۔

"بس پانچ لاکھ روپے اور۔" اس نے بتایا۔ "ان بندوں کو بھجوانا ہیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں لے جانا پانچ لاکھ۔"

اس طرح اب تک میرے لاکھوں خرچ ہو چکے تھے۔ لیکن کوئی بات نہیں تھی۔ اپنی عزت کے لیے تو یہ سب کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایک ایک دن بے چینی سے گزر رہا تھا۔ میں نے کلب کی طرف جانا ہی چھوڑ دیا تھا اور اس دن جانا تھا جب اس حشمت کے خلاف سارے ثبوت میرے پاس آ جاتے۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا۔ جب وکیل نے میرے دفتر آ کر مجھے خوش خبری سنائی۔ "مبارک ہو جناب، کام ہو گیا۔ اس حشمت کے دادا کے خلاف سارا ثبوت مل گیا ہے۔"

"تمہیں میرے دادا کی پوزیشن بھی تو کلیئر کرنی تھی نا۔"

"رہنے دیں جناب آپ کے دادا واقعی دھوبی تھے۔" اس نے کہا۔ "ہزار کوششوں کے باوجود میرے بندے انہیں میجر ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن حشمت اور اس کے دادا کا کام ہو گیا ہے۔"

"چلو یہی سہی۔ بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

"دستاویزی ثبوت، دکان کی تصویریں، محلے والوں کی گواہیاں، سب سے اہم یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ حشمت کے دادا حجام تھے۔" اس نے ایک فائل میری طرف بڑھا دی۔ "آپ یہ فائل دیکھ لیں۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے آدمیوں نے کتنی محنت کی ہے۔"

واقعی وکیل نے تو کمال کر دکھایا تھا۔ کتنی مکمل فائل تھی۔ اس کرنل حشمت کے دادا واقعی ایک حجام تھے اور خود کرنل اپنے آپ کو معزز خاندان کا فرد ظاہر کیے جا رہا تھا۔ اسٹرونگ بیک گراؤنڈ۔ اب اس کے اسٹرونگ بیک گراؤنڈ کی دھجیاں بکھرنے والی تھیں۔

کوئی پروا نہیں اگر میرے چالیس پچاس لاکھ خرچ ہو گئے تھے تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ انسان اپنی عزت کے لیے سب کچھ قربان کر سکتا ہے۔

وکیل بتا رہا تھا۔ "جناب عالی! اب آپ دھڑلے سے کلب جائیں اور جب کرنل حشمت سامنے آ جائے تو اس سے کہیں کہ وہ پریس کانفرنس کر کے آپ سے معافی مانگے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو آپ بھرے کلب میں اس کا پول کھول دیں گے۔"

"یعنی میں اسے بلیک میل کر جاؤں۔" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"جناب یہی تو موقع ہے اسے بلیک میل کرنے کا۔" اس نے کہا۔ "اور جب وہ کچھ آنکھیں دکھانے لگے تو آپ حجام پورہ کا حوالہ دے دیں۔ بس وہ وہیں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔"

"اور یہ حجام پورہ کیا ہے۔"

"جناب! یہ حجاموں کی بہت بڑی کالونی تھی۔" وکیل نے بتایا۔ "حشمت کا دادا اس کالونی میں رہا کرتا تھا۔"

"واہ واہ زبردست۔ شاباش یہ بات ہوئی نا۔ اب تم دیکھ لینا میں اس کے غبارے سے کیسی ہوا نکالتا ہوں۔"

اور اس شام کو میں ایک نئے عزم اور نئی شان کے ساتھ کلب پہنچ گیا۔ آج تو میرا انداز ہی کچھ اور تھا۔ میں ایک فاتح کی شان سے کلب میں داخل ہو رہا تھا۔

چونکہ بہت دنوں کے بعد کلب آیا تھا۔ اس لیے جاننے والے ملنے کے لیے چلے آ رہے تھے لیکن میری نگاہیں اس کرنل کو تلاش کر رہی تھیں۔

پھر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ وہ شہر کی ایک معزز خاتون کے ساتھ ایک طرف کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ میں اس خاتون کو بھی جانتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

میں ابھی اس کے پاس جانے یا نہ جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہی وکیل نہ جانے کس طرف سے نمودار ہو کر میرے پاس آ گیا۔ وہ اس وقت بہت پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ "بھائی شہریار صاحب۔" اس نے دھیرے سے

کہا۔ ''بہت زبردست موقع ہے اٹیک کردیں اس پر۔''

''تمہارا مطلب ہے پریس کانفرنس میں معافی کی بات کروں۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں لیکن دو چار تابڑ توڑ حملے کرنے کے بعد۔'' اس نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ پہلے ہی حملے میں اسے بوکھلا دیں۔''

''او کے تم دیکھتے رہو میں کیا کرتا ہوں۔''

پھر میں ٹہلتا ہوا کرنل کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

''او ہو شہر یار صاحب! خیریت ہے۔ بہت دنوں کے بعد دکھائی دیے۔''

''کیا بتاؤں کرنل صاحب مجھے اپنے بالوں کی کٹنگ کروانی تھی لیکن کوئی ڈھنگ کا حجام نہیں مل رہا تھا۔'' میں نے اس پر پہلا حملہ کر دیا۔

''اچھا۔ کمال ہے بھائی۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''پورے شہر میں آپ کو کوئی ڈھنگ کا حجام نہیں ملا۔''

''نہیں بھائی! اس لیے مجھے حجام پورہ جانا پڑ گیا۔'' میں نے بتایا۔ ''میں نے وہاں کے ایک مشہور حجام کرامت کا نام سن رکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی کہ اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

کرنل کے ہونٹ بھینچ گئے۔ اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے کون سی داستان چھیڑ دی ہے اور میں کیا کہنے جا رہا ہوں۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حجام پورہ سے ناکام واپس آ گئے۔'' اس معزز خاتون نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ وہ بھی میری بات سن کر کچھ گڑبڑا سی گئی تھی کہ میں نے کس طرح کی بات چھیڑ دی ہے۔

''میں یہ بتاؤں کہ شہر یار صاحب کی ملاقات اس حجام سے کیوں نہیں ہوئی۔'' کرنل نے کہا۔

''لیس کرنل..... بھائی کیوں نہیں ہوئی۔'' خاتون نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس حجام کا اب سے پچیس برس پہلے انتقال ہو چکا ہے۔''

''اوہ تو کیا آپ اس حجام کو جانتے ہیں کرنل؟'' میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح کیوں کہ وہ میرے دادا تھے۔'' کرنل نے بتایا۔

''کیا!'' مجھے ایک زوردار شاک سا لگا تھا۔

''جی بھائی۔'' کرنل ہنس پڑا۔ ''اور شاید آج آپ یہی ثابت کرنے آئے ہوں گے۔ تو میں خود ہی بتا رہا ہوں کہ وہ میرے دادا تھے اور مجھے اس بات پر کوئی شرمندگی نہیں ہے کہ میرا دادا ایک حجام تھا۔ کیوں کہ وہ ایک بہت بڑا انسان تھا۔ اس نے خود تو تعلیم حاصل نہیں کی لیکن اپنی اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اس کا پوتا کرنل حشمت آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ مجھے اپنے دادا پر فخر ہے شہر یار صاحب۔ آئی سیلوٹ ہم۔''

''یو آر ریئلی اے گریٹ مین کرنل۔'' اس معزز خاتون نے اس کا شانہ تھپک دیا۔

''اور ہاں شہر یار صاحب ایک بات اور۔'' کرنل نے کہا۔ ''آپ تو جانتے ہیں کہ اس کلب کی ممبر شپ صرف ان ہی کو ملتی ہے جن کا بیک گراؤنڈ بہت اعلیٰ اور شاندار ہو۔ لیکن مجھے اس لیے دی گئی کہ میں نے اپنے ماضی کو چھپانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ سب کچھ بتا دیا اور اس کردار کی بنیاد پر مجھے ممبر شپ دی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے دادا کو دریافت کرنے کے سلسلے میں آپ نے بہت محنت کی ہوگی۔ بہت پیسے خرچ کیے ہوں گے۔ تو کیا ضرورت تھی اس تکلیف کی۔ اگر مجھ سے پوچھ لیتے تو میں اسی دن آپ کو بتا دیتا۔''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ کم بخت وکیل منحوس سی صورت بنائے ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کرنل سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس وکیل کے پاس پہنچ کر اس کو دو چار گھونسے ضرور رسید کر دیے۔

جو بات مجھے مفت میں معلوم ہو سکتی تھی اس کے لیے اس بدمعاش نے مجھ سے تیس چالیس لاکھ خرچ کروا دیے تھے۔

بہرحال وہ دن ہے اور آج کا دن میں دوبارہ اس کلب کی طرف نہیں گیا ہوں اور اس کہانی کو لکھنے کا مقصد یہی کہ اگر آپ بھی کسی عہدے اور کسی مرتبے کو پہنچ چکے ہیں تو کبھی اپنے ماضی کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔

آپ کے باپ دادا ہی آپ کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔ آپ کی شناخت وہی ہیں۔ چاہے وہ کوئی بھی ہوں۔ اگر وہ محنت کش تھے تو اور بھی فخریہ بتائیں کہ دیکھو ایک محنت کش کے بیٹے یا پوتے نے کتنی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔

آپ یقین کریں آپ کی عزت دوگنی ہو جائے گی۔

نہ خدا ملا

محترم معراج رسول
السلام علیکم
ایک عورت کی بے وقوفی کس طرح ہنستے بستے گھر کو برباد کردیتی ہے اس کے لیے ثمینہ کو بطور تمثیل پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی زندگی برباد کرلی۔ اس کی غلطی کی سزا کتنے لوگ بھگت رہے ہیں اس پر ضرور غور کریں۔

محمد عارف ہاشمی
مکران



ہنستا بستا اور خوشیوں بھرا گھر جب بھی یاد آتا ہے میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کاش میں جہان آباد کے زمیندار کی دعوت پر اس کے گھر نہ گئی ہوتی۔ کچھ ایسا سحر تھا اس کی آنکھوں میں کہ میں جب وہاں سے واپس آگئی تو میں نے خود کو بے بس پایا۔

میرے شوہر کو اس قصبے میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ وہاں کے سب سے بڑے زمیندار کی بیوہ پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ چلنے پھرنے سے

معذور ہو گئی۔ فوری طور پر میرے شوہر سے رابطہ کیا گیا۔ انہوں نے اپنی روایتی دیانت داری اور اپنے پیشے کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ملکانی کا علاج بڑی توجہ سے کیا اور شاید یہ ان کے خلوص اور محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کی مریضہ جلد تندرست ہو گئی۔ اپنی شفایابی پر ملکانی تو میرے شوہر کی ممنون تھی ہی اس کے نوجوان اور اکلوتے بیٹے جاوید نے بھی اسے خود پر بہت بڑا احسان گردانا اور وہ میرے شوہر کا خاصا معتقد بن گیا۔ غالباً اسی تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی جس میں مجھے بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا۔

میں اس روز پہلی دفعہ ان کے گھر گئی تھی۔ کیوں کہ میرے شوہر اس انداز کی دعوتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی بڑے آدمی کے گھر جانے سے تو وہ بہت کتراتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سرکاری ملازم کا اس طرح کی دعوتیں قبول کرنا بھی رشوت میں شمار ہوتا ہے۔ جاوید کی دعوت بھی انہوں نے بڑی پس و پیش کے بعد اور ملکانی کے زبردست اصرار پر قبول کی اور پھر مقررہ وقت پر ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔

اس سے پہلے میں نے جاوید کو دیکھا بھی نہ تھا۔ مگر پہلی ہی ملاقات میں وہ میرے دل میں کھب گیا۔ اس کی پُر وقار شخصیت اور گفتگو کے دلکش انداز نے میرے ذہن کو ایکدم منتشر کر دیا تھا۔ جتنی دیر میں وہاں بیٹھی رہی، میری سوچ اسی کے گرد گھومتی رہی اور پھر گھر آکر بھی میں نے خود کو اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے پایا اور میری خوشگوار ازدواجی زندگی میں زہر شامل ہونا شروع ہو گیا۔ اسے میں اپنی بدقسمتی کہوں کہ میں تو اس سے متاثر تھی ہی، وہ بھی اپنے دل میں میرے لیے ایک جذبہ محسوس کرنے لگا تھا اور پھر اسی جذبے کو پروان چڑھانے کے لیے وہ ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے ہاں آنے لگا۔ بظاہر وہ خود کو احسان نافراموش ظاہر کرتے ہوئے میرے شوہر سے ملنے آیا کرتا لیکن میں اس کی آمد کا اصل مقصد پہلے دن ہی جان گئی تھی، کیوں کہ اس کی باتوں اور نظروں کی مخاطب عموماً میں ہی رہتی۔ میرے شوہر نے بھی اس بات کو یقیناً محسوس کیا ہوگا لیکن انہیں مجھ پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ میری گمراہی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور جب انہیں اس امر کا احساس ہوا تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ میں انہیں چھوڑ کر اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک نئے ساتھی کا انتخاب کر چکی تھی۔ دراصل میرے دل کے کسی کونے میں جاوید کی چاہت کی جو چنگاری میرے حالات کی وجہ سے دب چکی تھی۔ وہ اس کے مسلسل سامنے آنے سے سلگی اور پھر اس روز تو وہ ایک شعلہ بن گئی جب ہمیں اتفاق سے کچھ وقت تنہا گزارنے کا موقع ملا۔ میرے شوہر اس دن کسی مریض کو دیکھنے ایک قریبی گاؤں گئے ہوئے تھے۔

قبل ازیں چونکہ دل کی بات زبان پر لانے کا کوئی موقع نہ ملا تھا۔ اس لیے اب تک ہم ایک دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی آگ میں جل رہے تھے لیکن جونہی تنہائی میسر آئی تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ آگ دونوں طرف ہے اور پھر ہم نے بلا سوچے سمجھے اقرار محبت کر لیا۔ میرے شوہر کی چند ساعتوں کی دوری نے ہمیں ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا لیکن صرف روحانی طور پر اور یہی وہ بڑی وجہ تھی جس نے مجھے جاوید کی شخصیت کا مزید گرویدہ بنا دیا کہ ہم خاصی دیر تک تنہا رہے مگر اس دوران اس نے ایک مرتبہ بھی مجھے چھونے کی کوشش نہ کی اور جب میرے شوہر واپس آئے تو میری دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میں آئندہ کے لیے خود کو جاوید سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

پھر اسی دن سے میں اپنی ازدواجی زندگی سے فرار کی جستجو میں رہنے لگی لیکن میرے شوہر اس سے بے خبر تھے۔ کتنے سادہ اور مخلص تھے وہ کہ میں ان سے دامن چھڑانے کی تدبیریں کر رہی تھی اور وہ بدستور مجھ سے پیار کیے جا رہے تھے۔ کبھی کبھار میں سوچتی کہ اس قدر چاہنے والے شوہر اور تین پیارے پیارے بچوں کو میں کیسے چھوڑ سکوں گی لیکن میرے ذہن پر جاوید کے عشق کا جو بھوت سوار تھا۔ اس نے سب کچھ بھلا دیا۔ جاوید سے اقرار محبت کے اگلے روز سے ہی میری گھریلو زندگی میں خلل واقع ہونے لگا۔ میں نے گھر گرہستی اور بچوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ شوہر سے بے نیاز رہنے لگی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے شوہر کچھ متفکر ہوئے کہ میں خواہ مخواہ ان سے الجھ پڑتی ہوں۔ بچوں کو بلاوجہ پیٹنے لگتی ہوں۔ خانہ داری کے امور میں میری دلچسپی بتدریج کم ہو رہی ہے۔

ایک روز میرے شوہر نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ثمینہ؟“

”آپ کو اس سے کیا۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

اپنی معقول بات کا انتہائی نامعقول جواب سن کر وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے تم تو ایک مثالی بیوی تھیں۔“

جواب میں، میں نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ ”ہاں ہاں! اب آپ کو مجھ میں خامیاں ہی نظر آئیں گی۔ پانچ سال باندی بن کر خدمت جو کی ہے۔ اس کا یہی صلہ ملنا تھا مجھے۔ بس خدا مجھے موت دے۔“ اور وہ گوں مگوں کی کیفیت میں باہر چلے گئے۔

ان دنوں میں نے بلاناغہ جاوید کے گھر جانا شروع کر دیا۔ کیوں کہ اب وہ ہمارے ہاں کم آنے لگا تھا اور میری کیفیت یہ تھی کہ میں ایک لمحہ بھی اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے کہہ چکا تھا ”میں شادی کروں گا تو تم سے لیکن ڈاکٹر صاحب سے تمہاری علیحدگی کی ذمہ داری تم پر ہے۔ کیوں کہ میں اس سلسلے میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا۔“

اور پھر ایک روز یہ سوچے بغیر کہ ہمارے معاشرے میں بیوی کا اپنے شوہر سے طلاق مانگنا کتنا معیوب ہے، میں نے ان سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر ان کا چہرہ ایکدم بجھ گیا اور انہوں نے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص تمہاری زندگی میں قدم رکھے گا۔ جاوید کی طرف تمہارا جھکاؤ میں کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا لیکن اس لیے خاموش تھا کہ تمہیں خود اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور تم لوٹ آؤ گی مگر ایسا لگتا ہے کہ تم نے میری محبت کو ٹھکرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ فی الحال میں تم سے صرف اتنا کہوں گا کہ ہو سکے تو اپنے اس مطالبے پر نظر ثانی کر لو۔“

لیکن میں نے ان کی اس بات کو چنداں اہمیت نہ دی اور بدستور اپنے موقف پر قائم رہی۔ جب کہ میرے شوہر نے اسی روز مجھے بتائے بغیر گزشتہ تمام واقعات اور تازہ ترین صورت حال سے میرے گھر والوں کو آگاہ کر دیا۔ تیسرے روز وہاں سے امی اور میرے بڑے بھائی آن پہنچے۔ امی نے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کی ساری گفتگو مجھے آج تک یاد ہے۔

”ثمینہ! تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟ پاگل ہو گئی ہو کیا؟“ انہوں نے ایک ہی سانس میں مجھ سے کئی سوال کر ڈالے۔ مجھے خود معلوم نہیں وہ سب کیا تھا کہ گزشتہ ساری زندگی ماں کے سامنے زبان نہ کھولنے والی بیٹی نے ایک دم گستاخ لڑکی کی طرح منہ پھاڑ کر کہا۔

”ہر انسان کو اپنی منشا کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے امی۔ آپ نے میری شادی میری مرضی کے بغیر کر دی تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ نباہ ہو جائے مگر ایسا نہیں ہو سکا اور اب میں مجبور ہو گئی ہوں۔“

اگرچہ یہ کہتے ہوئے میرا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں لیکن میں نے دوسری طرف منہ پھیر کر یہ سب کچھ کہہ دیا۔

”تو کیا تو نے کوئی اور خصم ڈھونڈ لیا ہے؟“ امی نے بڑے غصے میں پوچھا۔

”ہاں! میں نے اپنا آئیڈیل پا لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ زندگی میں میرے لیے ان سے بہتر ساتھی ثابت ہوگا۔“

”کون ہے وہ؟“ انہوں نے اسی کیفیت میں پوچھا۔

”کوئی بھی ہو؟ آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ نے جب انہیں میرے لیے منتخب کیا تھا تو کیا میں نے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟ آپ نے تو اپنا انتخاب مجھ پر ٹھونسنے میں اتنی جلدی کی تھی کہ مجھے ایم اے کے امتحان میں بھی نہیں بیٹھنے دیا جو صرف تین ماہ بعد ہونا تھا۔ اس وقت میں نے آنکھیں بند کر کے آپ کا فیصلہ قبول کر لیا تھا۔ اس اُمید پر کہ آپ نے سوچ سمجھ کر ہی میرے لیے رشتہ تلاش کیا ہوگا لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کا وہ فیصلہ درست ثابت نہیں ہوا۔ اس لیے مجھ میں بدستور اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے رہنے کی سکت نہیں رہی۔“

ایک ہی سانس میں میری اس طویل اور تلخ تقریر کے بعد امی کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا تو ان کا لہجہ نرم پڑ گیا اور انہوں نے خوشامد کے انداز میں مجھ سے کہا۔ ”خدا کے لیے ہوش میں آؤ، ثمینہ! اپنا نہیں تو ان معصوموں کا ہی کچھ خیال کرو۔“ انہوں نے باہر صحن کی طرف اشارہ کیا جہاں میرے تینوں بچے حالات کی نزاکت سے بے خبر کھیل رہے تھے۔

میں نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ ایک دفعہ تو مجھے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے جاوید کی چاہت مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے ان سے نظریں ہٹا کر بڑی ڈھٹائی سے کہا۔

”امی! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ بہتر ہے آپ اس میں دخل نہ دیں اور یہ سن لیں کہ میں نے ان سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی۔“

یہ گویا میری طرف سے حرفِ آخر تھا جسے سننے کے بعد امی سکتے میں آ گئیں اور پھر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ الٹے قدموں سے واپس لوٹیں اور یہ کہتے ہوئے

کہ "تمہیں خدا سمجھے" میرے کمرے سے باہر چلی گئیں۔ صحن سے گزرتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر رکیں کانپتے ہونٹوں سے میرے بچوں کو چوما اور کہا۔ "تمہاری قسمت میرے بچو۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ میرے بڑے بھائی اس دوران میرے شوہر کے پاس اسپتال میں بیٹھے رہے۔ امی مجھ سے مل کر گئیں اور انہیں ساری صورتِ حال بتائی جس کے بعد امی اور وہ گھر واپس چلے گئے۔

میرے شوہر اس رات گھر نہیں آئے۔ اگلی صبح میں ابھی سو رہی تھی کہ میرے سرہانے کھٹکا ہوا۔ میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے اوپر دیکھا۔ وہ میز پر کوئی چیز رکھ رہے تھے۔ مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "میں نے تمہارا مطالبہ پورا کر دیا ہے۔ خدا کرے تمہارا یہ فیصلہ تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو۔"

یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھر گئی اور اگلے لمحے وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھی اور ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ اٹھا لیا جو وہ ابھی ابھی رکھ کر گئے تھے۔ وہ طلاق نامہ تھا۔ میری ان سے آزادی کا پروانہ۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے پا کر میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھی ہوں لیکن جونہی جاوید سے اپنی مستقل وابستگی کا خیال آیا۔ تمام خدشات ہوا ہو گئے۔ میں نے چہرہ اور بال درست کیے اور دوسرے کمرے کی طرف چلی جہاں ہم اپنے بچوں کو سلایا کرتے تھے لیکن یہ کیا؟ وہاں تو کوئی نہ تھا۔ بچوں کے بستر خالی تھے۔ شاید وہ انہیں سوتے میں اٹھا کر لے گئے تھے۔ ورنہ اتنی جلدی ان کا خود اٹھ کر کہیں جانا تو بعید از امکان تھا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ ورنہ بچوں سے جدا ہوتے وقت شاید میرا دل بھر آتا۔" میں نے سوچا اور اپنے طور پر مطمئن ہو کر جاوید کے گھر کی طرف چل دی۔ میں پہلی فرصت میں اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی مگر وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ ملکانی نے حسبِ معمول خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں مستقل طور پر ان کے گھر آ گئی ہوں تو اس کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا اور اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے ملکانی پر یہ سب کچھ ظاہر کرنے میں بہت جلدی کی ہے۔ دراصل میرا خیال تھا کہ جاوید نے میرے معاملے میں اپنی والدہ کو پہلے سے اعتماد میں لے رکھا ہوگا اور وہ میرے اس انکشاف پر اظہار مسرت کرے گی مگر وہاں تو بازی ہی پلٹ گئی۔

ملکانی مجھے چھوڑ کر کمرے سے باہر جا چکی تھی اور میں اس سوچ میں مبتلا تھی کہ اب کیا ہوگا؟ کہ اتنے میں باہر سے جاوید کی آواز آئی۔ میں خوشی سے باہر لپکی۔ ادھر سے ملکانی بھی دوسرے کمرے سے نکل آئی۔ میرا ایک قدم دروازے کے اندر اور ایک باہر رہ گیا اور زبان کو جیسے تالے لگ گئے۔

جاوید اس وقت صحن میں کھڑا تھا اور ملکانی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی اسے گھورے جا رہی تھی۔ جاوید نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر اپنی ماں کی طرف اور پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے اپنی ماں کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جا کر بڑے ادب سے اسے اندر چلنے کو کہا۔ ملکانی اس کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی اور میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے دروازے سے جا لگی۔ جاوید نے اندر داخل ہوتے ہی اپنی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"امی جان! میں معافی چاہتا ہوں۔ میں آپ سے آج تک یہ بات چھپاتا رہا۔ دراصل میرا خیال تھا کہ......!" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ملکانی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے جاوید؟ اور اب تم میرا فیصلہ بھی سن لو۔"

"اوہ! میری پیاری امی جان۔" جاوید نے انجانے میں کہا۔

"میں تمہیں کبھی اس حرافہ سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" ملکانی نے کہا۔

"مگر کیوں امی؟" جاوید نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہارے لیے کنواریوں کی کمی ہے کہ تم ایک مطلقہ سے شادی کرو۔" ملکانی بولی۔

"مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟" جاوید نے دوسرا سوال کیا۔

"اس کا پتا تو تمہیں اس وقت چلے گا جب یہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی جائے گی۔ جو عورت ایک مثالی شوہر کے ساتھ وہ نہیں کر سکتی۔" ملکانی کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ جاوید بول پڑا۔

"اسے میری محبت نے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے امی جان ورنہ......!"

"میں سب جانتی ہوں؟ بعد میں اسے کسی اور کی محبت مجبور کردے گی۔" ملکانی نے دوسری مرتبہ میرے کردار پر شک کا اظہار کیا تو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ جاوید نے مجھے دیکھتے ہی جھٹ سے کہا۔

"ثمینہ! تم ابھی باہر ٹھہرو۔" جس کے جواب میں، میں نے اس سے کہا۔

"مجھے امی جان سے صرف دو باتیں کرلینے دو، جاوید۔" اور پھر میں ملکانی سے مخاطب ہوئی۔

"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے، امی جان۔ مجھے ان کے ناروا سلوک اور آپ کے بیٹے کی محبت نے ایسا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ ورنہ میں بھی ایک مثالی بیوی تھی۔"

"ڈاکٹر صاحب اور ناروا سلوک؟" ملکانی نے حیرت کا اظہار کیا۔

بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایک جھوٹ کو پاٹنے کے لیے مجھے اب کئی جھوٹ بولنے تھے لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔ جاوید اور ملکانی استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بالآخر میں نے زبان کھولی۔

"جی ہاں! ان کا سلوک میرے ساتھ انتہائی ظالمانہ تھا۔ میں نے ایک طویل عرصہ اسے برداشت کیا لیکن اب میں عاجز آگئی تھی۔" ملکانی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ اس دوران میرے اور جاوید کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز ہمارے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیلتی چلی گئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"پھر بھی میں تمہیں اپنی بہو بنا کر خود کو احسان فراموش کہلوانا پسند نہیں کروں گی۔"

"کیا مطلب امی جان؟" جاوید نے تعجب سے کہا اور میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس نے اس شخص سے بے وفائی کی ہے جس نے مجھے موت کے منہ سے نکالا تھا۔ سوا ہے اپنے گھر میں رکھنا احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے۔" ملکانی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو مجھے طلاق دے کر یہاں سے چلے گئے ہیں۔" میں نے آخری کوشش کے طور پر کہا۔

"وہ فرشتہ خصلت انسان کہیں بھی ہو، میں اس سے غداری کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔" ملکانی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سلیکون کے کرشمے

۷ جولائی 1981ء کو اسٹیفن تیک نامی پائلٹ نے شمسی توانائی سے چلنے والے ہوائی جہاز کے ذریعے رودبار انگلستان عبور کیا۔ اس پرواز میں ساڑھے پانچ گھنٹے صرف ہوئے، طیارے کا نام سولر چیلنجر تھا اور وہ پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ اس کی دم اور پروں پر سولہ ہزار ننھے ننھے شمسی سیل نصب تھے۔ یہ سولر سیل جسے فوٹو وولٹیک سیل بھی کہا جاتا ہے، سورج کی روشنی بلاواسطہ بجلی میں تبدیل کردیتے ہیں، انہیں بجلی پیدا کرنے کے لیے دخانی انجن یا جنریٹر استعمال نہیں کرنا پڑتے۔ سولر سیل چارلس فرٹس نامی ایک سائنسداں نے 1889ء میں ایجاد کیے تھے، وہ چھوٹے چھوٹے سکوں کی مانند تھے۔ انہیں بہتر بنانے کی سرتوڑ کوششیں ہوتی رہیں، آخر 1954 میں امریکا کی بیل لیبارٹری کے سائنسدانوں نے ایک ایسا عنصر دریافت کرلیا جو سولر سیل کو بہت زیادہ بہتر بنانے میں ممد ثابت ہوسکتا تھا۔ یہ عنصر تھا سلیکون! جو ریت جیسی معمولی شے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمسی توانائی ایک بالکل نئی دریافت ہے لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں! تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قدیم کا انسان بھی شمسی توانائی سے آگاہ تھا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی زندگی کا زیادہ تر انحصار صرف شمسی توانائی ہی پر تھا۔ تاریخ کے وہ مہذب لوگ جنہوں نے سب سے پہلے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، یونانی تھے، انہی نے سب سے پہلے توانائی کے اس بے شکل ذریعہ کو اپنا غلام بنایا۔ وہ اپنے گھروں، محلوں اور عوامی چوراہوں کا رخ ہمیشہ جنوب کی طرف رکھتے تھے جہاں سورج کی روشن کرنیں زیادہ شدت اور خاص زاویے سے گرتیں، ان کے بعد رومی تہذیب کو عروج نصیب ہوا تو ان لوگوں نے بھی یونانیوں کی دیکھا دیکھی اپنی رہائش گاہیں اور پلازے انہی کے طریق پر ڈیزائن کیے۔ انہوں نے صاف شیشہ ایجاد کیا جو سورج کی شعاعیں گھروں کے اندر تک لے جانے میں کارآمد ثابت ہوا۔ سورج کی توانائی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لیے انہوں نے جابجا گرین ہاؤس بنائے جن میں وہ سارا سال سبزیاں اور پھل کاشت کرسکتے تھے۔

مرسلہ: نعمان صفدر، لاہور

"مگر امی جان۔" جاوید اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ملکانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جاوید! تم کسی طوائف سے شادی کرلو مگر میں تمہیں اس کو اپنی شریکِ حیات بنانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" اور وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

اسی لمحے جاوید اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں اس وقت حسرت و یاس کا مجسمہ بنی ہوئی تھی۔ جاوید نے آگے بڑھ کر میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "امی نے آج تک میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ خدا جانے آج انہیں کیا ہوگیا ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد انہیں آمادہ کرلوں گا۔ اس دوران تمہاری عدت کی مدت بھی گزر جائے گی اور پھر ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں گے۔"

"لیکن مجھے تو اپنے خواب بکھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"محبت کرنے والے تو بڑے پختہ عزم کے مالک ہوتے ہیں مگر تم تو بڑی کمزور دل واقع ہوئی ہو۔ تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں کیا؟" جاوید نے مجھے تسلی دی۔

"تم پر تو اعتماد ہے مگر..." اس سے آگے میری زبان میرا ساتھ نہ دے سکی۔

"مگر کیا؟" جاوید نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"حالات بالکل ہمارے خلاف جارہے ہیں۔ جاوید مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"حالات کو گولی مارو؟ اور جس طرح تمہیں اپنی محبت کا یقین ہے۔ اسی طرح مجھ پر یقین رکھو۔ میں امی کو تمہیں اس گھر کی بہو بنانے پر راضی کرلوں گا۔" یہ کہہ کر جاوید باہر جانے لگا تھا کہ میں نے اسے روک کر کہا۔

"وہ تو صبح ہی بچوں کو لے کر یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اب میں وہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔"

"تمہیں وہاں جانے کو کون کہتا ہے۔ تم ابھی سے اس گھر کو اپنا گھر سمجھو اور اطمینان سے یہاں رہو۔ آخر کل کو تمہیں اس گھر کی مالکن بننا ہے۔" جاوید کا جواب تھا۔

اور پھر میں وہیں رہنے لگی۔ بقول جاوید یہ تصور لے کر کہ کل میں اس گھر کی مالکن بنوں گی لیکن چند ہی دنوں میں مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ میرا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ کم از کم ملکانی کے ہوتے ہوئے کیوں کہ اس نے جو سلوک مجھ سے روا رکھا ہوا تھا۔ اس سے یوں لگتا تھا کہ وہ ساری زندگی تو کیا عدت کے دن بھی مجھے وہاں گزارنے نہیں دے گی لیکن میں ڈھیٹ بن کر جاوید کی تسلیوں کے سہارے پڑی رہی۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے میرا یہ احساس قوی ہو رہا تھا کہ میرے سپنے ادھورے ہی رہیں گے۔ جاوید اگرچہ اس گھر کا مالک تھا مگر وہ بے اختیار تھا۔ وہاں کا تمام کاروبار ملکانی کے اشارے پر چلتا تھا۔ دراصل جس وقت بڑا ملک (جاوید کا باپ) فوت ہوا، جاوید بہت چھوٹا تھا سو گھر اور باہر کا تمام انتظام ملکانی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسی وقت سے یہ انتظام اس کے پاس تھا۔ جاوید تو اس کا ایک نمائندہ تھا۔ زمین کی پیداوار کا حساب کتاب، مزارعوں سے لین دین، نوکروں کا اہتمام اور دیگر خاندانی امور بظاہر تو جاوید کے ہاتھوں سرانجام پاتے مگر ان کے بارے میں آخری فیصلہ ملکانی ہی کرتی۔ یہ سلسلہ چونکہ عرصے سے چلا آرہا تھا اس لیے نہ کبھی جاوید نے اپنی حد سے بڑھنے کی کوشش کی اور نہ ملکانی نے اس کے اختیارات میں اضافہ کیا۔ ویسے بھی جاوید ایک فرمانبردار نوجوان تھا اور عام زمینداروں کے بچوں کی طرح اس میں خودسری اور ہٹ دھرمی نام کو نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ میں اکثر سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ وہ کس طرح اپنی ماں سے یہ بات منوائے گا جب کہ یہاں آج تک ہر کام ملکانی کی مرضی سے ہوا تھا۔

پھر ایک روز بالآخر یہ خواب ٹوٹ گیا اور جاوید کی ساری باتیں طفل تسلیاں ثابت ہوئیں۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں کھانا کھا کر اٹھنے لگی تھی کہ ملکانی نے مجھے طلب کرتے ہوئے کہا۔ "بالآخر تمہارے جھوٹ کا پردہ چاک ہوگیا؟"

"جی۔" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"تم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ناروا سلوک کی وجہ سے تم نے ان سے طلاق لی ہے۔ جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ اس الزام کی اصل مستحق تم ہو۔" ملکانی کا جواب تھا۔

"آپ یہ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" میں نے ہزار اندیشوں کے ساتھ سوال کیا۔

"مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہاں سے اپنا تبادلہ کرالیا ہے۔ اسپتال کا سارا عملہ اور پورا قصبہ اس بات پر حیران ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ جب کہ وہ یہاں بہت مطمئن تھے۔ اب پتا چلا کہ ان کے اس اچانک فیصلے کی وجہ تم ہو۔ تمہارے توہین آمیز رویے اور میرے بچے

میں تمہاری دلچسپی نے انہیں یہاں سے چلے جانے پر مجبور کیا۔ اب بولو اپنی صفائی میں کوئی اور جھوٹ تراشو۔''

میرے پاس ملکانی کی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ سو میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔ پھر میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''اب تم میری بہو بننے کے خواب دیکھنا چھوڑ دو اور شرافت سے اپنا راستہ ناپو۔ اب تک میں تمہیں صرف اس لیے برداشت کررہی تھی کہ شاید تمہاری باتوں میں کچھ حقیقت ہو لیکن آج مجھ پر تمہارا کیا دھرا منکشف ہوگیا ہے۔ اب تم اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتیں۔'' پھر اس نے جاوید کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''جاوید! تم بھی کان کھول کر سن لو کہ میرے جیتے جی یہ تمہاری دلہن نہیں بن سکتی۔ بہتر ہے اسے آج ہی یہاں سے روانہ کردو۔''

''امی جان! میری بات سنیے۔'' جاوید کچھ کہنے لگا تھا کہ ملکانی نے یہ کہہ کر اسے چپ کرا دیا۔

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ اس گھر میں اس کی ڈولی صرف میری لاش پر آسکتی ہے۔'' اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اب کیا ہوگا جاوید؟'' ملکانی کے باہر جاتے ہی میں نے جاوید سے سوال کیا جو اس وقت بالکل خاموش تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنی ماں سے شکست تسلیم کرلی ہو۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں نے اس کی محبت میں مبتلا ہوکر بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اسی دوران ایک خیال میرے ذہن کے پردے پر ابھرا۔ جاوید ابھی تک چپ تھا۔ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

''جاوید! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم کسی دوسرے شہر جاکر شادی کرلیں اور اپنی علیحدہ زندگی کا آغاز کریں۔''

''تمہارا مطلب ہے میں ماں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں۔'' جاوید نے چونک کر کہا۔

''کوئی ضروری نہیں، ہم کچھ عرصے بعد واپس بھی آسکتے ہیں۔ ماں آخر ماں ہے۔ ممکن ہے ہمیں ایک بندھن میں بندھا دیکھ کر وہ ہار مان لیں۔'' میں نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔

''تم امی جان کو نہیں جانتیں۔ وہ اپنے قول کی بڑی پکی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان کی نافرمانی کی تو وہ عمر بھر میری شکل نہیں دیکھیں گی۔'' جاوید نے مایوسی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔'' مجھے غصہ آگیا۔

''یہ بالکل غلط ہے۔ میں آج بھی تم سے پہلے جیسی محبت کرتا ہوں مگر...... امی جان۔'' وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بول رہا تھا۔

''تم مجھے تو چھوڑ سکتے ہو جس نے تمہارے لیے اپنا گھر بار اور بچے تک چھوڑ دیے لیکن اس ماں کو نہیں چھوڑ سکتے جو بلاوجہ کی ضد کررہی ہیں۔'' میں نے جل کر کہا۔

''دیکھو ثمینہ! مجھے غلط نہ سمجھو۔ دراصل میں امی کو اس لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا کہ میرے علاوہ ان کا اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔ انہوں نے مجھے نہ صرف ماں بلکہ باپ بن کر پالا ہے۔ میرے لیے انہوں نے اپنی جوانی بیوگی کی نذر کردی اور پھر میرے یہاں سے چلے جانے سے اتنی بڑی جائیداد بے انتظامی کا شکار ہوجائے گی۔'' جاوید کا جواب تھا۔

''امی جان! تم سے بہتر منتظم ہیں۔'' میں نے اسے اپنی راہ پر لانے کی ایک اور کوشش کی۔

''وہ اب بوڑھی ہوچکی ہیں اور بتدریج اپنی ذمے داریاں مجھے منتقل کررہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں جائیداد مجھ سے زیادہ پیاری ہے۔'' میں نے اسے اپنی محبت کا احساس دلانا چاہا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرا پیار کلی طور پر فراموش کرچکا ہے اور میرے لیے اپنے ٹھاٹھ باٹھ ترک نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ میرے اس سوال کے جواب میں اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں لیکن تمہارے لیے اپنی ماں کو چھوڑ نہیں سکتا۔''

ظاہر ہے اس کے بعد مزید اصرار فضول تھا۔ چنانچہ اپنی قسمت کو کوستی ہوئی میں صائمہ کے گھر آگئی۔ صائمہ میری کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ اس کے گھر میں رہتے ہوئے میں نے ایم اے کی تیاری شروع کردی۔ شادی سے پہلے جہاں سے میں نے تعلیم منقطع کی تھی وہیں سے دوبارہ شروع کردی۔ پھر ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرارشپ مل گئی اور میں فیصل آباد آگئی۔

آج اس واقعے کو 13 سال گزر چکے ہیں مگر میں اب بھی اسے بھول نہیں پائی ہوں۔ میری تمام بہنوں سے التجا ہے خدارا میری غلطی کوئی اور نہ دہرائے۔



قصۂ درد

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

یہ میری روداد نہیں ہے۔ میری ایک واقف کار کی ہے۔ اسے دنیا والوں نے کس طرح ستایا اسے ہی میں نے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے قارئین کو بھی اس درد کی ماری کی آپ بیتی پسند آئے گی

پروفیسر ڈاکٹر نرگس وقار
(کراچی)

شانو سے میری پہلی ملاقات آفس کولیگ کی حیثیت سے ہوئی۔ وہ اس آفس میں میرے بعد آئی تھی لیکن بہت جلد ہم دونوں کو دوستی جیسے سچے اور پُرخلوص رشتے نے جکڑ لیا۔ وہ کم گو تھی مگر جب بولتی تو ایسا لگتا کہ دنیا جہاں کا درد اس کے دل میں ہلکورے لے رہا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ اس بات سے بھی شاکی تھی کہ اس کے باپ نے کبھی اس کے وجود کو قبول نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ گلہ کرتی کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے اس معاشرے میں عورت کا کوئی مقام نہیں۔ اکثر بیٹی کی نوید سن کر ماں جیسی ہستی کے چہرے پر بھی ممتا کے نور کی جگہ تاریک سائے نظر آجاتے ہیں۔

اسے یہ بھی گلہ تھا کہ اس کی پیدائش پر باپ نے اسے نظر بھر کر بھی نہ دیکھا تھا مگر اس کے بلکتے وجود نے ماں کے سینے میں ممتا کے سوتے جگا دیے تھے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے اور ممتا کا جذبہ ہر جذبے پر حاوی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ماں

نے اسے دل و جان سے قبول کرلیا لیکن باپ کا رویہ اکھڑا اکھڑا ہی رہا۔

آفس میں بریک تھا۔ شانو اپنا چہرہ ہاتھوں پر ٹکائے کسی سوچ میں گم تھی۔ میں نے ہولے سے اس کا کندھا ہلایا تھا۔ وہ چونکی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کن خیالوں میں ہو؟"

میری بات پر وہ مسکرائی۔ کچھ پل خاموشی میں کٹے۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔"جب سے ہوش سنبھالا ہے باپ کو نشے میں دھت دیکھا اور ماں کو محنت کی چکی میں پستے لیکن باوجود اس کے ماں بہت نیک اور مخلص ہے۔ اس نے زندگی کے کچے دھاگے میں دکھ ہی دکھ پروئے ہیں۔"

وہ چھٹی کا دن تھا۔ شانو میرے گھر آئی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔"شانو تم آج مجھے اپنی ماں کی کہانی سناؤ ان کی زندگی میں اتنے دکھ، کرب اور تلخیاں کیوں ہیں۔"

شانو کچھ پل خاموش رہی۔ پھر پرت در پرت وہ ماں کے دکھ کھولتی چلی گئی۔ اس نے نم آنکھوں اور گلوگیر لہجے میں بتایا کہ ماں کو جنم دے کر ان کی ماں یعنی شانو... کی نانی منوں مٹی تلے سو گئیں۔ نانا نے نانی کی قبر کی مٹی سوکھنے کا بھی انتظار نہ کیا اور شاداں نام کی ایک عورت کو بیاہ لایا۔ ماں سوتیلی ماں کی گود میں پروان چڑھنے لگی۔ جیسے جیسے وہ پروان چڑھی۔ دکھ بھی امر بیل کی طرح ماں کے وجود سے لپٹ کر پروان چڑھتے گئے۔ نانا کے سامنے تو ماں کے ساتھ شاداں کا رویہ خاصا بہتر ہوتا لیکن ان کے گھر سے نکلتے ہی وہ ناگن کی طرح پھنکارنے لگتی۔

ماں بے چاری سارا سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی لیکن صلے میں دو میٹھے بول بھی نہ ملتے۔ ماں شام کی شدت سے منتظر رہتی۔ شاید اس لیے کہ نانا شام کو گھر پر ہوتے تھے اور ماں کے وجود سے لپٹا شاداں کا خوف کہیں چھپ جاتا تھا۔

وہ بھی معمول کی ایک شام تھی۔ نانا گھر نہیں لوٹے تھے۔ شاداں اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور ماں صحن میں بچھے پلنگ پر انتظار کرتے کرتے اونگھ گئی تھی کہ اچانک کسی نے گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا۔

ماں ہڑبڑا کر اٹھی۔ جلدی سے کنڈی کھولی سامنے ایمبولینس کھڑی تھی۔ اہل محلہ نے نانا کا سفید چادر میں لپٹا بے جان وجود صحن میں بچھی چارپائی پر ڈال دیا۔

نانا قبر میں کیا گئے، ماں کی تمام خوشیاں بھی قبر کی مٹی میں رل مل گئیں۔

شاداں ماں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کچا چبا جائے گی۔ وہ ہر عورت کو پکڑ پکڑ کر ماں کی گردن پہ سیاہ دھبا دکھا رہی تھی۔ شاداں کا کہنا تھا کہ یہ دھبا نحوست کی علامت ہے۔

وہ بین کر کر کے بتا رہی تھی کہ یہ منحوس پیدا ہوتے ہی ماں کو کھا گئی اور اب باپ کو چاٹ گئی۔ شاداں کا خیال تھا کہ اس کے شوہر کو بس نے نہیں بلکہ اس منحوس نے کچلا ہے۔

ماں بے چاری گونگی بہری بنی سب سن رہی تھی۔ کرچی کرچی دل اور فق چہرے کے ساتھ وہ باپ کے بے جان وجود کو اپنی آنکھوں میں سمو رہی تھی۔ یہ سوچ اس کی رگوں میں لہو منجمد کر رہی تھی کہ کچھ پل کے بعد یہ شفیق چہرہ ہمیشہ کے لیے کہیں کھو جائے گا۔

ماں بتاتی ہیں کہ دکھ کے ان لمحات میں یوں لگتا تھا کہ دل پھٹ جائے گا۔ سانسیں تھم جائیں گی اور اپنے باپ کے ساتھ ساتھ وہ بھی بے درد دنیا چھوڑ دیں گی۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ رب اپنے بندوں کو بہت چاہتا ہے۔ بے شک وہ ہم سے ہمارے پیاروں کو جدا کر کے ہمیں دکھوں کے سمندر میں دھکیل دیتا ہے لیکن پھر پہاڑ جیسے اس دکھ کو سہنے کی ہمت اور طاقت بھی وہی رب دیتا ہے۔

آہ گزرتے وقت کے ساتھ تمام دکھ صبر کی چادر میں لپٹ جاتے ہیں اور انسان دوبارہ سے دنیا کے جھمیلوں میں گم ہو جاتا ہے۔ وقت کی چلتی چرخی کے ساتھ شاداں نے گارمنٹس فیکٹری میں پیکنگ کا کام شروع کر دیا۔ ماں بے چاری سارا دن گھر کے کام کاج سنبھالتی۔

وہ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ کام کاج سے فارغ ہو کر ماں ذرا ستانے کو لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ اچانک ڈور بیل کی تیز آواز پر ماں ہڑبڑا کر اٹھیں اور بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچیں۔

"کون؟"

"دروازہ کھولو۔" شاداں کی آواز سن کر ماں سنبھلی اور پھر جلدی سے کنڈی کھول دی۔

شاداں کے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ تھے۔ وہ ماں کو تھماتے ہوئے بولی۔"اس میں نکاح کا جوڑا ہے۔ آج شام رمضانی کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھوا رہی ہوں۔"

ماں نے لرزتی آواز میں شاداں سے کہا۔"اماں اتنی جلدی۔ یہ سب کچھ....."

شاداں نے ماں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو میں نہ سننے کی عادی نہیں ہوں۔ رمضانی میرا دیکھا بھالا ہے۔ فیکٹری کے تمام لوگ اس کے اخلاق کے گن گاتے ہیں۔ وہ تمہیں خوش رکھے گا اور پھر تمہارے باپ کے مرنے کے بعد تم میری ذمہ داری ہو۔ شہر کے حالات اچھے نہیں۔ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ یہی سب سوچ کر میں نے تمہارے نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔ رمضانی میں کوئی بڑی برائی نہیں۔ بس وہ سٹے کا شوقین ہے۔ تمہاری ذمہ داری پڑے گی تو وہ بھی چھوڑ دے گا۔''

ماں ہونق بنی شاداں کو دیکھتی رہ گئیں۔ شاداں ماں کو گم صم دیکھ کر بولی۔ ''جاؤ جلدی سے سر میں پانی ڈالو۔ گلی کے نکڑ پر پارلر والی بانو باجی کو میں نے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں سرخی پاؤڈر لگا کر تیار کر دے گی۔''

ماں، شاداں کی باتیں سن کر اس سے لپٹ گئی اور بہت منت سماجت کی کہ مجھے خود سے الگ مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ لیکن شاداں نے ماں کی ایک نہ سنی اور کہا کہ بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے۔ بیکے کے آنگن کی چڑیا، دانہ چگا اور پھر اڑ گئی۔ ماں سسک رہی تھیں کہ رمضانی آ گیا۔

شاداں نے ماں کو اندر جانے کے لیے کہا اور پھر رمضانی سے مخاطب ہوئی۔ ''رمضانی لگتا ہے تمہیں نکاح کی بہت جلدی ہے۔''

''نہیں شاداں! نکاح کی جلدی نہیں، دراصل کچھ معاملات ایسے ہیں جو میں نکاح سے پہلے طے کرنا چاہتا ہوں۔''

ماں غیر ارادی طور پر دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو کر دونوں کی باتیں سننے لگی۔ دونوں دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک شاداں کی تیز آواز کانوں کے پردے چیرتی گزر گئی۔

شاداں غصے میں رمضانی سے کہہ رہی تھی ''لگتا ہے تو نے پچیس ہزار میں جمیلہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی خرید لیا ہے۔''

کچھ پل خاموشی میں کٹے پھر رمضانی منمناتا ہوا بولا۔ ''شاداں آپا بات پچیس ہزار کی نہیں بات ہے اصول کی۔ جب میں نے تمہاری بیٹی کی قیمت دی ہے تو مجھے کام بھی پکا کرنا ہے۔''

شاداں پھنکارتی ہوئی بولی۔ ''رمضانی تو کیا چاہتا ہے۔ نکاح کے وقت کورے کاغذ پر اس کا انگوٹھا لگوا دوں بلکہ وہ چار جماعت پاس ہے۔ اپنا نام بھی لکھ دے گی۔ رمضانی تو فکر نہ کر۔ میں نے تجھے زبان دی ہے میں اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ تجھے جو شرائط طے کرنی ہوں لکھ لینا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور بس اب جلدی سے قاضی کو پکڑ لا اور ہاں قاضی کو پیسے خود دینا۔ میں اب ایک ٹکا بھی نہیں دوں گی اور ویسے بھی قاضی کا خرچا لڑکے والوں کا ہوتا ہے۔''

یہ سب سن کر اماں کے پاؤں تلے سے زمین کھسک رہی تھی۔ شاداں نے اماں کی محبتوں اور خدمت گزاری کا یہ صلہ دیا۔ ماں کے جسم کی بولی لگا دی۔ چند ٹکوں کی خاطر اس نے اماں کا وجود بیچ دیا۔

اماں کو گھر سے بھاگ جانے کا خیال آیا لیکن اگلے ہی پل اس سوچ نے قدم جکڑ دیے کہ اس محلے میں ابا کی بڑی عزت تھی۔ جو سنتا وہ یہی کہتا کہ باپ کے مرنے کے بعد جواں بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔

اس کے بعد اماں کو کچھ ہوش نہ رہا۔ کب قاضی آیا، کس کاغذ پر انگوٹھا لگا، کہاں نام لکھا، کب نکاح کا جوڑا پہنا، کس نے سرخی پاؤڈر لگایا، کب اور کیسے ابا کا گھر چھوڑ کر پیا گھر پہنچ گئی۔

شادی کے بعد بھی بدنصیبی نے اماں کا پیچھا نہ چھوڑا۔ شروع دنوں میں ابا اماں کا بہت خیال رکھتے لیکن زیادہ عرصے کے لیے وہ خود پر خول نہ چڑھا سکے۔ آہستہ آہستہ اپنی پرانی ڈگر پر آ گئے۔

شادی کے کچھ دنوں بعد جب ابا اپنی فیکٹری گئے تو پتا چلا کہ فیکٹری مسلسل نقصان میں جا رہی تھی۔ اس لیے بہت سے مزدوروں کو نکال دیا گیا۔ نکالے جانے والوں میں ابا بھی شامل تھے۔

نوکری کیا گئی گھر میں کھانے پینے کے لالے پڑ گئے۔ شروع شروع میں ابا نے نوکری کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن ہر بار مایوسی ہوئی۔

ابا کو برباد کرنے میں اس شہر کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ کئی کئی گھنٹوں کی مسلسل لوڈشیڈنگ سے فیکٹریاں بند ہونا شروع ہو گئیں اور پھر سونے پر سہاگہ بھتا خوری نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ شہر کے کئی بڑے بزنس مین اپنا بزنس پاکستان سے شفٹ کر کے دوسرے ممالک کی طرف لے گئے۔

انہی وجوہات کی وجہ سے ابا کو کہیں کام نہیں مل رہا تھا۔ چاروناچار گھر کی دگرگوں حالت دیکھ کر اماں نے گھر سے باہر قدم نکالا۔

پڑوس میں بھجو خالہ رہتی تھیں۔ انہوں نے اماں کو ایک بنگلے پر کام دلا دیا۔ بھجو خالہ کو اپنے گاؤں علی پور جانا تھا لیکن بیگم

صاحبہ سے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ اماں نے بیگم صاحبہ کا کام سنبھال لیا اور بجو چھٹی پر چلی گئیں۔ اماں بے چاری کا دن جھاڑو برتن اور بیگمات کی جھڑکیاں سنتے گزرتا۔ ابا سارا دن نشے میں دھت پلنگ توڑتا رہتا اور رات کو جوئے کے اڈے پر پہنچ جاتا۔ بیگم صاحبہ کا دیا ہوا صدقہ خیرات اور اماں کی کمائی سب جوئے کی نذر ہو جاتی۔

زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے ایک شام رب نے مجھے اماں کی گود میں ڈال دیا۔

ابا کو جب میری پیدائش کا علم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ سنا ہے ابا نے مجھے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں تھا بلکہ اماں بے چاری پر یہ الزام بھی دھر دیا کہ یہ چاند چہرہ یہ رنگ روپ نہ تیرا ہے نہ میرا آخر تم نے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے۔

اماں خاموشی سے ابا کی لعن طعن سنتی رہتی۔ وقت کے بہتے دھارے میں، میں نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ اماں ہر دم مجھے اپنے ساتھ رکھتی۔ جب میں پانچ برس کی ہوئی تو اماں نے بیگم صاحبہ کے کہنے پر مجھے بستی کے قریب ہی ایک گورنمنٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔

ابا نے اب کچی شراب کا استعمال بھی شروع کر دیا۔ ابا کو میری اور اماں کی کوئی فکر نہ تھی۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا اور میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔ اماں مجھے بہت پیار کرتی لیکن ابا کے پیار کو میں ہمیشہ ترستی رہی۔ کبھی کبھار ابا میرے لیے کوئی چھوٹی موٹی چیز لے آتا تو میں کئی دنوں خوش رہتی۔

وقت نے کروٹ بدلی ایک روز اچانک ابا کی طبیعت بگڑ گئی۔ میں اور اماں جیسے تیسے ابا کو لے کر سرکاری اسپتال پہنچے۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے ابا کا بغور معائنہ کیا اور پھر اماں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیا یہ نشہ کرتا ہے؟“

”جی ڈاکٹر صاحب، کچی شراب بھی بہت پینے لگا ہے۔“

”بی بی! مریض کی حالت اچھی نہیں ہے۔ یہ دوائیں فوری طور پر چاہئیں۔“ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے پرچی اماں کو تھما دی۔

میں اور اماں میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھ گئے۔

”اماں پیسے ہیں؟“

”ہاں بیٹی تو پریشان مت ہو۔ بیگم صاحبہ کو اللہ بہت دے۔ میرے اس کڑے وقت میں انہوں نے بہت مدد کی ہے۔ آج بھی میں ان سے دو مہینے کی ایڈوانس تنخواہ لے کر آئی ہوں۔“

اماں کے آنسوؤں سے ان کا دامن تر تھا۔ میں نے اماں کو تسلی دینی چاہی تو اماں سسکتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹی! اب ہمت ٹوٹ گئی ہے۔ زندگی بھر دکھ ڈھوتے ڈھوتے تھک گئی ہوں۔ حوصلے اُمیدیں سب دم توڑ گئے ہیں۔“ میں نے سسکتی ہوئی اماں کو گلے لگا لیا۔

”گل رخ! میں نے ابا کی زندگی کے لیے بہت دعائیں مانگیں لیکن رب کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میری اور اماں کی دعائیں عرش سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔

ابا کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب ابا نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند کر مجھ سے اور اماں سے ناتا توڑ لیا۔

ابا کے وجود کو سفید چادر میں لپٹا دیکھ کر اماں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بجو خالہ بھی ماں کو گلے لگاتی تو کبھی مجھے حوصلہ دیتی۔

ماں ہمیشہ کہتی ہیں شانو تیرا باپ جیسا بھی تھا۔ میرے سر پر اس کے نام کی چادر تو تھی۔ رب نے وہ بھی کھینچ لی۔

ماں کو رب نے ایک بار پھر صبر کی دولت سے مالا مال کر دیا لیکن وہ اکثر نم آنکھوں اور زرد چہرہ لیے مجھ سے کہتی ہیں۔

”شانو! جانے مجھ سے ایسی کون سی خطا سرزد ہوئی ہے جو میرا رب مجھ سے روٹھ گیا ہے۔“

ماہ و سال بنا چاپ کے گزرتے رہے۔ ماں صبح سے شام تک لوگوں کے ہاں جھاڑو برتن کرتی اور میں نے خود کو کتابوں میں گم کر لیا۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میری اور ماں کی زندگی میں خوشیوں بھرا وہ دن آ گیا جس کا ماں نے شاید برسوں انتظار کیا تھا۔ میں نے نہ صرف بی اے کر لیا تھا بلکہ کالج... میں ٹاپ کیا تھا۔ محلے والے ہار پھول اور مٹھائی لے کر ماں کے پاس آ رہے تھے۔ محلے والوں نے میری اور ماں کی خوشی کو سیلیبریٹ کیا تھا۔ ماں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اس دن ماں سے وعدہ لیا تھا کہ اب وہ گھر میں آرام کریں گی اور میں نوکری کروں گی۔ کیوں کہ وہ زندگی بھر میری خاطر محنت کی چکی میں پستی رہی ہیں۔ ماں نے مسکراتے ہوئے مجھے گلے لگا لیا اور بولیں۔ ”بیٹی تو جیسا بولے گی میں ویسا ہی کروں گی لیکن پہلے تجھے نوکری مل تو جائے۔ بیٹی میں خود جاہل سہی لیکن میں نے زندگی پڑھے لکھے لوگوں کے بیچ

گزاری ہے۔"

پھر ماں نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ پل خاموش رہیں اور پھر میرے ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔ "شانو! میں نے بنگلے والے سیٹھ صاحب سے تمہاری نوکری کی بات کی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے جمیلہ تمہاری بیٹی بی اے پاس ہے مگر یہاں بغیر سفارش کے تو ایم اے پاس بھی جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔"

"اماں سیٹھ صاحب سو فی صد درست کہہ رہے ہیں۔ رشوت اور سفارش جیسی لعنتوں نے ہمارے معاشرے کو تباہ و برباد کر دیا ہے لیکن اماں مجھے اپنے اوپر بھروسا ہے اور میں اللہ کی ذات سے پُرامید بھی ہوں کہ وہ میری محنت کا صلہ دے گا۔ کہیں نہ کہیں مجھے نوکری مل جائے گی۔"

میں ہر روز بڑے دھیان سے پورا اخبار پڑھتی تھی اور جہاں کوئی جاب کا اشتہار نظر آتا فوراً اپلائی کر دیتی۔

"تقریباً چھ ماہ کی بھاگ دوڑ کے بعد بالآخر اس فیکٹری میں پرسنل سیکریٹری کی جاب مل گئی۔ تنخواہ بھی اچھی تھی اور سب سے بڑی بات کہ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی تھی۔ اس لیے یہ جاب جوائن کر لی۔"

شانو نے سسکتے ہوئے اپنی کہانی ختم کی تو میری آنکھیں بھی نم تھیں۔

☆......☆

میں کئی بار شانو کے گھر جا چکی تھی۔ شانو کی اماں یعنی جمیلہ آنٹی بہت محبت کرنے والی خاتون تھی۔ ان کا برتاؤ اور محبت بالکل بیٹیوں کی طرح تھی۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی کہ میری شانو کو تمہاری صورت میں بہن مل گئی ہے۔

میں اور شانو بہت انجوائے کرتے۔ شاپنگ ساتھ کرتے۔ اس کے علاوہ جب موڈ بنتا کبھی پیزا ہٹ تو کبھی میکڈونلڈ میں پہنچ کر خوب مزے اڑاتے۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ بات سو فی صد درست ہے کہ غم کی راتیں بہت کٹھن اور طویل ہوتی ہیں جب کہ خوشی کے دن بہت مختصر ہوتے ہیں اگر دکھ کا کوئی پل زندگی میں در آئے تو لگتا ہے ہم صدیوں سے اس دکھ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھر رہے ہیں لیکن خوشی کا پل پلک جھپکتے گزر جاتا ہے۔

اس روز خلافِ معمول شانو آفس دیر سے پہنچی۔ میں نے تیزی سے اپنی سیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے شانو سے کہا۔

"شانو آج تمہیں دیر ہوگئی۔"

"بس یار کیا بتاؤں۔ اس شہر کے آئے دن کے ہنگاموں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کہیں ٹائر جل رہے ہیں تو کہیں ٹریفک جام ہے۔ تو کہیں دھرنا چل رہا ہے۔ ابھی شانو نے سیٹ سنبھالی بھی نہیں تھی کہ چپون نے آکر اطلاع دی کہ اسے باس بلا رہے ہیں۔"

شانو فوراً ہی اٹھ کر آفس کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ باہر آئی تو غصے سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ سیدھی میرے پاس آئی اور غصے میں بولی۔

"یہ بتاؤ کون پاگل ملک صاحب کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔"

"ارے... ارے وہ پاگل نہیں وہ ملک صاحب کا بیٹا عیان ہے۔ عیان زیادہ تر انگلینڈ میں ہوتا ہے۔ سال میں ایک دو بار آتا ہے۔"

"میری بلا سے وہ ایک بار آئے یا دس بار۔ اس کو بات کرنے کی تمیز نہیں۔ اپنے باپ سے کس قدر مختلف ہے۔ کہاں ملک صاحب کی عجز و انکساری اور حلیم طبیعت اور کہاں اس کا ناک پہ دھرا غصہ اور یہ لال انگارہ آنکھوں سے مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے کچا چبا جائے گا۔"

"اچھا شانو اب تم بھی غصہ نہ کرو۔"

"ارے کیا غصہ نہ کروں۔ آج میں بیس منٹ لیٹ کیا ہوگئی اس نے مجھے اتنی باتیں سنا ڈالیں جیسے میں اس کی ذاتی ملازم ہوں۔ جب کہ آفس سے لیٹ ہونے میں قصور میرا نہیں شیر علی کا ہے۔ وہ پچھلے دو دن سے مجھے پک نہیں کر رہا۔"

"شانو! شیر علی بے چارہ بھی اپنی پریشانی میں ہے۔ اس کی بیوی کو ڈینگی بخار ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ... خیر چھو اب غصہ تھوک دو اور جلدی سے اپنے کام نمٹا لو۔"

شانو خاموشی سے کام میں لگ گئی۔ وہ خاصی محتاط ہوگئی تھی۔ عیان کے رویے میں بھی کچھ تبدیلی آئی تھی اور وہ خلافِ معمول اس بار پاکستان میں بزنس کے معاملات دیکھ رہا تھا۔ ملک صاحب انگلینڈ روانہ ہوگئے تھے۔

"شانو اکثر لنچ بریک میں عیان کو ڈسکس کرتی۔ مجھ سے کہتی گل پتا نہیں کیوں مجھے عیان کی آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ عجیب طبیعت کا مالک ہے۔ کبھی تو وہ ملک صاحب کا پرتو نظر آتا ہے اس کی ذات سے عجز و انکساری چھلکتی ہے اور کبھی کسی معمولی سی بات پر اتنا غصہ کرتا ہے کہ ہر چیز تہس نہس کر دیتا ہے۔ اتنی بے بھاؤ کی سناتا ہے کہ دل چاہتا ہے اسی

لیے جاب چھوڑ دوں۔"

میں بڑے رسان سے اسے سمجھاتی۔ "دیکھو شانو تم پریشان مت ہو۔ بڑے لوگوں کی اولادیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ صرف یس سننے کی عادی۔ لفظ نو ان کی ڈکشنری میں نہیں ملتا۔ رہ گئی بات ان موصوف کی تو یہ چند دن کے اور مہمان ہیں۔ ملک صاحب اپنے چیک اپ کے بعد پاکستان واپس آجائیں گے۔"

کچھ دنوں سے عیان کے آفس کے معمولات میں خاصی تبدیلی نظر آرہی تھی۔

عیان نے آفس آنا خاصا کم کردیا تھا اور جب آتا تو تب بھی شانو سے کچھ معاملات ڈسکس کرتا اور چلا جاتا۔

شانو سے ہی سے مجھے پتا چلا کہ وہ کوئی لیدر فیکٹری لگانے کی پلاننگ کررہا ہے۔ فیکٹری کی جگہ وغیرہ کے لیے بھی سروے کررہا ہے اور تقریباً تمام معاملات طے پا چکے ہیں۔ اس مصروفیت کی وجہ سے ہی وہ آفس کو بھی ٹائم نہیں دے پارہا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں آفس پہنچی تو خلافِ معمول شانو موجود تھی۔ کچھ ہی دیر میں عیان بھی آگیا۔ عیان نے آتے ہی شانو کو اپنے کمرے میں بلایا اور پھر کچھ پیپرز تیار کرنے کو دیے۔ شانو خاصی مصروف تھی۔ لنچ بریک سے کچھ دیر قبل وہ میرے پاس آئی۔

"عیان نے فیکٹری کی بات طے کرلی ہے۔ آج کچھ لیٹرز وغیرہ اور پیپرز تیار کرنے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہے۔ پلیز تم بھی ساتھ چلو۔"

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی عیان ہمارے درمیان پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "گل رخ! میں اور شانو جی فیکٹری کے کچھ معاملات دیکھنے جارہے ہیں۔ میری واپسی تک آفس کی ذمہ داری آپ کو سونپ کر جارہا ہوں۔"

اگلے ہی پل وہ شانو سے مخاطب تھا۔ "شانو چلیے۔"

شانو نے اسکارف سیٹ کیا۔ بیگ کندھے پر ڈالا اور مجھے دیکھتی ہوئی وہ عیان کے ساتھ نکل گئی۔

اگلے دن شانو آفس نہیں پہنچی تو میں نے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ وہ بخار میں پھنک رہی ہے۔

دوسرے دن بھی آفس سے غیر حاضر پاکر میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ شانو کی اماں گھر پر نہیں تھیں۔ شانو مجھ سے لپٹ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

"گل رخ تمہاری شانو مرگئی۔ تمہارے سامنے اس کی لاش ہے۔ جانتی ہو وہ فیکٹری دکھانے کے بہانے مجھے ایک عمارت میں لے گیا۔ وہاں کچھ مزدور کام کررہے تھے۔ میں نے اس سے استفسار بھی کیا کہ یہاں آپ کس سے ملنے آئے ہیں۔ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "سیکنڈ فلور پر منیجر صاحب اور ان کی فیملی ہے۔"

بلڈنگ کے دوسرے فلور پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور چیتے کی سی پھرتی سے میرا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا اور دروازہ اندر سے لاک کردیا۔

وہ لمحے بہت بھاری تھے اور وقت بڑا کڑا تھا۔ جب میں بے بسی سے اس کے آگے ہاتھ جوڑتی رہی لیکن اس ظالم پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ سب ہوگیا جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔

اپنی من مانی کرکے وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

"شانو تمہیں اپنی عزت پہ بہت ناز تھا۔ جانتی ہو خوب صورت لڑکیاں میری کمزوری ہیں اور ہاں میں نے جب چاہا جس سے چاہا دوستی کی۔ تم پہلی لڑکی ہو جس نے میری دوستی کو ٹھکرایا اور تم اپنے جس حسن پر ناز کرتی ہو آج میں نے اس کو مٹی کردیا ہے۔ اب تم خود اپنے وجود سے نفرت کرو گی۔" کہہ کر شانو سسکنے لگی۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپک کر تسلی دی تو وہ بولی۔

"اب جینے کو دل نہیں کرتا دعا کرو مجھے موت آجائے۔ ماں نے تمام زندگی صرف دکھ ڈھوئے ہیں چند پل خوشی کے میں نے اس کی جھولی میں ڈالے تھے لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ خوشی کے ان لمحوں کے عوض ماں کو اتنا بڑا دکھ سہنا پڑے گا۔ گل رخ اماں نے ہمیشہ مجھ سے کہا بیٹی ہم غریبوں کے پاس سونے چاندی کے ڈھیر نہیں، بنگلا گاڑی نہیں جس کی ہم حفاظت کریں۔ لے دے کے اس جھونپڑی میں ہم غریبوں کی قیمتی شے عزت ہے۔ اس کی ہمیں حفاظت کرنی ہے۔ عزت کی خاطر جان سے بھی گزرنا پڑے تو گزر جانا مگر اسے پامال ہونے سے بچالینا۔ بتاؤ میں ماں کو کیسے بتاؤں کہ جس چہرے کو وہ چاند چہرہ کہتی ہے، اسے گہن لگ چکا ہے۔ شاید میں اب جی نہ سکوں۔ تم ماں کا بہت خیال رکھنا اور یہ میرا استعفیٰ ہے آفس میں دے دینا۔"

"شانو حوصلے سے کام لو۔ جاب چھوڑنے میں جلد بازی مت کرو۔ عیان تو کل رات کی فلائٹ سے انگلینڈ چلا گیا ہے۔ ملک صاحب ایک دو روز میں پاکستان واپس آجائیں گے۔ میں خود ان سے بات کروں گی۔ وہ بہت غریب پرور انسان ہیں۔ ضرور اس مسئلے کا کوئی حل نکالیں گے۔"

میرا اندازہ درست نکلا۔ چند روز بعد ملک صاحب آ گئے۔ آفس جوائن کرنے کے بعد سب سے پہلے انہوں نے شانو کو غیر حاضر پا کر اس کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ شانو چھٹی پر ہے۔

"اچھا۔" ملک صاحب کسی سوچ میں گم تھے۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ "سر مجھے آپ سے شانو کے متعلق کچھ بات کرنی ہے۔"

ملک صاحب نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں بڑی گہری تھیں۔ کچھ پل خاموشی میں کٹ گئے۔ وہ پُرسوچ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ "گل رخ میں خود بھی شانو سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے بیٹی کی طرح سمجھا لیکن اس نے بہت برا کیا۔ عیان نے جب مجھے سب بتایا تو میرا سر شرم سے جھک گیا۔ اس نے تو میرے سفید بالوں کی بھی لاج نہیں رکھی۔"

"سر آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ شانو بے چاری تو خود عیان......"

ملک صاحب میری بات کاٹ کر انتہائی درشت لہجے میں بولے۔ "گل رخ! آپ کو معلوم نہیں شانو معصومیت کی چادر اوڑھے کتنی سیاہ کاریوں میں ملوث ہے۔ اس نے عیان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ بقول عیان وہ اسے بلیک میل کر کے اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ آپ ابھی اور اسی وقت شانو کو آفس بلوایئے۔ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ملک صاحب کا پارہ ہائی ہوتا دیکھ کر میں خاموشی سے آفس سے باہر آ گئی۔

شانو کو فون کیا کہ ملک صاحب نے بلوایا ہے۔ وہ نہیں آنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے زور دے کر بلایا۔

کچھ دیر بعد وہ زرد چہرہ اور بجھی بجھی اشکبار آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے تھی۔

میں اسے لے کر ملک صاحب کے کمرے میں گئی۔

ایک لمحے کو تو اس کی حالت دیکھ کر ملک صاحب بھی ٹھٹک گئے لیکن اگلے ہی پل وہ سنبھل گئے اور حقارت سے شانو کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "بی بی تم عیان کو محبت کے جال میں پھنسا کر شادی کرنا چاہتی تھیں۔ یہ سب کچھ تم نے چند ٹکوں کی خاطر کیا۔ مجھے بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں۔ تم نے اپنی عزت کی بولی کتنی لگائی ہے۔ بولو جواب دو۔ میں تمہیں بلینک چیک دیتا ہوں۔"

"بس ملک صاحب بس آپ کے بیٹے نے تو عزت تار تار کی تھی مگر آپ نے تو مجھ سے جینے کا حوصلہ ہی چھین لیا۔" وہ رکی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ "ملک صاحب میں صرف اتنا کہوں گی کہ اس فانی دنیا کی عدالت میں تو آپ جیسے امراء دولت کی جھنکار میں مجھ جیسی غریب کی آواز دبا کر انصاف خرید سکتے ہیں۔ لیکن......" وہ دوبارہ رکی۔ اس نے ملک صاحب کے چہرے کا جائزہ لیا پھر بولی۔ "ایک عدالت اور بھی ہے۔ میرے رب نے چاہا تو میری بے گناہی اور معصومیت کا ثبوت وہاں آپ کو ملے گا اور آپ کے بیٹے کی گردن میں انصاف کا پھندا ہوگا۔"

شانو خاموشی سے آنسوؤں کے کڑوے گھونٹ پیتی آفس سے نکل گئی۔ میں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ ایک پل بھی آفس میں نہ رکی۔

ملک صاحب کے رویے اور باتوں سے میں بھی دل برداشتہ تھی۔

میں نے اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور آفس کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔ سامنے سے آتے آٹو کو روکا اور شانو کے گھر کا پتا بتا کر سوار ہو گئی۔

جمیلہ خالہ گلی میں مل گئیں۔ "آؤ بیٹی آج تم جلدی آ گئیں۔ شانو نہیں آئی؟"

میں نے چہرے کی پریشانی کو مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں شانو اب تک پہنچی نہیں؟"

ابھی میری بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ایمبولینس کے سائرن نے دلوں کو دہلا دیا۔

"اللہ خیر۔" کہتے ہوئے آنٹی دروازے کی طرف بڑھیں گھر کے سامنے ایمبولینس کھڑی تھی۔

سفید چادر میں لپٹی لاش کو اہل محلہ ایمبولینس سے اتار رہے تھے۔

میں جمیلہ آنٹی کے لرزتے وجود کو تھامے کھڑی تھی۔ ایمبولینس والے نے بتایا کہ بیگ سے شناختی کارڈ ملا ہے۔ اس پر لکھے ایڈریس کو دیکھ کر ہم ان کی ڈیڈ باڈی لے کر آئے ہیں۔

جمیلہ آنٹی چیخنے لگیں۔ "میری شانو چلی گئی وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ چلی گئی میری شانو......" کہتے کہتے وہ اس کی میت کے برابر میں زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔

میں نے آگے بڑھ کر جمیلہ آنٹی کو اٹھانا چاہا لیکن ان کی روح بھی شانو کی روح کی ہمسفر ہو چکی تھی اور میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا غریبوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔



ساون

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم
انسان کی زندگی بذاتِ خود ایک کہانی ہے اس میں وہ تمام لوازمات موجود ہوتے ہیں جو ایک بہترین افسانے، کہانی، ڈرامے کے لیے ضروری ہے۔ اب ساون کی زندگی ہی کو دیکھ لیں۔ اس معذور و معصوم بچے کے حالات کتنے سبق آموز ہیں۔ اسی لیے میں نے اسے سرگزشت میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ظہیر مرزا
(کراچی)

ساون کو اپنی زندگی سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ وہ چاہنے پر بھی اسے ختم نہیں کرسکتا تھا اور نہ جی سکتا تھا۔ سالوں بستر پر بیمار پڑے پڑے وہ خود کو بے جان سا محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ بے رنگ بے کیف زندگی ہی اس کے لیے کچھ کم عذاب نہ تھی کہ ٹھیکیدار حشمت نے اسے اپنے گھر بلوا کر اس کی زندگی کو مزید امتحانوں میں ڈال دیا تھا۔

ساون کو لگتا تھا کہ وہ منحوس ہے۔ کیونکہ اس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے باپ کی موت ہوگئی، ماں

فرزانہ نے جاب کر لی اور زندگی کے کڑے دن جھیلنے لگی مگر یہیں اس کی آزمائشوں کی انتہا نہ ہوئی بلکہ بیماری نے اسے سالوں کے لیے بستر پر لا ڈالا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ماں نے بھی قبر کا کونا سجا لیا۔ اب زندگی صرف امیدوں اور خوابوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ زندگی کا ہر دن اس کے لیے نئی آزمائش بن گیا تھا۔

ساون کے ماموں ٹھیکیدار حشمت اسے اپنے گھر لے آئے۔ ان کے دو منزلہ گھر میں جہاں ساون کے دوسرے ماموں بھی رہتے تھے ساون کے رہنے کے لیے جگہ تو مل سکتی تھی مگر دلوں کی تنگی نے اسے دالان تک محدود کر دیا۔ اس کی آمد پر سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ کوئی اپنا حصہ خالی کرنے یا اسے رکھنے کا روادار نہ تھا لہٰذا یہ طے پایا کہ صحن اور باورچی خانے کے درمیان دالان میں اس کا بستر لگا دیا جائے اور ایک دیوار اٹھادی جائے یا پھر لکڑی کے کیواڑوں کے دو پٹ لگوا دیے جائیں جن کو بند کرنے سے اس جگہ کو کمرے کی سی شکل دے دی جائے گی تاکہ ساون رہ سکے۔ یہ سب شاید ساون کے آنے سے پہلے سوچا جاتا تو ہو بھی سکتا تھا مگر اس کے آنے کے بعد اس کام میں سب کی دلچسپی محض باتوں تک رہ گئی۔ اور ایک موٹا پردہ ڈال کر کام چلا لیا گیا۔ جو دن کے وقت کھول دیا جاتا اور شام کو گرا دیا جاتا تاکہ ساون کو احساس ہو کہ اسے ایک کمرا دیا گیا ہے۔

ساون کی معذوری کو دیکھتے ہوئے یہ بھی طے کیا جانے لگا کہ اس کے کاموں کی ذمہ داری کس کی ہوگی، اور اگر یہ لوگوں کی ذمہ داری ہوں گی تو کون دن کب وہ کام کرے گا مگر ان معاملات کو بھی اس خوبی سے نبھایا گیا کہ خیال پیش کر دیا گیا" اس کے لیے ایک الگ نوکر رکھ دیا جائے گا جو ساون کو نہلانے دھلانے اور کھانا کھلانے کے کام کرے گا۔

یہ سب دیکھتے ہوئے ساون جو رات دن اپنی صحت یابی کے لیے فکر مند رہا کرتا تھا اب اپنی موت کی آرزو کرنے لگا۔

صبح ہوتے ہی سارے گھر کے کاموں کا شور وغل ساون کو سنائی دیتا۔ دودھ والا، اخبار والا، کام والی اور بچوں کے اسکول کی گاڑی کے ہارن کی آوازوں سے وہ جھنجلانے لگتا۔ مگر جلد ہی اسے ان آوازوں کی عادت ہو گئی۔ مگر جو چیز اس کے ذہن کے لیے شدید اذیت کا باعث تھی وہ تھی ٹھیکیدار صاحب کی بیوی نفیسہ بیگم کے جلے کٹے جملے۔

وہ یہاں کچھ بھی بدل نہیں سکتا تھا بس اتنا ضرور کر سکتا تھا کہ جب نفیسہ بیگم باورچی خانے کی طرف آتیں اور دالان میں بیٹھ کر اپنی نوکرانی ولاری سے کام کروایا کرتیں تو ساون اپنی آنکھیں بند کر کے بے سدھ سا ہو جاتا جیسے سو رہا ہو۔ اس دن بھی جیسے ہی اس نے نفیسہ بیگم کو آتے دیکھا تو آنکھیں موند لیں۔ نفیسہ بیگم کی باتوں سے اسے اپنے ماضی کی کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوئیں جو اسے نہیں بتائی گئی تھیں مگر ان کا ہر ہر جملہ اسے خنجر کی طرح لگا۔

"اے بنے یہ تو غیر مسلم ہے..... پھر تو اس کے برتنوں کو بھی الگ کر دو بھیا۔" گھر کی بوڑھی ملازمہ ولاری نے ہولتے ہوئے کہا۔

"خاک مسلمان ہوگا.... جب اماں کو ہی کوئی فرق نہ پڑتا تھا تو اسے کیا تربیت کی ہوگی۔" نفیسہ بیگم نے تنک کر جواب دیا۔

"ہائے کس کا ذکر کر دیا' کس کی یاد دلادی' بے چاری فرزانہ کی بھی کیسی قسمت تھی۔ اگر اس کے شوہر کے مرنے کے بعد اسے بلا لیا ہوتا تو کچھ تو دن اچھے گزر جاتے اس کے۔" ولاری نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تم جانتی نہیں ہو اس اندھی محبت نے فرزانہ کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ اچھا خاصا شفقت چچا جان کے بیٹے کا رشتہ موجود تھا مگر اس نے گریز کی وجہ سے گھر بار چھوڑا جو اس کے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھا کرتا تھا اور شادی کرلی۔ چلو خیر شادی تک بھی بات قابل قبول ہوتی اگر گریز مسلمان ہوتا۔ کوئی اس سے ملتا جلتا نہیں تھا سب نے ہی تعلق توڑ لیا تھا۔"

ولاری نے سبزی کاٹتے کاٹتے ہاتھ روک کر کہا" برا ہوا بیچاری کے ساتھ۔ اب اس بن ماں باپ کے بچے کو دیکھ کر دل پھٹتا ہے۔ دیکھو تو کچھ خاصا جوان بچہ ہے۔ جب اس کے باپ کی موت ہوئی تھی تب تو مشکل سے سال بھر کا ہوگا یہ۔ تب ہی اسے لے آتے تو کم از کم ہمارے.... مذہب کو تو جانتا۔"

"سب کچھ کر کے دیکھ لیا تھا ولاری۔ گئے تھے ٹھیکیدار صاحب خود۔ پر اس وقت بھی فرزانہ کے دماغ آسمان پر رہے۔ آنے سے منع کر دیا۔ جاب کر لی پھر ہم بھی خاموش ہو گئے۔ فرزانہ کے انتقال کی بھی خبر نہ ہوئی۔ خیر اس نے اپنے گھر والوں کو بھی اپنی میت پر آنے سے منع کیا تھا۔ یہ سب تو ابھی پتا چلا ہے جب اس لڑکے کی رشتے کی پھوپی

سکتا ہے اور نہ سورج چاند کو۔

چاند اور سورج شاید انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی حیرت کا سبب رہے ہیں۔ سورج کو دیکھ کر اور اس کی تمازت محسوس کر کے اس نے قوت اور نمو کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے جب کہ چاند کو دیکھ کر اس نے خوشی اور رومانس محسوس کیا ہے۔

چاند کے ساتھ سینکڑوں افسانے اور کہانیاں بنا دی گئیں۔ اس کا روشن چہرہ انسان کو اس کے محبوب کے خوب صورت چہرے کی طرح محسوس ہوا۔ ''یہ چاند سا روشن چہرہ۔'' ایک مثال بن کر رہ گیا۔

ہماری اردو شاعری میں چاند پیار اور رومان کی ایک مضبوط علامت بن کر سامنے آیا ہے۔

چاند پھر اس کے دریچے کے برابر آیا۔ دلِ مشتاق مگر
پھر وہی منظر آیا۔

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا۔ کچھ
نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ تیرا۔

اس قسم کے اور بے شمار اشعار محبت کرنے والوں نے چاند کو گواہ بنا کر ایک دوسرے سے محبت کے وعدے کیے ہیں۔

کہیں کہیں روایتیں چاند سے منسلک رہی ہیں۔ بچپن میں چاند، چندا ماموں ہوا کرتے تھے۔ چندا ماموں دور کے یا پھر کوئی بڑھیا چاند میں بیٹھ کر چرخہ کات رہی ہوتی تھی۔

چاند کی بڑھیا کات رہی ہے چرخہ کتنے برسوں سے۔
جیسی پیاری سوچیں ایسی پیاری الجھن بھی۔

ہم چاند سے آنے والے شہزادے اور شہزادیوں کی کہانیاں سنا کرتے۔ کیسی کیسی روایات چاند سے وابستہ رہیں (اور آج تک ہیں) مکمل چاندنی راتوں میں سمندر کا مد و جزر اور ساروحوں کا گھومنا۔ انسان تو انسان جانوروں تک پر چاند کی کرنوں کا اثر۔ ایک طویل داستان ہے۔ ہم نے اس مضمون میں چاند سے متعلق روایات بیان کرنے کی کوشش کی ہے وہ روایات جو شاید ہزاروں برسوں سے دنیا کے مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ روایات ان کی تہذیب اور مذہب کا حصہ ہیں۔

امریکی قدیم قبائل جنوری کے پورے چاند کو بھیڑیوں کا چاند کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب جنوری کے مہینے میں چاند پورا ہوتا ہے تو اس وقت بھیڑیے اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل کر چاند کی پرستش کرتے ہیں۔ بھیڑیے جب ایک غول کی صورت میں جمع ہو کر زور زور سے شور کرتے تو وہ یہ کہا کرتے کہ وہ چاند دیوتا سے فریادیں کر رہے ہیں۔

انہوں نے ہر مہینے کے چاند کو ایک نام دے رکھا تھا۔ یعنی جنوری کے چاند کا نام کچھ اور تھا۔ فروری کے چاند کا نام کچھ اور.....

وہ اسی چاند کے لحاظ سے اپنا کام کیا کرتے۔ یعنی کاشت کاری کا چاند، شکار کا چاند، ماہی گیری کا چاند، گھروں کی مرمت کا چاند اور شادی بیاہ کا چاند وغیرہ۔

چینیوں کا خیال تھا کہ سال میں بارہ چاند ہوتے ہیں۔ یعنی ہر مہینے کا ایک نیا چاند اور پرانے چاند کے ٹکڑے کر کے کرۂ آسمان پر بکھیر دیے جاتے ہیں جو ستارے کہلاتے ہیں۔

ان کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ ہر چاند کا ایک شہزادہ ہوتا ہے جو چاندی میں رہتا ہے اور ریشموں سے بنا ہوا لباس پہنتا ہے۔ گرین لینڈ میں رہنے والوں کے مطابق چاند اور سورج کے دیوی دیوتا الگ الگ تھے۔ چاند کے خدا کو انگ نان (Anwing Nan) کہا جاتا۔ جب کہ سورج کی دیوی ملینیاق۔

کچھ اس قسم کے اوٹ پٹانگ خیالات دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے تھے اور ان کے عقیدے بہت پختہ ہوا کرتے۔ ایک بہت قدیم تہذیب تھی مایا۔ یہ اپنے زمانے کی بہت ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ مایا کیلنڈر اور مایا تعمیرات پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ یہ ایک پُراسرار تہذیب تھی۔

ان کی یہ روایت ہے کہ اکس چال Ixchal نامی ایک بوڑھی عورت تھی جو ہر وقت کسی نہ کسی کام میں معروف نظر آتی۔ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں ایک سانپ بھی ہوا کرتا تھا۔ (ہوسکتا ہے کہ دیکھنے والوں کو اس قسم کی کوئی تصویر دکھائی دیتی ہو۔ یہ ایک نفسیاتی امر ہے کہ جس شے کے بارے میں سوچا جائے وہی درو دیوار اور چاند وغیرہ پر دکھائی دینے لگتی ہے۔)

بہت سے لوگوں کو چاند میں اپنا محبوب دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے گھنٹوں اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ سنا ہے کہ ہمارے مشہور شاعر میر تقی میر بھی اس عارضے کا شکار ہو گئے تھے۔

اس بوڑھی عورت کی پرستش حاملہ خواتین کچھ زیادہ ہی کیا کرتیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق چاند کی یہ بوڑھی

تھی۔ وہ کراہی تھی مگر جب میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”خاص نہیں ہے پلیز کوشش جاری رکھو۔ شاید یہ ہمارے پاس آخری موقع ہے۔“

”ہاں شاید یہی آخری موقع ہے۔“ میں نے اس بار اس کی کمر کی بجائے بیلٹ پکڑی۔

”ایک منٹ میں ہاتھ خشک کرلوں۔“ جولی نے کہا اور دیوار پر رگڑ کر ہاتھ خشک کرنے لگی۔ پانی کی سطح میں مسلسل کمی ہورہی تھی۔ جولی ہاتھ خشک کرکے تیار ہوئی اور اس نے کہا۔ ”اگر میرا ہاتھ کنارے پر جم جائے تب بھی مجھے چھوڑنا مت بلکہ سہارا دینا۔ مجھے اوپر چڑھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوگی۔“

میں نے سر ہلایا اور اس کی کمر پکڑ لی۔ کلپ میں میرا پاؤں پھنسا ہوا تھا اور جولی نے اوپر ایک کلپ تھام لیا تھا۔ میں نے ایک دو تین کہا اور جسم کی پوری قوت سے اسے اوپر اچھالا اور جولی تیزی سے اوپر گئی۔ اس کا ہاتھ کنارے پر گیا اور وہ رکی۔ اس کا جسم کسی قدر غیر متوازن ہوا اور مجھے یوں لگا کہ وہ واپس آرہی ہے مگر نہیں اس کا ہاتھ جم گیا تھا۔ میں نے پھرتی سے اس کے پیروں کو تھام کر اسے سہارا دیا۔ وہ بولی۔ ”میرے پاؤں دیوار سے ذرا دور رکھو ورنہ میرے ہاتھ پھسل جائیں گے۔“

میں نے اس کے پاؤں دیوار سے دور کیے اور اس کا جسم ذرا ترچھا ہوا اور اسے کنارے پر ہاتھ جمانے میں آسانی ہوئی۔ میں نے اس کے پاؤں اپنے شانوں پر ٹکا لیے اور کہا۔ ”میں کلپس پکڑ رہا ہوں اور آہستہ سے خود کو اوپر کروں گا۔ تم چڑھنے کی کوشش کرنا۔“

”اوکے۔“ اس نے جواب دیا۔ میں نے ہاتھوں سے پانی سے باہر کا ایک کلپ پکڑا اور اس پر زور لگاتے ہوئے خود کو اوپر کیا۔ اب جولی بغلوں تک اوپر تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر کرکے پھیلا لیے تھے۔ اس نے کہا۔

”یہاں ڈھلان ہے اور مجھے تھوڑا اور اوپر کرو تب میں چڑھ سکوں گی۔“

اس بار میں نے ہاتھ کے ساتھ پاؤں والے کلپ کی مدد سے خود کو اوپر کیا اور جولی اتنی اوپر گئی کہ اسے ہاتھ جمانے کا موقع مل گیا۔ میرے شانوں سے اس کا بوجھ کم ہوا تب بھی مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ سوراخ میں پہنچ چکی ہے۔ میں اوپر دیکھ رہا تھا کہ ابھی وہ واپس آئے گی۔ مگر اس کی ٹانگیں بھی اوپر غائب ہوگئیں۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ”میرا بیگ دو۔“

میں نے بیل سے اس کا بیگ نکال کر اوپر اچھالا جو اس نے پکڑ لیا اور سب سے پہلے ایل ای ڈی لائٹس نکال کر دیواروں پر لگائیں۔ اوپر کا پورا حصہ روشن ہوگیا اور جولی نے کہا۔ ”یہ جگہ سرنگ لگ رہی ہے آگے راستہ ہے۔ لیکن پہلے تم اوپر آؤ تب ہم اسے دیکھتے ہیں۔“

”اس نے ایک جگہ کیل گاڑی اور رسی باندھ کر نیچے کی تو میں نے اپنا بھی بیگ اوپر پھینکا اور پھر رسی کی مدد سے اوپر پہنچ گیا۔ تقریباً تین گھنٹے بعد پانی سے نکل کر ایسا سکون ملا جو بیان سے باہر ہے۔ ہماری تکلیف میں بھی فوری کمی آئی تھی۔ آگے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کرکے اپنے کپڑے اتار کر نچوڑے اور پھر پہن لیے۔ یہاں ہلکی سی گرمی اور نمی تھی مگر حبس نہیں تھا اس کا مطلب تھا کہ وہاں کہیں سے تازہ ہوا آرہی تھی۔ اس جدوجہد نے ہمیں تھکا دیا تھا اس لیے ہم کچھ دیر سستانے کے بعد سرنگ میں آگے روانہ ہوئے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے لگ رہا تھا کہ ہم کھلی ہوا کے پاس ہوتے جارہے ہیں۔ پھر پانی کا شور سنائی دینے لگا مگر یہ شور سرنگ میں نہیں تھا بلکہ اس سے باہر تھا۔ سرنگ بلندی پر تھی اور مزید بلندی کی طرف جارہی تھی۔ بالآخر ہم سمندر کے اوپر ایک جگہ نکلے۔ تقریباً سیدھی دیوار پر سرنگ کا دہانہ نکل رہا تھا اور نیچے اترنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ کوئی تیس فٹ نیچے سمندر کا پانی پہاڑی سے ٹکرا رہا تھا۔ چاند نکل آیا تھا اور سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر خوشی سے ہماری کیا حالت ہوئی وہ ہم بیان نہیں کرسکتے۔“

دو گھنٹے بعد ہم غار کے دہانے پر موجود امدادی کیمپ میں تھے اور وہاں ڈاکٹرز ہمیں چیک کررہے تھے۔ پانی سے نکلتے ہی خارش میں کمی ہونے لگی تھی مگر ہمیں مکمل ٹھیک ہونے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ بہرحال جان بچ جانے کے مقابلے میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔ اس واقعے کا سب سے افسوسناک پہلو کلارا کی اندوہناک موت تھی۔ وہ سرنگ میں پھنسی رہ گئی اور اس میں پانی بھر گیا تھا۔ وہ ڈوب کر ہلاک ہوگئی۔ ہم نے اس کی تدفین میں شرکت کی اور پھر بوجھل دلوں سے اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہوئے تھے۔ جولی نے ریٹائرمنٹ لے لی اور آئندہ کے لیے مہمات میں شامل نہ ہونے کا اعلان کیا مگر فریک اب بھی ہمارا شریک کار ہے۔

چھوٹی سی بنیان پہن رکھی تھی۔ کچھ جولی کے پیٹ پر بھی سرخ دھبے نظر آنا شروع ہو گئے تھے اور ان میں خارش ہو رہی تھی۔ مگر ہم کھجانے سے گریز کر رہے تھے کیونکہ اس صورت میں یہ زخم بن جاتے۔ میں نے اپنی ران کو کھجایا تو وہاں زخم بن گیا تھا اس لیے ہم یہ اذیت برداشت کر رہے تھے۔ درمیان میں کئی بار جولی نے کہا کہ اب اس سے برداشت نہیں ہو رہا ہے مگر میں نے اسے روکا۔ ایک بار تو اسے دبوچنا پڑا تھا ورنہ وہ خود کو کھجانے جا رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ ''بس کچھ دیر اور برداشت کر لو ابھی کچھ دیر میں پھر ٹائیڈ بڑھے گی تو ہم سوراخ تک جانے کی کوشش کریں گے۔ پانی سے نکل کر یقیناً اس میں فرق پڑے گا۔ زخموں کی صورت میں انفیکشن کا امکان بڑھ جائے گا۔''

جولی نازک عورت تھی اور اس وقت بڑے حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''تمہارا شکریہ اگر تم نہ ہوتے تو شاید میں مر جاتی۔ تم نے مجھے حوصلہ دیا ہے۔''

''اور مجھے تمہاری موجودگی سے حوصلہ ملا ہے۔ اکیلا آدمی ایسی مشکلوں کا بہت مشکل سے مقابلہ کر سکتا ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ میں اسے اور خود کو باتوں میں لگا رہا تھا۔ تاکہ خارش اور دوسری تکلیفوں سے توجہ ہٹ سکے۔ تکلیف کی وجہ سے اب نیند بھی نہیں آ رہی تھی اس لیے ہم جاگ رہے تھے اور اونگھ بھی رہے تھے۔ اب میں سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس وقت ایسی تکلیف برداشت کی تھی۔ مسلسل پانی میں رہنے سے ہماری جو حالت ہوئی میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ شاید یہ زندہ رہنے کی لگن تھی جو ہم میں اتنی قوت برداشت آ گئی تھی۔ دوپہر تین بجے تک کا وقت ہم نے کیسے گزارا یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ جولی بار بار رونے لگتی تھی مگر ساتھ ہی اپنی آواز دباتی تھی کہ میں پریشان نہ ہوں۔ خود میرے بھی آنسو نکل رہے تھے مگر میں آواز نہیں نکال رہا تھا۔ تین بجے کے بعد ٹائیڈ آئی اور پانی اوپر بڑھنے لگا۔

اس وقت تک ایک مصیبت یہ ہوئی تھی کہ ہماری ہیلمٹ لائٹس بیٹریز کمزور ہونے سے بہت کم روشنی دے رہی تھیں۔ اس لیے ہمیں دستی ٹارچیں استعمال کرنا پڑ رہی تھیں۔ جولی کا ہارن بھی آخری دموں پر تھا اس لیے ہم نے فی الحال اس کا استعمال بند کر دیا تھا شاید اس میں پہلے ہی گیس کم تھی اس لیے یہ جلدی خاتمے کے قریب پہنچ گیا۔ پانی دو لیٹر رہ گیا تھا اور ایک بوتل خالی ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے رسی باندھ کر اسے ٹول کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب ہم سوراخ کے پاس پہنچ جاتے تو اسے اندر پھینک کر رسی اٹکانے کی کوشش کرتے۔ جولی نے چھوٹی کیلیں نکال لی تھیں اور چند جگہوں پر ٹھونک کر ان کا تجربہ بھی کر لیا تھا۔ چھ بجے کے بعد ہمارے لیے مشکل وقت شروع ہوا کیونکہ پانی دونوں بڑی کیلوں سے اوپر آ گیا تھا اور اب ہمیں اپنے بل بوتے پر تیرنا پڑ رہا تھا اور ساتھ ہی جولی دیوار میں کیلیں ٹھونکنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں اسے سہارا دے رہا تھا۔ بے پناہ تھکن اور خارش کی تکلیف میں یہ آسان کام نہیں تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ کیل ٹھونکنے کے لیے جو قوت درکار ہے وہ جولی میں نہیں ہے اس لیے میں نے اس سے ہتھوڑی لے لی اور کیلیں ٹھونکنے لگا۔ میں ہر چھ انچ کے بعد کیل ٹھونک رہا تھا اور ان سے کلپ منسلک کر رہا تھا۔ چھ بجے ہم سوراخ سے تقریباً چار فٹ نیچے آ چکے تھے اور دو فٹ نیچے تک کیل ٹھونک چکے تھے۔ مگر اس کیل پر انحصار کر کے ہم اوپر نہیں چڑھ سکتے تھے۔ اس سے معمولی سہارا مل سکتا تھا۔ جولی کے مشورے پر میں نے پانی کی بوتل کی بجائے ہتھوڑی استعمال کی کیونکہ اس کے اوپر سے دونوں سرے نکلے ہوئے تھے اور اس کے دستے میں رسی باندھنے کی مناسب جگہ بھی تھی۔ اس کے بعد میں ذرا پیچھے ہوا اور پھر پانی میں اچھلتے ہوئے ہتھوڑی سوراخ میں پھینکی۔ مگر جب رسی کھینچی تو ہتھوڑی نہایت آرام سے پھسلتی واپس آ گئی۔ میں نے پھر پھینکی اور مختلف سمت میں پھینکی اور نتیجہ حسب سابق نکلا۔ کوئی درجن بھر کوششوں کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ اوپر موجود سوراخ ہموار اور چکنا ہے اور اس میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہتھوڑی پھنس سکے۔

''اب کیا ہوگا؟'' جولی نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' میں نے مایوسی سے اوپر کی طرف دیکھا۔ ''کچھ دیر میں پانی کم ہونے لگے گا اور ہم مزید بارہ گھنٹے کے لیے اس قید خانے میں پھنس جائیں گے۔''

جولی رونے لگی۔ ''اب میں نہیں رہ سکوں گی میں مر جاؤں گی۔''

خود میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ شاید اب ہمیں موقع نہ ملے۔ یہ آخری چانس تھا۔ اس کے بعد ہمارے لیے صرف موت تھی۔ میں اوپر دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ''سنو تمہارا وزن کم ہے اگر میں تمہیں اوپر

کہا۔ ”پانی بہنے کی آواز بھی نہیں آرہی ہے۔“

میں نے کان لگا کر سنا۔ ”ہاں پانی بہنے کی آواز نہیں آرہی ہے پھر پانی کیوں بڑھ رہا ہے۔“

پانی پہلے کے مقابلے میں خاصی تیز رفتاری سے اوپر بھر رہا تھا اور ہم اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ ایک گھنٹے بعد پانی کیل تک پہنچ گیا اور جولی نے ذرا اوپر ایک کیل اور ٹھونکی۔ اب رسی کھول کر اس سے باندھ لی تھی مگر پانی جس رفتار سے بڑھ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ اس کیل تک بھی پہنچ جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ایک گھنٹے بعد یہ کیل بھی پانی تلے آگئی تھی اور اس سے اوپر کیل لگانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی یہ سپاٹ ہموار سخت لاوے سے بنی دیوار تھی جس میں کیل بھی نہیں ٹھک رہی تھی۔ پانی بھرنے سے کمرے کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا تھا اور اب ہم آٹھ فٹ کے قطر میں تھے اور اس سے اوپر تقریباً پانچ فٹ کا گنبد تھا جس کے دائیں طرف چھت میں تین فٹ کا سوراخ نظر آرہا تھا۔ ہم سوراخ سے کوئی سات فٹ نیچے تھے۔ میں نے جولی سے کہا۔ ”اگر پانی اسی رفتار سے بڑھتا رہا تو ایک گھنٹے بعد ہم سوراخ تک پہنچ سکیں گے۔“

یہ خیال بیک وقت خوش آئند بھی تھا اور پُرخدشہ بھی۔ خوش آئند یوں کہ شاید اس سوراخ سے ہمیں کہیں نکلنے کا راستہ مل سکے اور خدشہ یہ تھا کہ اگر سوراخ آگے سے بند ہوا تو ہم یہیں پھنس کر رہ جائیں گے۔ صبح چھ بجے تک پانی سوراخ سے چار فٹ نیچے رہ گیا تھا۔ میں نے اس میں رسی پھینک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی جگہ ہے جس میں رسی پھنس جائے مگر ہر بار رسی واپس آجاتی تھی۔ جولی نے کہا کہ ہمیں کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہیے کہ پانی مزید چڑھ جائے تو ہم اندر جانے کی کوشش کریں۔ میں نے اس سے اتفاق کیا۔ مسلسل دو گھنٹے سے پانی میں تیرنے کی وجہ سے ہمارے جسم پھر شل ہونے لگے تھے۔ اس لیے اب ہماری اولین خواہش یہی تھی کہ کسی طرح پانی سے نکل کر کسی جگہ آرام کرسکیں۔ مگر چھ بجے کے بعد پانی بھرتا رک گیا اور ہم انتظار کرتے رہے۔ ساڑھے چھ بجے جولی نے کہا۔ ”پانی کم ہو رہا ہے۔“

میں ہتھوڑی سے دیوار پر نشان لگاتا جا رہا تھا اور میں نے چیک کیا تو واقعی پانی کم ہو رہا تھا۔ سات بجے کے بعد یہ خاصی تیزی سے کم ہونے لگا اور ہم خوش ہو گئے تھے۔ شاید یہاں بھرنے والا پانی اب نکل رہا تھا اور اُمید تھی کہ اسی طرح پانی کم ہوتا رہا تو شاید چند گھنٹوں بعد ہم سرنگ تک جا سکتے تھے اور اس کے سامنے جمع پتھر ہٹانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ جولی نے ایک جگہ دیکھی تھی اور وہاں کیل ٹھونکی جا سکتی تھی۔ مگر اتنی دیر میں پانی نیچے جا چکا تھا۔ نو بجے کے قریب پانی پہلی کیل تک پہنچا اور ہم نے اس سے رسیاں باندھ کر خود کو آرام دیا۔ تھکن سے برا حال تھا۔ ہاتھ پاؤں ساکت ہوئے تو ایسا آرام ملا کہ کچھ دیر کو ہم دونوں ہی غنودگی میں چلے گئے۔ مگر جب پانی مزید نیچے گیا اور رسی لٹکنے لگی تو ہم چونکے۔ پانی کی سطح مستقل کم ہو رہی تھی اور ۱۱ بجے کے بعد پانی تقریباً اسی سطح پر آکر رک گیا جہاں وہ رات تین بجے تھا یعنی جولی کی ٹھونکی کیل سے دو فٹ نیچے۔ یہ واضح ہو گیا تھا کہ اب پانی مزید نیچے نہیں جائے گا۔ اچانک جولی نے کہا۔

”چاند کی کون سی تاریخ ہے؟“

میں چونکا اور فوراً اپنی گھڑی میں چاند کی تاریخ اور پوزیشن چیک کی تو معاملہ واضح ہو گیا۔ آج چاند کی بارھویں تاریخ تھی اور یہ وقت ٹائیڈ (مد) کا تھا۔ ان دنوں سمندر دو مرتبہ چڑھتا اور دو مرتبہ اترتا ہے۔ اس وقت سمندر کا پانی چڑھا تھا اور پھر اترا تھا اسی لحاظ سے کمرے میں بھی پانی چڑھتا اترتا تھا۔ مدوجزر جان کر ہم ذرا مایوس ہوئے تھے یعنی پانی اترنے کا تعلق سمندر سے تھا اور اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ سمندر کی سطح اتنی ہی تھی اور کمرے میں کم سے کم گیارہ بارہ فٹ پانی رہے گا اور اس صورت میں مدد کا آنا مشکل لگ رہا تھا۔ پانی میں رہ کر راستہ صاف کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے اب کلارا کا خیال بھی آرہا تھا۔ ہم اپنی مشکل میں پڑے رہے تھے اور اس بے چاری کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں پانی چڑھنے کے دوران میں اس پر کیا گزری ہوگی۔ میں نے جولی سے کہا۔

”میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔“

”کیسے؟“ جولی بولی۔ ”میرا مطلب ہے اگر کلارا زندہ ہے تو کیسے بتائے گی۔“

”میں روشنی سے اشارہ دوں گا ممکن ہے اس کے پاس بھی روشنی والی کوئی چیز باقی ہو تو وہ اشارہ دے سکے۔“ میں نے کہا اور اپنا بیگ اتارنے لگا۔ پھر رسی کو الگ کیا اور ہیلمٹ والی لائٹ جلا کر میں نے غوطہ لگایا۔ اس کی لائٹ واٹر پروف تھی۔ میں سرنگ کے دہانے کے پاس آیا جہاں اوپر سے گرنے والے پتھر جمع تھے۔ میں نے کوشش کی اور اوپری پتھر آرام سے ہٹ گئے اور سرنگ کا دہانہ تقریباً

اس ملبے کو ہٹانا ہوگا۔"

"تم مجھے مایوس کر رہے ہو۔" جولی پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"نہیں میں حقیقت پسندی سے کام لے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر ہمیں فوری کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم ایک دو تین دن بھی مدد آنے کا انتظار کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس پانی ہے اور کھانے کا سامان بھی ہے۔"

"اس صورت میں ہمیں فوری راشننگ کر لینی چاہیے۔" جولی نے کہا۔ "میرے پاس تقریباً دو لیٹرز پانی ہے۔"

"میرے پاس تین لیٹرز ہے۔"

"کھانے کے لیے تین بڑے چاکلیٹ بار، کنڈینسڈ ملک کے دو ڈبے اور دو ڈبے بسکٹ ہیں۔"

"تقریباً یہی سب میرے پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"اب دوسری چیزیں دیکھو۔" جولی نے کہا۔

"ہمارے پاس دو ہیلمٹ لائٹس اور تین ٹارچیں ہیں۔ ان کے سیل اتنی دیر نہیں چل سکتے اس لیے ہمیں فی الحال انہیں بند کر دینا چاہیے۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "لیکن پہلے ہمیں باہر والوں کو اپنی زندگی کا پیغام بھیجنا چاہیے۔"

جولی میری بات کا مفہوم سمجھ گئی سب سے پہلے ہم نے ائر پلگ نکال کر اپنے کانوں میں لگائے۔ پھر میں نے اپنے پاس موجود گیس پریشر ہارن چند سیکنڈ کے لیے بجایا۔ اس محدود جگہ اس کی آواز اتنی زیادہ گونجی کہ ائر پلگ کے باوجود ہمیں اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ جب میں نے بٹن سے ہاتھ ہٹایا تب بھی اس کی آواز کچھ دیر تک کمرے اور ہمارے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔ جولی نے کہا۔ "میرے خدا اتنی بھیانک آواز۔"

"محدود جگہ اس کی آواز اور بڑھ جاتی ہے۔"

"ان لوگوں نے سن لیا ہوگا؟"

"شاید سن لیا ہو اور ہمیں یہی سوچنا چاہیے کہ وہ سن لیں گے۔ میں سوچ رہا ہوں ہر آدھے گھنٹے بعد ہارن بجاؤں گا۔"

"ہم لائٹس بھی تب آن کریں گے۔" جولی نے کہا اور اپنے ہیلمٹ کی لائٹ بجھا دی۔ تاریکی چھا گئی تھی اور ہم جیسی صورتِ حال سے دوچار تھے اس میں دل گھبرانا بھی فطری امر تھا۔ اگر تین چار دن ہمیں مدد نہ ملتی تو ہماری زندگی محال تھی۔ جولی عورت ہونے کے ناطے زیادہ گھبرا رہی تھی۔ وہ میرے پاس آ گئی اور وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "مجھے اپنی بیٹی یاد آ رہی ہے۔ اس بار اس نے مجھے بہت روکا کہ میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں مگر میں نے اس کی بات نہیں مانی۔"

میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "اتفاق سے میرے دونوں بیٹوں نے بھی مجھ سے یہی کہا کہ اب میں نہ جاؤں مگر میں نے ان کی بات نہیں مانی۔"

"میں نے اپنی بیٹی سے وعدہ کیا کہ میں اب نہیں جاؤں گی یہ بس آخری بار ہے۔"

ہم دونوں اپنی فیملیز کی باتیں کرنے لگے۔ جولی خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ فریک ساتھ نہیں تھا ورنہ وہ بھی پھنس جاتا۔ اب کم سے کم وہ اس آفت سے بچ گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "فکر مت کرو ہم بچ جائیں گے۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم نے ہیلمٹ لائٹس آن کیں اور میں نے پانچ سیکنڈ کے لیے پریشر ہارن بجایا۔ اس بار اس کی شدت ہمیں کم لگی تھی۔ شاید ہمارے کان اس کے عادی ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی ہتھوڑی سے دیوار پر نشان لگایا تھا کہ پانی کی سطح جانچتا رہوں۔ روشنی میں چیک کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ اس دوران میں پانی صرف ایک انچ اوپر گیا تھا۔ جولی نے کہا۔ "ممکن ہے پانی اتر جائے۔"

"ہوسکتا ہے لیکن امکان کم لگ رہا ہے اگر پانی اترنا ہوتا تو اب تک کم ہونا شروع ہو جاتا۔ مگر یہ بتدریج بڑھ رہا ہے۔"

"اور رفتار بس اتنی ہے کہ اوپر تک جاتے جاتے شاید کئی دن لگ جائیں۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"مگر یہ بھی کم نہیں ہے کہ ہم زندہ ہیں اور زندہ رہ سکتے ہیں۔ ہمیں کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ "ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو مجھے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

ہم نے کیل سے رسیاں اس طرح باندھی تھیں کہ ہم سینے تک پانی میں تھے اور کیل پر بہت کم بوجھ آ رہا تھا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد میں اور جولی لائٹس آن کرتے اور میں پانچ سیکنڈ کے لیے پریشر ہارن بجاتا۔ ایک ہارن میں اتنی گیس تھی کہ اسے لگاتار دو منٹ کے لیے بجایا جا سکتا تھا۔ اس لحاظ سے ایک ہارن چوبیس گھنٹے کام آ سکتا تھا۔ ہم نے کھانے پانی کی بھی راشننگ کر لی تھی۔ اس وقت ہم بھوک پیاس محسوس

"ہاں لیکن میں پیچھے نہیں جا سکتی۔" اس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ "یہاں بھی دیوار ٹوٹ گئی ہے اور پانی آرہا ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ سرنگ میں بھی ایک جگہ دیوار ہل رہی تھی۔ "کہاں سے ٹوٹی ہے؟"

کلارا نے جو جگہ بتائی وہیں میں نے دیوار ہلتی محسوس کی تھی۔ صورتِ حال بہت خوفناک تھی۔ ہماری واپسی کا راستہ بند ہو گیا تھا اور ہم جس جگہ محصور تھے وہاں پانی آرہا تھا۔ کمرا نشیب میں تھا اور ذرا سی دیر میں پانی ہمارے ٹخنوں سے اوپر جا چکا تھا۔ سرنگ اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے کلارا سے کہا۔ "تم نکلنے کی کوشش کرو۔"

"میں کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "لیکن یہاں پتھر گرنے سے راستہ بند ہو گیا ہے۔"

شان تک ہماری آوازیں پہنچ گئی تھیں مگر وہ جو کہہ رہا تھا وہ مجھے ٹھیک سے سنائی نہیں دے رہا تھا یہاں پانی گرنے کا شور بہت زیادہ تھا۔ کلارا نے اس کی بات سنی اور اسے مدد طلب کرنے کو کہا۔ پھر ہمیں بتایا کہ شان مدد لینے گیا ہے۔ "کلارا کیا سرنگ میں پانی آرہا ہے؟"

"نہیں میں جہاں ہوں یہاں پانی نہیں آرہا بلکہ بہہ کر تمہاری طرف جا رہا ہے۔"

میں نے جھک کر دیکھا راستہ روک لینے والے پتھروں کے نیچے سے بھی پانی بہہ کر کمرے میں آرہا تھا اور اب ہمارے گھٹنوں تک پانی کھڑا تھا۔ اس کی سطح میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ کلارا کی طرف پانی نہیں آرہا تھا مگر کچھ دیر بعد سرنگ میں بھی پانی جمع ہونے لگتا۔ وہاں جگہ نہیں تھی اور اگر پانی بھر جاتا تو کلارا کے لیے بچنا مشکل تھا میں نے اس سے کہا۔ "کسی ایسی جگہ رہو جہاں چھت اونچی ہو اور پانی بھرنے کی صورت میں تمہیں سانس لینے کے لیے جگہ ملتی رہے۔"

"میں ایسی ہی جگہ ہوں۔"

اس دوران میں جولی کمرے کے اوپر موجود سوراخ کا جائزہ لے رہی تھی۔ دس منٹ سے پہلے پانی ہماری رانوں تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے پانی چکھ کر دیکھا وہ نمکین تھا۔ میں نے جولی کو آگاہ کیا۔ "یہ سمندری پانی ہے اس کا مطلب ہے ہم سطح سمندر سے نیچے آگئے ہیں اور پانی غار کی دیواروں کو توڑ کر اندر داخل ہو رہا ہے۔"

"پینے کا پانی بچانا۔" جولی نے رسی کا بنڈل شانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ اس میں مل گیا تو ہمارے پاس پانی نہیں رہے گا۔"

ہم نے اپنی بوتلوں کے ڈھکن کس کر بند کر لیے۔ اس دوران میں سرنگ کا دہانہ تقریباً پانی میں ڈوب گیا تھا اور اب نہ کلارا کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ ہی ہماری آواز اس تک جا سکتی تھی۔ دہانہ ڈوبنے کے بعد یقیناً سرنگ میں بھی پانی داخل ہو گیا ہوگا۔ مگر کلارا بلندی پر تھی اس لیے فی الحال اس کے ڈوبنے کا خطرہ نہیں تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ ہم سطح سمندر سے کتنے نیچے آچکے تھے اور یہاں مزید کتنا پانی بھر سکتا تھا۔ اس کمرے کی بلندی خاصی تھی مگر سرنگ میں چھت زیادہ بلند نہیں تھی۔ بہرحال اب ہم کلارا کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور ہمیں اپنی فکر کرنی تھی۔ پانی ہمارے سینوں تک آگیا تھا۔ میرا قد پانچ فٹ دس انچ ہے اور جولی کا قد مجھ سے دو انچ کم ہے۔ اب ہم پانی میں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے اس لیے تیرنے پر مجبور ہو گئے۔ میں نے جولی سے کہا۔ "ہمیں تمام بھاری سامان چھوڑنا ہوگا۔"

اس نے اتفاق کیا اور ہم اپنے بیگوں سے ایسی چیزیں نکالنے لگے جو بھاری تھیں اور ہمارے تیرنے میں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔ جب تک ہم نے یہ کام کیا پانی ہمارے سروں سے اوپر چلا گیا تھا۔ اب ہم باقاعدہ تیر رہے تھے۔ غیر ضروری سامان کم کرنے کے باوجود تیرنا آسان نہیں تھا کیونکہ ہمارے خاص جوتے اور دوسرے اوزار اور اشیا بھی کم وزنی نہیں تھیں۔ میں نے جولی سے کہا۔ "دیکھو باہر سے اتنی جلدی مدد آنے کا امکان نہیں ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں خود کچھ کرنا ہوگا۔"

"کلارا......؟"

"اس کے لیے بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ سرنگ کے دہانے پر گرنے والے پتھر بہت وزنی ہیں اور اگر پانی نہ بھی ہوتا تب بھی ان کو اپنی جگہ سے ہٹانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں۔" جولی بولی۔

پانی میں تیرنے کے دوران میں ہمارے ہیلمٹ سے لگی لائٹس روشنی دے رہی تھیں دستی لائٹس بند کر دی تھیں۔ پانی بلند ہونے کے ساتھ ہم چھت پر موجود سوراخ کے پاس ہوتے جا رہے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ پانی کی سطح کوئی دس بارہ فٹ بلند ہو گئی تھی اور اب بھی سوراخ اتنا ہی بلند تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب پانی بلند ہونے کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ اتنا

کے لیے اس کے پاس الگ بکس تھا جس میں یہ کیسٹس ڈبوں، حرارت اور پانی سے مکمل محفوظ رہتی تھیں اس کے باوجود شان جان سے زیادہ ان کی حفاظت کرتا تھا۔ میں اور جولی اس کے دائیں بائیں بیٹھے ویڈیوز دیکھ رہے تھے۔ شان کے علاوہ بھی باقی سب کے پاس کیمرے تھے جنہیں وہ بہ وقت ضرورت استعمال کر سکتے تھے۔ میرے ہیلمٹ میں بھی کیمرا لگا ہوا تھا اگر مجھے ضرورت ہوتی تو میں صرف ایک بٹن دبا کر اسے آن کر سکتا تھا۔ یہ آواز کے ساتھ ویڈیو ریکارڈ کرتا تھا۔ فرینک اور کلارا آپس میں محو گفتگو تھے کہ یہاں سے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ فرینک کا اصرار تھا کہ ہمیں وہ راستہ اختیار کرنا چاہیے جو نیچے کی طرف جا رہا تھا جب کہ کلارا کا کہنا تھا کہ ہمیں دائیں طرف نکلنے والا راستہ دیکھنا چاہیے کیونکہ یہ ذرا اوپر جا رہا ہے۔ نیچے پانی ہے اور جہاں پانی ہو وہاں چٹانوں میں خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ میرے خیال میں کلارا درست کہہ رہی تھی مگر جب فرینک کے ساتھ حسن اور کم بھی شامل ہو گئے تو میں نے ان کی تائید کی۔ میں لیڈر تھا مگر فیصلہ اتفاق رائے سے کرتے تھے۔

آرام کے وقفے کے بعد ہم کھڑے ہوئے تو اچانک شان نے تجویز پیش کی۔ ”کیوں نہ ہم دو ٹیموں کی صورت میں الگ الگ سرنگوں میں سفر کریں۔“

مجھے اور کلارا کو اس کا خیال اچھا لگا اور جب باقی سے پوچھا تو انہوں نے بھی تائید کی۔ ہم میں حسن اور جولی رسی کے استعمال کے ماہر تھے۔ اسی طرح شان اور فرینک اچھے فوٹو گرافر تھے۔ اس لیے میں، جولی اور شان ایک ٹیم بن گئے جب کہ فرینک، کم اور حسن دوسری ٹیم میں آ گئے۔ کلارا کے بارے میں فیصلہ خود اس پر چھوڑ دیا اور اس نے میری ٹیم کا انتخاب کیا۔ دوسری ٹیم کو فرینک لیڈ کرتا۔ ہمارے پاس محدود رینج میں کام کرنے والے واکی ٹاکی سیٹ تھے۔ جو بند جگہوں پر بھی بہترین کام کرتے تھے۔ ہمارے پاس ایسے پریشر ہارن تھے جو مشکل یا خطرے کی صورت میں بجائے جانے پر بہت دور سے بھی سنائی دیتے تھے۔ ریڈیو کے کام نہ کرنے کی صورت میں ہم ان کی مدد سے اپنا پیغام بھیج سکتے تھے۔ کلارا ہمارے ساتھ آئی تھی لیکن میں نے نیچے جانے والی سرنگ کا انتخاب کیا تھا اور فرینک جو یہاں جانے کو کہہ رہا تھا اس کے حصے میں اوپر والی سرنگ آئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ یہ سرنگیں آگے جا کر مل جائیں گی۔“

”شاید۔“ فرینک نے اپنا بیگ اٹھا کر شانے پر لاد لیا۔ ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور الگ الگ سرنگوں میں روانہ ہو گئے۔ عملی طور پر انہیں سرنگ نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ یہ کہیں بہت کھلی تھیں اور ان کی چھت بھی تیس فٹ سے زیادہ اونچی ہو جاتی اور کہیں یہ گھٹ کر صرف چند فٹ رہ جاتی جس میں ہمیں چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چلنا پڑتا۔ ہم کوئی دو سو گز آگے گئے ہوں گے کہ ہمیں پہلی رکاوٹ سے واسطہ پڑا۔ یہ بولڈر قسم کے پتھر تھے جو اوپر سے ٹوٹ کر گرے تھے اور تہہ در تہہ جمع تھے۔ ان کے درمیان میں راستہ تھا مگر بڑا مشکل اور پیچیدہ راستہ تھا۔ ہم میں جولی سب سے چھریرے جسم کی تھی۔ اس لیے وہ آگے روانہ ہوئی۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے کلارا تھی سب سے پیچھے شان تھا کیونکہ وہ بھاری جسم کا تھا اگر وہ کہیں پھنستا تو اس کے پیچھے موجود افراد کو بھی واپس آنا پڑتا۔ اب وہ کہیں پھنستا تو وہیں واپس جاتا یا اسی جگہ رک کر ہمارا انتظار کرتا۔

راستہ ایسا تھا کہ ہمیں سانپ کی طرح رینگ کر اور مڑ مڑ کر گزرنا پڑ رہا تھا۔ جسم چٹانوں سے رگڑ کھا رہا تھا اور کہیں کوئی حفاظت نہیں تھی۔ یہاں رکنے اور دیکھنے کا موقع نہیں تھا سب اپنی اپنی جگہ خاموشی سے رینگ رہے تھے۔ میں نے اپنے ہیلمٹ پر لگا ہوا کیمرا آن کر دیا تھا۔ تقریباً بیس گز کے بعد جگہ کسی قدر کھلی ہوئی تھی مگر یہاں بھی پتھر ہی تھے۔ گزرتے ہوئے بعض پتھر ہلتے محسوس ہوتے تھے۔ ہم یہ احتیاط کر رہے تھے کہ اوپر پتھر نہ ہوں جن کے نیچے سے ہمیں گزرنا پڑے اور وہ سرک کر ہم پر آن گریں۔ اگر اوپر کی چٹان ہلتی محسوس ہوتی تو ہم راستہ بدل دیتے مگر بعض مقامات پر راستہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں ان کے نیچے سے گزرنے کا خطرہ مول لینا پڑتا تھا۔ البتہ ہم چٹان ہلا جلا کر اندازہ کرتے تھے کہ وہ کس قدر مستحکم ہے۔ بالآخر ہم ایک صاف جگہ نکلے جہاں پتھر نہیں تھے۔ جولی اپنا جسم جھاڑ رہی تھی...... شان نے باہر آتے ہی اپنے کیمرے کا جائزہ لیا کہ اسے تو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے ہم سب ہی گرد میں اٹے ہوئے ہیں۔“ میں نے کہا اور ٹارچ کی روشنی آس پاس ڈالی۔ بہ ظاہر ہمارا سفر اس جگہ پہنچ کر ختم ہو گیا تھا مگر غور کرنے پر ایک جگہ دراز نظر آئی۔ جولی اس طرف بڑھی۔ کلارا اپنی کلائی دیکھ رہی تھی جس پر ہلکا سا زخم آ گیا تھا میں نے پٹی لگانے کو کہا مگر اس نے منع کر دیا۔

لے جانا لازمی تھا۔روانہ ہونے سے پہلے میں نے مہم کے اصول بیان کیے۔

”اپنی حفاظت اولیت رکھتی ہے۔کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی حفاظت کو یقینی بنانا ہوگا۔اگر کوئی کسی مشکل میں پڑ جائے اور اسے مدد کی ضرورت ہو تو پہلے اس کا جائزہ لیا جائے کہ اس کی مدد کرتے ہوئے آپ خود تو اس مشکل میں نہیں پھنس جائیں گے۔کسی بھی خطرناک مقام سے بیک وقت دو افراد نہیں گزریں گے بلکہ جب ایک گزر جائے تب دوسرا قدم آگے بڑھائے۔“

ہر مہم کے آغاز سے پہلے لیڈر کی حیثیت سے میں اس قسم کی تقریر کرتا تھا۔اگرچہ سب جانتے تھے کہ کس حالت میں کیا کرنا چاہیے۔دوسرے جب ایک مشکل میں پڑتا تو باقی سب اپنی حفاظت کی پروا کیے بغیر اس کی مدد کی کوشش کرتے تھے۔غار کے انجانے حصے کی طرف ایک پتلی سی دراڑ جارہی تھی۔ہم ایک ایک کرکے اس میں اترنے لگے۔سب سے آگے میں تھا اور میرے سر کے ہیلمٹ پر تیز روشنی والی لائٹ لگی تھی۔دوپہر کے دو بج رہے تھے جب ہم نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔میرے پیچھے شان تھا جو کیمرا سنبھالے ہوئے تھا۔اس کے پیچھے ایک قطار میں جولی،کم اور کلارا تھیں۔پھر فرینک اور حسن تھے۔دراڑ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی۔تقریباً بیس گز کے بعد ہم ایک کشادہ ہال کے دہانے پر تھے لیکن اس کے فرش پر پانی جمع تھا اور مخالف سمت میں ایک سرنگ آگے جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ہمیں اس سرنگ تک جانا تھا۔میں نے دیوار پر ایک ایسی جگہ لائٹ لگائی جہاں سے تقریباً پورا ہال روشن ہوگیا تھا۔یہ کوئی تیس گز قطر کا تھا۔جولی آگے آئی تھی اس نے ایک چبوترے سے چھجے کی طرف اشارہ کیا جو دہانے کے ساتھ سے شروع ہوکر سرنگ تک جارہا تھا۔مگر یہ بہت پتلا سا تھا۔میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

”کیا خیال ہے غار محفوظ ہے؟“

جولی نے کہا۔”کوشش کرتے ہیں ویسے مجھے تو آسان لگ رہا ہے۔“

پہلے جولی گئی۔وہ مہارت سے ابھرے پتھروں کو پکڑتی اور چھجے پر پاؤں لگاتی چند منٹ میں دوسری طرف پہنچ گئی۔اس کے بعد شان گیا اور اس کی جگہ کیمرا میں نے سنبھالا۔دوسری طرف پہنچ کر اس نے دوبارہ اپنا کام شروع کردیا۔اس کا کہنا تھا وہاں سے وہ زیادہ اچھا شوٹ کررہا تھا۔باری باری سب چھجے سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گئے۔سرنگ ایک اور دراڑ ثابت ہوئی۔اس میں سے کئی راستے نکل رہے تھے اور یہاں ہمیں پہلی بار پانی بہنے کی آواز آئی۔مگر ایسے آثار نظر نہیں آئے کہ یہاں تازہ چٹانیں گری تھیں۔شاید چٹانیں کہیں اندر گری تھیں جہاں تک ابھی کسی کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔کارڈین کے مطابق اس ہال سے آگے کوئی نہیں گیا تھا۔یعنی ہم سرنگ نما دراڑ میں قدم رکھنے والے اولین انسان تھے۔اس یادگار موقع کے لحاظ سے ہم سب نے اپنی اپنی پسند کا مشروب نوش کیا اور ایک طرف دیوار پر مہم کا چھوٹا سا جھنڈا نصب کیا۔فرینک نے کہا۔

”مجھے تو یہاں کوئی خطرے والی بات نظر نہیں آرہی ہے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔“

کم نے تائید کی۔”بالکل اور ہم یہاں آنے والے اولین انسان ہوں گے۔“

کم کے پاس ایک ڈیجیٹل میپ مشین تھی وہ اس میں غار کے راستے محفوظ کرتی جاتی بعد میں نقشہ تیار ہوجاتا۔یہ تھری ڈی میپ ہوتا اور اس کی مدد سے غار میں راستہ تلاش کرنا آسان ہوجاتا مگر فی الحال ہمیں خود راستہ تلاش کرنا تھا۔حسن اپنے پیک سے رسی کا بنڈل نکال رہا تھا۔آگے کہیں رسی کے استعمال کی ضرورت پیش آتی تو حسن یہ کام کرتا۔دراڑ آگے جاکر دو حصوں میں تقسیم ہورہی تھی مگر ہم نے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ابتدائی طور پر میں اور شان ایک دراڑ میں گئے اور یہ آگے جاکر بہت تنگ اور ناقابلِ گزر ہوگئی تھی۔یہاں پانی بہنے کی آوازیں نمایاں تھیں اور شور سے لگ رہا تھا کہ کوئی تیز رفتار ندی یہاں زیرِ زمین گزر رہی تھی۔میں نے سونگھا تو مجھے لگا جیسے پانی سمندر کا تھا اس میں نمک کی مہک تھی۔ہم پلٹ کر واپس آرہے تھے تب مجھے لگا جیسے عقب میں ہلکا سا دھماکا ہوا ہو۔یہ دھماکا نہیں بلکہ دھمک تھی جو سنائی نہیں دی تھی بلکہ محسوس ہوئی تھی۔شان نے محسوس بھی نہیں کی اور میں سوچتا ہوا واپس آیا کہ یہ دھمک کیسی تھی؟

ہم سب دوسری دراڑ میں جانے لگے۔یہ زیادہ چوڑی تھی اور کسی قدر اوپر کی طرف جارہی تھی۔اس کے اوپر پتھر نکلے ہوئے تھے اور ہمیں سر بچا کر چلنا پڑ رہا تھا۔فرش اور دیواریں کھردری تھیں اور یہ جگہ اوپر سے اتنی دور تھی کہ یہاں فرش پر نمی تک نہیں تھی۔فرینک نے اپنا چھوٹا سا ہتھوڑا ایک جگہ آزمایا اور بولا۔”خالص لاوا ہے۔ابھی

نے آکر بتایا۔'' نفیسہ بیگم نے غصے میں کہا۔'' ہماری قسمت میں تو پریشانیاں ہی پریشانیاں لکھی ہیں..... پہلے کیا کم پریشانیاں تھیں کہ اب یہ مصیبت ہمارے گلے پڑ گئی ہے۔''

''ایسے تو کیا پوری ددھیال میں اور کوئی نہیں تھا۔'' دلاری نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''کوئی نہیں ہے..... جبھی تو اسے لانا پڑا۔'' نفیسہ بیگم نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا'' اگر اس کے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے، کچھ کام کاج کر سکتا۔ چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاتا تو شاید دسیوں جاننے والے نکل آتے مگر اب اس بوجھ کو ڈھونے کے لیے کون آئے گا؟''

''تم پریشان کیوں ہوتی ہو، یوں کرو کہ اپنے خصم سے کہو کہ اسے کسی یتیم خانے میں داخل کرادیں..... بچے کی دیکھ بھال بھی وہ لوگ اچھی طرح کرلیں گے اور تمہیں بھی بے آرامی نہیں ہوگی۔'' دلاری نے مشورہ دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے دلاری، کچھ کہنے سننے کا۔ جو ٹھیکیدار صاحب کے جی میں آتا ہے وہی کرتے ہیں اور تمہیں تو پتا ہے ان کی زبان سے نکلا ہوا لفظ پتھر کی لکیر ہے۔ اب تو یہ رونا زندگی بھر کا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے بے بسی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

گھر میں موجود کوئی فرد بھی ساون کی آمد پر خوش نہیں تھا مگر فرق صرف اتنا تھا کہ کوئی ساون سے کم برا رویہ رکھتا تھا اور کوئی زیادہ۔ اس لیے ساون کی سب سے زیادہ قربت صرف بو سے ہو پائی تھی کیونکہ وہ اس کا ہم عمر بھی تھا اور اس کی حیثیت بھی ساون سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ بو تھا تو نوکر مگر گھر کے فرد کی طرح تھا لیکن بو سے ہر شخص اس لیے بھی بات کرتا تھا کہ وہ ہر شخص کی ضرورت بن گیا تھا۔ گھر کے ہر فرد کا کوئی بھی کام اس کی مدد کے بغیر مکمل نہ ہوتا تھا۔ اسی لیے گھر کے دوسرے بچوں کے ساتھ وہ بھی مولوی صاحب سے سیپارہ پڑھا کرتا تھا اور کھانا بھی سب لوگوں کے ساتھ ہی کھایا کرتا تھا۔

بو کو جب بھی موقع ملتا وہ ساون کے پاس آجاتا اور دنیا جہان کے قصے سنایا کرتا مگر جیسے ہی کوئی اسے کسی کام کے لیے پکارتا وہ واپس دوڑ جاتا۔ بو نے ساون کو بتایا تھا کہ وہ چار سال کی عمر سے اسی گھر میں ہے اور اس کا باپ گاؤں میں رہتا ہے جو اس سے ملنے کبھی کبھی آیا کرتا ہے۔ ساون کا دل کچھ دیر کے لیے اس کی باتوں سے بہل جاتا تھا۔

''تمہارے ابو کیا انگریز تھے؟'' بو نے جھجکتے ہوئے ساون سے پوچھ ہی لیا۔

''نہیں تو..... '' ساون نے سر جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ اسے اس کی معصومیت پر بے ساختہ ہنسی آگئی اور اس گھر میں آنے کے کئی دنوں بعد وہ شاید پہلی بار ہی ہنسا تھا۔

''دراصل گھر میں سب لوگ جو باتیں کرتے ہیں تو میں سمجھا تھا کہ..... '' بو نے ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے وضاحت کی۔

''وہ بھی پاکستانی تھے اور..... اور انہوں نے اسلام بھی قبول کرلیا تھا..... ہاں میرے دادا وغیرہ کے بارے میں مجھے پتا ہے کہ وہ کرسچن تھے۔'' ساون نے بو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا، اچھا۔ تو پھر سب لوگ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں کہ..... خیر چھوڑو، تم کس کے پاس رہتے تھے؟'' بو نے تجسس سے پوچھا؟

''میری بس ایک آنٹی ہیں، روز آنٹی۔ وہ میرے ابو کی کزن ہیں۔ ان کے پاس رہتا تھا لیکن.....'' ساون نے افسردگی سے جواب دیا'' جب وہ بھی بہت زیادہ بیمار رہنے لگیں تو انہوں نے مجھے یہاں بھجوادیا۔''

بو نے افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ چند لمحے دونوں خاموش رہے۔'' تم اسکول جاتے تھے؟'' ایک دن بو نے ساون سے پوچھ لیا؟''

''ہوں'' ساون نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں گرامر اسکول میں تھا مگر جب پولیو ہوا تو پھر میں صرف گھر پر ہی بکس پڑھنے لگا۔ میرے پاس بہت سی کتابیں ہیں۔''

''تمہیں کتابیں کون لاکر دیتا تھا؟'' بو نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے روز آنٹی لاکر دیتی تھیں۔ وہ اسکول میں ٹیچر ہیں اور ان کے پاس بکس کا بہت بڑا کلیکشن ہے۔'' ساون نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''اُف تم کو بیماری میں بھی اتنا پڑھنا پڑتا تھا۔'' بو افسوس کرتے ہوئے بولا۔

بو باتوں باتوں میں اس گھر کے اور گھر والوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہتا تھا۔ بو کی زبانی اسے سارے گھر والوں کے بارے میں پتا چلتا رہتا کہ کون کیا کرتا ہے، کہاں پڑھتا ہے کیسے رہتا ہے۔

''بڑی آپی ہیں نا، فائزہ آپی..... وہ تو بڑی قابل ہیں۔ انگریزی کی ایسی موٹی موٹی کتابیں یوں پڑھتی ہیں فر

فر ...... وہ عاصم ہے ناں عاصمؔ اس کی باجی ہیں..... اور فرید بھائی جان بھی پڑھنے میں بڑے استاد ہیں...... افسر ہیں افسر۔'' بو تعریفوں کے پُل باندھ دیتا۔

''اور کون کون ہے گھر میں...... کیا کام کرتے ہیں باقی سب لوگ؟'' ساون نے تجسس سے پوچھا۔

''بلقیس چچی ہیں، اور ان کے تین بیٹے سہیل بھائی جان اور کامران بھائی، اور بیٹی ہیں شازیہ باجی۔ سب بچے اسکول جاتے ہیں..... میں بھی پہلے جاتا تھا ان کے ساتھ اسکول مگر پھر ٹھیکیدار صاحب نے منع کر دیا تو اب نہیں جاتا۔'' بو روانی میں کہتا رہا۔

ساون کو اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس کے ایک ماموں فرید بھی ہیں مگر ملازمت کی وجہ سے حیدر آباد میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی کراچی آتے ہیں۔ اسے لگتا کہ ان سب لوگوں کی زندگیوں میں سکون ہی سکون ہے۔ ساون سارا دن لیٹے لیٹے یہی دیکھتا رہتا کہ گھر کے بچے اسکول سے واپس آتے ہیں، کھیلتے کودتے لڑتے جھگڑتے ہیں اور شام میں گلی میں کھیلنے نکل جاتے ہیں مگر اس سے بات کرنا تو دور کی بات دیکھتے تک نہیں ہیں۔ اس کو اپنی حیثیت گھر میں پڑے بوسیدہ کاٹھ کباڑ سے بھی کم لگنے لگی۔

ساون کو اپنا گھر شدت سے یاد آنے لگا، اپنی روز آنٹی کی محبت کو یاد کرنے لگا۔ پھر اس کا ذہن ان کی مجبوریوں کی طرف چلا گیا جنہوں نے اسے یہاں بھیجتے وقت اس سے یہ وعدہ لیا تھا کہ وہ ہر حال میں ان لوگوں میں گھل مل کر رہنے کی کوشش کرے گا اور اسی وعدے کی بنا پر ہر تکلیف برداشت کرنے لگا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے لیے دسترخوان بچھا۔ بلقیس نے ایک پلیٹ میں کھچڑی اور رائتہ لا کر ساون کو دیا۔ گلی میں قلفی والا آیا اور سارے بچے قلفی لینے بھاگ اٹھے۔ کچھ دیر بعد جب بلقیس ساون کے لیے قلفی لے کر آئی تو دیکھا کہ ساون کے کھانے کی پلیٹ جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔ بلقیس نے ساون کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے... اپنا گھر یاد آ رہا ہے؟''

ساون خاموش رہا۔ ناظم میاں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ساون کو بغور دیکھتے ہوئے کہا ''چلو کل ہم فون پر تمہاری آنٹی سے تمہاری بات کروا دیں گے..... ٹھیک ہے؟''

ساون کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ وہ دیر تک بلقیس اور ناظم میاں سے اپنی روز آنٹی کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ ساون کی باتوں سے ناظم میاں کو معلوم ہوا کہ ان کی بہن فرزانہ کی خواہش تھی کہ ساون کی تربیت ان درست خطوط پر ہو کہ وہ عملی طور پر حقیقی اور بہتر مسلمان بن کے زندگی گزارے تو فخر سے ان کی گردن تن گئی۔ ساون نے انہیں بتایا کہ اسی وجہ سے اس کی روز آنٹی نے اسے اسلام ہی نہیں دیگر اقوام و مذاہب کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں مگر وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ اس کے پاس مذہب کو سمجھنے کے لیے کوئی عملی تصویر موجود نہیں ہے اور اس خلاء کو ختم کرنے کے لیے ساون کو اپنے لوگوں میں رہنا چاہیے تبھی وہ اپنے مذہب کو بہتر طور پر سمجھ سکے گا۔

اس گھر میں ساون کی ایک مشکل حل نہیں ہو پاتی تھی کہ دوسری پیدا ہو جاتی تھی، رات کو سردی کی شدت بڑھ جانے سے ساون کو بخار آ گیا، کسی سے دوا کے لیے کہنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ عاصم گلی کے بچوں کے ساتھ ایک بلی کا بچہ گھر میں لے آیا اور ساون کے پلنگ کے نیچے ہی جوتوں کے ڈبے سے اس کا گھر بنا دیا، سارے بچے مل کر اس بلی کے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگے، ساون کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، نفیسہ بیگم کی ڈانٹ ڈپٹ نے بچوں کو تو وہاں سے بھگا دیا مگر گھر میں کام کرنے والی ماسی بینا کے سامنے وہ بھی بے بس تھیں۔ ساون کی وجہ سے وہ ذرا ذرا سی بات پر جھلانے لگتی، کبھی اس سے فرش دھلوایا جاتا یا کوئی اور اضافی کام کروایا جاتا۔ اٹھتے بیٹھتے وہ ساون کے واپس جانے کے متعلق پوچھتی رہتی۔ ان حالات میں ساون کے دل سے اپنے مذہب کو جاننے کی لگن ختم ہونے لگی۔

اگلے روز ساون کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس کی روز آنٹی کا فون آ گیا۔ انہوں نے ساون کی خیریت پوچھی۔ روز آنٹی کی آواز سنتے ہی اس کی آنکھوں میں بھی ایک ساون امڈ آیا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا' بتانا چاہتا تھا مگر وہ کوئی بات نہ کر سکا بس روتا رہا، ساون کی حالت دیکھ کر روز آنٹی نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی بیماری سے لڑ رہی ہیں اس لیے اس کی ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتیں مگر جیسے ہی ان کی صحت بہتر ہوئی وہ اسے فوراً واپس لے آئیں گی لہٰذا بس کچھ عرصہ کسی نہ کسی طرح گزار لے۔

ناظم میاں نے ساون کی بے قراری کو دیکھتے ہوئے اسے سمجھایا کہ اسے تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ یہاں

اس کی زندگی پہلے کی زندگی سے بہت مختلف ہوگئی ہے۔ بہت سی خوشیاں ملی ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ شب برات، رمضان، عید، بقرعید اور محرم وغیرہ میں شریک ہے مگر ساون نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔

روز آنٹی نے ساون کو تسلی دی کہ اگر اس کا ملنے کو بہت زیادہ دل چاہنے لگے تو ایک ڈائری میں روز اپنے دن کا حال لکھ دیا کرے۔ اس نے یہاں کیا دیکھا، کیا سیکھا کیا سمجھا ..... تاکہ جب اس سے ملاقات ہو تو اس کی ہر ہر بات ان کو معلوم ہو جائے اور اس طرح یہ محسوس ہوگا کہ وہ اس سے باتیں کر رہی ہیں اس سے دور نہیں ہیں اس کے پاس ہی ہیں۔

ساون نے ایک بار پھر حالات سے مقابلے کے لیے ہمت پیدا کی، اس نے ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہر روز جو دیکھتا جو سمجھتا اور جو نہ سمجھ سکتا تھا سب اس نے اپنی ڈائری میں لکھنا شروع کر دیا مگر اس کے اپنے بہت سے سوالوں کے جواب نہیں مل پا رہے تھے۔

شام میں گھر کے بچوں کو قرآن پڑھانے مولوی صاحب بھی آیا کرتے تھے۔ ناظم میاں ساون کی تربیت کے لیے فکرمند تھے۔ ان کی خصوصی ہدایت پر مولوی صاحب بچوں کو دین کی بہت سی باتیں بھی بتایا کرتے تھے۔ اکثر بچوں کو جھوٹ، غیبت سے بچنے اور ماں باپ کی فرمانبرداری اور حق گوئی کی اہمیت کے متعلق اخلاقی درس بھی دیا کرتے تھے۔ ساون بھی ان کی باتوں کو بہت توجہ سے سنا کرتا تھا مگر کسی بچے کی کسی غلطی پر ان کا رویہ نہایت سخت ہو جاتا تھا، ان کی قہر آلود نگاہوں اور گرجتے ڈپٹتے کے انداز سے ڈر جاتا تھا۔ ساون کے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ جب سارے مذاہب محبت کا درس دیتے ہیں تو لوگوں کے درمیان اتنی نفرتیں کیوں ہیں لیکن ساون نے کبھی اپنے کسی سوال کا جواب معلوم کرنے کی ہمت نہیں کی۔

ایک دن ساون کی آنکھ معمول کے مطابق دلاری کی آواز سے کھلی۔ رات سردی کی لہر بڑھ گئی تھی اور ساون کو دیا گیا پرانا لحاف اس شدید سردی سے بچاؤ کے لیے ناکافی ہو رہا تھا مگر ساون کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس بارے میں کس سے بات کرے۔ کون اس پر اتنا رحم کرے گا کہ اس کی تکلیف کو سمجھے۔ گلی میں سل بٹے کوٹنے والے کو روک لیا تھا پیسے کم کرانے پر دلاری بک بک کر رہی تھی۔ پھر اس نے صحن میں ہی سل بٹے رکھوا کر کٹوانے شروع کر دیے۔ اس کی مسلسل تھک تھک ساون کے دماغ پر لگ رہی تھی مگر کرتا تو کیا کرتا۔ خاموش لیٹا رہا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ٹھیکیدار حشمت کا کمسن بیٹا عاصم ساون سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ماں سے چھپ کر کبھی بھی ساون کے پاس آ جاتا۔ ساون نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس سے باتیں شروع کر دیں۔

"تم ہر وقت کیا لکھتے رہتے ہو؟" عاصم نے ساون کی ڈائری کو دیکھتے ہوئے تجسس سے پوچھا۔

"بس کچھ نہیں ..... بس ایسے ہی جب میں ذرا بور ہو جاتا ہوں تو کچھ لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔" ساون نے مسکرا کر کہا۔

"ایک بات تو بتاؤ ..... پہلے تمہارے ابو مسلمان کیوں نہیں تھے؟ ہمارے ابو تو ہیں۔" عاصم اس سے بے تکلفی سے پوچھتا۔

اس بچے کی زبان پر بھی وہی سوالات تھے جن کا جواب اسے بھی نہیں مل سکا تھا، ذرا توقف کے بعد ساون نے آہستہ سے کہا۔

"وہ ..... بات یہ ہے کہ ..... دیکھو ..... سب لوگوں کو تو God نے بنایا ہے ناں ..... ہم سب جو کچھ کرتے ہیں، چاہے مسجد میں جائیں یا چرچ میں جائیں، سب کچھ اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ خوش ہو۔ پھر اس سے کیا فرق ....."

ساون نے اسے سمجھانے کے ساتھ ساتھ خود کو بھی یقین دلانے کی کوشش کی مگر اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی نفیسہ بیگم کی ایک زوردار دھاڑ سنائی دی۔

"عاصم ..... اے عاصم ..... ادھر آ ..... تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ اس طرف مت جایا کرو مگر تم نہیں مانتے ناں اب دیکھو میں تمہارا کیا حشر کرتی ہوں۔"

"مگر میں نے تو صرف یہ بتایا ہے کہ مذہب تو درحقیقت ..... ساون نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر نفیسہ بیگم نے جھڑک دیا۔"

"بس بس ..... کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، اب کیا ہمارے بچے تم جیسوں سے سیکھیں گے بھلا ..... ہمارے سارے بچوں کو تم سے بہت زیادہ پتا ہے دین دنیا کا ..... نماز قرآن پڑھنے کے عادی ہیں، چھ کلمے زبانی یاد ہیں۔ اب آئندہ ان سے کچھ نہ کہنا ..... سمجھے۔" نفیسہ بیگم نے سارے جہان کا غصہ ساون پر اتار دیا۔

ساون خاموش رہ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں

تا کہ اس کا غم آنکھوں سے جھلک نہ جائے۔ ساون کے دل کی یہ واحد آرزو اس کی سب سے بڑی تمنا بن گئی کہ کاش وہ دن جلد آئے جب اسے بھی مسلم کی تعریف پر پرکھا جائے اور اس کسوٹی پر وہ پورا اترے۔ اگلے دن بھی ساون کی آنکھ دلاری کی دودھ والے کے ساتھ جھگڑنے سے کھلی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی ہلکی ہلکی دھوپ نکلی تھی۔ نفیسہ بیگم اور دلاری نے لحاف اور کمبل کو دھوپ لگانے کے لیے پھیلائے ہوئے تھے۔ دلاری نے تسلے میں مٹر کی پھلیاں لا کر رکھیں اور اس کے دانے نکالنے لگی۔ نفیسہ بیگم کی دیورانی بلقیس عاصم کے گیلے گدے اور کپڑے دھوپ میں ڈالنے لگیں کہ صبح ہی ایک مہمان کی آمد ہوئی مگر خلافِ توقع نفیسہ بیگم اور باقی گھر والے اس مہمان کی آؤ بھگت میں لگ گئے۔

ساون جو ابھی تک مذہب کی حقیقت کو جاننے کے لیے کوشاں تھا سب کچھ بھلا کر گھر کی بدلتی ہوئی فضا کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساون کے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی۔۔۔ کچھ دیر تو ساون سوچتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ کون رشتہ دار ہے۔ سب اس شخص سے یاور بھائی کہہ کر بات کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی باتوں سے بھی اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ نفیسہ بیگم اور سب لوگ اس مہمان کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں۔

"دیکھو نفیسہ بہن! تمہارے بھتیجے کو میں پہلے بھی کئی بار بچا چکا ہوں مگر ہر بار ایسا نہیں ہو سکتا...... پہلے وہ اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ لڑائی جھگڑوں میں تھانے میں بند ہو جاتا تھا تو الگ بات تھی مگر اب اسے اینٹی کرپشن والوں نے جعلی دواؤں کے کاروبار کے جرم میں پکڑا ہے۔ اس کے خلاف ثبوت ہیں۔" یاور نے نفیسہ بیگم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی یاور بھائی ...... آپ تو ایڈووکیٹ ہیں آپ کے آگے کسی کی کیا چلے گی؟ آپ نے انور بھائی کو بھی تو عدالت سے بری کرا لیا تھا۔ ان کا جرم کچھ کم تھا کیا۔" نفیسہ بیگم ہار ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

"اوہو......وہ ٹھیک ہے مگر تم سمجھتیں کیوں نہیں ابھی تو میں صرف تمہارے میاں کے کہنے پر یہاں آیا ہوں کسی اور مسئلے کو سلجھانے کے لیے۔" ایڈووکیٹ یاور نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بڑا سیدھا بچہ ہے مگر بس اپنے دوستوں کی وجہ سے پھنس جاتا ہے اور وہ جو اس کا دوست راجو ہے ناں سارا اسی کمبخت کا کیا دھرا ہے۔" نفیسہ بیگم نے جھٹ سے کہا۔

"اچھا میں کوشش کروں گا ٹھیک ہے ...... اب تم چائے بنواؤ اور ٹھیکیدار صاحب کو بلواؤ...... کہاں رہ گئے مجھے بلوا کر؟" ایڈووکیٹ یاور نے ٹالتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں ہاں کیوں نہیں ...... تم آرام سے بیٹھو...... وہ ابھی آرہے ہیں۔" نفیسہ بیگم نے خوش ہو کر ایڈووکیٹ یاور سے کہا اور بجو کو آواز دی "ارے بجو، غسل خانے میں گرم پانی رکھ دیا ہے تو ادھر آ اور دوڑ کے جا بازار ...... یاور بھائی کے لیے حلوا پوری لے کے آ جلدی سے۔" نفیسہ بیگم نے اپنے آنچل میں سے دس روپے نکال کر بجو کے ہاتھ پر رکھ کر رعب جماتے ہوئے حکم دیا۔ "دھیان سے جا گھومتا نہ رہنا اُس کل کی طرح...... ایڈووکیٹ صاحب کو غصہ آگیا تو تجھے تھانے میں بند کرا دیں گے۔"

بجو تیزی سے چلا گیا۔ ٹھیکیدار آکر یاور سے بغل گیر ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد یاور سے ذرا رازدارانہ لہجے میں بولے۔ "بھئی یاور! تمہیں تو پتا ہے ابا جان کے مزاج کا ...... کتنے دن ہو گئے ہیں اس مسئلے کو نمٹتے ......اب کچھ کرواسے حل کروانے کے لیے۔"

"حشمت بھائی جان! بات یہ ہے کہ مکان کے کاغذات ابا جان کے ہی نام ہیں وہ رہتے بھی عمر میں اختری پھپھو کے گھر میں ہیں۔ اب اختری پھپھو کے شوہر چاہتے ہیں کہ ابا جان کا یہ مکان بک جائے اور ان کا حصہ ان کو مل جائے تو اس میں کیا کیا جا سکتا ہے۔" یاور نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے...... میں چاہتا ہوں کہ ابا جان مکان میرے نام کر دیں تو اختری پھپھو کا حصہ خود بخود نہیں رہے گا۔" ٹھیکیدار صاحب نے تیزی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ کے ابا جان مکان صرف آپ کے نام کرنے پر بھی راضی نہیں ہوں گے۔" یاور نے خدشہ ظاہر کیا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ معاملہ نمٹائے بغیر ابا جان کو عمرہ نہ جانے دو مگر کوئی سنتا ہے میری اس گھر میں، پہلے ہی کیا کم لوگ ہیں اس گھر میں حصہ دار بنے ہوئے جو اب اختری پھپھو کے میاں بھی ضد پر اڑ گئے ہیں۔ جانے کیا بنے گا اس گھر کا۔" نفیسہ بیگم نے جل کر کہا۔

"تم تو خاموش ہی رہو، بے کار کی باتیں کرتی ہو۔" حشمت صاحب نفیسہ بیگم کو گھورتے ہوئے بولے۔

"اور یاور میاں! میں ابھی تیار ہو کر آتا ہوں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

حشمت صاحب کے جاتے ہیں بلقیس بیگم بھی قریب آ کر سلام کر کے بیٹھ گئیں۔

ایڈووکیٹ یاور نے ذرا توقف کے بعد رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "ایک ترکیب تو یہ ہے کہ آپ اپنے ابا جان کو یہاں لے آئیں اور......"

"اے لو ... کتنی مشکل سے تو سمجھایا تھا ہم دونوں نے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ...." بلقیس نے بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا مگر یاور نے روک دیا۔

"بھئی تو سمجھ کی بات کر لیا کرو، بس جذباتی ہو جاتی ہو، سنو میں خود بھی حشمت بھائی کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور بس ایک یہی آخری حل ہے کہ تم میاں بیوی ابا میاں کی چائے میں نیند کی دوا ملا دو جب سو جائیں تو ان کا انگوٹھا کاغذات پر لگوا لو، پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا ہر چیز قانونی ہو جائے گی......اب مجھے دیر ہو رہی ہے حشمت بھائی سے کہو جلدی آ جائیں۔" ایڈووکیٹ یاور کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہتے تو آپ ٹھیک ہیں مگر انہیں راضی کرنا بھی بس آپ کا کام ہے۔" نفیسہ بیگم نے مطمئن ہو کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"زاہدہ بھابی کو بتا دیجئے گا کہ چودہ تاریخ کو ہم لوگ شازیہ کی آمین کر رہے ہیں، میلاد شریف میں ضرور آئیں!" بلقیس نے خوش ہو کر دعوت دی۔

ایڈووکیٹ یاور ہامی بھر کے ٹھیکیدار حشمت کے ساتھ چلے گئے۔ نفیسہ بیگم ان کی باتوں سے قدرے مطمئن ہو گئیں۔

ساون کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھر رہے تھے اور اسے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ ساون سوچنے لگا کہ بسم اللہ، میلاد، تشریح وغیرہ کے بارے میں اس نے سن تو رکھا ہے مگر اب تک ان تقریبات میں بھی شریک نہ ہو سکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ناظم میاں ٹھیک کہتے تھے اب وہ ان تقریبات میں شامل بھی ہو سکے گا اور وہ ان دنوں کا انتظار کرنے لگا۔

دوپہر کے کھانے کے دوران میں اس نے کچھ اور باتیں بھی سنیں مگر وہ پوری طرح انہیں سمجھنے سے قاصر تھا، اس نے سنا کہ اس کے ماموں فرید کی شادی ہونے والی ہے مگر اسے سمجھ نہیں آیا کہ ان کا نام آتے ہی ٹھیکیدار صاحب غصے میں آ جاتے ہیں۔ گھر میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ساون کو گھر کے ماحول کو سمجھنا پہلے ہی مشکل ہو رہا تھا۔ شام تک اسے اطلاع ملی کہ اس کی خالہ دردانہ ملتان سے آنے والی ہیں اور شاید اب اسے بھی ان کے ساتھ ملتان بھیج دیا جائے گا، ساون کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ہر نئی بات اس کے لیے لاتعداد سوالات کھڑے کر رہی تھی۔ زندگی ساون کو ہر روز ایک نیا روپ دکھا رہی تھی۔

رات ٹی وی پر خبرنامہ دیکھتے ہوئے ٹھیکیدار صاحب کسی خبر پر آگ بگولہ ہو گئے۔ ساتھ ہی گھر کے باقی سبھی لوگ بھی اس بارے میں باتیں کرنے لگے۔ ٹھیکیدار صاحب کی زوردار آواز میں چلّانے سے ساون اتنا ہی سمجھ سکا کہ کہیں مسلمانوں کے خلاف کچھ ہوا ہے جس پر ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے۔ کچھ دیر اس نے سوچا کہ نہ جانے کیا ہوا ہو گا مگر پھر کوئی سرا نہ پا کر اس نے اپنے ذہن کو خالی چھوڑ دیا۔

رات دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔ بلقیس ایک پلیٹ میں مٹھائی اور ایک کٹورا لے کر ساون کے پاس آئی۔ ساون کو مٹھائی کا ٹکڑا کھلاتے ہوئے کہنے لگیں "کل تو چندی جمعرات تھی، تمہارے ماموں درگاہ گئے تھے وہاں سے یہ تبرک لائے تھے، اور یہ..... دعا کا دم کیا ہوا پانی بھی پی لو... انشاء اللہ جلد اچھے ہو جاؤ گے تو میں تمہیں خود لے کر وہاں جاؤں گی۔"

ساون کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ عین اسی لمحے نفیسہ بیگم باورچی خانے سے کوڑا لیے آتی نظر آئیں، انہوں نے ایک قہر آلود نظر ساون پر ڈالی پیر پٹختی ہوئی گلی کے دروازے پر چلی گئیں، بلقیس نے ان کے رویے پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا مگر ان کی موجودگی میں خاموش رہی، نفیسہ بیگم نے گلی میں جھانکا اور کوڑا پھینک کر جھٹ سے دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں، ساون کو پانی پلا کر بلقیس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "اور وہ کہہ رہے تھے کہ تمہارے علاج کے لیے ڈاکٹر کو بھی گھر پر بلائیں گے۔"

احسان مندی کے بوجھ سے ساون کا سر جھک گیا، بلقیس اسے پیار کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح اخبار کی سرخی دیکھتے ہی سارے گھر میں ایک ہلچل مچ گئی۔ ساون گھر والوں کے تبصروں سے بھی اندازے لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بلقیس تیزی سے زینے

سے اتر کر آئیں اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ''نفیسہ باجی..... پتا ہے بلوائیوں نے چوک پر پتھراؤ شروع کر دیا ہے۔''

''اے ہے نہ جانے کیا بیر ہے ان انگریزوں کو مسلمانوں سے۔ جو ہمارے دین مذہب کے خلاف لکھ دیتا ہے اسے سر پہ اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔'' نفیسہ بیگم نے غصہ میں کہا۔

''اب پتا نہیں کتنے دن ہنگامے اور ہوتے رہیں گے۔'' بلقیس نے خود کلامی کی۔

''اب یہ ختم نہیں ہوتے بہن، جب سے اس بدبخت نے اپنی کتاب میں ہمارے مذہب کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا ہے اسے بھی ساری دنیا میں ہیرو بنا دیا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے تیوری چڑھا کر کہا۔

''یہ تو مسلمانوں کی عزت کا سوال ہے، سارے ہی ہم مذہب ایک ہو جائیں گے اس بات پر تو۔'' بلقیس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''مسلمانوں کا تو خون ایسا ارزاں ہو گیا ہے۔ خدا جانے اور کیا کیا ہوگا۔'' نفیسہ بیگم نے دکھی لہجے میں کہا۔

''تو ہنگامے کیا اور بڑھیں گے؟'' بلقیس نے ہولتے ہوئے پوچھا۔

''کیا معلوم...... مگر تمہارے بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ اگر اس معاملے کو حل نہ کیا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے...... مجھے تو لگتا ہے کہ کہیں حکومت نہ چلی جائے۔'' نفیسہ بیگم نے کہا۔

ساون سب کچھ سنتا رہتا مگر اسے یہی معلوم ہو سکا کہ سب کچھ مذہب کے نام پر ہو رہا ہے۔ اور یہ سب کسی شاتم رسولؐ کے خلاف سارے عاشقانِ رسولؐ کر رہے ہیں۔

چند روز انہی ہنگاموں میں گزر گئے۔ ساون نے بھی اپنی پریشانیوں کو یکسر بھلا دیا تھا، روز کے معمول کے مطابق بو پھپھی نے کر ساون کا منہ ہاتھ دھلانے آیا پھر ناشتا دیا۔ بلقیس صحن میں بیٹھی بچوں کے گرم کپڑوں پر ترپائی کر رہی تھی۔ ناشتا کرتے ہوئے ساون یہی سوچتا رہا کہ آج خلاف توقع نفیسہ بیگم اپنے کمرے سے اب تک نکل کے نہیں آئی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں نفیسہ بیگم اپنے کمرے سے باہر آئیں مگر ان کا انداز ایک دم بدلا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر ساون کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نفیسہ بیگم نے ایک بڑی سی سفید چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ صرف ان کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہاتھوں میں سیاہ دستانے پہنے ہوئے تھے اور تسبیح کے دانے گھما رہی تھیں۔

''ارے واہ بڑی بیگم، واقعی اب تم سچ میں اللہ والی لگ رہی ہو۔ ارے میں تو کہتی ہوں تم.....'' دلاری نے دیکھتے ہی کچھ کہنا چاہا مگر نفیسہ بیگم نے اثبات میں سر ہلا کر ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا۔ بڑی نخوت سے ایک بار اپنے حلیئے کا جائزہ لیا۔ چادر کی سلوٹوں کو درست کرتے ہوئے بولیں ''صدیقہ آپا آنے ہی والی ہیں میں ان کے ساتھ جا رہی ہوں..... اور دلاری تم ان کے سامنے اپنا منہ بند ہی رکھا کرو۔''

''ہیں..... مگر اس وقت کہاں جا رہی ہیں......'' بلقیس نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے ان کا کل بھی فون آیا تھا..... بار بار اصرار کر رہی تھیں، ان کے ہاں درس کی بڑی محفل ہوتی ہے اس میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے دوسری بہت سی خواتین کے پاس جانا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے جواب دیا۔

بو نے نفیسہ بیگم کو چائے کا کپ دیا۔ وہ چائے ختم نہیں کر پائی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی، دلاری صدیقہ آپا کو اندر لے آئی۔ ساون انہیں بغور دیکھنے لگا۔ ان کا حلیہ بھی نفیسہ بیگم کے جیسا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگا تھا اور آواز باریک تھی۔ دلاری نے انہیں بھی صحن میں موڑھے پر بٹھا دیا۔

نفیسہ بیگم اٹھ کر جانے ہی والی تھیں کہ بلقیس نے یاد دہانی کرائی۔ ''باجی لیکن شام کو زوار بھائی کے ہاں بھی تو جانا ہے..... آپ کو یاد ہے ناں۔''

''ہوں...... مگر شاید میرا جانا مشکل ہو جائے...... ایسا کرو.....'' نفیسہ بیگم نے تردد کیا۔

''لیکن ان کے بچے کی پہلی خوشی ہے..... کتنے سال بعد ان کے ہاں اولاد ہوئی ہے اتنے اصرار سے کہا تھا انہوں نے۔'' بلقیس نے بات کاٹ کر اصرار کیا۔

نفیسہ بیگم ابھی اسی کشمکش میں تھیں اور کچھ کہہ نہ پائی تھیں کہ صدیقہ آپا نے بڑھ کر سختی سے جواب دیا۔ ''دیکھئے بہن! ایسی تقریبات تو ہوتی ہی رہتی ہیں..... اول تو ایسی تقریبات میں کوئی شرعی بات نہیں ہوتی صرف اسراف اور لہو و لعب ہوتا ہے اس لیے ان تقریبات سے اجتناب برتنا چاہئے اور نہ کہ ہم لوگوں کو منع کریں ہم خود ہی ان میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے۔''

صدیقہ آپا کی بات سنتے ہی بلقیس کے تن بدن میں

آگ لگ گئی۔ وہ انہیں کوئی جواب تو نہ دے سکی مگر نفیسہ بیگم سے بولیں۔ ''وہ ہمارے ہاں ہر تقریب میں آتے ہیں۔ آخر اتنا قریبی رشتہ ہے، مجھے تو لگتا ہے کہیں برا نہ مان جائیں۔''

صدیقہ آپا نے پھر بلقیس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ بہن، آپ بھی نفیسہ بہن کی طرح ہماری محفلوں میں شرکت کریں تاکہ آپ جیسی دوسری خواتین کو بھی علم ہو کہ ہم بحیثیت قوم کہاں جارہے ہیں، اور ہم کن دنیاوی چیزوں میں پڑے ہوئے ہیں۔''

نفیسہ بیگم اس صورتِ حال سے ذرا پریشان ہوگئیں۔ صدیقہ آپا کی بات ختم ہوتے ہی انہوں نے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ جاتے جاتے بلقیس کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''میری بات پر غور ضرور کیجئے گا...... ہم سب کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ قصور دراصل آپ کا بھی نہیں ہے۔ یہ سب غیر مسلم اقوام کا کیا دھرا ہے کہ آج ہم مذہب سے دور ہوگئے ہیں اور دنیاداری میں پھنس گئے ہیں۔ جب آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں گی تو آپ کو یہ بات باآسانی سمجھ آجائے گی کہ غیر مسلموں کی اس سازش کو ہم کس طرح ناکام بناسکتے ہیں، چلیے نفیسہ بہن...... ہمیں پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔''

صدیقہ آپا نفیسہ بیگم کے ساتھ چلی گئیں۔ بلقیس نے غصے سے اٹھ کر برتنوں کو ایک طرف پٹخنا شروع کردیا۔

جب بھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے رویوں کے بارے میں بات نکلتی ساون کا دل بیٹھنے لگتا، وہ سوچنے لگتا کہ اب پھر سے سب لوگ مسلمانوں کی تمام ذلتوں اور مسائل کا ذمہ دار غیر مسلموں کو ٹھہرائیں گے حالانکہ اس کی آنٹی کے گھر تو مسلمانوں کو بڑی عزت دی جاتی ہے۔ مگر وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا کوئی ملنے والا ان گھروں میں آجائے تو اسے بھی ایسی عزت دی جائے گی۔ ساون کا ذہن اپنے سوالات کی تشنگی کو ختم کرنے کے لیے جس قدر غور کرتا وہ اتنا ہی زیادہ الجھ جاتا۔

اگلے روز دلاری نے ساون کو جگایا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ دلاری نے بتایا کہ پلنگوں میں کھٹمل ہوگئے ہیں وہ اپنے پلنگ کے ساتھ اس کے کھٹولے کو بھی صاف کرے گی۔ اس نے کھولتا ہوا گرم پانی پلنگوں پر ڈالنا شروع کیا۔ ساون بیزاری سے بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔ نفیسہ دھوپ کھانے والان میں بیٹھی ہوئی تھیں بلقیس ساون کو ناشتہ دینے کے بعد باورچی خانے کے سامنے مونڈھے پر بیٹھ کر چاول چننے بیٹھ گئی۔ جیسے ہی ساون نے سنا کہ مہمان گھر میں آرہے ہیں تو اس نے پوری توجہ نفیسہ بیگم اور بلقیس کی گفتگو پر لگادی۔

''نفیسہ باجی! یہ حاجرہ پھپو تو فائزہ کی شادی کے لیے تاریخ طے کرنے پر کسی صورت تیار نہیں ہورہی ہیں حالانکہ اب تو ان کا بیٹا ڈاکٹر بھی بن گیا ہے پھر یہ کس لیے آرہی ہیں؟'' چاول چنتے چنتے بلقیس نے نفیسہ بیگم سے کہا۔

''اب کیا بتاؤں...... سارا معاملہ اس پیسے کا ہے...... کب سے تو مقدمے بازی چل رہی تھی تب تو میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے لیکن اب...... جب کورٹ نے گاؤں والی زمین کا فیصلہ ان کے حق میں دے دیا ہے اور لاکھوں کی جائیداد مفت ہاتھ آگئی ہے تو دماغ آسمان پر ہے۔ اب رشتے کی بات بڑھانے کی کوشش کرو تو ٹال مٹول کررہی ہیں پھر میں بھی انہی کے بیٹے سے کرکے رہوں گی چاہے کتنا بھی وقت لے لیں۔'' نفیسہ بیگم نے جھنجلا کر کہا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اور اس طرح تو فائزہ کی عمر نکلتی چلی جائے گی۔'' بلقیس نے غصے سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو میں بھی ایسی کوئی بے وقوف نہیں ہوں، فائق بھائی کے لڑکے کو نظر میں رکھا ہوا ہے۔ ان کے رشتے کو بھی صاف منع نہیں کیا ہے بس یہ کہہ دیا تھا کہ رشتے تو آرہے ہیں مگر فائزہ پڑھ رہی ہے۔ اگر حاجرہ نے انکار کیا تو میں نے بھی سوچ رکھا ہے جھٹ سے فائق بھائی کے لڑکے سے رشتہ پکا کردوں گی۔''

''اور جو حاجرہ رشتے پر راضی ہوگئیں تو؟'' بلقیس نے ہاتھ ایک دم روک کر تعجب سے پوچھا۔

''اگر حاجرہ کے ہاں شادی طے ہوجاتی ہے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے کونسا فائق بھائی سے کوئی وعدہ کرلیا ہے بس۔'' نفیسہ بیگم نے زاروارانہ لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا اور تسبیح کے دانے گھمانے لگیں۔

نفیسہ بیگم نے داد طلب نگاہوں سے بلقیس کو ایک نظر دیکھا اور پھر نظریں چرانے لگیں۔ ناظم میاں کی اپنے کمرے سے چیخنے کی آواز آئی۔

''ارے جاکر دیکھو تمہارے میاں کو پھر شاید دورہ پڑ گیا ہے پتا نہیں اب کس پر زند گر رہا ہوگا۔'' نفیسہ بیگم نے بلقیس کو بیچ بچاؤ کے لیے بھیجتے ہوئے کہا۔

بلقیس تیزی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ ناظم میاں بچوں

کوڈانٹ رہے تھے کہ غسل خانے کا نلکا خراب تھا تو اسے ربر بینڈ سے کیوں باندھا اسے ٹھیک کروانا چاہیے تھا سارا دن پانی کی دھار مسلسل بہتی رہی ہے۔ بلقیس نے بچوں کی حمایت میں ان کی مصروفیت کا کہا تو بلقیس پر غصہ ہونے لگے، بلقیس ناظم میاں کی انہی باتوں سے عاجز تھی۔ اور ساون کو ناظم میاں کی یہی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔

ساون گھر کے ان ہنگاموں سے فرصت ملتے ہی اپنی واپسی کے لیے دن گننا شروع کر دیتا۔ نہ جانے روز آنٹی اب کہاں ہوں گی، اب کیسی ہوں گی اور کب مجھے لینے آئیں گی۔۔۔ اس طویل انتظار کی کوفت کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک مشغلہ اپنایا۔ خالی ماچس کی ڈبیا پر رنگین کاغذ چپکا کر چھوٹے چھوٹے کھلونے صوفہ سیٹ وغیرہ بنانے شروع کردیے۔ عاصم اور دوسرے بچے بھی اس کے ساتھ مل جاتے۔

بلقیس نے دیکھا تو شازیہ کے اسکول میں بھیجنے والی دستکاری کی ذمہ داری ساون پر ڈال دی۔ ساون نے جوتے کے ڈبوں سے ایک خوبصورت سا گھر بنایا۔ ہو نے اسے بتایا کہ اس کا باپ مستوئی آنے والا ہے۔ اور وہ جب بھی آتا ہے پھلوں کا ٹوکرا لاتا ہے۔

اب گھر میں پھر ایک ہنگامہ رونما ہو گیا، یہ تلخ کلامی ناظم میاں اور نفیسہ بیگم کے درمیان ہوئی۔ اسے کمرے سے پہلے ہلکے ہلکے باتوں کی آوازیں آئیں پھر جب ناظم میاں چیخنے لگے تو اسے ایک ایک لفظ صاف سنائی دینے لگا۔ ساون ان کی باتوں سے کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا کہ مسئلہ کیا ہے مگر وہ اتنا سمجھ پایا کہ نفیسہ بیگم عاصم کو کسی مدرسے میں داخل کروانا چاہتی ہیں اور ناظم میاں اس کی سخت مخالفت کر رہے ہیں۔

"میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہ لڑکا میرے باقی بچوں سے پڑھنے میں کمزور ہے سب تو اچھا پڑھ لکھ لیں گے اس کا مستقبل نہ بن سکے گا تو یہ اس مدرسے میں ہی چلا جائے آخر کو مولویوں کی بھی گزر اوقات اچھی ہوتی ہے پھر ہمیں اس کا ثواب الگ ملے گا کہ میں نے اپنے بچوں میں سے ایک کو دین کے لیے وقف کر دیا۔۔۔ شاید اسی عمل سے ہماری بخشش ہو جائے۔" نفیسہ بیگم نے صفائی میں کہنا شروع کیا۔

"لیکن میں کہتا ہوں کہ اسی بچے کو کیوں جس کا ذہن کند معلوم ہوتا ہے اور نظر آرہا ہے کہ جو دنیا کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔" ناظم میاں دلیل دے رہے تھے۔

"تمہیں تو عادت ہو گئی ہے میری ہر بات میں کیڑے نکالنے کی۔ میں نے تو یہی سوچا کہ عاصم کے مستقبل کا معاملہ ہے اچھا خاصہ دین دنیا سب کا علم حاصل کرنے گا تو برا کیا ہے۔" نفیسہ بیگم برہم ہو رہی تھیں۔

"جی ہاں۔۔۔ اور اسی پر مذہب کی ذمہ داری ڈال دی اور کل اسے ہی مذہب کا ٹھیکیدار بنا دیا جائے گا۔۔۔ نہ ایسے لوگ دنیا کے نئے افکار، نئے رجحانات کو سمجھتے ہیں نہ ایجادات کو۔ پھر جب بات بے بات غلط فتوے دیتے ہیں تو آپ ہی لوگ پریشان رہتے ہیں۔" ناظم میاں نے دلیل دی۔

"تم تو اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے اور یہی سمجھتے ہو کہ سارے مدرسے ایسے ہوتے ہیں۔" نفیسہ بیگم نے تنک کر کہا۔

"چند ایک نہ سہی مگر زیادہ تر ایسے ہی ہیں مگر مجھے کیا آپ جانیں اور آپ کا کام۔" ناظم میاں بھی اپنی بات پر اڑے رہے۔

ساون کے ذہن میں مذہب اور مسلمانوں سے متعلق جو سارے تصورات تھے وہ گڈمڈ ہونے لگے۔

ہو کے باپ مستوئی کی عجیب حالت تھی۔ وہ ہر دفعہ کی طرح نہ پھل لایا نہ ہی سبزی اور پھل وغیرہ، بڑی دیر تک ٹھیکیدار صاحب اور ناظم میاں سے رو رو کر اپنے گاؤں کے حالات بتاتا رہا، ساون کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حالات ایک دم سے کس طرح بگڑتے جا رہے ہیں۔ ساون پورے طور پر تو اس معاملے کو نہ سمجھ پایا تھا مگر اسے صرف اتنا سمجھا کہ اب جو حالات بگڑے تو ان کی وجہ مذہب نہیں تھا۔ یہ فسادات لسانی ہیں اور ایک علاقے کے لوگ دوسری زبان کے لوگوں کو نکالنا چاہتے ہیں۔

مستوئی کہہ رہا تھا کہ سب کے تو گھر بار، روٹی روزی سب وڈیرے سائیں کے ہاتھ میں ہے ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جب شہر میں ہنگامے ہوئے تھے اور اس کے بعد اس کے علاقے میں ایک ساتھ چار جوانوں کی لاشیں آئی تھیں جو یہاں ہاسٹل میں رہتے تھے۔ جن لوگوں کا شہر سے اس گاؤں میں تبادلہ ہوا تھا ان کی جان کو خطرہ ہوا تو وہ لوگ وہاں سے ملازمتیں، کاروبار، گھربار سب چھوڑ کر چلے آئے۔ سارے علاقے زبان کے لحاظ سے بٹ گئے۔ ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے میں جانے سے ڈرنے لگے۔ ان کے شہر میں واپس آنے کے بعد سے ہنگامہ آرائیوں میں شدت

آنے لگی۔ رات دن لوگوں کو موت کا خوف رہنے لگا۔ پھر تو گاؤں والوں نے اپنے بچوں کو شہر سے بلوانا چاہا۔ یہ ممکن نہ تھا اس لیے شہر میں اپنی اپنی نسل کے لوگوں نے گروہ بنا کر ایک جگہ رہنا شروع کر دیا۔

"جو کچھ ہم بو رہے ہیں وہ ہماری نسلیں کاٹیں گی۔" ٹھیکیدار صاحب افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "حالات نے تو یہ رخ دکھانا ہی تھا جب آرٹ، ادب اور کلچر کو پروان چڑھانے کی بجائے ان ساری باتوں کو اسلام کے نام پر ختم کرنے پر تلے ہیں لوگ .... اور پوری سوسائٹی کو وحشت زدہ بنا رہے ہیں۔" ناظم میاں تقریباً چلانے لگے۔

دین کا مقصد حکومتی انقلاب کہاں سے ہو گیا اس کا مقصد تزکیہ نفس ہے .... سیاسی نظام کی تبدیلی اس کا جز ہو سکتی ہے اسے کل سمجھ لینا، سراسر غلطی ہے۔" ناظم میاں اٹھتے بیٹھتے جھنجلا کر کہتے۔

بو گھر سے چلا گیا۔ ساون کو اس کے جانے کا بہت دکھ تھا۔ حالات کا رخ پلٹ گیا تھا۔ گھر والے ہنسنا بولنا، تفریح کرنا تقریباً بھلا چکے تھے۔ فرید ماموں آ گئے اور حیدر آباد سے اپنے ٹرانسفر کے لیے کوششیں کرانے میں مصروف ہو گئے۔

ناظم میاں اکثر کڑھتے ہوئے کہتے تھے کہ ان حالات کے قصور وار دراصل عوام ہیں۔ چونکہ وہ اپنی حمیت کھو رہی ہے اور اخلاقی قدروں سے تعلق توڑ رہی ہے اسی لیے محض رعایا بن گئی ہے۔

رفتہ رفتہ حالات معمول پر آ گئے۔ ان لوگوں کی باتیں سنتے سنتے اس کی زندگی اسی ڈھب سے گزرنے لگی تھی۔ کام کا بوجھ بڑھ جانے کی وجہ سے مینا اپنے ساتھ اپنی بارہ سالہ بچی رانی اور چھوٹے بیٹے منو کو بھی لے آتی تھی۔ کبھی کبھی مینا اپنے ساتھ رانی کو جھاڑ پونچھ کرنے میں لگا لیتی مگر زیادہ تر وہ بھی عاصم اور منو کے ساتھ کھیل کود میں مگن رہتی اور وہ سب وہیں صحن میں غدر مچاتے رہتے۔

ساون کو اپنی بوریت دور کرنے کا بہانہ مل گیا اور وہ ان بچوں کو پاس بلا کر کہانیاں سنانے لگتا۔ رانی نے بتایا کہ اس کا ایک بھائی مدرسے میں چلا گیا ہے۔ اس مدرسے میں اسے نئے جوتے، نئے کپڑے اور طرح طرح کے کھانے بھی ملتے ہیں۔ ساون یہ سب سنتا رہتا۔ منو نے ساون کو بتایا کہ اس کا ابا نشہ کرتا ہے۔ سارا دن گھر پر رہتا ہے۔ اب بیمار بھی رہنے لگا ہے اور اس کا بڑا بھائی مدرسے سے اس سے ملنے نہیں آتا۔ وہ حافظ بن رہا ہے پھر مولوی بنے گا۔

دروازے پر بھیڑ بکریاں چرانے والی عورت آ گئی اس کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔ دلاری نے باورچی خانے سے بھوسی ٹکڑے لا کر دیئے۔ عاصم بکری کے بچے کو خریدنے کی ضد کرنے لگا۔ بھیں بھیں کر کے رونے لگا۔ اسی دوران ایڈووکیٹ یاور آ گئے انہوں نے عاصم کو پچاس روپے دیئے عاصم رونا دھونا بھول گیا اور ساون نے سکون کا سانس لیا۔ سب گھر والوں نے گھیرے رکھا۔ ہر شخص اپنے مسئلوں کے حل کے لیے ان سے مشورے مانگتا تھا۔ پڑوس کے ناصر صاحب بھی ملنے آ گئے اور اپنے دفتر کا مسئلہ لے کے بیٹھ گئے کہ سرکاری ملازمت کر رہے تھے طبیعت کی خرابی کے بہانے چھٹیاں لیں اور بیرون ملک ملازمت کے لیے چلے گئے یہاں بھی نوکری نہیں چھوڑی البتہ اپنے محکمے میں ہر تھوڑے عرصے بعد وہ ایک درخواست داخل کروا دیتے تھے۔ مگر جب سے حکومت نے سختی کی ہے تو وہ معتوب ہو گئے ہیں۔ ایڈووکیٹ صاحب نے قانونی داؤ پیچ کے ذریعے انہیں بچا لینے کی حامی بھری پھر تو ناصر صاحب ان کے مطیع ہو گئے۔ ناصر صاحب مطمئن ہوئے اور جلدی میں اٹھ کر اپنے گھر گئے اور ذرا دیر میں ہی وہ ایک بڑا سا لفافہ لیے واپس آ گئے۔ ایڈووکیٹ یاور نے بہت منع بھی کیا مگر ناصر صاحب بھی بضد رہے کہ میں عمرہ کرنے گیا تھا تو خاص آپ کے لیے یہ تبرکات اور کھجوریں لایا تھا۔ اس کے بعد وہ دیر تک اپنے عمرے پر جانے کی روداد سناتے رہے۔ اب ٹھیکیدار صاحب کے ایک اور دوست بھی ایڈووکیٹ صاحب کے پاس ملنے آنے لگے۔ لیکن ساون کو ان کی باتیں اتنی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر وہ اتنا ضرور سمجھ گیا کہ وہ کسی نیوز ادارے میں ہیں اور ادارے میں مالی بے ضابطگیوں اور انکم ٹیکس کے گوشواروں میں کچھ رد و بدل کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔

ناظم میاں گھر کے بکھیڑوں سے الگ رہتے تھے ایک دن ساون کے پاس پرانی تصویریں اور ایک پرانی ڈائری لے کر آئے اور اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے تمہاری ماں بہت اچھی شاعری کرتی تھی۔"

ساون نے نفی میں سر ہلایا مگر پوری توجہ اور تجسس سے ناظم میاں کی بات سننے لگا۔

"وہ . . . وہ بہت ہی پیاری، بہت باہمت اور ہمیشہ

مثبت سوچ رکھنے والی لڑکی تھی، دنیا سے بالکل مختلف۔" ناظم میاں نے اپنی عمر گزشتہ کو یاد کرتے ہوئے محبت سے کہا۔ "جیسے تمہارا نام اس نے بالکل مختلف رکھا ہے۔"

ناظم میاں بات کرتے کرتے رک گئے۔ پھر گلوگیر آواز میں کہنے لگے۔ "وہ دنیا کی فرسودہ روایتوں کے مقابلے میں اپنے اندر کے سچ کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی...... معلوم نہیں ہم لوگ کیوں اب تک خود کو دوسروں کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہم اپنے اندر کے سچ کو تلاش نہیں کر سکتے۔ کب تک اس سے دور بھاگتے رہیں گے۔ آج ہم اس کے مجرم ہیں۔"

ناظم میاں خاموش ہو گئے۔ ساون اپنی ماں کی پرانی تصویریں دیکھتا رہا۔

ساون زندگی سے بہت سے سبق سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بہت سی باتوں کی تشریح چاہتا تھا، اور گھر میں کسی کو کسی بات سے کچھ مطلب نہیں تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی دنیا میں مگن تھا، اسی افراتفری میں اس نے سنا کہ شام کو دردانہ خالہ آ رہی ہیں۔ ساون کا دل بیٹھنے لگا۔ ایک وقت تھا کہ وہ یہاں سے جانے کے لیے بے چین تھا مگر اب وہ کسی اور کے گھر جانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ساون دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگا۔

ساون کی خالہ دردانہ شام تک آ گئیں۔ وہ ساون سے مل کر بڑی دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔ دردانہ خالہ ساون کے کھانے کے لیے بسکٹ کے ڈبے اور نمکو کا بہت سا سامان لائی تھیں۔ ہر لمحہ نئی داستان اس کی زندگی میں شامل ہو رہی تھی۔ جتنی محرومیاں اسے ملی تھیں قدرت اس کا ازالہ کر رہی تھی۔

دردانہ خالہ کے سامنے نفیسہ بیگم جو مسلسل ساون کو کہیں اور بھیجنے پر بضد تھیں انہوں نے موقع دیکھ کر فوراً اپنے گھر میں جگہ کی تنگی کا رونا شروع کر دیا۔ اس کے منجھلے ماموں ناظم میاں نے نفیسہ بیگم کو ٹوکنا چاہا مگر وہ کسی کی کہاں سننے والی تھیں اپنی بات ختم کر کے ہی دم لیا۔ ساون کو لگا کہ شاید وہ اسے اپنے گھر لے جانا چاہیں گی مگر وہ نفیسہ بیگم کی بات سنتے ہی سٹپٹا گئیں۔ گھبراہٹ کے مارے انہیں چائے کا گھونٹ اتارنا مشکل ہو گیا اور اچھو لگنے لگا۔ پھر ذرا توقف کے بعد دھیمی آواز میں بتانے لگیں کہ وہ ساون کو لے جاتیں مگر اپنے شوہر کی وجہ سے مجبور ہیں۔ نفیسہ بیگم نے چائے کی پیالی کو زور سے میز پر رکھا اور بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگیں۔ ناظم میاں نے بات بدلنا چاہی مگر ماحول میں وہی کشیدگی برقرار رہی۔ ساون کو اپنی حیثیت کا اندازہ ہونے لگا۔ ہر لمحہ اسے دنیا کے پرکھنے کا نیا ڈھنگ نظر آ رہا تھا۔

منو نے باتوں باتوں میں بتایا کہ کچھ دن پہلے گھر میں ابا کا اماں سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہ شادی کر رہا ہے۔ وہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اگلے روز ایک اور کام کرنے والی عورت نے آ کر بتایا کہ مینا کے شوہر کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا ہے۔ دو چار دن تک منو اور رانی کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ رانی اور منو کسی محلے دار کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ چند دنوں بعد جب مینا آئی تو عجیب حالت تھی۔ اس نے رو رو کر بتایا کہ اس کے شوہر کے چھوٹے بھائی نے گھر پر قبضہ کر لیا اور انہیں نکال دیا تھا اور وہ اس کے محلے کی مسجد کا مولوی ہے۔ وہ اس گھر پر اپنا حق جتاتے ہوئے اس پر مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہے۔

مینا مجبور ہو کر کسی دوسرے دور علاقے میں جھگی میں رہنے لگی تھی۔

رانی اور منو کے ذریعہ ساون کو معلوم ہوا کہ اس کے ابا کا ایک دوست منظور ان کے گھر آیا کرتا ہے۔ اور ان کی مدد کرتا رہتا ہے۔ رانی نے بتایا کہ وہ نشہ بیچا کرتا ہے اور اس کے پولیس والوں سے بھی تعلقات ہیں۔

شام کو جاتے وقت منو نے بتایا کہ رانی اب چلی جائے گی۔ اس کے منظور چاچا کے دوست آئے تھے اور اب وہ رانی کو حج کرانے لے جائیں گے وہ اماں کو بہت سے پیسے بھی دیں گے جن سے اماں ایک دکان لے گی اور انہوں نے اماں کو بہت قیمتی جوڑا بھی دیا ہے مگر اماں نے ابھی کسی کو یہ بات بتائی نہیں ہے۔

اب جو کچھ ہونے والا تھا ساون کو اس کا اندازہ ہونے لگا۔ ساون ایک دم پریشان ہو گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کیا وہ گھر میں کسی سے ذکر کرے مگر اس کے نتیجے میں کہیں اسے کوئی مزید پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ رانی کو کچھ سمجھانا بے کار تھا۔ وہ اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلنے میں مگن تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اسے اس مسئلے کا ایک حل...... سمجھ میں آیا۔ گھر میں بھی لوگ اس کے اطراف میں تھے۔ دیر تک وہ موقع کی تلاش میں تھا کہ رانی سے کوئی بات کر سکے مگر اسے کوئی موقع نہ مل سکا۔ منو اس کے ساتھ کھیلتا رہا۔ جاتے وقت اس نے رانی کے کان میں کچھ کہا

رانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساون نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے کاغذ کے چند کھلونے رانی اور منو کو دے دیے۔

رانی کے جانے کے بعد ساون اسی کے بارے میں دیر تک سوچتا رہا۔

ساون نے سنا کہ فرید ماموں کی شادی کے سلسلے میں دیوان جی کے گھر والے آنے والے ہیں۔ دردانہ خالہ بھی بہت خوش ہیں نفیسہ بیگم بہت تیاریاں کر رہی تھیں مگر فرید ماموں کسی بات پر شدید ناراض ہو رہے تھے۔ جب جو یہاں تھا تو ساون کو اس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ دیوان جی بہت بڑے آدمی ہیں۔ اور بڑے مذہبی بھی ہیں۔ رات میں اٹھ کر بھی نماز پڑھتے ہیں ان کے گھر سے شب برأت کے لیے بہت سے پٹاخے بھی آیا کرتے ہیں۔ اور محرم میں حلیم کی دیگ پکائی جاتی ہے۔ ان کے بیٹے شربت کی سبیل لگاتے ہیں۔ جب بھی وہ آتے ہیں تو ان کے لیے طرح طرح کے کھانے پکوائے جاتے ہیں، الگ ایک کمرا خالی کر کے انہیں دیا جاتا ہے اور وہ جو کو سو روپے بخشش بھی دیا کرتے تھے۔ ساون کا جی چاہنے لگا کہ وہ کسی طرح دیوان جی سے ضرور ملے۔

''نفیسہ باجی میں تو کہتی ہوں کہ جب فرید کی مرضی یہی ہے تو آپ آخر تصدق چچا کی بیٹی شہناز سے ہی فرید کی شادی کیوں نہیں کروا دیتیں۔'' دالان میں بیٹھی ہوئی بلقیس نے فرید کی حمایت میں کہا۔

''اے لو یہ کیا کہہ دیا تم نے ..... اس گھر میں اب ایسی بہوئیں آئیں گی جو دن بھر دفتروں میں رہیں اور آدھی آدھی رات کو غیر لوگوں کے ساتھ گھومیں پھریں۔'' نفیسہ بیگم نے تنک کر جواب دیا۔

ہر شخص دوسرے پر اعتراض کر رہا ہے۔ ساون سوچنے لگا کہ کون صحیح ہے کون غلط ہے کس طرح معلوم ہو وہ اسی الجھن میں تھا کہ اسے خیال آیا کہ یہ شہناز کون ہے؟ پھر اسے یاد آیا کہ تصدق چچا کا نام تو اس نے بہت سنا ہے۔ جو نے اسے بتایا تھا کہ تصدق چچا کراچی میں ہی رہتے ہیں۔ جب بھی چھٹیوں میں وہ لوگ آتے ہیں تو گھر کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ رات کے ڈھائی تین بجے تک ہا ہائے ہوتی رہتی ہے۔ تاش کھیلے جاتے ہیں، وی سی آر پر فلمیں لگاتے ہیں۔ بیت بازی اور گانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ روز رات کو آئس کریم کھانے باہر جاتے ہیں۔ مذہب کے معاملے میں وہ بھی بڑے جوشیلے ہیں۔ ان کے ہاں قوالی کی محفل ہوتی ہے تو پوری گلی میں ضیافت لگتا ہے۔ سال میں دو تین بار تو وہ لوگ گاڑی کر کے سب کو مزار پر لے جاتے ہیں۔

اٹھتے بیٹھتے سب گھر والے انہی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ساون کو ان باتوں سے اندازہ ہوا کہ دیوان جی اور تصدق چچا کی برسوں سے زبردست لڑائی ہے اور وہ لوگ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہے اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اب جو بھی نہیں تھا جس سے اسے کچھ علم ہوتا۔ کسی اور سے پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی مگر یہی پتا چلا کہ یہ جھگڑا نسلوں میں چلا آ رہا ہے۔

''میں پوچھتی ہوں آخر دیوان جی کی بیٹی نوشابہ میں کیا کمی ہے جو فرید منع کر رہا ہے..... صوم صلوٰۃ کی پابند ہے، گھر گرہستی کو اچھی طرح سنبھالتی ہے پھر خوبصورت ہے میٹرک بھی کیا ہوا ہے۔'' نفیسہ بیگم نے بدستور حمایت کی اور گھر میں ایک بار پھر تو تکار شروع ہو گئی۔

''پر دیوان جی کے گھر کا ماحول کیسا سخت ہے کہ خدا کی پناہ... خود تو دنیا جہان میں گھومتے پھرتے ہیں مگر بی آپا اور بچوں پر کس قدر روک ٹوک ہے۔'' بلقیس نے زور دے کر کہا۔

اسی فرسٹیشن کی وجہ سے نندوں کی واحد تفریح یہی تھی کہ بھابیوں کی لڑائیاں بھائیوں سے ہوں، بیچاریاں اپنے رشتوں کے لیے خود کوششیں کرتیں کہ بھابیاں خود کو ایک عذاب میں گرفتار سمجھتیں اور ایک ایک کر کے دن گنتیں کہ کب پیسا ہو کہ الگ مکان لے لیں اور اس جنجال سے جان چھوٹ جائے۔ ایک دن ناظم میاں نے کہا تھا۔

''اسی لیے تو آئے دن جادو ٹونے کرواتی رہتی ہیں۔''

''آپ ایک بار پھر سوچ لیں ناں۔'' بلقیس نے اصرار کیا۔

''توبہ ہے تم لوگ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو..... میرا کیا ہے جو جس کے جی میں آئے کرے۔'' نفیسہ بیگم نے جھنجلا کر کہا اور اٹھ کر چل دیں۔

یہ کون لوگ ہیں، ان کا مجھ سے کیا تعلق ہے، نہ جانے مجھ سے کیسا رویہ ہوگا اس کے ذہن میں ایسے بہت سے سوالات ایک ساتھ گردش کرنے لگے۔ کون دین پر ہے کون نہیں ہے۔ کیا دین اور دنیا واقعی اس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ میری آنٹی نے مجھے یہاں کس لیے بھیجا تھا۔ ساون کے ذہن

میں سوالات کی ایک یلغار ہونے لگی۔

گھر میں کسی کو رانی اور منو کے متعلق کچھ خبر نہ تھی۔

ساون اکثر ان کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ ایک دن گھر کے دروازے کو کسی نے بہت زور سے کھٹکھٹایا۔ ولاری بڑبڑاتی ہوئی دروازے پر گئی۔ اس نے جھنجلاتے ہوئے دروازے کا پٹ کھولا لیکن ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی اور اس نے جھٹ سے دروازے پر کنڈی چڑھائی اور دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ گھر میں موجود سارے لوگ پریشان ہوگئے ہر ایک اس سے پوچھ رہا تھا مگر وہ ایک لفظ نہیں بتا پا رہی تھی۔ دروازہ پیٹنے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ساون پریشان تھا مگر کوئی اسے حقیقت بتانے والا نہیں تھا۔ ڈرتے ڈرتے نفیسہ بیگم دروازے کے قریب گئیں اور دروازے کی جھری میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا ”کون ہے؟“

باہر چھ آٹھ لٹھ مار قسم کے اوباش دروازے پر موجود تھے۔ اور آپس میں چیخ و پکار گالم گلوچ کر رہے تھے۔

”میں رانی کے باپ کا دوست منظور ہوں..... میں رانی کو لینے آیا ہوں۔“ ان میں سے ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا۔

”کون رانی..... یہاں کوئی رانی وانی نہیں ہے چلے جاؤ سمجھے۔“ نفیسہ بیگم نے ہمت کرتے ہوئے زوردار آواز میں جواب دیا۔

”کیسے نہیں ہے..... میں رانی کو لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔“ منظور نے بدستور چیختے ہوئے کہا۔

”کہہ دیا ناں کہ یہاں کوئی رانی وانی نہیں ہے۔ فوراً چلے جاؤ یہاں سے ورنہ فون کر کے ابھی بلاتی ہوں پولیس کو۔“ نفیسہ بیگم نے زوردار آواز میں دھمکایا۔

چند لمحے ان لوگوں کی آپس میں چہ میگوئیوں کی آوازیں آئیں..... منظور ڈھٹائی سے اڑا ہوا تھا مگر اس کے ساتھ کے لوگ اسے سمجھا بجھا کر واپس لے گئے۔

ان کے جانے کے بعد دیر تک سب کے دل ہولتے رہے۔ گھر میں سے کسی نے باہر جھانکا تک نہیں۔ بلکہ جلدی جلدی فون کر کے ایڈوکیٹ صاحب اور ٹھیکیدار صاحب کو گھر بلوایا۔ شام تک یہ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ آخر رانی کا کیا معاملہ ہے اور یہ لوگ یہاں کیوں آئے تھے۔

اگلے روز پڑوس میں کام کرنے والی ایک عورت کو بلوا کر معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ رانی کے بھائی منو نے اپنے گھر والوں کو بتایا ہے کہ اس گھر میں موجود معذور لڑکے نے رانی کو ورغلایا ہے۔ وہ اس کے کہنے پر کہیں بھاگ گئی ہے۔ اسی لیے وہ لوگ اس لڑکے کو مارنے اور رانی کا معلوم کرنے آئے تھے۔ کام والی کا یہ بتانا غضب ہوگیا۔ نفیسہ بیگم تو آگ بگولہ ہوگئیں۔ غصے میں ان کے منہ سے تھوک اڑنے لگا۔

”غضب خدا کا یہ عمر دیکھو اور اس کے کام دیکھو۔ میں تو پہلے ہی کہے دیتی تھی کہ اسے گھر میں رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے پر میری کسی نے سنی ہی نہیں اب دیکھ لیا۔ سارے زمانے میں رسوا کروا رہا ہے یہ..... اس کی اتنی ہمت ..... میں اسے آج ہی گھر سے نکال کر رہوں گی۔“ نفیسہ بیگم سارا دن ساون پر گرجتی برستی رہیں۔

نفیسہ بیگم نے ساون کو گھر سے نکالنے کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ان کا بس چلتا تو ساون کو بستر سمیت ہی سڑک پر پھینک دیتیں۔ گھر میں ہر کوئی انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ غصے میں کسی کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔

ساون کو لگا جیسے یہ اس کا اس گھر میں آخری دن ہے۔ ہر کوئی جہاں بلقیس بیگم کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہیں ساون پر بھی ملامت کر رہا تھا۔

یقین نہیں آتا کہ اس بچے نے ایسا کیا ہوگا۔

اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملنی چاہیے تاکہ یہ آئندہ باز رہے۔

آئندہ کا سوال ہی کیا۔ میں تو ابھی اسے یتیم خانے میں بھجوا کر رہوں گی تم لوگ سمجھتے کیا ہو۔ ذرا ٹھیکیدار صاحب کو گھر آنے تو دو۔

ساون نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ خاموشی سے لیٹے لیٹے سب کے جملے سنتا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن کسی نے اس سے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔

ساون کو لگا کہ اس کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسے اپنے سینے پر اچانک دباؤ سا محسوس ہوا پھر اس کے سینے میں درد بڑھنے لگا۔ سر میں دھمک سی ہونے لگی، پیاس سے اس کا حلق خشک ہوگیا۔ ساون کے ماتھے پر پسینا آگیا۔ ایک زوردار کراہ نکلی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

ساون کی زندگی اسے پھر ایک نئے موڑ پر لے آئی۔

جن لوگوں کو وہ اپنا سمجھتا تھا انہوں نے ساون کا ہاتھ ان

لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جو لاوارث لوگوں کے لیے پناہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔

ساون کے روز و شب ایک چھوٹے سے کمرے میں گزرنے لگے۔ فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایک خستہ حال سی میز کمرے میں تھی۔ دیوار پر دو ایک طغرے لگے تھے۔ برابر کے کمرے سے بچوں کے سبق پڑھنے کی آوازیں آتی تھیں۔ اسے اس ماحول میں ڈھلنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔ یہ سارے لوگ ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک فلاحی ادارے میں اتنے مختلف ذہن، قومیتوں اور مسالک کے لوگ ایک ساتھ مل جل کر محبت سے بھی رہ سکتے ہیں۔ اور یہ لوگ جو یہاں کام کرتے ہیں ان میں زیادہ تر لوگ رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں۔

اسے زندگی کی ہر شئے مختلف دکھائی دینے لگی۔ کبھی کبھی اسے ٹھیکیدار صاحب کے گھر کا خیال آتا مگر وہ لوگ اسے کس جرم میں اپنوں سے الگ چھوڑ گئے یہ سوچ کر وہ رنجیدہ ہو جاتا۔

اسے کتابیں پڑھنے کا دوبارہ موقع مل گیا۔ وہ چند چھوٹے بچوں کو پڑھانے بھی لگا۔ اسے اس کام کی باقاعدہ اجرت بھی دی جانے لگی۔ ساون کو زندگی کے نئے معنی اور مفاہیم سمجھ میں آنے لگے۔ یہاں ہر کوئی ایک مذہب، مسلک، زبان اور قوم کا نہیں تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ یہ سب لوگ ایک قبیل کے ہیں۔ اسے اس آشیانے سے باہر کی دنیا ایک الگ دنیا لگتی تھی۔ جہاں ان ہی بنیادوں پر لوگوں کے دلوں میں دوریاں ہیں۔

اکثر بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر کبھی کبھی اسے رانی کا خیال آتا۔ نہ جانے وہ اب کہاں ہوگی۔ مگر دوسرے ہی لمحے جب اسے نفیسہ بیگم اور باقی سب گھر والوں کی باتیں یاد آتیں تو وہ رانی کے غم کو بھول جاتا۔ اسے اداس دیکھ کر عنایت اپنے کام چھوڑ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتا اور اس کا دل بہلانے کے لیے اس سے باتیں کرنے لگتا۔

عنایت یہاں درسی تعلیم دیا کرتا تھا لیکن ساون کے ساتھ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بات کیا کرتا تھا۔ ساون بھی کبھی ان سے اپنی زندگی کی کسی مشکل کے یا دکھ کا ذکر کرتا۔ وہ اس کی ہمت بندھانے اور درست سمت دکھانے کے لیے بہت سی حکایتیں سنایا کرتا۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ ساون کو اپنی ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ لیکن اسے اپنی ماں کی وصیت پر بہت افسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے اسے اس کے ماموں کے پاس بھجوانے پر اصرار ہی کیوں کیا تھا۔ اسے دکھ ہو رہا تھا کہ آخر مذہب کو بنیاد بنا کر لوگ اپنے دلوں میں دوریاں کیوں بڑھا لیتے ہیں۔

اسے دل گرفتہ دیکھ کر عنایت اس کے پاس آ گیا۔ اسے ساون کے دل کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ ساون کے ذہن کو پڑھنا چاہ رہا تھا لیکن ساون نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔

”ارے میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔“ عنایت نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ایک بڑھیا اپنے گھر میں پوجا کر رہی تھی کہ ایک شخص زخمی حالت میں اس کے گھر آ گیا۔ بھوک پیاس سے اس کی حالت غیر تھی۔ اس شخص نے بتایا کہ وہ راستہ بھٹک گیا تھا اور جنگلی جانور سے بچتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔ بڑھیا نے اس کی مرہم پٹی کی اور کھانا کھلایا۔ اس شخص نے بڑھیا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ اپنی عبادت میں مشغول تھیں اور میری وجہ سے آپ کو اپنی عبادت روکنا پڑی۔ بڑھیا نے مسکرا کر کہا کہ میری عبادت رکی کہاں؟ میں تو ابھی بھی عبادت ہی کر رہی ہوں۔“

ساون کے چہرے کی مسکراہٹ نے اس کے غم کے دور ہونے کا اعلان کیا۔ عنایت آہستہ سے بولا۔ ”تم جو کچھ سوچ رہے تھے مجھے معلوم تھا اس لیے کہ پہلے میں بھی اسی انداز سے سوچا کرتا تھا۔“

ساون کے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرنے لگے۔ ساون نے ہمت کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو پہلے آپ کہاں تھے..... کیا آپ بھی کسی اور مذہب سے ...؟“

”پتا نہیں۔“ عنایت نے نفی میں سر ہلا کر گلے میں پڑا ایک ٹوٹا ہوا لاکٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”معلوم نہیں مجھے یہاں کون چھوڑ کر گیا لیکن جب ان لوگوں نے مجھے یہاں اس جھولے سے اٹھایا تھا تو بس یہی ایک نشانی میرے پاس تھی جس سے کچھ بھی اندازہ نہیں ہوتا۔“

لاکٹ سے نگاہ ہٹا کر ساون نے عنایت کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر پہلی بار اسے مسکراہٹ کے ساتھ تلخی بھی نظر آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ عنایت کے چہرے کے نقوش میں اس کا دکھ گھل مل گیا ہو۔ ساون عنایت کے گلے میں لٹکتے ہوئے لاکٹ کو بغور دیکھنے لگا۔

عنایت نے اپنے لاکٹ کو دیکھ کر کہا۔ "میں نے بھی بہت غور کیا تھا۔ بہت سمجھنا چاہا مگر کچھ پتا نہیں چلتا۔ کبھی یہ 'اوم' سا لکھا ہوا لگتا ہے، کبھی کچھ مختلف لگتا ہے مگر مجھے اب کوئی فرق نہیں پڑتا...... میں نے خود کو اس کی قید سے آزاد کر لیا ہے۔ اس لیے کہ ہر قبیلہ میرا قبیلہ ہے۔ میں تو انسانیت کا بیٹا ہوں۔"

چند لمحوں کے لیے عنایت نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبایا اور اپنا منہ دوسری جانب کر لیا۔ ساون گنگ سا ہو کر رہ گیا۔ وہ خود کو اس کے مقابلے میں بہت بہتر حالات میں محسوس کرنے لگا۔ اپنا غم اسے بہت ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

کاریڈور میں آہٹ سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھیکیدار صاحب ادارے کے سربراہ کے ہمراہ اس کے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ ساون کو کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اب وہ کیوں آئے ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ٹھیکیدار صاحب سے ملنا پڑا۔

وہ ساون کے ساتھ اس کے کمرے میں چلے گئے۔

ٹھیکیدار صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے کہا۔ "ہم سب کو رانی بہت عزیز تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم اس سے بالکل بے خبر تھے...... دراصل ہم سب یہ سمجھتے تھے کہ رانی تمہارے کہنے پر کہیں بھاگ گئی ہے لیکن......"

ساون نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ ٹھیکیدار صاحب نے پھر اپنی صفائی میں کہنا شروع کیا۔ "مجھے واقعی بڑی شرمندگی ہے کہ گھر کے سب لوگ تم سے بڑے بدگمان رہے...... لیکن اب...... اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ دراصل رانی کو اس کے رشتے دار بیچنا چاہتے تھے اور ملک سے باہر بھجوانا چاہتے تھے۔" ٹھیکیدار صاحب نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تو کیا...... رانی چلی گئی...... وہ لوگ رانی کو لے گئے؟" ساون نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں بیٹا...... تم نے جیسا رانی سے کہا تھا۔ اس نے وہی کیا اور اپنے رشتے داروں کو آگاہ کر دیا۔ وہ لوگ منظور سے لڑ پڑے اور انہوں نے رانی کو بچا لیا مگر......" ٹھیکیدار صاحب نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "رانی کو حاصل نہ کرنے پر منظور نے انتقام لینے کے لیے رانی کی ماں کو مار ڈالا۔"

ساون ایک دم افسردہ ہو گیا۔ کچھ دیر ٹھیکیدار صاحب خاموش رہے۔ ٹھیکیدار صاحب نے ساون کو پیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

"خدا کو یہی منظور تھا مگر...... مگر تم پریشان نہ ہو، بس تم اپنا سامان باندھو، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اب تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔"

"نن...... نہیں...... میں نہیں جا سکتا۔" ساون کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

"کیوں بیٹا...... میں ذمہ داری لیتا ہوں کہ اب تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔" ٹھیکیدار صاحب نے اصرار کرتے ہوئے کہا اور پھر تمہاری ماں کی بھی تو یہی خواہش تھی ناں کہ تم اچھے دیندار گھرانے میں پروان چڑھو، ہمارے رسموں رواج کو دیکھو، مذہب پر عمل پیرا ہو...... اور اپنے دین کو سمجھو...... ہے ناں۔"

"مگر...... مگر اب ایسا نہیں ہو سکتا۔" ساون نے بے بسی سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا...... اب ایسا کیا ہو گیا ہے؟" ٹھیکیدار صاحب نے الجھتے ہوئے کہا۔

ساون خاموش رہا۔ ٹھیکیدار صاحب نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا...... کیا تم اب کوئی اور مذہب......"

"نہیں......" ساون نے ٹھیکیدار صاحب سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے یہاں مذہب کی روح کو سمجھا ہے...... میں نے یہاں سے جو درس سیکھا ہے وہ دنیا کے تمام مذاہب میں مشترک ہے اور وہ ہے احترامِ آدمیت۔ انسانیت جس کی میں نے یہاں عملی تصویر دیکھی ہے۔ مذاہب کا مقصد تزکیہ نفس اور تطہیر نفس ہے۔ مذاہب اس دنیا سے زیادہ ہمارے اندر کی دنیا میں انقلاب برپا کرتے ہیں۔ مگر کوئی اس انقلاب کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا کیونکہ مجھے اس آشیانے سے زیادہ خدا پرستی کہیں نظر نہیں آئی۔"

ٹھیکیدار صاحب خاموش ہو گئے اور بنا کچھ کہے اٹھ کر جانے لگے، دروازے پر جا کر ایک بار مڑے۔ ساون کے قریب آئے۔ ان کی آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ ٹھیکیدار صاحب نے ساون کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی پیشانی پر اس طرح بوسہ دیا جیسے زمین پر پڑا ہوا کسی مقدس صحیفے کا پھٹا ہوا ورق ہو۔

انا پرستی

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت

اولاد کی تربیت آسان نہیں ہے مگر کچھ لوگ جو اپنی انا کے خول میں بند ہوتے ہیں اور یہی چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔بچے کی دلچسپی خواہ کچھ بھی ۔ اس کشمکش میں بچے کی انا کس طرح مجروح ہوتی ہے. یہ عرفان صاحب کے ہاں میں نے دیکھا آپ بھی ملاحظہ کریں.

دانیہ صدیقی
(کراچی)

نادیہ آج پھر سر تھامے بیٹھی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹا پہلے ہی عرفان بک جھک کر کے گھر سے نکلا تھا۔ جنید اس کے سامنے صوفے پر نڈھال سا پڑا تھا جبکہ زارا سہمی ہوئی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ گھر جہاں تھوڑی دیر پہلے بچوں کے قہقہے گونج رہے تھے اب وہاں سی قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آج صبح ہی عرفان کی پندرہ دن بعد دبئی سے واپسی ہوئی تھی۔ بچے اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے تھے اور وہ بھی ہمیشہ کی طرح ان کے لیے طرح طرح کے کھلونے اور قیمتی کپڑے لایا تھا



جن کو پا کر وہ پورے گھر میں ناچتے پھر رہے تھے۔ نادیہ بھی بچوں کو خوش دیکھ کر پھولے نہ سما رہی تھی۔ عرفان اس کے لیے بھی قیمتی ساڑیاں اور پرفیوم وغیرہ لایا تھا۔ وہ لوگ لنچ کے لیے ایک قریبی ریسٹورنٹ گئے پھر وہاں سے واپسی پر نادیہ نے آخر کار ہمت کر کے اسے وہ خبر سنا ہی دی جس کو بتانے کا سوچ سوچ کر پچھلے ایک ہفتے سے اس کا دم خشک ہوئے جا رہا تھا۔ خبر سن کر عرفان کا ردعمل حسب توقع تھا۔

عرفان کا ہنستا مسکراتا چہرہ ایک سیکنڈ میں غصے سے لال بھبھوکا ہوگیا۔ اس نے گاڑی چلاتے چلاتے گردن موڑ کر دس سالہ جنید کو شرربار نگاہوں سے گھورا جو خوشی خوشی بہن کو اپنا نیا وڈیو گیم دکھانے میں مگن تھا۔ باپ کو اپنی طرف گھورتا پا کر وہ اک دم سہم گیا اور سمجھ گیا کہ انہیں اس کے خراب رزلٹ کی اطلاع مل چکی ہے۔ گاڑی میں اچانک خاموشی چھا گئی۔ سب چپ چاپ عرفان کی گالیاں سنتے رہے۔ جو وہ جنید کو ایک تواتر سے دے رہا تھا جبکہ جنید سر جھکائے خاموشی سے بیٹھا باپ کی لعن طعن سن رہا تھا۔ گھر پہنچ کر عرفان نے جنید کو گھسیٹ کر گاڑی سے اتارا اور وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے اس کی پٹائی شروع کردی۔ زارا اپنے بھائی کی درگت بنتی دیکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ نادیہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ تیزی سے جنید کو بچانے آگے بڑھی تو عرفان نے اسے دھکا دے کر پیچھے کردیا اور پھر دروازہ کھول کر جنید کو پکڑے اندر داخل ہوگیا۔

شور وغوغا سن کر کئی لوگوں نے اپنے گھروں سے جھانکا۔ نادیہ یہ منظر دیکھ کر تڑپ کر رہ گئی اور زارا کا ہاتھ تھامے دونوں کے پیچھے گھر میں داخل ہوگئی۔ اس وقت گھر جنید کی دردناک چیخوں سے گونج رہا تھا۔ وہ رو رو کر اپنے باپ سے معافیاں مانگ رہا تھا اور یہ وعدے کررہا تھا کہ اگلے امتحانوں میں وہ اچھے مارکس سے پاس ہوگا لیکن عرفان تو اس وقت جیسے بہرہ ہوچکا تھا۔ نادیہ نے ایک مرتبہ پھر عرفان کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی تو وہ اس پر الٹ پڑا۔

"تمہارے ہی لاڈ پیار نے اسے بگاڑ رکھا ہے۔ آج تک کیا کمی کی ہے میں نے تم لوگوں کے نخرے اٹھانے میں؟ تم لوگوں کی فرمائش منہ سے نکلنے سے پہلے ہی پوری کردیتا ہوں۔ میں نے اسے شہر کے بہترین اسکول میں داخل کروایا جہاں کے اساتذہ اور بہترین اسٹینڈرڈ کی تعریف ایک دنیا کرتی ہے۔ وہاں سے نکلنے والے بچے آج ملک کے بہترین ڈاکٹرز اور انجینئرز ہیں لیکن اس نے تو قسم ہی کھا رکھی ہے کہ باپ کا نام ڈبو کر رہے گا!" بولنے کے ساتھ ساتھ عرفان کے ہاتھ بھی تیزی سے چل رہے تھے اور اب جنید کی چیخیں آسمان چھو رہی تھیں۔

نادیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ عرفان اب کسی کی نہیں سنے گا۔ وہ اس وقت اتنے شدید اشتعال میں تھا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اور ماتھے کی رگیں تک ابھر آئی تھیں۔ وہ زارا کو سینے سے لگائے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جنید کی درگت بنتا دیکھتی رہی، یہاں تک کہ عرفان نے تھک کر خود ہی اسے چھوڑ دیا اور نادیہ کو مزید بے بھاؤ کی سنانے کے بعد گھر سے نکل گیا۔

اس کے گھر سے نکلتے ہی نادیہ لپک کر ادھ موئے سے پڑے جنید کے پاس پہنچی۔ زارا نے اسے پانی پلایا، پھر نادیہ نے اسے بمشکل اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا۔ جنید کے چہرے پر عرفان کی انگلیوں کے نشان صاف نظر آرہے تھے اور بالائی ہونٹ بھی ہلکا سا سوج گیا تھا۔ اس کے جسم پر جا بجا نیل دیکھ کر نادیہ بے اختیار سسک اٹھی۔

آج بچارے جنید پر یہ اُفتاد پہلی مرتبہ نہیں ٹوٹی تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ وہ عرفان کے ہاتھوں بری طرح پٹ چکا تھا۔ وجہ ہر مرتبہ اس کا خراب رزلٹ ہی بنتا۔ یہ نہیں تھا کہ عرفان بہت ظالم قسم کا باپ تھا بلکہ اس کی تو جان بچوں میں اٹکی تھی۔ وہ ان سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور ان کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتا لیکن جب بات پڑھائی کی آتی تو وہ ہر باپ کی طرح جنید کو سب سے آگے دیکھنا چاہتا تھا بلکہ شاید اس کے اندر یہ خواہش دوسرے والدین کی بہ نسبت زیادہ شدید تھی۔ اسی مقصد کے تحت اس نے جنید اور زارا کا شہر کے بہترین اسکول میں داخلہ کروایا تھا جہاں امراء کے بچے زیر تعلیم تھے۔ اس کا کاروبار دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی پر تھا اس لیے اسکول کی بھاری فیس اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھی۔

عرفان اپنے جس دوست کے ساتھ بزنس کرتا تھا اس کا بیٹا بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا جہاں اس نے جنید کا داخلہ کروایا تھا۔ وہ لڑکا جنید سے دو کلاس آگے تھا اور ہر سال اس کا رزلٹ نہایت شاندار رہتا، اسپورٹس ہو یا تقریری مقابلے، وہ ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور سالانہ تقسیم انعامات والے دن ہر استاد اس کے گن گا رہا ہوتا۔

اس کے مقابلے میں جنید کا رزلٹ نہایت معمولی سا رہتا بلکہ اکثر تو وہ کسی نہ کسی سبجیکٹ میں صرف پاسنگ مارکس ہی حاصل کر پاتا۔ اپنی کمزور جسامت کی بدولت وہ کھیل کود کے

مقابلوں میں بھی حصہ نہیں لے پاتا تھا۔ نادیہ اس کو ذہنی اور جسمانی طور پر طاقتور بنانے کے لیے سوجتن کرتی، خشک میوہ جات، دودھ اوولٹین، مقوی دوائیں اور ہر طرح کے پھل اور سبزیاں اس کو کھلاتی۔ یہاں تک کہ کوئی اسے دم درود یا دیسی ٹوٹکہ بتا دیتا تو وہ جھٹ سے اسے جنید پر آزمانے کھڑی ہو جاتی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی نکلتا۔

ایسا نہیں تھا کہ جنید کوئی بہت ہی کمزور یا لاغر بچہ تھا، بس وہ اپنے ہم عمروں کے مقابلے میں قدرے چھوٹا سا نظر آتا۔ امتحانوں کے زمانے میں وہ اچھا رزلٹ لانے کے لیے رات دن ایک کر دیتا لیکن اس کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ گھر پر تو اسے سب کچھ اچھی طرح یاد ہو جاتا تھا۔ نادیہ اس سے سارے جواب تین تین مرتبہ سن کر انہیں اپنے سامنے لکھواتی مگر جب وہ اگلے روز پرچہ دینے جاتا تو اس کا ذہن کسی سلیٹ کی مانند صاف ہوتا۔ کوشش کر کے جتنے آدھے ادھورے جواب اس کے ذہن میں ہوتے وہ لکھ دیتا لیکن جب رزلٹ آتا تو گویا گھر میں بھونچال ہی آ جاتا، جس کی زد میں جنید کے ساتھ ساتھ نادیہ بھی آ جاتی اور عرفان اس کو بھی جنید کے خراب رزلٹ کا ذمے دار ٹھہرا کر سخت سست سناتا۔ عرفان نے تو اس کے متواتر خراب رزلٹ کی وجہ سے پچھلے دو سالوں سے رزلٹ ڈے پر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نادیہ یہ سب دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ خراب رزلٹ میں اس معصوم کا کوئی قصور نہیں بلکہ وہ تو اپنی بساط سے بڑھ کر محنت کیا کرتا لیکن نجانے کیوں امتحانی پرچہ ہاتھ میں آتے ہی گھبراہٹ کے مارے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور وہ یاد کیا ہوا سب کچھ بھول جاتا پھر رزلٹ آنے پر عرفان کے ہاتھوں اس کی شامت آ جاتی۔ اس سے ایک سال چھوٹی زارا اچھا رزلٹ لانے میں کامیاب ہو جاتی اور اکثر اس کا نام اپنی کلاس کے ٹاپ ٹین اسٹوڈنٹس میں ہوتا نیز وہ کھیلوں کے مقابلوں میں بھی کوئی نہ کوئی انعام جیتنے میں کامیاب ہو ہی جاتی تھی اس لیے باپ کے غصے کا نشانہ بننے سے بچ جاتی۔ دیکھا جائے تو جنید کے خراب رزلٹ کے پیچھے کافی حد تک عرفان کا ہی ہاتھ تھا۔

نادیہ اپنے شوہر کی محرومیوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ عرفان جب تیرہ سال کا تھا تو اس کے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسے تھے۔ ان کی محلے میں اچھی خاصی چلتی ہوئی کریانے کی دکان تھی جس پر ملازمین بھی کام کیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں تو ملازمین نے ایمانداری کا ثبوت دیا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہیں ہے تو انہوں نے حساب کتاب میں ڈنڈی مارنی شروع کر دی۔ عرفان اس وقت آٹھویں کا اسٹوڈنٹ تھا، گھر میں کبھی روپے پیسے کی کمی نہ دیکھی تھی۔ اس کے والد اسے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ وہ خود بھی پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ اسے یقین تھا کہ انٹر میں وہ اتنے مارکس حاصل کرے گا کہ شہر کے کسی بھی بڑے میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ با آسانی ہو جائے گا۔ حسب توقع عرفان نے میٹرک بھی امتیازی نمبرز سے پاس کیا۔ بیوہ ماں نے بیٹے کا شوق اور مرحوم شوہر کی خواہش پوری کرنے کی پوری کوشش کی لیکن دو بیٹیوں کو باعزت طور پر بیاہنے اور خود ان کے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جانے کے بعد علاج کے سلسلے میں سارا جمع جتھا تیزی سے خرچ ہونے لگا۔

دھیرے دھیرے نوبت یہاں تک آ گئی کہ انٹر کے بعد عرفان نے اپنے ڈاکٹر بننے کے خواب کو کچل کر گزارے کے لیے کریانے کی دکان سنبھال لی۔ جب اس نے دکان کے کھاتے چیک کیے تو سناٹے میں رہ گیا۔ تمام کھاتوں میں دانستہ طور پر چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ اس کو اندازہ ہوا کہ دکان کی آمدنی تو سالانہ لاکھوں میں ہے جبکہ ملازمین سدا خسارے کا رونا روتے ہوئے آدھے سے بھی کم منافع دیتے ہوئے اصل منافع اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ اب ان سے بے ایمانی کا شکوہ کرنا بیکار تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں ان سب کا حساب چکتا کر کے انہیں چلتا کر دیا۔

اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس نے کچھ قرض ادھار لے کر دکان کو پہلے چھوٹے سے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں تبدیل کیا جہاں گھریلو ضروریات کی اہم اشیاء دستیاب تھیں۔ کچھ سال بعد اپنے دوست کی پارٹنر شپ کی آفر قبول کرتے ہوئے عرفان نے اپنے ڈپارٹمنٹل اسٹور کو بڑی ہی سپر مارکیٹ کی شکل دے دی جہاں بقول شخصے سوئی سے ہوائی جہاز تک ہر چیز موجود تھی۔ کراچی میں اس زمانے میں آج کی طرح جگہ جگہ سپر مارکیٹ کھلنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اس لیے لوگ خریداری کے لیے یہیں کا رخ کرنے لگے۔ اب اس کے پاس چاروں طرف سے دھن کی برسات ہو رہی تھی۔ اس دوران اس کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا جبکہ دونوں بہنیں اپنے شوہروں کے ساتھ ملک سے باہر جا بسی تھیں۔

دھیرے دھیرے اسے ایک اچھے جیون ساتھی کی

طلب ہونے لگی تھی جو ترقی کی راہوں میں اس کے ہمقدم ہو۔ نادیہ کو اس نے اپنے ایک کزن کی شادی میں دیکھا تھا۔ نازک سی، تیکھے تیکھے نقوش والی نادیہ اسے ایسی بھائی کہ عرفان نے اسے اپنی دلہن بنا کر ہی دم لیا۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد جب جنید ان کی گود میں آیا تو عرفان کو ایسا لگا جیسے وقت کا پہیا تیزی سے الٹا گھومنے لگا ہو۔ وہ جنید کی شکل میں اپنا ڈاکٹر بننے کا خواب پورا کر سکتا تھا۔ اسی دن اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جنید کو اپنی طرح محرومیوں کا شکار نہیں ہونے دے گا اور اسے شہر کے سب سے بہترین میڈیکل کالج سے تعلیم دلوائے گا۔ جب جنید اسکول جانے کے قابل ہوا تو عرفان نے اس کے نام الگ سے اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں بھاری رقم جمع کروا دی تاکہ اس کے مالی حالات بعد میں چاہے جیسے بھی ہوں جنید کسی بھی میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکے۔ نادیہ اس کی بے قراری پر ہنستی اور کبھی کبھار اس کے جنون سے خوفزدہ ہو کر اسے سمجھانے بیٹھ جاتی۔ ”عرفان، ضروری نہیں کہ جنید بھی آپ کی طرح ڈاکٹر بننا چاہے۔ ہو سکتا ہے اس کا رجحان کسی اور جانب ہو۔ ویسے بھی آج کل نت نئے شعبے متعارف ہو رہے ہیں۔ ہمارا بیٹا اگر ایم بی اے یا۔۔۔“ لیکن عرفان اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا کرتا تھا۔ ”میرا بیٹا صرف ڈاکٹر ہی بنے گا۔ تم دیکھنا جب وہ سفید کوٹ پہنے، گلے میں اسٹیتھسکوپ لٹکائے ایک ایک مریض سے ان کی خیریت دریافت کرے گا تو کیسا شاندار لگے گا۔ میرا تو سیروں خون بڑھ جائے گا۔“ عرفان کی آنکھوں میں مستقبل کے سپنے جگمگ کرنے لگتے۔

حالانکہ جنید کے دنیا میں آنے کے اگلے ہی سال زارا کی بھی پیدائش ہوئی تھی۔ عرفان نے بیٹی کی پیدائش بھی دھوم دھام سے منائی لیکن اس کی ساری توقعات کا محور اب بھی صرف اور صرف جنید کی ذات تھی۔ وہ اکثر اس کو پیار سے ڈاکٹر صاحب کہہ کر پکارتا۔ یہاں تک کہ جنید کے کھلونے بھی زیادہ تر پلاسٹک کے بنے ہوئے کھلونا میڈیکل اوزار پر مبنی تھے جو عرفان اسے وقتاً فوقتاً لا کر دیا کرتا تھا۔ نادیہ اس کی جذباتیت دیکھ کر دل ہی دل میں ہنستی اور اللہ سے بس یہی دعا کیا کرتی کہ آنے والا وقت سب کے لیے بہتری لے کر آئے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا مگر عرفان کے جنون میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب وہ کام کے سلسلے میں دبئی گیا تھا تو واپسی پر جنید کے لیے بچوں کے لیے تیار کردہ ایک خاصا مہنگا میڈیکل کٹ لیتا آیا تھا جس میں ربڑ کا بالکل اصلی نظر آنے والا اسٹیتھسکوپ، بلڈ پریشر کا آلہ، سرنج، رنگ برنگی دوائیوں کی شیشیاں، ایکسرے کی کاپیاں اور دوسری بہت سے طبی اوزار شامل تھے۔ اس میں خصوصی طور پر بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا سفید لیب کوٹ بھی شامل تھا۔ جب جنید وہ کوٹ پہن کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے فرضی طور پر عرفان کا بلڈ پریشر چیک کرتا اور اس کو انجکشن لگاتا تو عرفان کا چہرہ خوشی کی شدت سے تمتمانے لگتا تھا۔ زارا اور نادیہ بھی کبھی مریض اور کبھی نرس بن کر اس کھیل میں شامل ہو جاتیں اور گھر ان کے قہقہوں سے گونجنے لگتا۔

جنید اب پانچویں جماعت میں آ چکا تھا۔ اتنی کم عمری میں بھی جنید کے اوپر پڑھائی کی ٹینشن اس قدر تھی کہ امتحانوں کے زمانے میں وہ رات رات بھر جاگا کرتا تھا اور پرچہ سامنے آتے ہی اس کے اعصاب جواب دے جایا کرتے تھے۔ لگاتار چار سالوں کے خراب رزلٹ نے عرفان کو بہت دلبرداشتہ کر دیا تھا۔ اب وہ جنید سے بات بھی کم ہی کیا کرتا تھا۔ رزلٹ ڈے پر جانا تو وہ پچھلے دو سالوں سے چھوڑ ہی چکا تھا حالانکہ نادیہ نے اسے بہت سمجھایا تھا اور زارا نے اس کی بہت منتیں کی تھیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ اسے یہ بات قطعی ناقابلِ قبول تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا جسے وہ ڈاکٹر بنانے کے سپنے دیکھ رہا ہے دراصل کلاس کے نکمے بچوں میں شمار ہوتا ہے اور سوائے فائن آرٹس ٹیچر کو چھوڑ کر تقریباً ہر استاد کو اس سے شکایت رہتی ہے۔

جنید کی اسکیچنگ بہت شاندار تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں بڑے بڑے اسکیچ پیپرز پر طرح طرح کے اسکیچز بنا کر لگائے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ جب نادیہ نے فخر سے اسے جنید کے ہاتھوں بنایا گیا اپنا اسکیچ دکھایا تو کتنی دیر تک تو عرفان کو یقین نہ آیا تھا کہ یہ پنسل اسٹروکس کسی دس سالہ بچے نے لگائے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں جنید کی ڈرائنگ کا قائل ہو گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس کو ڈاکٹر بنانے کی خواہش سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس کو یہ سوچ کر تسلی ہوئی کہ جنید کو مستقبل میں میڈیکل کی پڑھائی کے دوران دشوار اور پیچیدہ ڈایاگرامز بنانے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی۔ جب اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار نادیہ کے سامنے کیا تو نادیہ خاموشی سے صرف اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

نادیہ نے ہی بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے پچھلی

سالگرہ پر اسے ایزل، کینوس، مختلف اقسام کے پینٹس، پینسلز اور پینٹ برشز وغیرہ گفٹ کیے تھے جن کو پا کر جنید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اب وہ ٹیوشن اور ہوم ورک وغیرہ سے فارغ ہو کر اسی میں مگن رہتا۔ زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی بچوں کے سالانہ امتحانات سے کچھ عرصہ قبل عرفان کو اسکول سے ایک خط موصول ہوا۔ خط میں صاف طور پر یہ بات لکھی گئی تھی کہ اگر اس سال بھی جنید نے اپنی پچھلی روش برقرار رکھتے ہوئے خراب کارکردگی دکھائی تو اسے سیکنڈری میں پروموٹ نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے اسکول کی پالیسی بھی واضح کی تھی جو ان کے داخلہ فارم پر بھی درج تھی جس کے مطابق اگر کوئی طالبعلم لگاتار تین سال تک خراب کارکردگی دکھائے گا تو چوتھے سال اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا جائے گا۔

عرفان نے انتہائی پریشانی کے عالم میں یہ خط نادیہ کو دکھایا تو جیسے اس کی تو جان پر بن آئی۔ ان دونوں نے مل کر جنید کو امتحانوں کی تیاری کروائی۔ جنید بیچارہ خود بھی اپنے والدین کی پریشانی میں پریشان تھا۔ اس کا کھیل کود، ٹی وی اور یہاں تک کہ اس کا پسندیدہ مشغلہ اسکیچنگ تک اس سے چھن گیا تھا۔ وہ دن رات پڑھائی میں مصروف رہتا تھا۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا یہ اسکول اور پرانے ساتھی اس سے چھن جائیں۔ اس کی محنت کو دیکھتے ہوئے یہ لگتا تھا کہ اس بار تو وہ ضرور امتیازی نمبروں سے پاس ہوگا۔

رزلٹ آیا تو اُمیدوں کے برخلاف جنید دو پرچوں میں فیل ہو گیا تھا۔ شاید یہ حد سے زیادہ ٹینشن کا نتیجہ تھا جو اتنے برے رزلٹ کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ اس کے برخلاف زارا کی پانچویں پوزیشن آئی تھی جبکہ نادیہ اس مرتبہ جنید پر پوری توجہ دینے کے باعث زارا پر زیادہ دھیان بھی نہیں دے پائی تھی۔ عرفان آج ان لوگوں کے ساتھ اسکول بھی چلا گیا تھا کیونکہ اسے بھی یقین تھا کہ جنید اس بار اسے مایوس نہیں کرے گا لیکن وہاں پہنچ کر عرفان کو جیسے سانپ سو نگھ گیا۔ یہاں تک کہ زارا جو پوزیشن لے کر آئی تھی اس کو بھی شاباشی کے دو بول نہیں بولے۔ جنید بری طرح سہما ہوا تھا۔ اسے باپ کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ نادیہ بھی دھڑکتے دل کے ساتھ درود شریف کا ورد کر رہی تھی۔ عرفان کے ہاتھوں جنید کی درگت بننے کا سوچ سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

واپسی کا سفر بالکل خاموشی سے کٹا۔ عرفان دانت بھینچے چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔ اس نے تینوں کو گھر ڈراپ کیا اور خود کہیں چلا گیا۔ ڈر کے مارے نادیہ کی بھی ہمت نہ پڑی کہ اس سے کچھ پوچھتی۔ رات کو نو بجے کے قریب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فارم تھا۔ اس نے خلاف توقع جنید کو کچھ نہ کہا اور کھانا کھا کر سو گیا۔ اگلی صبح نادیہ نے دیکھا کہ وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا گزشتہ رات والا فارم پُر کر رہا تھا۔ نادیہ نے غور کیا تو وہ کسی اسکول کا داخلہ فارم تھا جس کا نام بھی اوپر درج تھا۔ اسے لگا کہ اس نام کا اسکول اس نے کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔ ناشتے کے بعد عرفان نے اسے اور جنید کو تیار ہونے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی نادیہ اور جنید، عرفان کے ہمراہ حیران پریشان سے ایک خستہ حال سے اسکول میں بیٹھے تھے۔

نادیہ کو اب اچھی طرح یاد آ گیا تھا کہ یہ اسکول اس نے اکثر گزرتے ہوئے راستے میں پڑنے والی کچی بستی کے قریب دیکھا تھا۔ یہاں پر پڑھنے والے تمام بچے غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ خود اسکول کی موٹی تازی پرنسپل بمشکل انٹر پاس لگتی تھی اپنی بچی عمر سے بے نیاز شوخ رنگوں کے کسے ہوئے کپڑوں میں ملبوس بیٹھی تھی۔ جب اسے یہ پتا چلا کہ اسکول کے گیٹ پر ایک چمچماتی، نئے ماڈل کی گاڑی آ کر رکی ہے تو وہ گرتی پڑتی خود ہی ان کے استقبال کو آن پہنچی تھی اور پچھلے دس منٹ سے چڑھی ہوئی سانسوں سے اپنے اسکول کی تعریفیں کرنے میں مگن تھی۔

کہنے کو تو یہ ایک پرائیوٹ اسکول ہی تھا لیکن یہاں پر انتہائی کم آمدنی والے گھرانوں کے بچے ہی زیرِ تعلیم تھے۔ نادیہ بار بار بے یقینی کی سی کیفیت میں عرفان کو دیکھ رہی تھی۔ جنید بھی اسکول کے عسرت زدہ ماحول اور ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ جب عرفان نے وہیں بیٹھے بیٹھے جنید کے داخلے کی تمام کارروائیاں مکمل کر کے ایڈوانس میں ایک سال کی فیس موٹی سی پرنسپل کے حوالے کی تو جنید بے اختیار رونے لگا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس کے شدت پسند باپ نے اپنی خواہشات کے خون ہونے کا بدلہ اس سے لے لیا ہے۔

نادیہ بھی اپنے شوہر کے اس انتہائی اقدام پر گنگ بیٹھی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے ایسا بھی سوچ سکتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا شوہر شدت پسند ہے مگر وہ اس انتہا تک جا پہنچے گا، یہ نادیہ

نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ جب عرفان جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ دونوں بھی تقریباً گھسٹتے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گئے۔ پرنسپل بہ نفسِ نفیس انہیں باہر تک رخصت کرنے آئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت صاف پڑھی جا سکتی تھی کہ اس قدر امیر آدمی نے اپنے بیٹے کا اس قدر معمولی اسکول میں کیوں ایڈمیشن کرا دیا جبکہ شہر میں اس کے شایانِ شان ایک سے ایک اسکول موجود ہیں۔

گھر پہنچ کر نادیہ غصے سے پھٹ پڑی۔ ''میں اپنے بیٹے کو اس تھرڈ کلاس اسکول میں پڑھنے نہیں دوں گی۔ آپ نے معیار دیکھا ہے وہاں کا؟ لکڑی کے گھسے ہوئے فرنیچر، خستہ حال بلیک بورڈز، بمشکل میٹرک اور انٹر پاس اساتذہ اور میلے چیکٹے یونیفارم میں ملبوس بچے۔ کیا آپ کو پورے شہر میں یہی اسکول ملا تھا؟ اتنے بڑے شہر میں اور بھی تو پرائیوٹ اسکولز ہیں، ہم جنید کا داخلہ وہاں بھی کروا سکتے ہیں۔'' عرفان مطمئن سے انداز میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا، جب نادیہ چپ ہوگئی تو وہ تلخ لہجے میں گویا ہوا۔ ''اس اسکول کا معیار تمہارے بیٹے کے ذہنی معیار سے بالکل میل کھاتا ہے۔ کم سے کم اس اسکول میں پڑھ کر وہ کلاس میں دسویں تک تو پوزیشن لے ہی آئے گا۔ میری بھی چار لوگوں میں عزت ہوگی کہ میرا بیٹا بھی ان کے بیٹوں کی طرح کلاس کے ٹاپ ٹین بچوں میں شمار ہوتا ہے۔ رہی بات اسکول کے فرنیچر اور اساتذہ کی تو نادیہ بیگم یہ مت بھولو کہ تم نے بھی میٹرک تک سرکاری اسکول سے ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد اچھے کالجز میں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ایسے چھوٹے موٹے... پرائیوٹ اسکولز کی بورڈ انتظامیہ کی چند کالی بھیڑوں سے سیٹنگ ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنا معیار ثابت کرنے کے لیے انہیں میٹرک کے رزلٹس بہتر بنانے کے لیے بھاری رشوتیں بھی دیتے ہیں۔ جنید بھی ایک بار اچھے نمبرز سے میٹرک کرے تو میں اس کا کسی اچھے پرائیوٹ کالج میں داخلہ کروا دوں گا۔''

نادیہ اس نرالی منطق پر اسے منہ کھولے دیکھتی رہی۔ وہ یہ سمجھ چکی تھی کہ عرفان نے جو ٹھان لی ہے اس پر عمل کر کے ہی رہے گا۔ وہ اس کی ضدی اور اکھڑ طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہتھیار بھی نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس نے بھوک ہڑتال کر کے دیکھ لی، لگاتار تین دنوں تک عرفان سے بات نہیں کی، گھر میں کھانا نہیں پکایا مگر عرفان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ جنید الگ اسکول کا سوچ سوچ کر پریشان تھا اور ماں کے آگے روتا رہتا تھا لیکن نادیہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ جاتی۔

ایک ہفتہ بعد جنید کا اسکول شروع ہوگیا۔ پہلے دن وہ قطعی طور پر اسکول جانے کو تیار نہ تھا لیکن عرفان نے زبردستی اسے خود اسکول ڈراپ کیا۔ نادیہ اس کی واپسی تک فکرمند رہی۔ جب وہ اسکول سے لوٹا تو روہانسا ہو رہا تھا۔ آتے ہی ماں سے لپٹ گیا۔ نادیہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ رات کو کھانے کی میز پر عرفان نے بھی جنید کی اتری ہوئی صورت دیکھی لیکن اس کی خیریت پوچھے بغیر خاموشی سے کھانا ختم کر کے اٹھ گیا۔

اس دن کے بعد سے جنید کوئی شکایت کیے بغیر بے دلی سے اسکول جانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ اسکول میں سیٹ ہوتا جا رہا تھا لیکن اب تک اس کا کوئی دوست نہیں بنا تھا۔ سب ہی لڑکے اچھی طرح جانتے تھے کہ جنید کا اور ان کا آپس میں کوئی میل نہیں کیونکہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس بات کا اظہار ان کے اساتذہ کے عاجزانہ رویے سے بھی ہوتا رہتا تھا۔ وہ ہوم ورک کرے نہ کرے یا سیدھے سیدھے ٹیسٹ میں فیل ہو جائے، آج تک کسی استاد کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ جنید کو اونچی آواز میں ڈانٹ بھی سکے۔ ٹیچر کسی بھی بچے سے اس کا کلاس ورک اور ہوم ورک مکمل کروا دیتے۔ ٹیسٹ میں ان کی پوری کوشش یہی ہوتی کہ جنید کو پاس کر دیا جائے۔ اسکول کی پرنسپل تقریباً ہر تیسرے روز اس کی جماعت کا چکر لگا کر اور اس کی خیر خیریت پتا کر کے جاتی تھی۔ اس کا چھٹی جماعت کا ششماہی رزلٹ کافی اچھا رہا تھا بلکہ وہ (زبردستی کی) آٹھویں... پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ اساتذہ کے نرم رویے اور خصوصی توجہ دینے کی وجہ سے نادیہ کو بھی کافی حد تک جنید کی پڑھائی کی طرف سے اطمینان ہوگیا تھا اور اس کے رہے سہے خدشے بھی اس ششماہی رزلٹ کے بعد دم توڑ گئے تھے۔

دیکھتے دیکھتے جنید کو اس اسکول میں سال پورا ہوگیا۔ رزلٹ ڈے کے لیے پرنسپل نے عرفان کو ایک خصوصی دعوت نامہ ارسال کیا تھا جس میں اسے بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ مقررہ دن جب عرفان، نادیہ کے ہمراہ جنید کے اسکول پہنچا تو ان پر پھول کی پتیاں نچھاور کی گئیں۔ بڑا سا پھولوں کا ہار پہنایا گیا اور اسٹیج پر اسکول کے مالک کے ساتھ بٹھایا گیا۔ جب تقسیم انعامات کا وقت آیا تو

جنید کی چھٹی پوزیشن تھی۔ عرفان اتنے شاندار استقبال اور جنید کے رزلٹ پر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ نادیہ کی خوشی بھی اس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ تمام والدین اور بچے رشک سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ عرفان نے اس خوشی کے موقع پر اسکول کو دو لاکھ روپے کا ڈونیشن دینے کا اعلان کیا تو پورا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ آخر میں اسکول کے مالک نے ایک جذباتی سی تقریر کرنے کے بعد عرفان کو اعزازی شیلڈ اور نادیہ کو تحفتاً ایک قیمتی شال بھی پیش کی۔

اس دن کے بعد تو نادیہ جیسے اس اسکول کی اور ان کے اخلاق کی گرویدہ ہی ہوگئی۔ اب وہ جنید کی پڑھائی کی جانب سے بالکل بے فکر ہوگئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس سال بھی وہ آرام سے ٹاپ ٹین اسٹوڈنٹس میں اپنی جگہ بنا لے گا۔ اس نے پچھلے سال کا اسکول کا میٹرک کا رزلٹ بھی دیکھا تھا جو اس کی توقع کے برخلاف کافی اچھا تھا۔ اسے بھی اب عرفان کی بات پر یقین ہو چلا تھا کہ جنید یہاں سے ضرور اے ون گریڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔

جنید کو اب ساتویں جماعت میں پڑھتے ہوئے چار ماہ گزر چکے تھے۔ نادیہ نے نوٹ کیا تھا کہ پچھلے ماہ سے جنید کی حساب کی کاپی پر کسی نئے استاد کی سائن نظر آرہی تھی۔ اس کے استفسار پر جنید نے بتایا کہ اس کی حساب کی مس جاب چھوڑ کر چلی گئی ہیں اور ان کی جگہ نئے آنے والے سر ارسلان انہیں حساب پڑھایا کریں گے۔ چھوٹے موٹے اسکولز میں ہمیشہ ٹیچرز کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے اس لیے نادیہ نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ماہانہ ٹیسٹ میں جنید کے حساب میں بہت برے مارکس آئے۔ اس کے بعد ہونے والے تمام کلاس ٹیسٹس میں بھی صرف حساب کے پرچے میں اس کے مارکس بہت خراب رہنے لگے۔ عرفان نے بھی اس بات کا نوٹس لیا اور ڈائریکٹ پرنسپل سے بات کی۔ اس نے فوراً سر ارسلان کے ساتھ نادیہ اور عرفان کی میٹنگ فکس کروادی۔

میٹنگ میں وہ دونوں ارسلان کی اعلیٰ قابلیت اور شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نے غور سے جنید کا مسئلہ سنا اور عرفان کی دیرینہ خواہش کے بارے میں جان کر بہت خوش ہوا۔ اس نے یقین دلایا کہ جنید ایک ذہین بچہ ہے بس اسے مناسب رہنمائی کی ضرورت ہے۔ البتہ ارسلان نے نرمی سے ان کے گھر آکر حساب پڑھانے کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے انہیں مشورہ دیا کہ اسکول کے بعد رک کر وہ جنید کو یہیں دو گھنٹے کے لیے ٹیوشن پڑھا دیا کرے گا۔ پرنسپل نے بھی اس اقدام کا خیر مقدم کیا اور تھوڑے سے بحث مباحثے کے بعد عرفان اور نادیہ بھی اس کے قائل ہوگئے۔ اگلے ہی دن سے جنید ان سے ہی حساب کی ٹیوشن لینے لگا۔

میٹنگ کے بعد عرفان کو کافی حد تک اطمینان ہوگیا تھا کہ جنید اس بار ٹاپ تھری میں تو لازماً آہی جائے گا۔ نادیہ یہ دیکھ کر خوش تھی کہ سر ارسلان سے ٹیوشن لینے کے بعد جنید کے ٹیسٹ رزلٹس پر اچھا اثر پڑا تھا نیز وہ بھی ہر وقت سر ارسلان کے گن گاتا نظر آتا۔ کچھ عرصہ قبل اس نے سر ارسلان کی فرمائش پر ان کا اسکیچ بھی بنایا تھا جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کمال محض بارہ سالہ بچے کا ہے۔ انہوں نے خود ہی عرفان کو یہ آفر کی تھی کہ وہ جنید کو حساب کے علاوہ دیگر سبجیکٹس بھی پڑھا دیا کرے گا۔ جنید نے بھی تائید کی تھی کہ وہ سر ارسلان سے ہی ٹیوشن پڑھنا چاہتا ہے چنانچہ رفتہ رفتہ انہوں نے جنید کی پڑھائی کی ساری ذمے داری سنبھال لی۔

ششماہی امتحانات میں جنید کی کارکردگی بہترین رہی اور وہ صرف بارہ نمبرز سے تیسری پوزیشن حاصل کرتے کرتے رہ گیا۔ اس کے بعد تو وہ خود بھی سر ارسلان کا مداح ہوگیا اور فائنل میں اوّل آنے کی کوششوں میں جت گیا۔ عرفان اور نادیہ اس کا یہ جنون دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ عرفان کو اب یقین ہو چلا تھا کہ جنید اس کا خواب ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا، اس کے انداز میں عرفان کو اپنی جھلک نظر آتی تھی۔ سر ارسلان نے بھی ان لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں مایوس نہیں کریں گے۔ جنید باقاعدگی سے ٹیوشن لینے لگا تھا۔ واپسی کے لیے نادیہ کو اس نے خود ہی گاڑی بھیجنے سے منع کیا تھا۔ اس کے بقول اب وہ بڑا ہوگیا تھا اور ٹیوشن کے بعد اپنے دوستوں کے ہمراہ کچھ وقت گزار کر وہ خود ہی پانچ بجے تک گھر لوٹ آتا تھا۔ نادیہ نے بھی یہ سوچتے ہوئے اس سے زیادہ باز پرس نہیں کی کہ یہ اس کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ بھی کچھ وقت گزارا کرے۔ اس کے علاوہ وہ جنید کو پہلے سے کافی پُراعتماد محسوس کرنے لگی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح خاموش اور شرمیلا سا جنید نہیں رہا تھا بلکہ آٹھویں جماعت تک آتے آتے خاصا تنک مزاج اور منہ پھٹ ہوگیا تھا۔ غنیمت تھا کہ اس نے

عرفان کے سامنے کبھی کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی ورنہ اس کی شامت یقینی تھی۔ نادیہ نے نوٹس کیا تھا کہ اکثر جنید کے منہ سے کچھ نازیبا الفاظ بھی نکل جاتے جس پر وہ اسے ٹوکتی تو وہ فوراً سوری کر لیتا۔ نادیہ بھی یہ سوچ کر نظرانداز کر دیتی کہ کچھ عرصہ بعد جب کسی معیاری کالج جائے گا تو خود ہی سنبھل جائے گا۔

ایک دن جب نادیہ کچن میں مصروف تھی تو زارا نے اس سے جنید کے رویے کی شکایت کی۔ اس نے زارا کا ٹیڈی بیئر ادھیڑ دیا تھا۔ نادیہ یہ سن کر حیران رہ گئی اور جب اس نے جنید سے باز پرس کی تو وہ جواب دینے کی بجائے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نادیہ سمجھ گئی کہ وہ یہ حرکتیں پڑھائی کی ٹینشن کی وجہ سے کر رہا ہے۔ آج کل وہ شام چھ بجے تک ٹیوشن سے گھر واپس آ رہا تھا۔ عرفان نے اسے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ وہ نویں جماعت میں پہنچ کر سائنس کا ہی انتخاب کرے گا جس کے لیے اسے آٹھویں جماعت میں خوب محنت کرنی تھی۔ نادیہ اس کی پریشانی سے خوب آگاہ تھی اس لیے اس نے زارا کو بھی اس کے چڑچڑے پن کی وجوہات سے آگاہ کیا اور اسے جلد ہی دوسرا ٹیڈی بیئر دلانے کا وعدہ کر لیا۔

رفتہ رفتہ جنید کا رویہ بدلتا جا رہا تھا۔ وہ روز بروز بدتمیز ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے پہل تو نادیہ نے اس کی حرکتیں پڑھائی کی ٹینشن سمجھ کر نظرانداز کیں اور عرفان کو بتانا ضروری نہ سمجھا لیکن ایک روز تو اس کے پیروں تلے زمین ہی نکل گئی۔ وہ بیٹی زارا کو ہوم ورک کروا رہی تھی جبکہ جنید دوپہر کا کھانا کھا کر حسب معمول اسکول میں ہی سر ارسلان سے ٹیوشن لے رہا تھا جب اسے سر ارسلان کی کال ریسیو ہوئی۔ انہوں نے اس کی خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد جب جنید کی خیریت دریافت کی تو نادیہ کو حیرت سی ہوئی، اس نے اچنبھے سے پوچھا۔ ”جنید بھی خیریت سے ہی ہے مگر وہ تو آپ کے پاس ہی ہے۔ آپ اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟“

جواباً دوسری جانب ایک لمحے کو خاموشی چھا گئی پھر سر ارسلان کی حیرت زدہ سی آواز ابھری۔ ”جی؟! آپ کا مطلب ہے کہ جنید میرے پاس بیٹھا ہے۔ نادیہ صاحبہ وہ تو تین روز سے اسکول ہی نہیں آ رہا۔ پرنسپل صاحب ہی کے کہنے پر میں نے آپ کو خیریت معلوم کرنے کے لیے کال کی ہے کہ کہیں اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔“ اس کے آگے بھی وہ کچھ بولتے رہے لیکن فون نادیہ کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ اپنا چکراتا ہوا سر پکڑ کر وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ جنید کو ڈرائیور پابندی سے اسکول چھوڑنے جاتا تھا۔ نادیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈرائیور دونوں بچوں کو اسکول گیٹ پر ڈراپ کیا کرتا تھا۔

نادیہ نے فوراً عرفان کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی جسے سن کر وہ بھی دنگ رہ گیا۔ بغیر کسی تاخیر کے نادیہ نے ڈرائیور سے بھی پوچھ تاچھ کی لیکن اس کا جواب حسب توقع تھا۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے دونوں بچوں کو اسکول ڈراپ کر رہا تھا اس لیے اس کی احساس ذمے داری پر شک کرنا بھی بیکار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں عرفان بھی گھر پہنچ گیا مگر جنید کا ابھی تک کچھ اتا پتا نہ تھا۔

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ جنید زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک لوٹ آتا تھا مگر اس وقت تو گھڑی نو بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔ نادیہ اور زارا رو رو کر بے حال ہوئی جا رہی تھیں جبکہ عرفان پریشانی کے عالم میں جنید کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اس نے جنید کے تمام دوستوں کے گھر بھی فون کروائے تھے لیکن سب نے ہی لاعلمی ظاہر کی تھی البتہ اس کے ایک دوست نے ڈرتے ڈرتے اس کا نام نہ لینے کی شرط پر یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ جنید ضرور نبیل کے ہمراہ اسکول کے پیچھے واقع کچی بستی میں اس کے بڑے بھائی نعیم کے ہوٹل پر ہوگا۔ یہ ساری باتیں سن کر تو ان لوگوں کے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ عرفان نے فی الفور اسی کچی بستی کا رخ کیا جہاں جنید کے پائے جانے کے امکانات موجود تھے۔

وہاں پہنچ کر عرفان جب اپنی گاڑی سے اترا تو بدبو کے بھبکوں نے اس کا استقبال کیا۔ کچرے کے ڈھیر اور وہاں بہتے گندے نالے کے ساتھ ساتھ ہر طرف کچے پکے مکانات بنے تھے۔ کچرے کی اس قدر فراوانی تھی کہ پہلی نظر میں کئی منزلہ بھرے کچرے اور مخدوش مکانات کے بیچ فرق کرنا مشکل تھا۔ مچھروں کی بہتات تھی اور جابجا پڑا کیچڑ اور مویشیوں کا گوبر آپس میں خلط ملط ہو کر اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وہاں کے مکین بھی زیادہ تر مزدور پیشہ تھے اسی لیے دن بھر کی مشقت کے بعد عصر کے مرد زیادہ تر اپنے گھروں کے سامنے چارپائیاں ڈالے اونچی آوازوں میں باتوں میں مصروف تھے یا پیشہ ور مالشیوں سے اپنی مالش کروا رہے تھے۔ عرفان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہاں نوعمر بچے بھی کھلم کھلا سگریٹ نوشی میں مگن تھے۔

عرفان نے گھبرا کر پاس کھڑے قدرے شریف نظر آنے والے لڑکے سے نبیل کے بڑے بھائی کا ہوٹل دریافت کیا تو اس نے جھٹ ایک تنگ سی نظر آنے والی گلی کی طرف اشارہ کردیا۔ وہ بڑی مشکلوں سے جھجکتا، گندے پانی کی چھینٹوں سے خود کو بچاتا، کچرے کے انبار کو پھلانگتا ہوا اس گھٹی ہوئی اور تاریک سی گلی میں پہنچا تو کونے پر واقع ہوٹل کا ماحول دیکھ کر تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ وہ ایک ہوٹل کم اور فحاشی کا اڈہ زیادہ معلوم ہو رہا تھا جہاں شکلوں سے ہی غنڈے موالی نظر آنے والے افراد، بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس اور سستا سا میک اپ کیے کچی عمر کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے شراب نوشی میں مشغول تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں ہوٹل بے باکانہ مردانہ قہقہوں تو کبھی بناوٹی سی نسوانی ہنسی سے گونج اٹھتا۔ وہاں عرفان کو عورتوں کے علاوہ کئی کم عمر لڑکے بھی بیٹھے نظر آئے۔ کسی خیال کے تحت عرفان کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک اٹھیں اور اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ پاس پڑی ایک غلیظ سی کرسی پر ٹک گیا اور پاس سے گزرتے ایک بیرے سے پانی کا گلاس طلب کیا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا چلا گیا۔

دو منٹ بعد وہ پانی لے کر آیا اور اکھڑے لہجے میں بولا۔ "چلو ہمارا ساتھ۔ سیٹھ تم کو بلاتا ہے۔" عرفان جبراً اٹھا اور اپنے آپ کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیا۔ سگریٹ کا دھواں اس قدر تھا کہ سانس لینا دشوار تھا۔ کھلے عام شراب نوشی کے علاوہ برسرِ عام فحش مذاق بھی کیے جا رہے تھے۔ عرفان اس وقت صرف جنید کے بارے میں یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ وہ اس ماحول میں کیسے پہنچ گیا۔ اس کے تو باپ دادا نے بھی کبھی ایسی جگہ کے بارے میں سوچا تک نہ تھا کجا وہاں جانا۔ عرفان جب کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک بدمعاش صورت شخص سگریٹ منہ میں دبائے حساب کتاب میں مصروف تھا۔ عرفان کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ رقم ایک طرف رکھتا ہوا بولا۔ "جی صاحب، بولیے ہم غریب آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ ویسے آپ جیسے معززین کے لیے یہ ہوٹل کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی لیکن بہرحال اپنا اپنا ٹیسٹ ہوتا ہے۔" آخری جملہ مکمل کرتے ہوئے اس نے خباثت سے ایک آنکھ میچی تو عرفان بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پاتا ہوا بولا۔ "کیا تم نبیل کے بڑے بھائی ہو جو بستی کے اسکول میں پڑھتا ہے؟"

عرفان کے اس سوال پر اس بدمعاش نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور تھوڑا متجسس ہو کر بولا۔ "ہاں ہوں تو مگر تم کون ہو؟"

عرفان ایک مرتبہ پھر اس کے منہ پر گھونسا رسید کر دینے کی شدید خواہش کو دباتا ہوا بولا۔ "میرا بیٹا جنید جو تمہارے بھائی کا دوست ہے۔ اس وقت کہاں ہے؟ میں اسے لینے آیا ہوں۔" یہ سن کر عرفان کے چہرے پر پھر ویسی ہی خباثت بھری مسکراہٹ آ گئی اور وہ بڑے اسٹائل سے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتا ہوا بولا۔

"نام تو سنا سنا لگ رہا ہے۔ یہ وہی لڑکا ہے نا بابو جو کسی بڑے انگریزی اسکول سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا ہے۔ ایک بات تو بتاؤ شکل اور کپڑوں سے تو تم پیسے والے لگتے ہو پھر اولاد کے معاملے میں یہ کنجوسی کیوں؟"

عرفان دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا بولا۔ "تم ہوتے کون ہو مجھ سے اس طرح کے سوالات کرنے والے؟ وہ میری اولاد ہے۔ میں اس کے لیے جو بہتر سمجھوں گا وہی کروں گا۔ ابھی مجھے صرف یہ بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟"

عرفان کے تلخ لہجے کو دیکھ کر اچانک اس لڑکے کے بھی تیور بدل گئے اور وہ غرا کر بولا۔ "زبان سنبھال کر بات کرنا بابو۔ یہاں کسی کی مجال نہیں جو فہیم تیزے کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھ بھی سکے۔ تمہارا لحاظ صرف اس لیے کر رہا تھا کہ تمہارا بیٹا نبیل کا دوست ہے ورنہ جس لہجے میں تم نے مجھ سے بات کی ہے اگر کوئی اور کرتا تو اب تک کسی اسپتال میں پڑا اپنے کیے پر پچھتا رہا ہوتا۔"

عرفان اس کے کڑے تیوروں کو نظر انداز کرتا ہوا اسی لہجے میں گویا ہوا۔ "میں یہاں تمہاری بکواس سننے نہیں آیا! مجھے شرافت سے بتا دو کہ کیا میرا بیٹا تمہارے اس گھٹیا ہوٹل میں ہی کہیں موجود ہے؟"

جواباً عرفان صرف اتنا دیکھ سکا کہ فہیم نے چشم زدن میں کسی کو اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ عرفان پلٹتا، کسی نے اس کی گدی پر ایسا کرارا ہاتھ جمایا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے اور اگلے ہی لمحے اس کی کمر پر زوردار لات لگی جس کی وجہ سے وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل کاؤنٹر پر گر گیا جہاں فہیم مزے سے پاؤں پسارے، اس کی درگت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کمینگی بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہوٹل میں بس ایک لمحے کو خاموشی چھائی تھی پھر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے

گویا ان کے لیے یہ روزانہ کا معمول ہو۔

عرفان کے کرتے ہی فہیم نے ہاتھ اٹھا کر رکنے کا اشارہ کیا پھر اسے ادب سے پانی کا گلاس پیش کرتے ہوئے گویا ہوا ”دیکھنے میں تو تم اتنے خرد ماغ نہیں لگتے۔ اب یہ بتاؤ، تمہیں کس نے بتایا کہ تمہارا بیٹا اس وقت یہاں ہے؟“

عرفان اب تک ان لوگوں کا مزاج اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ ان لوگوں سے بھڑ کر وہ صرف اپنا اور جنید کا نقصان کرے گا۔ چنانچہ وہ اپنے بے تحاشا اندتے غصے پر قابو پا کر، اپنی آواز میں حتی المقدور نرمی پیدا کر کے بولا۔ ”دیکھو! میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میرا بیٹا جنید ابھی تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔ مجھے اس کے دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ وہ آج کل نبیل کے ساتھ اکثر اس ہوٹل میں آیا کرتا ہے۔ اگر وہ یہاں ہے تو پلیز اسے بلا دو۔ میں اسے لے کر چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا اور تمہارے اس اڈے کے متعلق پولیس کو بھی کوئی خبر نہیں دوں گا۔“

اس کی بات مکمل ہوتے ہی فہیم ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔ ”بابو، پولیس کی غلط فہمی میں ہرگز مت رہنا! عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ رہی بات تمہارے بیٹے کی تو وہ یہاں نہیں ہے۔ بس! اب تم نے میرا بہت ٹائم کھوٹا کر لیا، اپنا منہ اٹھاؤ اور یہاں سے سیدھے اپنے گھر کا راستہ ناپو۔“

عرفان اس کی بات سن کر سراسیمہ سا ہو گیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟ جب وہ یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں گیا؟ نبیل کو بلاؤ، میں خود اس سے بات کروں گا۔“

فہیم اسے کینہ توز نگاہوں سے گھورتا ہوا بولا۔ ”جب میں نے ایک بار بول دیا کہ تمہارا بیٹا یہاں نہیں ہے تو پھر کیوں مغز ماری کر رہے ہو۔ یقین نہیں آتا تو جاؤ پولیس کو لے آؤ۔ فالتو میں دھندے کا ٹائم خراب کر رہے ہو۔“

جب عرفان وہاں سے کسی طرح نہ ٹلا تو فہیم کے دو جیم شحیم غنڈوں نے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے ہوٹل کے باہر لے جا کر کیچڑ میں پھینک دیا۔ عرفان کے کپڑے اور چہرہ گندگی سے اٹ گئے۔ اس کی درگت پر ہوٹل کے ملازمین اور گاہکوں نے فلک شگاف قہقہے بلند کیے اور بہتوں نے چند بیہودہ اشارے بھی کیے۔ اس بے عزتی کے بعد عرفان وہاں ایک لمحہ بھی نہیں رکنا چاہتا تھا لیکن وہ اولاد کی محبت کے ہاتھوں وہیں کھڑا رہا اور پندرہ منٹ تک اس کی پُر امید نگاہیں وہاں بیٹھے لڑکوں میں جنید کو تلاشتی رہیں۔ وہاں سے ناکام ہو کر وہ مردہ قدموں سے چلتا ہوا اپنی گاڑی تک آیا۔

راہگیروں نے حیرت اور استعجاب بھری نظروں سے اس کے کیچڑ میں سنے وجود کو دیکھا لیکن کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئے۔ عرفان گاڑی چلاتا ہوا اس بستی سے باہر نکل آیا اور پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے گاڑی سائیڈ پر روک دی اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

یہ اشکِ ندامت تھے جو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی اولاد کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ یہ کیسے توقع کر سکتا تھا کہ اس کا بیٹا انگاروں پر چلے لیکن اس کے پیر نہ لہولہان ہوں۔ ظاہر ہے اس اسکول میں جو بچے پڑھتے تھے وہ ایسے ہی پس منظر سے آئے تھے جہاں یہ باتیں روزانہ کا معمول ہوتی ہیں۔ بچوں کے والدین اسی ماحول کا حصہ ہوتے ہوئے اپنے بچوں کی پرورش اس نوعیت کی کرتے ہیں کہ بچے اچھے برے کا فرق جان سکیں جبکہ جنید جس فیملی سے آیا تھا وہاں ایسی باتوں کا کوئی تصور بھی نہ تھا اس لیے وہ آسانی سے بدقماش لڑکوں کی نظروں میں آ گیا۔ اس نے یا نادیہ نے یہ سوچ کر بھی یہ جاننے کی بھی کوشش نہ کی تھی کہ جنید کے دوست کس قسم کے ہیں کیونکہ وہ خود بھی اس تلخ حقیقت سے واقف تھے کہ اسکول کے ماحول میں جہاں بیس فیصد اچھے لڑکے زیرِ تعلیم ہیں وہاں اسی فیصد لڑکوں کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر بدمعاشوں سے تھا۔

جب وہ گھر واپس پہنچا تو نادیہ گیٹ پر ہی لگی تھی۔ عرفان کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر اس نے صبر سے کام لیا اور جنید کے بارے میں کوئی سوال کیے بغیر بیڈروم میں چلی گئی۔ عرفان بھی ہاتھ منہ دھو کر اس کے پیچھے بیڈروم میں آ گیا جہاں نادیہ بستر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس نے تسلی دینے کے لیے نادیہ کے ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تو اس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑوا لیے اور تڑپ کر بولی ”دیکھ لیا اپنی بیجا ضد کا نتیجہ؟ میں پوچھتی ہوں آخر کیا ضرورت تھی سب کچھ جانتے بوجھتے بھی جنید کو ایسے اسکول میں بھیجنے کی جہاں ایسے آوارہ اور بدقماش لڑکے بھی زیرِ تعلیم ہوں لیکن آپ پر تو یہ ضد سوار تھی کہ بیٹے کو ڈاکٹر بنانا ہے۔ جیسے وہ اسی اسکول سے ہی ڈاکٹر بن کر نکلتا! اور پورے شہر میں تو جیسے سارے اسکول ہی ختم ہو گئے تھے نا۔ اس معصوم سی جان کو اپنی ضد، انا اور غصے کی بھینٹ چڑھا کر آپ نے بہت بڑا ظلم کیا ہے عرفان! خدا آپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ہائے! پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہو گا میرا لعل۔“

عرفان مجرموں کی طرح سر جھکائے نادیہ کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی ایک ایک بات تیر کی طرح دل کے پار ہو رہی تھی۔ اسے واقعی اپنے غصے اور اشتعال پر قابو پاتے ہوئے جنید کو کسی اور معیاری اسکول میں داخل کروانے کا... سوچنا چاہیے تھا لیکن وقتی طور پر وہ جذبات کی دھارا میں بالکل بہہ گیا تھا اور اپنی ہی اولاد کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا ڈالا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی کہ اس طرح اس کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہو جائے گی اور جنید بھی اس کے دوست کے بیٹے کی طرح ہر جماعت میں نمایاں رہے گا۔

عرفان اب سنجیدگی سے پولیس میں رپورٹ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ نادیہ نے لپک کر فون اٹھایا اور دوسری جانب سے آنے والی آواز سن کر بیقرار سی ہو گئی۔ ''جنید میرے بچے! کہاں سے بات کر رہے ہو تم؟''

عرفان نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے فون لے لیا۔ دوسری جانب سے جنید کی آواز آ رہی تھی۔ وہ متوحش سے انداز میں جلدی جلدی بات کر رہا تھا۔ ''امی، میں ریلوے چورنگی کے پاس موجود ہوں۔ یہاں پر عابد شو مارٹ کے نام سے ایک دکان ہے، میں وہیں سے بات کر رہا ہوں۔ آپ جلدی سے پاپا کو ادھر بھیج دیجیے۔''

''بیٹا تم وہیں رہنا میں فوراً نکل رہا ہوں۔ تم دکاندار سے میری بات کرواؤ۔'' عرفان کی آواز سن کر جنید ایک لمحے کو خاموش ہو گیا پھر اس نے جی پاپا کہہ کر فون دکاندار کو تھما دیا۔ عرفان نے اس سے دکان کی لوکیشن معلوم کی اور گاڑی کی چابیاں لے کر دوڑا۔ پیچھے سے نادیہ بھی کچھ کہتی رہ گئی شاید وہ بھی ساتھ آنا چاہ رہی تھی۔ مگر عرفان آندھی طوفان کی طرح گاڑی دوڑاتا روانہ ہو گیا۔ ریلوے چورنگی ان کے گھر سے اچھے خاصے فاصلے پر واقع تھی۔ عرفان حیران تھا کہ جنید اتنی دور کیسے پہنچ گیا لیکن یہ وقت سوال جواب کرنے کا نہ تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا تھا اور اسے گلے لگا کر بتانا چاہتا تھا کہ اس کا باپ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔

آدھے گھنٹے کا فاصلہ پندرہ منٹ میں طے کرتا ہوا جب وہ تیز رفتاری سے مطلوبہ پتے پر پہنچا تو اسے جنید دکان کے سامنے ہی کھڑا نظر آیا۔ وہ دور ہی سے گاڑی پہچان گیا تھا اس لیے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ عرفان نے گاڑی سائیڈ پر روکی اور اتر کر دیوانوں کی طرح اپنے بیٹے سے لپٹ گیا۔ جنید جو ذہنی طور پر باپ کے ہاتھوں مرمت کے لیے تیار ہو چکا تھا اس خلافِ توقع ردِعمل کو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ جب سے وہ پچھلے اسکول سے نکال دیا گیا تھا، اس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ عرفان نے جنید کو گلے لگا کر پیار کیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے بھی باپ کی شفقت دیکھ کر آنسو رواں ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں باپ بیٹے ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے جبکہ نادیہ اور زارا جلدی جلدی کھانا لگا رہی تھیں۔ اس کے بعد سب نے مل کر خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔ جنید تو بس عرفان کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر حیران ہی ہوا جا رہا تھا۔ عرفان نے ایک مرتبہ بھی اس سے یہ نہ پوچھا تھا کہ وہ اتنی رات گئے گھر سے اتنی دور کیا کر رہا تھا۔ نادیہ بھی عرفان کی کایا پلٹ پر خوش تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد نادیہ کافی لے آئی۔ کچھ لمحوں بعد عرفان نے کافی پیتے ہوئے بالکل نارمل لہجے میں جنید سے سوال کیا۔ ''کیوں بھئی، آج کل نبیل کے ساتھ تمہاری دوستی کیسی چل رہی ہے؟''

یہ سن کر جنید کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور اس نے خوفزدہ نظروں سے عرفان کی جانب دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے برہمی کے تاثرات نہ دیکھ کر اس نے اٹکتے اٹکتے کہا۔ ''سوری پاپا، نبیل جیسے لڑکے سے دوستی کرنا میری بہت بڑی غلطی تھی۔ آج میں اسے بول آیا ہوں کہ وہ مجھ سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش نہ کرے۔ آئندہ سے میں کلاس میں اس کے ساتھ بیٹھنا بھی بند کر دوں گا۔'' اس دوران عرفان بغور اس کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرتا رہا جو اس کی سچائی کی گواہی دے رہے تھے۔ اب کی بار نادیہ بے چین ہو کر بولی۔ ''مگر بیٹا تم اتنی دیر تھے کہاں اور گھر سے اتنی دور کیسے پہنچ گئے؟''

''امی میں نبیل کے ساتھ اس کی بائیک پر وہاں گیا تھا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے سات بجے سے پہلے پہلے گھر چھوڑ دے گا لیکن کچھ ایسا ہو گیا کہ میں خود وہاں سے... بھاگ آیا۔'' جنید نے اتنا کہہ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے تھے۔ عرفان کے پوچھنے پر اس نے اعتراف کیا۔

''پاپا میں پچھلے تین چار دنوں سے اسکول جانے کی بجائے نبیل اور اس کے دوستوں کے ہمراہ انٹرنیٹ کیفے جانے لگا تھا۔ ہم اپنا سارا دن وہیں گزارتے پھر شام کو وہ مجھے اپنی بائیک پر ہی گھر ڈراپ کر دیا کرتا تھا۔ آپ کے ڈر سے میں نے چند دنوں کے لیے اسکول میں بیماری کی فرضی درخواست بھی دے دی تھی تاکہ میں اطمینان سے مزے

کروں اور پیچھے آپ لوگوں کو بھنک بھی نہ لگ سکے لیکن......"

اس کے آگے زارا نے بات اچک لی۔ "لیکن آج سر ارسلان کا فون آ گیا اور آپ کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔"

جنید شرمندگی سے بولا۔ "نہیں زارا، آج تو میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ نبیل اور اس کے دوستوں کے ساتھ قطعی میل جول نہیں رکھوں گا۔" وہ تھوڑا اسا رکا پھر پھر کر بولا۔ "آج جو ہوا اس کے بعد تو میں زندگی بھر ان کی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔"

نادیہ مزید پوچھنا چاہتی تھی لیکن عرفان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ جنید کچھ یاد کر کے ڈسٹرب سا نظر آ رہا تھا۔ کبھی وہ طیش میں آ کر اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیتا تو کبھی اس کے چہرے پر فکر و تردد کے سائے سے لرز جاتے۔ عرفان اور نادیہ اس کی بدلی ہوئی کیفیت کے پیش نظر سونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زارا ابھی بھائی کے کان مزید کھاتی لیکن نادیہ نے اسے بھی زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا۔

اگلی صبح عرفان حسب معمول فجر پڑھنے کے لیے بیدار ہوا تو جنید کو بھی نماز پڑھتے دیکھ کر اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے نماز پڑھنے کے بعد اپنے لیے چائے بنائی اور لان میں آ کر بیٹھ گیا۔ دس منٹ بعد جنید بھی اس کی ساتھ والی کرسی پر آ کر ٹک گیا۔ عرفان سمجھ گیا کہ وہ ضرور کل ادھوری رہ جانے والی بات مکمل کرنے آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جنید کی خوفزدہ سی آواز ابھری۔ "پاپا اگر میں آپ کو وہ بات بتاؤں گا تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گے نا؟"

عرفان نے اس کے چہرے پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور بولا۔ "ایک مشہور کہاوت ہے کہ جب بیٹا قد میں اپنے باپ کی برابری کرنے لگے تو باپ کو چاہیے کہ وہ اسے اپنا دوست بنا لے۔ میں نے تو تمہیں اپنا دوست تسلیم کر لیا۔ اب تم بتاؤ کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟"

تھوڑی سی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر جنید نے بولنا شروع کیا۔ "نبیل سے میری دوستی ساتویں جماعت میں ہوئی تھی۔ میری اس اسکول میں کسی سے اچھی دوستی نہیں تھی۔ لڑکے مجھ سے کم کم ہی بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے اس ماحول میں مس فٹ سمجھتے تھے۔ میں نے کئی لڑکوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ ایسے میں نبیل میرا ہمدرد اور دوست بن کر سامنے آیا۔ اس کا بھائی فہیم بستی کا نامی گرامی غنڈہ تھا اس لیے کوئی ہمارے منہ لگنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ میں اب اکثر ٹیوشن کے بہانے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر مجھے اچھا لگتا تھا کیونکہ اب لڑکوں پر میرا بھی رعب ہو گیا تھا۔ ہم اپنا رعب جمانے کے لیے اکثر کمزور لڑکوں سے زور زبردستی کر کے لنچ کے لیے لائے گئے ان کے پیسے وغیرہ چھین لیا کرتے تھے اور وہ بیچارے جب ہمارے آگے منتیں کرتے تو مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا۔ میں بھی کبھار نبیل کے ساتھ فہیم بھائی کے ہوٹل بھی چلا جایا کرتا تھا۔"

یہ جملہ سن کر عرفان ایک لمحے کو چونکا کیونکہ وہ اس ہوٹل کا غلیظ ماحول اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا تھا۔ لیکن جنید اس بات سے بے خبر تھا ورنہ ظاہر ہے کہ وہ باپ کے سامنے اس ہوٹل کا ذکر کرنے کی جسارت نہ کرتا۔

جنید اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ "ہم فہیم بھائی کی ہوٹل پر بیٹھ کر مزے سے مفت کی بوتلیں پیتے اور گپیں مارتے۔ پچھلے ہفتے نبیل مجھے ریلوے کالونی میں واقع اپنے دوست کے نیٹ کیفے لے گیا جہاں اس نے مجھے چیٹنگ سکھائی۔ مجھے اس میں بہت مزہ آیا، دو تین روز تک تو میں ٹیوشن سے واپسی پر تھوڑی دیر کے لیے نبیل کے ساتھ وہاں جاتا رہا پھر اسی نے مجھے آئیڈیا دیا کہ میں اسکول میں جھوٹی عرضی دے کر پورا دن وہیں گزاروں۔ مجھے ڈر تو لگا لیکن نبیل نے میری مدد کی اور میں نے کسی طرح آپ کے سائن کی پریکٹس کر کے اسکول میں بیماری کی درخواست دے دی۔ ہم جماعت لڑکے ہماری سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھے لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ ہمارے خلاف کچھ بول سکیں۔ ڈرائیور مجھے اسکول کے گیٹ پر ڈراپ کرتا اور میں دھڑلے سے نبیل کے ہمراہ دوسرے گیٹ سے نکل جاتا اور شام کو اپنے ٹائم پر گھر واپس آ جاتا۔"

کل صبح بھی میں اسی کے ساتھ نیٹ کیفے پر موجود تھا۔ وہاں ہم دونوں کے علاوہ نادر اور فصیح بھی تھے جو نبیل کے علاوہ اب میرے بھی اچھے دوست بن گئے تھے۔ ایک بجے تک تو ہم لوگ مزے سے چیٹنگ میں مصروف رہے پھر لنچ کر کے ہم چاروں سی ویو کی طرف نکل گئے۔ میں نبیل کے ساتھ ہی بائیک پر تھا جبکہ نادر اور فصیح دوسری بائیک پر تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ نادر کی بائیک ایک گلی میں مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ میں نے نبیل کو روکنے کے لیے کہا لیکن اس نے ہنس کر کہا۔ "کوئی بات نہیں وہ لوگ پیچھے ہی ہوں گے۔" بہرحال ہم لوگ سی ویو پہنچ گئے اور واقعی تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بھی ہم سے آ ملے۔ ہم لوگ

وہیں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک فصیح مجھ سے بولا۔ "یار میرے لیے سامنے کھوکھے سے پان تو لادو۔" اتنا کہہ کر جب اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالنے چاہے تو غیر ارادی طور پر میری نظر اس کی جیب پر پڑی اور اس میں رکھی گن کی جھلک دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔

میں نے اس سے گن کے بارے میں دریافت کیا تو وہ نبیل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نبیل کھسیا کر مجھ سے کہنے لگا۔ "کیا ہو گیا یار۔ آج کل شہر کے حالات ہی ایسے ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار ساتھ رکھنے پڑتے ہیں۔" میں اس کی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔ مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا اس لیے مزید سوالات کرنے کی بجائے میں چپ چاپ پان لانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پان کی دکان تھوڑے سے فاصلے پر تھی۔ ان تینوں کی پیٹھ میری جانب تھی اس لیے میں ان کی کارروائیوں پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا۔ میں کافی دیر وہیں کھڑا رہا۔ نادر اور فصیح غصے میں معلوم ہوتے تھے جبکہ نبیل انہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد فصیح نے اپنی جیب سے کچھ پیسے نکالے اور پھر ان تینوں نے وہ پیسے آپس میں بانٹ لیے۔ میرا یقین اب پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

میں پان لے کر لوٹا تو فصیح نے منہ بنا کر اتنی دیر لگانے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے رش کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ ہم لوگ چار بجے تک وہیں بیٹھے رہے پھر وہ دونوں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے جانے سے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں نبیل کو کوئی اشارہ کیا جسے نبیل نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم کچھ دیر تک تو وہیں ٹہلتے رہے پھر ہم بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ واپسی پر نبیل کچھ چپ چپ سا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ میں نے اس کی کیفیت نوٹ کر لی اس لیے خود بھی خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد نجانے کیوں نبیل نے مین روڈ کی جگہ گلیوں کا رخ اختیار کر لیا تو میں مزید خاموش نہ رہ سکا اور اس کی وجہ پوچھی۔ اس نے بتایا کہ شام کو سڑکوں پر ٹریفک جام کی وجہ سے گلیوں سے ہی شارٹ کٹ مارنا ٹھیک رہے گا۔ اب شام ہونے لگی تھی اس لیے میں بھی جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا ورنہ میرا جھوٹ پکڑا جاتا۔ اس لیے میں بھی اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

کچھ دور جا کر نبیل نے ایک سنسان سی گلی میں گھنے درخت کی آڑ میں بائیک روک دی۔ مجھے اب کسی گڑبڑ کا

احساس ہونے لگا تھا اسی لیے سختی سے نبیل سے یہاں چھپنے کی وجہ پوچھی مگر اس نے مسکراتے ہوئے خاموش کروادیا۔ "بس تھوڑی دیر رک جاؤ پھر دیکھنا کیسا مزہ آئے گا! تم اس ایڈونچر کے سامنے تو سب چیٹنگ ڈیٹنگ کے شوق بھی بھول جاؤ گے۔" میں بھی کچھ تجسس اور سنسنی کا شکار ہو کر اس کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ گلی میں دور دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم لوگ یہاں پچھلے دس منٹ سے کھڑے تھے لیکن اِکا دُکا گاڑیاں گزرنے کے علاوہ یہاں سے کوئی نہیں گزر رہا تھا۔ اچانک دور سے کسی ٹھیلے والے کی آواز ابھری وہ غالباً کوئی سبزی والا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز واضح ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے نزدیک آنے لگی، وہ یقیناً ادھر ہی آ رہا تھا۔ نبیل نے اپنی جیب تھپتھپائی اور سیدھا ہو گیا۔ اس نے چٹخارہ سا لیا اور میری جانب دیکھ کر کہا۔ "تیار ہو جاؤ۔ اب آئے گا مزہ!" اس وقت اس کی آنکھیں کسی خیال کے تحت چمک رہی تھیں۔

میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ وہ آخر کیا کرنے والا ہے۔ اسی اثناء میں سبزی والا بھی گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا مسکین سا نظر آنے والا آدمی تھا جو دن بھر کی مشقت کے بعد تھکا ماندہ سا آوازیں لگا رہا تھا۔ نبیل نے اسے ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا گویا وہ اس کے ٹھیلے سے سبزی خریدنا چاہ رہا ہو۔ وہ بےچارہ جلدی جلدی ٹھیلا دھکیلتا ہماری جانب آنے لگا۔ نبیل نے جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اسی لمحے مجھ پر آشکار ہوا کہ نبیل دراصل کرنے کیا والا تھا۔ وہ یقیناً اس غریب آدمی کو لوٹنے والا تھا جو خوشی خوشی اپنی سبزیوں کا ٹھیلا دھکیلتا ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ آج میں نے فصیح کے پاس گن دیکھی تھی اور بعد میں وہ لوگ جو آپس میں پیسے بانٹ رہے تھے وہ بھی ضرور کسی سے چھینی گئی رقم ہو گی۔ یہ لوگ دراصل چھوٹے موٹے قسم کے وارداتیے تھے جو راہ چلتے لوگوں کو لوٹا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کی حقیقت جان کر میرے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔

اتنی دیر میں سبزی والا پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ "بولو صاحب، آپ کو ک۔۔۔" بقیہ الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے کیونکہ نبیل نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ گن نکال کر اس کے پیٹ میں لگا دی۔ گن کو دیکھ کر اس غریب کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ خود میں بھی گنگ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ نبیل غرایا۔

"آواز نکالی تو یہیں تیری قبر بنا دوں گا۔ چپ چاپ کھڑا رہ اور رقم سامنے کھڑے میرے ساتھی کے حوالے کر دے۔" اس آدمی نے خوف سے ایک جھرجھری سی لی اور جیب میں پڑے پیسے نکال کر میری جانب بڑھا دیے لیکن میں پیسے تھامنے کی بجائے آنکھیں پھاڑے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ نبیل نے گن اس کے پیٹ میں چبھوئی اور خونخوار لہجے میں بولا۔ "ہم سے ہوشیاری دکھاتا ہے سالے۔ خفیہ خانے میں پڑے پیسے تیرا باپ دے گا؟" وہ اس وقت بالکل پیشہ ور مجرموں کی طرح بات کر رہا تھا۔

سبزی والا بےچارگی سے گھگھیانے لگا۔ "جانے دو صاحب۔ یہ پیسے آپ رکھ لو! غریب آدمی کے پاس دینے کے لیے اور کچھ نہیں ہے۔" نبیل نے اس کے ہاتھ سے پیسے چھینے اور اس کو ایک جانب دھکا دے دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے سڑک پر گر پڑا۔ نبیل سفاکی سے بولا۔ "یہ ہزار روپے خیرات دے کر تو سمجھ رہا ہے کہ بچ جائے گا۔ اب دیکھ اپنی ہوشیاری کا انجام!" اس کے بعد نبیل نے آگے بڑھ کر اس کا ٹھیلا الٹ دیا۔ ساری سبزیاں سڑک پر بکھر گئیں۔ اسی پر بس نہ کرتے ہوئے اس نے پیر سے دو چار بھاری ضربیں لگا کر اس کے ٹھیلے کو بھی توڑ پھوڑ دیا۔ سبزی والا تو وہیں سڑک پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا اور بے آواز رو رہا تھا۔ پھر نبیل پلٹا اور لپک کر بائیک پر سوار ہو گیا۔ میں بھی کسی روبوٹ کی مانند اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ نبیل دھواں دھار انداز میں بائیک چلاتا ہوا کچھ ہی منٹوں میں وہاں سے دور نکل آیا اور ایک کولڈ اسپاٹ پر بائیک روک کر میری جانب پلٹا۔ "بول جگر۔ ایسا ایڈونچر پہلے بھی کیا ہے؟ تو زیادہ ٹینشن مت لے۔ وہ ٹھیلے والا تو تھانے جا کر ہمارے خلاف رپورٹ بھی درج نہیں کرا پائے گا۔ اگر کرواتا بھی ہے تو اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں اور اگر وہ ثبوت بھی لے آئے تو تھانے والے اس سے شناختی پریڈ کے بہانے تھانے کے اتنے چکر لگوائیں گے کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگا لے گا کہ بھائی میں مجرم پہچانوں کہ اپنی سبزیاں بیچوں اور اگر بالفرض پولیس ہمیں ڈھونڈ کر اندر کر بھی لیتی ہے تو اسی وقت فہیم بھائی اگلے دروازے سے ہمیں ایسے باہر نکال لے جائیں گے کہ کوئی ہماری گرد کو بھی نہ پا سکے گا۔"

میں نبیل کی باتیں سن کر ہکا بکا سا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دوسروں پر اپنی دھونس جما کر خوشی ضرور ملتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں ایسی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث

... ہو جاتا۔ میں اس کی بائیک سے اترا تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے اسے وہیں روک دیا۔ ”نبیل مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اپنے والدین کو دھوکا دے کر میں زندگی کی کتنی بڑی غلطی کر رہا تھا۔ اب میں اپنی دوستی مزید برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یہ ساری حرکتیں میری تربیت اور مزاج سے میل نہیں کھاتیں۔ تم ایک بہت اچھے دوست ہو مگر میں ہی اس قابل نہیں ہوں کہ تمہاری سرگرمیوں میں تمہارا ساتھ دے سکوں۔“

اتنا کہہ کر میں وہاں سے چل پڑا۔ اس نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نہیں رکا اور وہیں قریب میں واقع اس دکان میں گھس گیا جہاں سے بعد میں آپ کو فون کیا تھا۔ نبیل کافی دیر تک مجھے منانے کی کوششیں کرتا رہا لیکن پھر تھک ہار کر چلا گیا۔ جنید نے تھوڑا سا توقف کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پاپا میں آپ دونوں کی تربیت کو بھولا نہیں ہوں بس اسکول کا ماحول ایسا ہے کہ تھوڑا سا بھٹک ضرور گیا تھا۔ پلیز مجھے معاف کر دیجیے!“

عرفان سُن بیٹھا یہ ساری روداد سن رہا تھا۔ اس کا بیٹا جس ذہنی اذیت سے گزرا تھا اس کا تو وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ ذہنی اذیت اس شدید ٹینشن کے علاوہ تھی جو عرفان نے اسے نویں میں سائنسی مضامین کا انتخاب کرنے کے لیے دی ہوئی تھی۔ اس کو اچھے گریڈز اور اپنی انا کی تسکین کے لیے ایسے اسکول میں داخل ہوا تھا جہاں اگر خود وہ پڑھنے جاتا تو دو دن بعد ہی بھاگ نکلتا لیکن جنید نے خاموشی سے اس کی سزا یہ بھی منظور کر لی اور اپنے باپ کی عزت اور دیرینہ خواہش کی خاطر نہ صرف اس اسکول میں پڑھتا رہا بلکہ جی توڑ محنت کر کے سائنس کے مضامین بھی منتخب کرنے کے لیے تیار تھا لیکن عرفان اس کی قربانیوں کے باوجود بھی اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔

بے اختیار عرفان کا دل بھر آیا اور اس نے آگے بڑھ کر جنید کو خود سے لپٹا لیا۔ پچھلے چند گھنٹوں میں ہی اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اپنے بیٹے کو تباہی کے دہانے پر پہنچانے کا ذمے دار وہ اور اس کی خود ساختہ انا ہے۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم کیا اور جنید ان خطرناک معاملات سے بال بال بچ نکلا۔ اس کے لیے یہ سوچنا بھی سوہانِ روح تھا کہ اگر جنید ان کے بچھائے جال میں پھنس جاتا تو کیا ہوتا، اس کا بیٹا تو سیدھے سیدھے اس کے ہاتھوں سے نکل جاتا اور مستقبل میں ڈاکٹر تو دور کی بات ہے، معاشرے کا عزت دار فرد بھی نہ بن پاتا۔

اس کے بعد سب سے پہلا کام تو عرفان نے یہ کیا کہ اسی ہفتے جنید کا داخلہ ایک معیاری اسکول میں کروایا۔ گو سال کے درمیان میں اسکول انتظامیہ نے داخلہ دینے میں کافی پس و پیش سے کام لیا لیکن عرفان نے منہ مانگی فیس اور بھاری رقم ڈونیٹ کر کے اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔ نادیہ نے بھی اس کی کایا پلٹ پر اطمینان کی سانس لی۔ جنید اب خوشی خوشی نئے اسکول جانے لگا اور یہاں پر اس کے کئی دوست بھی بن گئے۔ عرفان کے بے انتہا اصرار پر بالآخر سر ارسلان اسے گھر آکر ٹیوشن دینے پر بھی راضی ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں بعد عرفان کاروبار کے سلسلے میں باہر گیا اور جب وہ بیرونِ ملک سے لوٹا تو گھر والوں کو خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ عرفان اپنے ہمراہ بہترین کوالٹی کے پینٹ برشز، ایزل اور کینوس لانے کے علاوہ خصوصی طور پر اسکیچنگ کے لیے استعمال ہونے والی پنسلیں اور قلم ساتھ لایا تھا۔ ان چیزوں کو پا کر جنید جہاں ہواؤں میں اڑ رہا تھا وہیں اس پر بے یقینی کی سی کیفیت بھی طاری تھی۔

چند ماہ بعد جب جنید کا رزلٹ آیا تو وہ تمام مضامین میں پاس تو ہو گیا تھا لیکن اس کے نمبرز اتنے اچھے نہیں تھے کہ سائنس کا انتخاب کر پاتا۔ اس موقع پر بھی عرفان نے خلافِ توقع طیش کا مظاہرہ کرنے کی بجائے نرمی اور درگزر سے کام لیا اور جنید کو اس بات کی آزادی دی کہ وہ اپنی مرضی اور پسند سے مضامین کا انتخاب کر سکتا ہے۔ جنید کو تو اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک عرفان کے گلے لگ کر روتا رہا۔

آج کل جنید ملک کی بہترین یونیورسٹی سے آرکیٹیکچر کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے جبکہ زارا کیمسٹری میں ماسٹرز کر رہی ہے۔ زارا کی ہی زبانی یہ کہانی مجھ تک پہنچی۔ مجھے سننے میں تو یہ عام سی کہانی لگی لیکن جب میں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو مجھے اپنے آس پاس عرفان جیسے کئی ضدی اور انا پرست والدین نظر آئے جو اپنی اولادوں کو مختلف طریقوں سے اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ اس کہانی کو قلمبند کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ شاید اس کہانی کو پڑھ کر ایسے والدین کو بھی کچھ عقل آ جائے جو اندھادھند اپنی اولادوں کو اپنی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کے لیے قربان کر دیتے ہیں اور بدلے میں ان کے ہاتھ اکثر پچھتاوے ہی لگتے ہیں۔

تیسرا کون

محترم و مکرم معراج رسول
بعض انسان کتنی گری ہوئی فطرت کے حامل ہوتے ہیں یہ میں نے ماسٹر نسیم کو دیکھ کر جانا۔ اس نے کس طرح ایک معصوم لڑکی کی زندگی سے کھیلا یہی میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ پلیز اس واقعے کو سرگزشت میں ضرور لگائیں تاکہ لوگوں کو سبق حاصل ہو۔ میں نے اپنا نام تبدیل کرلیا ہے کیوں کہ میں ایک عزت دار شخص ہوں۔

انور حسین
(سرگودھا)

میں کہانیاں لکھتا ہوں۔

زیادہ تر کہانیوں کے کردار ایسے ہوتے ہیں جن کو دیکھتے دیکھتے کہانیاں بن جاتی ہیں۔ گویا ہر شخص اپنے ساتھ کہانیوں کا بوجھ اٹھائے گھوم رہا ہے۔ موت کی، زندگی کی۔ محبت کی اور نفرت کی کہانیاں۔ بس لکھنے کا ہنر آنا چاہیے۔ کرداروں کو ٹٹولتے جائیں۔ کہانیاں بنتی چلی جائیں گی۔

میں نے کئی دنوں سے کوئی کہانی نہیں لکھی تھی۔ کوئی اچھا پلاٹ سامنے نہیں آیا تھا۔ ایک بے کلی سی تھی جب موڈ بے کیف ہو تو سارا ماحول بے کیف ہو جاتا ہے۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں کچھ لکھوں۔ بس میں سوچتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ کئی پلاٹ ذہن میں آ رہے تھے لیکن سب کو ریجیکٹ کرتا چلا جا رہا ہے کہ کیا لکھوں۔

اپنے محلے میں پہنچا تو محلے کے دوست فخرو نے میرا راستہ روک لیا۔ اب یہاں میں واضح کردوں کہ میرے دوستوں کی کئی کیٹیگری ہیں۔ ایک تو ادبی محفلوں والے دوست ہیں جن کے ساتھ ادب پر باتیں ہوتی ہیں۔ کسی شاعر کو کھنگالا جاتا ہے اور دوسری قسم کے دوست شوبز سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں اداکار، ہدایت کار اور پروڈیوسر وغیرہ ہیں۔ پھر وہ دوست ہیں جو برسوں سے دوست چلے آرہے ہیں اور وہ واقعی دوست ہیں۔ پھر محلے کے دوست ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے ساتھ میں اس محلے میں رہتا ہوں۔

فخرو، عابد، رضا وغیرہ میرے محلے کے دوست تھے۔ یہ سب مختلف جاب کیا کرتے تھے۔ لیکن میرا احترام اس لیے کرتے تھے کہ میں ان سب میں زیادہ پڑھا لکھا تھا اور ان لوگوں کو دنیا بھر کی معلومات دیا کرتا تھا۔ میری کہانیاں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اس لیے وہ یہ سمجھتے کہ میں بہت بڑا بقراط ہوگیا ہوں۔

میں جب ان میں شامل ہوجاتا تھا پھر دانش وری وغیرہ کو ایک طرف رکھ دیتا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر ان ہی جیسی باتیں کرتا۔

یہ سب مجھے محلے میں ہونے والے تازہ ترین واقعات سے بھی آگاہ رکھتے تھے۔

اس محلے میں ایک گھر ماسٹر نسیم کا بھی تھا۔ وہ ایسا آدمی تھا جس نے محلے والوں سے کوئی رسم و راہ نہیں رکھا تھا۔ کسی سے نہیں ملتا تھا۔ کسی سرکاری اسکول میں پڑھایا کرتا۔ اس کو دیکھ کر اس کے سخت مزاج ہونے کا اندازہ ہوجاتا تھا۔

سخت مزاجوں کے چہرے بتا دیتے ہیں کہ اندر سے کتنے بے رحم ہوں گے۔ بہرحال محلے کے ان دوستوں کے سامنے آج کل ماسٹر نسیم ہی کا کیس تھا۔

وہ پچھلے دنوں گاؤں سے شادی کر کے لایا تھا اور صبح اسکول جاتے ہوئے وہ اپنے گھر کے باہر کے دروازے پر تالا لگا دیا کرتا تھا۔ اس لیے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیوی کیسی ہوگی۔ انتہا یہ تھی کہ اس بے چاری کو محلے کی عورتوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہم اکثر یہ سوچا کرتے کہ شاید یا تو وہ بہت خوب صورت ہے یا بہت بدصورت۔ اس لیے ماسٹر نسیم اس طرح

چھپا کر رکھتا ہے۔ ایک آدھ بار میں نے اس کو ماسٹر نسیم کے ساتھ باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ برقعے میں ملبوس۔ صرف اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ انجر بھی ہے اور خوف زدہ بھی۔

کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح چال تھی اس کی۔ بس اس سے زیادہ ہم اس کو نہیں دیکھ پائے تھے۔

''استاد ایک بہت زبردست نیوز ہے میرے پاس۔'' فخرو نے بتایا۔ وہ سب مجھے استاد کہا کرتے تھے۔

''تو پھر آؤ ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ہم ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ جانا پہچانا ماحول، جانے پہچانے لوگ۔ ہیلو ہائے کرتے ہوئے ہم ایک کونے میں آکر بیٹھ گئے۔ فخرو اس وقت بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔

''ہاں اب بتاؤ کیا نیوز ہے کہ تم اتنے بے کل ہو رہے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''استاد میں نے آج اس کو دیکھ لیا۔'' اس نے بتایا۔

''کس کو دیکھ لیا؟''

''ماسٹر نسیم کی بیوی کو۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پتا نہیں آج کس طرح وہ خود ٹھیلے والے سے آلو خریدنے دروازے پر آگئی تھی۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ عام طور پر تو خود نسیم ہی خریدنے آیا کرتا ہے۔''

''ہاں استاد آتا تو وہی ہے شاید اس کی بیوی آئی تھی۔ شاید وہ واش روم میں ہوگا۔''

''کیسی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''بس استاد کیا بتاؤں چاند کا ٹکڑا۔'' فخرو نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس احمق کھڑ کل نے ایسی کون سی نیکی کی ہوگی جو ایسی بیوی نصیب ہوگئی۔''

''یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔'' میں نے کہا۔

''استاد میرا تو جی چاہ رہا ہے کہ زبردستی اس کے گھر میں گھس جاؤں اور جی بھر کر اس کی بیوی کو دیکھتا رہوں۔''

''بکواس مت کرو۔ ایسا کیا تو سیدھے اندر ہو جاؤ گے۔''

ہم اور کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ محلے کے دوسرے دوست بھی آگئے اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ گھر



واپس آکر میں فخرو کی باتوں پر سوچتا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس ماسٹر نسیم پر غصہ آرہا تھا۔ جھنجلاہٹ ہورہی تھی حالانکہ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا اگر اس کی بیوی خوب صورت تھی تو میرا کیا۔ اگر بدصورت تھی تو میرا کیا۔

لیکن یہ شاید انسان کی فطرت ہوتی ہے کہ اگر وہ پہلوئے حور میں لنگور دیکھ لے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔

ایسا مشاہدہ راستہ چلنے میں کیا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی خوب صورت بیوی اپنے بدصورت اور بے ڈھنگے شوہر کے ساتھ گزر رہی ہو تو دیکھنے والے بس یونہی زیرِلب بڑبڑ کرنے لگتے ہیں جیسے ان کو ایسا جوڑا دیکھ کر صدمہ پہنچا ہو۔ حالانکہ دور دور تک ان کو ان سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا۔

شاید ایسی ہی کچھ نفسیاتی صورتِ حال میرے ساتھ بھی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ لڑکیاں میری زندگی میں نہیں آئی ہوں۔ بہت سی آئی تھیں لیکن ایسی کوئی نہیں ملی تھی جو میری زندگی کے سفر یا میرے ساتھ چل سکے۔ بس آکر گزر جانے والی لڑکیاں تھیں۔

جیسے آپ ٹرین کے ڈبے میں کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوں۔ مناظر تیزی سے آتے ہیں اور ہم انہیں جی بھر کر دیکھ بھی نہیں پاتے۔ انجوائے بھی نہیں کرپاتے کہ وہ گزر جاتے ہیں۔

ایسے ہی رفتار سے میرے سامنے بھی لڑکیاں آئی تھیں اور ایک لمحہ جھلک دکھا کر غائب ہوگئیں نہ جانے کہاں۔

بہرحال کئی دن گزر گئے۔ ایک شام ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ایک دوست رضا نے کہا۔ ''استاد! میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟''

''کیسا مشورہ؟''

''تم ایک بار اس لڑکی کو ضرور دیکھ لو۔ فخرو کہتا ہے کہ وہ بہت حسین ہے۔''

''وہ تو ہے۔ لیکن میں کیوں دیکھوں؟''

''اس لیے کہ تمہیں اس سے تحریک ملے گی۔'' رضا نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں شاعر اور ادیب قسم کے لوگ بہت حسن پرست ہوتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر تمہیں نئے نئے خیالات سوجھیں گے۔ تم Excited ہوگے اور اچھی چیزیں تخلیق کروگے (ان دوستوں میں رضا ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اس لیے وہ ایسی باتیں بھی کرلیا کرتا تھا)۔

''میری جان! تم مشورہ تو دے رہے ہو لیکن یہ بتاؤ میں کیسے دیکھوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تم خود ہی کوئی راستہ نکالو۔''

''ایک راستہ ہے۔'' عابد بول پڑا۔ ''تم لوگ تو جانتے ہو کہ میرا بھانجا ایک ناکارہ سا بچہ ہے۔ لکھنے پڑھنے میں دل نہیں لگاتا۔ تم ماسٹر نسیم کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہ شام چار بجے کے بعد گھر پر ہی ہوتا ہے۔''

''اور اس سے کیا کہوں؟''

''اس سے کہو کہ تم ایک بچے کو اس سے ٹیوشن پڑھوانا چاہتے ہو۔'' عابد نے کہا۔ ''تم اس کو یہ بھی بتا سکتے ہو کہ کچھ دنوں تک تم بھی کوشش کرکے دیکھ چکے ہو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائے گا؟''

''نہ مانے، تمہارا یہ مقصد تو نہیں ہے نا تم تو صرف اس کی بیوی کو ایک نظر دیکھنا چاہتے ہو۔''

''بے وقوف جب وہ اتنی پابندی میں رہتی ہے تو پھر دروازے پر کیوں آنے لگی۔'' میں نے کہا۔ ''ماسٹر نسیم اتنا بے وقوف تو نہیں ہے کہ جس کو سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہے اس کو باہر آنے دے۔ اس لیے کوئی اور پلاننگ کرو۔''

''بھائی کوئی اور پلاننگ تو سمجھ نہیں آرہی ہے۔'' رضا نے بے بسی سے کہا۔

''تو بس خاموش ہوجاؤ۔''

کئی دن گزر گئے ایک دن میں چائے پینے کی غرض سے ایک ہوٹل میں داخل ہوا تو وہاں میں نے ماسٹر نسیم کو دیکھ لیا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ کیوں کہ ہمارا محلّہ تو ایک ہی تھا لیکن نہ تو اس نے کسی قسم کی شناسائی کا اظہار کیا اور نہ میں نے کچھ گرم جوشی دکھائی۔ بلکہ ایک طرف جاکر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی چائے ختم کرکے ہوٹل سے باہر چلا گیا اور اس وقت ایک چیخ سنائی دی۔ گاڑیوں کے بریک لگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

شاید کسی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ ہوٹل میں بیٹھے لوگ تیزی سے باہر جانے لگے۔ میں بھی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے ہوٹل سے باہر آگیا۔

وہ ماسٹر نسیم ہی تھا، کوئی بائیک والا اسے مار کر نکل گیا تھا۔ اچھی خاصی چوٹ آئی ہوگی۔ کچھ لوگ اس کے پاس کھڑے ہوئے اس سے ہمدردی کا اظہار کررہے تھے اور بائیک والے کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔

میرے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا میں لپک کر اس

کے پاس پہنچ گیا۔ "ارے نسیم صاحب، کیا ہو گیا۔"
آس پاس کھڑے ہوئے لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ میں اس کو جانتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر آہستہ سے بولا۔ "مار کر بھاگ گیا ہے۔"

"چلیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لیے چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "لوگ ایسے ہی بے حس ہوتے ہیں۔ پروا ہی نہیں کرتے کہ کسی کو مار کر بھاگ جاتے ہیں۔" پھر میں نے ایک آدمی سے درخواست کی کہ "بھائی کوئی ٹیکسی رکواؤ۔ میں ان کو ساتھ لیے جا رہا ہوں یہ میرے ہی محلے کے ہیں۔"

ان لوگوں نے ٹیکسی رکوا دی۔ میں نے کچھ لوگوں کی مدد سے نسیم کو ٹیکسی میں ڈالا اور اسپتال پہنچنے کا کہا۔ نسیم اس دوران ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ شاید اس کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ صرف اس کی کھال پھٹ گئی تھی۔ اس لیے اس کی شلوار خون آلود ہو رہی تھی۔

اسپتال میں، میں نے ٹیکسی والے کی مدد سے نسیم کو اندر پہنچا دیا۔ اپنی جیب سے اس کا کرایہ ادا کر کے اسے رخصت کیا اور ڈاکٹر کے حوالے کر دیا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ فریکچر وغیرہ نہیں ہوا تھا۔ ایک ران کا گوشت پھٹ گیا تھا۔ جس کو ٹانکے لگا دیے ہیں اور مریض گھر جا سکتا ہے۔ بس کچھ دنوں تک احتیاط کرنی ہو گی۔ دوائی کھانی ہو گی۔ زخم بھر جائے تو پھر چلنا پھرنا شروع کر دیں۔

"چلیں اب میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں نہیں میں چلا جاؤں گا۔"

"ارے کیا تکلف کر رہے ہیں۔ میں بھی تو آپ کے محلے میں رہتا ہوں۔ میرا نام آصف ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں نے دیکھا ہے آپ کو۔" اس نے گردن ہلائی۔

"تو پھر چلیں۔ آپ چل نہیں سکیں گے۔"

اس بار وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے ٹیکسی کی اور اس بار بھی کسی کی مدد لے کر اسے ٹیکسی میں بٹھایا اور گھر آ گئے۔

ماسٹر نسیم کے گھر کے پاس ٹیکسی رکوا کر اسے سہارا دے کر اتارا اور اس کے دروازے کے پاس لے آیا۔ میں اس کی کشمکش کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے چابی نکالی۔ تالا کھولا اور اس دوران میں نے دروازے پر زوردار دستک دے دی تھی۔

اور پھر وہ آ گئی۔ وہی اس کی بیوی، فخرو نے اس کی تعریف ذرا کم ہی کی تھی۔ وہ واقعی خوب صورت لڑکی تھی۔ میں اسے جی بھر کر دیکھ نہیں پایا تھا کہ ماسٹر نسیم نے کہا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔ آپ نے بہت مہربانی کی۔ اب میں چلا جاؤں گا۔"

یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میں نے خدا حافظ کہتے ہوئے اس کی بیوی کی طرف دیکھا۔ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔ میرا مکان نمبر ایک سو بارہ ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ماسٹر نسیم اندر جا چکا تھا۔ اس وقت میں نے ایک بات محسوس کی کہ اس کی بیوی کے تاثرات بالکل سپاٹ تھے۔

اسے اپنے شوہر کو زخمی دیکھ کر بھی کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے اس بے چاری کو ایسے شوہر سے کیا دل چسپی ہو سکتی تھی یہ تو اس کی قسمت تھی جس نے اسے ماسٹر نسیم جیسے آدمی کے حوالے کر دیا تھا۔

وہ لڑکی لاکھوں میں ایک تھی۔ میری نگاہوں میں بس کر رہ گئی تھی۔ بہت ہی نیچرل حسن تھا اس کا۔ میک اپ وغیرہ سے بے نیاز اور اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی بلکہ بہت کم تھی۔

سچ یہ ہے کہ وہ لڑکی میرے اعصاب پر چھا گئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ اس کی خوب صورتی تھی اور دوسری وجہ شوہر کی طرف سے اس کا بے نیازانہ رویہ تھا۔

ایک دن ایک عجب بات ہوئی۔ میں ایک مارکیٹ میں کچھ خریدنے گیا تھا کہ اچانک میں نے اس لڑکی کو دیکھ لیا۔ یہ وہی تھی۔ وہی ماسٹر نسیم کی بیوی۔ اس کو بھولنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

وہ کسی اور شخص کے ساتھ تھی۔ یعنی کم از کم وہ ماسٹر نسیم تو نہیں تھا اور اس لڑکی کا انداز بھی بہت بے باکانہ تھا۔

اس نے اس نوجوان کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور دونوں اس طرح چل رہے تھے جیسے میاں بیوی چل رہے ہوں۔

اور یہ بالکل وہی تھی۔ کیوں کہ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی تھی جو اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم وہی ہو جو میرے شوہر کو اٹھا کر لائے تھے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اس کا شوہر تو اسے تالے میں بند کر کے رکھتا تھا۔ جب شوہر کے ساتھ نکلتی تھی تو سیاہ برقع میں لپٹی ہوئی ہوتی تھی اور یہاں کسی کے ساتھ بے پردہ اور بڑی بے نیازی کے ساتھ

گھومتی پھر رہی تھی۔ کیا تھا یہ سب؟

یہ اس لڑکی کا گیسا روپ تھا!

وہ دونوں مارکیٹ سے باہر نکل گئے اور میں نے کچھ فاصلے سے ان کا تعاقب شروع کر دیا لیکن وہ جلد ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

میں نے جب اپنے دوستوں کو یہ واقعہ سنایا تو وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔

"نہیں استاد! تم نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔" عابد نے کہا۔ "وہ بے چاری تو اپنے گھر سے باہر بھی نہیں جھانک سکتی۔ تم نے اس کو مارکیٹ میں کہاں سے دیکھ لیا اور وہ بھی کسی اور کے ساتھ۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ وہی لڑکی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں ایسا بھی نہیں ہوں کہ اس کو پہچان ہی نہیں سکتا اور دوسری بات یہ ہے کہ خود اس نے مجھے رسپانس دیا تھا۔ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔"

"حیرت ہے یار۔" رضا بڑبڑانے لگا۔

"استاد! ایک کام کرتے ہیں کل میں صبح سے دوپہر تک پہرہ دوں گا۔" فخرو نے کہا۔ "اس کے گھر کے سامنے اگر وہ نکلے گی تو پتا چل ہی جائے گا۔"

میں نے بھی ہاں کر دی۔ چونکہ اب مجھے بھی تجسس سا ہو گیا تھا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ لڑکی آخر کس طرح گھر سے باہر نکل کر ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔

دوسرے تیسرے دن فخرو خود ہی ایک بریکنگ نیوز لے کر میرے پاس آ گیا۔ "استاد میں نے پتا چلا لیا۔" اس نے بتایا۔

"کیا پتا چلایا؟" میں نے پوچھا۔

"استاد میں پروگرام کے مطابق ہی پہرہ دے رہا تھا کہ میں نے اس لڑکی کو گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ پوری طرح برقع میں تھی استاد، وہ جیسی اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی ہے۔"

"لیکن وہ گھر سے باہر کیسے نکلی؟" میں نے پوچھا۔ "دروازے پر تو تالا ہوتا ہے۔"

"استاد وہ جو اپنا دھوبی ہے نا کریم، اس کا لونڈا ہے۔ جو گھروں میں کپڑے سپلائی کرتا ہے اور گندے کپڑے لے کر آتا ہے۔ وہی لونڈا ٹھیک دس بجے دیوار کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کوئی آواز نکالی اور اندر سے ایک چابی باہر پھینک دی گئی۔ اس لونڈے نے تالا کھول دیا۔ دروازہ کھلا وہی لڑکی باہر آئی۔ اس نے دھوبی کے بیٹے کو کچھ پیسے دیے اور وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد لڑکی اندر گئی اور کچھ دیر بعد برقع میں باہر آ گئی۔ اس نے تالا لگایا اور ایک طرف چل دی اور تمہارا بھائی اس کے پیچھے پیچھے۔ بہت دور جانے کے بعد وہ لڑکی ماڈل اسکول کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ایک طرف سے ایک گاڑی آئی اور وہ لڑکی اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ یہ کوئی نیا ہی کھیل معلوم ہوتا ہے استاد۔"

"ہاں ہے تو نیا کھیل۔" میں نے پُرخیال انداز میں گردن ہلائی۔ "ویسے فخرو تم نے کمال کر دیا۔ کیا زبردست جاسوسی کی ہے۔"

"بس استاد۔" فخرو انکساری سے بولا۔ "میں نے بھی سوچا کہ آج اس راز سے پردہ ہٹ ہی جائے۔"

"اب یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔ "میں خود دیکھ لوں گا۔"

"ایک بات تو بتاؤ استاد؟ تم اتنے بے کل ہو رہے ہو کہیں اس لڑکی پر دل تو نہیں آ گیا۔"

"کچھ ایسا ہی ہے میرے یار۔ لڑکی ہے ہی اس قابل۔ اس کے علاوہ شاید میرا ایک کام بھی بن جائے۔"

"وہ کون سا کام ہے استاد؟"

"مجھے کہانی لکھنی ہے بہت دنوں سے کوئی اچھا پلاٹ سامنے نہیں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس چکر میں کوئی اچھی کہانی مل جائے۔"

"دیکھ بھال کر کرنا استاد۔" فخرو نے کہا۔ "معاملہ اتنا آسان نہیں لگ رہا۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔"

فخرو نے دھوبی کے جس لڑکے کا ذکر کیا تھا وہ کپڑے دینے اور لینے کے لیے میرے یہاں بھی آیا کرتا تھا۔ جب کہ اس کا باپ اس دوران باہر گدھا گاڑی میں بیٹھا رہتا تھا۔

ایک دن کے بعد جب وہ لڑکا میلے کپڑے لینے کے لیے آیا تو میں نے اسے روک لیا۔ "بات سنو۔"

"جی صاحب۔" وہ حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے دس کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "یہ لو یہ تمہارے لیے ہے۔"

"یہ..... یہ کیوں ہے صاحب؟" وہ کچھ ہچکچا رہا تھا۔

"ارے رکھ لو۔" میں نے کہا۔ "میں ماسٹر نسیم کو نہیں بتاؤں گا کہ اس کی بیوی تمہاری مدد سے گھر سے باہر نکلتی ہے۔"

وہ بری طرح گھبرا گیا تھا۔ "آ..... آپ کو کیسے معلوم صاحب۔"

"میں نے خود دیکھا ہے۔" میں نے بے تکلفی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "لیکن تم گھبراؤ نہیں میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ وہ تمہیں کتنے پیسے دیتی ہے۔"

"پانچ روپے۔" اس نے اعتراف کرلیا۔ "ایک دن میں ان کے گھر کپڑے ڈالنے گیا تھا تو اس نے یہ کہا تھا۔"

"کیا تم روز جاتے ہو؟"

"نہیں ہر دوسرے دن۔" اس نے بتایا۔

"اور تم وہاں جاکر آواز کیا لگاتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"آجانا۔ بس اتنی آواز لگاتا ہوں اور وہ چابی باہر پھینک دیتی ہے۔ اس کے بعد میں وہاں سے چلا جاتا ہوں صاحب۔ میں کچھ نہیں کرتا۔"

"ہاں ہاں گھبراؤ مت میں جانتا ہوں۔ تم کچھ نہیں کرتے۔ اب کب آواز دینی ہے۔"

"کل۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں انعام میں پچاس روپے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہارا کام صرف یہ ہوگا کہ تم جاکر آواز دو گے۔ جب کہ میں ایک طرف کھڑا رہوں گا اور جیسے ہی تمہیں چابی مل جائے تم چابی مجھے دے دینا۔ اس کے بعد نکل جانا۔"

"صاحب ابا بہت مارے گا۔"

"کوئی نہیں مارے گا، شاباش۔" میں نے دس کا ایک اور نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "کل میں ٹھیک وقت پر آجاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے صاحب لیکن ابا کو نہیں بتانا۔"

وہ کپڑے لے کر چلا گیا۔ دوسرا دن میری زندگی میں ایک ایڈونچر لے کر آنے والا تھا۔ میں نے اس قسم کی حرکت کبھی نہیں کی ہوگی لیکن اب نہ جانے کیوں دل چاہ رہا تھا۔

اس میں بدنامی بھی تھی۔ خطرہ بھی تھا۔ اس کے باوجود میں یہ رسک لینے کو تیار تھا۔ میں نے اپنے اس آنے والے ایڈونچر کے بارے میں اپنے دوستوں کو بھی نہیں بتایا۔

دوسرے دن میں دس بجے ماسٹر نسیم کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دور ہی سے نظر آرہا تھا کہ دروازے پر تالا ہے۔ کچھ دیر بعد دھوبی کا لڑکا بھی نمودار ہوگیا۔

میں مکان کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لڑکا کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "گھبراؤ نہیں، شاباش آواز

لوگ وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان ہمدردی اور امداد پر یقین رکھتے تھے کہ بے روزگاروں کو داخلہ دلانے' وزیراعظم کی کوٹھی پر لاتے۔ بارش ہوتی تو لوگ خراب اور بوسیدہ جھونپڑیوں کی مرمت کے ملیے چٹائی' بانس اور ٹین کی چادریں مانگنے آتے۔ ان کے دروازے سے ہر حالت میں لوگوں کی حاجت روائی کی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک برقع پوش خاتون ایک تپ دق کے مریض کو جو غالباً ان کے شوہر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ چند لوگوں کی مدد سے ٹھیلے پر ڈال کر لے آئیں۔ انہیں وزیراعظم کی طرف سے فوراً سینی ٹوریم میں داخل کرایا گیا۔ ایک بہن کو زچہ خانے میں داخلہ نہیں ملا تھا ان کو لوگ لے آئے۔ چند ہی منٹوں میں ایک ایمبولینس کار کے آنے سے پہلے پہلے گیٹ کے باہر دکٹوریہ روڈ پر بغیر کسی قسم کی طبی امداد کے ایک ننھے پاکستانی نے بخیریت جنم لیا۔ واہ کیا شان حکومت اور لیڈری تھی اور رعایا کی کیا کیا توقعات پوری ہوتی تھیں کہیں ملازمت کہیں اسکولوں' کالجوں میں داخلے دلوائے جارہے ہیں۔ کہیں شادی بیاہ کے لیے مالی امداد کی جارہی ہے۔ الحاصل جو کوئی اس دربار میں آیا' فیض یاب ہوکر گیا۔ کسی کی زبان سے اپنے وزیراعظم کے متعلق حرف شکایت نہیں سنا گیا۔ اس زمانے میں لوگ اتنے قانع اور صابر تھے کہ وہ اپنے نوشتۂ تقدیر کو سکون اور صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

لگاؤ۔"

لڑکے نے آواز لگائی۔ "آجانا۔" کچھ دیر بعد اندر سے چابی باہر پھینک دی گئی۔

لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلا کر کہا۔ "بس اب تم چابی دے کر چلے جاؤ اور کسی کو بتانا نہیں۔"

لڑکے نے چابی میرے حوالے کی اور دوڑ لگادی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ بے پناہ خوف بھی تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وجہ سے ماسٹر نسیم آج گھر میں ہو۔ پھر میرا کیا حشر ہونے والا تھا۔

دروازہ کھلا اور وہی لڑکی ماسٹر نسیم کی بیوی سامنے

آ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بھونچکی سی رہ گئی تھی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ دروازہ کھولنے کے بعد کس کی صورت دکھائی دے گی۔

اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کر کے اندر دوڑ جاتی میں نے کہا۔ "بات سنو۔ مجھے ماسٹر نسیم نے بھیجا ہے دھوبی کے لڑکے کو وہ پکڑ کر اپنے ساتھ نہ جانے کہاں لے گیا ہے۔"

میرا یہ کہنے کا مقصد تھا کہ وہ کچھ دیر کھڑی ہو کر میری بات سن لے۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "تمہارے شوہر کو کچھ نہیں معلوم۔"

وہ اچانک پھٹ پڑی۔ "وہ میرا شوہر نہیں ہے۔"

"تو پھر۔" میرے لیے تو یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔ "پھر وہ تمہارا کون ہے؟"

"میں اس کی بیٹی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "بیٹی ہو اس کی؟"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ تم اس کی بیٹی ہو؟"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ میں اس کی بیٹی جیسی ہوں۔" اس نے کہا اور لہراتی ہوئی گر پڑی۔

☆.....☆

میں بڑی مشکلوں سے اسے اٹھا کر اندر لایا اور آنگن پر پڑی ہوئی چارپائی پر ڈال دیا۔ پھر جلدی سے جا کر آنگن کا دروازہ بند کر دیا۔ ذرا سی دیر میں تماشا ہو سکتا تھا۔

ایک طرف ایک مٹکا تھا۔ ایک گلاس بھی تھا۔ میں نے گلاس میں پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے دیے۔ کچھ دیر بعد وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ مکمل ہوش میں تھی۔

"خدا کے لیے چلے جاؤ یہاں سے۔" اس نے کہا۔ "وہ بہت ظالم آدمی ہے۔ ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔" میں بھی کچھ نروس سا ہو رہا تھا۔ "لیکن میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ بھید معلوم کرنا چاہتا ہوں کیا چکر ہے یہ سب۔"

"ٹھیک ہے میں کل آجاؤں گی۔" اس نے کہا۔

"کہاں آؤ گی۔"

"جہاں تم کہو لیکن اس وقت جاؤ یہاں سے اور ہاں جانے سے پہلے ایک نظر اس کی بیوی کو دیکھتے جاؤ۔"

"کیا!" اس کے اس انکشاف نے اور بھی حیران کر دیا تھا۔ "اس کی بیوی ہے؟ اور تم؟"

"میں نے بتایا نا میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔" اس نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ اس کی بیوی اس وقت سو رہی ہے۔"

اس گھر میں دو ہی کمرے تھے اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر دکھایا۔ سامنے چارپائی پر کوئی عورت سو رہی تھی۔

کوئی عورت، جس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہوگی اور بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔

"دیکھ لیا اس کی بیوی کو۔ اب جلدی سے نکل جاؤ۔" اس نے کہا۔ "کل گیارہ بجے میں تم سے ملنے سلور مون میں آجاؤں گی۔"

"سلور مون۔" میں چونک گیا۔ "یہ ریستوران تم نے کہاں سے دیکھ لیا۔"

"یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ کل بتا دوں گی سب کچھ۔" اس نے کہا۔ "تم بھروسے کے آدمی ہو اسی لیے تمہیں بتا رہی ہوں۔ اب جاؤ اور ہاں باہر سے تالا دیتے جانا۔"

میں نے اس کی چابی اس کے حوالے کی اور اس مکان سے باہر آ گیا۔

بہت الجھا ہوا معاملہ تھا۔ لوگ اس لڑکی کو ماسٹر نسیم کی بیوی سمجھ رہے تھے۔ لیکن اس کی بیوی کوئی اور تھی۔ ایک عمر رسیدہ عورت۔

اس لڑکی نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ ماسٹر نسیم کی بیٹی ہے اور ماسٹر نسیم اسے تالے میں کیوں رکھتا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آج تک کسی کو پتا کیوں نہیں چل سکا۔ ماسٹر نسیم کی ایک جوان بیٹی بھی ہے۔ یہ پورا گورکھ دھندا تھا۔

لیکن پہلی بار میں نے ان باتوں کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا ہی نہیں۔ بلکہ اس ہوٹل ہی کی طرف نہیں گیا۔ میں پہلے خود اپنے طور پر اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے وعدے کے مطابق سلور مون پہنچ گئی۔ وہ واقعی ایک دل کش لڑکی تھی۔ کیا تراش تھی اس کی اور چہرے کے نقوش کتنے دل فریب تھے۔ اسی لیے فخرو وغیرہ اور خود میں بھی اس کی ایک جھلک دیکھ کر پاگل ہو گئے تھے۔

ویٹر شاید اسے پہچانتا تھا۔ اس نے قریب آ کر ادب سے سلام کیا۔ اس نے اس کی خیریت معلوم کی۔ پھر ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا۔ اس دوران میں، میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا تم یہاں آتی رہتی ہو؟"

"کئی بار۔ میں یہاں حبیب کے ساتھ آتی ہوں۔"

اس نے بتایا۔

''حبیب کون؟''

''میرا دوست۔'' اس نے بتایا۔ ''اگرچہ مجھے تالے میں بند رکھا جاتا ہے، اس کے باوجود میں نے باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ تم خود ہی دیکھ رہے ہو کہ اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں اور وہ یہ سمجھ رہا ہو گا کہ میں تالے میں بند پڑی ہوئی ہوں۔''

''تم اپنے باپ کے لیے ایسا کہہ رہی ہو؟''

''وہ میرا باپ نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بلکہ وہ میری ماں کا شوہر ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔''

''تم بہت الجھی ہوئی باتیں کہہ رہی ہو۔''

''تم نے جس بیمار اور بوڑھی عورت کو دیکھا تھا وہ میری ماں ہے۔ سگی ماں۔ جب کہ میرے سگے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ ماسٹر میری ماں کا دوسرا شوہر ہے اور چونکہ میرا اماں کے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے اس لیے میں اپنی ماں کے ساتھ جہیز میں آئی ہوں اور ساتھ رہنے پر مجبور ہوں اور وہ میری اس مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہ رہا ہے۔''

''کیا!'' یہ ایک اور شاک تھا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اس نے......''

''ہاں وہ ہم دونوں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔'' لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''ہم اس کے جبر کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے ہیں۔''

پھر اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ میں مختصر طور پر بتا رہا ہوں۔ اس نے بتایا۔

''ہم لوگ اودے پور کے رہنے والے ہیں۔ میرے بابا وہاں کے سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ بہت ایماندار اور شریف آدمی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ میں بچپن ہی سے خوب صورت اور ذہین تھی۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ بابا مجھے اپنے طور پر گھر پر ہی تعلیم دیا کرتے۔ بہت سی کتابیں تھیں میرے پاس۔ یہ جو ماسٹر نسیم ہے، یہ بھی اس اسکول میں ایک ٹیچر تھا اور میں جس حبیب کی بات کر رہی ہوں اس کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ مختصر یہ کہ میں حبیب کو پسند کرنے لگی تھی۔ جب کہ پورا علاقہ اس سے دور بھاگتا تھا۔''

''وہ کیوں؟''

''اس کی حرکتیں بہت غلط تھیں۔ سنا گیا تھا کہ اس کا کردار اچھا نہیں ہے لیکن اس کا گھر میرے گھر کے برابر میں تھا۔ میں روزانہ ہی اسے دیکھا کرتی تھی اس لیے میں اس سے قریب ہوتی چلی گئی۔''

''ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لڑکیاں امربیل کی طرح ہوتی ہیں۔ جو درخت قریب نظر آئے اس سے لپٹ جاتی ہیں۔''

''میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ پھر یہ ہوا کہ اس نے میرے لیے اپنا رشتہ بھیجا۔ ابا نے اس رشتے سے انکار کر دیا ان کو انکار کرنا ہی تھا۔ بہرحال میں بھی خاموش ہو گئی اور کیا کر سکتی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد ابا کا انتقال ہو گیا۔ اچانک سب کچھ ختم ہو گیا اور ایک سناٹا سا زندگی میں رہ گیا۔ ابا ہی گھر کے واحد کفیل تھے۔ ان کے دکھ میں اماں بیمار پڑ گئیں اور ایک دن ماسٹر نسیم نے اپنا رشتہ اماں کے لیے بھیج دیا۔ ہم سہارا ڈھونڈ رہے تھے تو ماسٹر نسیم کی صورت میں ایک سہارا مل گیا تھا اور ہاں حبیب بھی کہیں چلا گیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اماں نے ماسٹر کا رشتہ قبول کر لیا۔ اس دوران ماسٹر کا کراچی ٹرانسفر ہو گیا۔ اس نے کہا کہ وہ واپس آ کر شادی کر لے گا۔ پھر وہ بھی اودے پور سے چلا گیا اور ہم دو سال تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ ہاں اس دوران میں بھی وہ ہمیں خرچ بھیجتا رہا۔ جس سے ہماری ٹھیک ٹھاک گزر ہو جاتی تھی۔ دو سال کے بعد وہ واپس آیا اس نے اماں سے شادی کی اور ہمیں یہاں لے آیا۔ اماں کی بیماری اس دوران اور بڑھ گئی تھی۔ بہرحال یہاں آتے ہی ماسٹر نسیم کا کمینہ پن پوری طرح سامنے آ گیا۔''

''یہاں آ کر پتا چلا کہ اس کم بخت کی نگاہیں تو مجھ پر تھیں۔ وہ مجھے کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے میری اماں سے شادی کر لی تاکہ مجھ پر زور دکھا سکے۔''

''اوہ، بہت ہی افسوس ناک کہانی ہے تمہاری۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن یہ حبیب تمہاری زندگی میں دوبارہ کہاں سے آ گیا؟''

''یہ کلہاڑی خود ماسٹر ہی نے اپنے پاؤں پر ماری ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں بتا چکی ہوں کہ حبیب بہت پہلے اودے پور چھوڑ گیا تھا۔ یہاں آ کر اس نے اپنا کوئی کاروبار سیٹ کر لیا۔ اس کے پاس بہت پیسے آ گئے۔ اتفاقاً ماسٹر سے یہاں اس کی ملاقات ہو گئی۔ ایک جگہ کے رہنے والے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ حبیب نے ماسٹر پر نوازشیں شروع کر دیں کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ میری ماں کی شادی ماسٹر سے ہو چکی ہے۔ جب کہ ماسٹر نہیں جانتا تھا کہ

میں اور حبیب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ چھپ چھپا کر ملتے تھے۔ ایک دن نہ جانے کس موڈ میں ماسٹر اسے گھر لے آیا۔ اس وقت حبیب نے مجھے دیکھ لیا اور اسے معلوم ہوگیا کہ میں ماسٹر کے پاس ہوں۔ ماسٹر نے اسے بتایا ہوگا کہ اس نے بیوہ کو سہارا دینے کے لیے شادی کی ہے۔''

''بہر حال اس کے بعد کی مختصر کہانی یہ ہے کہ حبیب ہی نے میرے لیے تالے کی دوسری چابی بنوائی۔ میں نے دھوبی کے لڑکے کو اس بات کے لیے راضی کیا کہ وہ تالا کھول دیا کرے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔''

''کیا تم نے حبیب کو بتا دیا ہے کہ ماسٹر تم سے کیا چاہتا ہے۔''

''ہاں میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔''

''تو پھر وہ کیا کہتا ہے۔''

''بہت غصہ کرتا ہے۔ بہت افسوس ہے اس کو۔'' لڑکی نے کہا۔ ''لیکن وہ ابھی کچھ کرنہیں سکتا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک دن مجھے اس جہنم سے نکال لے گا۔'' اسے انتظار ہے کہ پہلے ماسٹر کوئی قدم تو اٹھائے جس کو وہ بہانہ بنا کر ماسٹر پر چڑھائی کر دے۔

''تم دونوں کیا ہوٹلوں میں ملتے رہتے ہو؟''

''نہیں، حبیب مجھے اپنے فلیٹ لے جاتا ہے۔ بہت اچھا فلیٹ ہے اس کا۔''

ایک سوال میرے ذہن میں آیا اور وہ سوال میں نے اس سے کر ہی دیا۔ ''یہ بتاؤ کیا حبیب سے.....''

اس کا رنگ اتر گیا کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں پائی۔

''ہاں شاید کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس کی آواز جیسے ڈوبتی جارہی تھی۔

''اب تمہارے ذہن میں کیا ہے تم کیا کرنے جارہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر کہو تو میں پولیس کو اپروچ کروں۔ وہ ماسٹر کے چنگل سے نکال لے گی۔''

''پولیس تک تو میں خود بھی جاسکتی تھی لیکن مجھے اپنی اماں کی فکر ہے۔ وہ ماری جائے گی۔ ماسٹر ایسا ہی آدمی ہے۔''

''تو پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ کوئی تو بات تمہارے ذہن میں ہوگی۔''

''ہاں ہے، حبیب ہی ایک اُمید ہے میرے لیے وہ مجھے اس جنجال سے نکال لے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔''

''خدا کرے کہ تمہاری پریشانیاں ختم ہوجائیں۔ تم اس عذاب سے نکل آؤ۔''

''نہ جانے کیوں عورت کی زندگی میں اتنی تلخیاں کیوں ہوتی ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

مجھے اس پر واقعی بہت افسوس ہورہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے بعد واقعات بہت تیز رفتار ہوگئے۔

ایک دن دھوبی کا لڑکا میرے گھر آگیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو چابی سے تالا کھولا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ جس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''صاحب یہ انہوں نے دیا ہے۔''

''کس نے دیا ہے۔''

''وہی جن کا تالا کھولتا ہوں۔''

میں نے بے تابی سے وہ خط لے لیا۔ اس پر لکھا تھا۔

''جانتے ہیں آپ۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ماسٹر اور حبیب ایک دوسرے کے اس راز میں شریک ہیں۔ میں نے ان دونوں کی گفتگو سن لی ہے۔ ماسٹر جانتا ہے کہ میں حبیب سے ملا کرتی ہوں اور وہ حبیب سے ہر مہینے پیسے لیا کرتا ہے جی ہاں وہی حبیب جس کو میں اپنا محبوب کہتی رہی ہوں۔ وہ دراصل میرے جسم کا خریدار ہے اور ماسٹر جو میری ماں کا شوہر ہے وہ میرا دلال بھی۔ اب میں کس پر اور کیوں بھروسا کروں لیکن مجھے تیسرے کا انتظار ہے۔ وہ آنے والا ہے۔ اسے میں نے بلا لیا ہے وہ آجائے تو میں اس کی ہو کر رہ جاؤں گی ہمیشہ کے لیے۔''

میرے خدا اس خط نے میرے اعصاب درہم برہم کردیے۔ کتنی بدنصیب لڑکی تھی ہر طرف سے اس کے لیے مسئلے تھے۔ اس کی اچھی صورت اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔

لیکن وہ تیسرا کون تھا۔ جس کو اس نے بلا لیا تھا۔

اس کا جواب بھی بہت جلد مل گیا۔ جب محلے والوں نے ماسٹر کے گھر سے چار لاشیں دریافت کرلیں۔ ایک خود ماسٹر کی، دوسری حبیب کی، تیسری اس بوڑھی مجبور عورت کی اور چوتھی اس لڑکی، اس بدنصیب لڑکی کے پاس آنے والا تیسرا موت کا فرشتہ تھا۔

اس نے زہر دے کر سب کو مار دیا ہوگا اور خود بھی زہر کھا کر اپنی کہانی انجام کو پہنچا دی ہوگی۔ تو یہ ہوا اس کہانی کا انجام۔

مجھے ایک کہانی کا پلاٹ تو مل گیا تھا لیکن میں بہت دنوں بعد اس پر کچھ لکھنے کے قابل ہوسکا تھا۔



بھٹکے قدم

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
زیرِ نظر سچ بیانی کافی عرصے سے لکھنے کا سوچ رہی ہوں۔ اس کے تمام کردار نظروں کے سامنے ہیں۔ ہر کردار اپنی جگہ ایک مکمل کہانی ہے پھر بھی میں نے صرف اریبہ کو مرکزیت دی۔ اسی کے واقعات بیان کیے ہیں جو موضوع کے اعتبار سے بھی صحیح ہیں۔
سلمٰی غزل
(مقام نامعلوم)

اسپتال سے نکل کر میں کار میں شہروز کے ساتھ بیٹھ گئی لیکن اپنے دل میں چھپے ہوئے خوف کو میں اس سے چھپانا چاہتی تھی۔ میرا دماغ اب بالکل صحت مند تھا اور ڈاکٹر نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”دیکھیے مسز شہروز آپ اپنے دماغ پر پورا بھروسا رکھیں اور کسی قسم کے خدشات ذہن میں نہ آنے دیں۔ ہر کام میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے۔ آپ سب کچھ بھلا کر آنے والی خوشیوں کے بارے میں سوچیے اپنے شوہر کے بارے میں سوچیے جو آپ کی

بیماری سے کسی قدر پریشان ہیں۔"

میں جو زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوئی تھی نہ کبھی بیمار پڑی تھی یہاں تک کہ اذان کی پیدائش کے وقت بھی نہیں۔ اچانک مجھے لگا جیسے میری قوت ارادی نے میرے ماضی کی یاد کے آگے ایک مضبوط دیوار کھڑی کردی ہو۔ اذان کے بارے میں سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ ڈاکٹر راحیل ایک ماہر نفسیات تھے۔ بے حد دیندار اور خدا پر یقین رکھنے والے۔ انہوں نے ہر مرتبہ مجھے سمجھایا۔ "دیکھو بیٹی تم اذان کے بارے میں اس طرح سوچو کہ یہ ایک امانت تھی جو اللہ نے تمہارے حوالے کی تھی اور پھر جب اللہ نے چاہا اپنی امانت واپس لے لی کہ یہ ہمارے رسول کی سنت کی اتباع ہے۔"

میرے دل و دماغ پر کافی بوجھ تھا لیکن میں ٹھیک تھی۔

"آدھے گھنٹے میں ہم اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے شہروز نے میرا ہاتھ محبت سے دباتے ہوئے کہا اور میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ گھر جانے کے تصور سے مجھے خوف آرہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا یہ سفر کبھی ختم نہ ہو اور میں کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھوں جہاں قدم قدم پر اذان کی یادوں کے نقش بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے کھلونوں اور تصویروں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ کیا میں اپنے بیٹے کو بھلا سکوں گی؟ کیا میں ایک عام انسان کی طرح نارمل زندگی گزار سکوں گی؟ ایسے بے شمار سوالات میرے ذہن میں گردش کررہے تھے اور یہ احساس میری روح میں کچوکے لگا رہا تھا مگر میں شہروز کو دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی جو شوہر سے زیادہ میرے محبوب تھے۔ ان کی رفاقت اور محبت پر مجھے فخر تھا۔ گو اذان ان کا اپنا بیٹا نہیں تھا مگر انہوں نے کسی لمحے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا اور اذان بھی انہیں دیوانہ وار چاہتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا کہ اذان مجھ سے بھی زیادہ شہروز کو چاہتا ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں میری بڑی نند عالیہ منتظر تھی لیکن میرا ذہن ماضی کے دھندلکوں میں بھٹک رہا تھا اور میں ماضی کی غمناک یادوں میں بھٹکتی چلی گئی۔

☆.....☆

مجھے یاد نہیں میری زندگی میں سکھ کا کوئی دن بھی آیا ہو۔ سولہ برس کی تھی تو باپ چل بسا۔ اماں نے بشتم پشتم میری پڑھائی کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ جونہی میں نے B.sc کیا، اماں نے میری شادی کردی حالانکہ میں ابھی اور پڑھ کر اماں کا سہارا بننا چاہتی تھی مگر جانے ان کو کیا جلدی تھی مگر اس جلدی کی وجہ فوراً ہی سمجھ میں آ گئی۔ ان کو گال بلیڈر کا کینسر تھا جس کی وجہ سے وہ میری خوشیاں دیکھے بغیر منوں مٹی تلے جا سوئیں۔ اس وقت مجھے لگا میں دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں مگر میرے شوہر طلال نے مجھے غم کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالنے میں میری پوری پوری مدد کی کیوں کہ اسے معلوم تھا میں ماں بننے والی ہوں۔ ہم دونوں کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ نہ باپ نہ بھائی اور جب الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ سے بیٹے کی نوید ملی تو ہم دونوں نے خود کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کیا۔ ننھے اذان کی آمد نے ہماری زندگی میں خوشیوں کے رنگ بکھیر دیے اور میرے منع کرنے کے باوجود بھی اس نے ادھار قرض لے کر بڑی دھوم دھام سے اذان کا عقیقہ کیا۔ میری خوشیوں کی عمر اتنی مختصر ہوگی یہ میں نہ جانتی تھی اور کاتب تقدیر نے کیا لکھا ہے میرے مقدر میں اس سے بھی لاعلم تھی۔ جس دن میرے بیٹے کی پہلی سالگرہ تھی میرے مقدر کا چاند گہنا گیا۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں طلال اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور میری دنیا اندھیری ہوگئی۔ اگر اذان کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں بھی زندہ لاش بن جاتی لیکن مجھے اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا تھا۔ آفس سے جو واجبات ملے اس سے میں نے لوگوں کا قرض اتارا اور بڑا مکان چھوڑ کر ایک کمرے کے مکان میں اٹھ آئی۔ بیٹھے بیٹھے تو خزانے ختم ہو جاتے ہیں۔ میں نوکری کر سکتی تھی لیکن اذان کو کس کے پاس چھوڑتی۔ میرے لیے اس کے اسکول جانے تک گھر میں ہی کچھ کام کرنا تھا اور پھر اپنی پڑوسن کی مدد سے مختلف گارمنٹ فیکٹریز سے مجھے گھر پر ہی سلائی کا کام ملنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ہنر تھا۔ سلائی اچھی آتی تھی۔ کارخانے کے علاوہ آس پاس کی خواتین نے بھی کپڑے سلوانے شروع کردیے۔ دن رات کی محنت نے زندہ رہنے کا آسرا بنا دیا۔ میں گھر سے باہر نکلنے سے بھی ڈرتی تھی کیوں کہ اکثر طلال جوش جذبات میں آکر کہہ اٹھتے تھے۔ "یہ حسین پری اس غریب خانے میں کیسے آگئی اسے تو کسی محل کی رانی بننا چاہیے تھا۔"

میری گلابی رنگت اور گھنے سیاہ بال مجھے ہر جگہ سب میں ممتاز کردیتے تھے مگر مجھے اس خوب صورتی پر نہ ناز تھا نہ غرور کیوں کہ اماں کی یہ مثال مجھ پر صادق آتی تھی کہ "روپ کی روئے نصیب کی کھائے۔"

میرے نصیب ہی کھوٹے تھے مجھے خوب صورتی کو کیا چاٹنا تھا ہاں بھوکے ننگے انسان کی شکل میں اپنی عزت و عصمت کی حفاظت ضرور کرنی تھی، ان گدھوں سے جو

میرے چاروں طرف تھے۔

میں اپنے مرحوم شوہر کے ان خوابوں کو تعبیر دینا چاہتی تھی جو انہوں نے اذان کے مستقبل کے حوالے سے دیکھے تھے وہ اسے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بنانا چاہتے تھے اور اسے کسی اچھے انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ دلانے کے لیے میرے وسائل محدود تھے بلکہ بعض اوقات تو فاقے کی بھی نوبت آجاتی تھی مگر میں اپنے بیٹے کو کسی احساسِ محرومی کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ تین سال کا ہو رہا تھا۔ اس کی ضروریات بڑھ رہی تھیں۔ اس لیے میں نے نزدیک ہی ایک ٹیلر ماسٹر سے بات کر رکھی تھی جو عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ فطرتاً بھی شریف تھا۔ وہاں سے مجھے شلواریں اور کاج بٹن کا کام مل جاتا تھا۔ اس اضافی آمدنی سے میں اذان کا داخلہ کرانا چاہ رہی تھی۔

☆......☆

آج گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ دو دن کی بارش نے گھر سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مطلع صاف تھا میں اذان کی انگلی پکڑ کر کائنات ٹیلر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اذان چھوٹا ہونے کے باوجود بے حد سمجھدار تھا۔ اس میں بچوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ نہ بے جا ضد کی اور جب راستے چلتے لوگ اس کو پیار کرتے یہ کہہ کر کہ ”کتنا خوب صورت بچہ ہے۔“ تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ اس نے نقش میرے چرائے تھے لیکن اس کی ہیزل گرین آنکھیں اور سنہرے بال بالکل اپنے باپ پر تھے۔

وہ بڑی متانت اور سنجیدگی سے میرے ساتھ چل رہا تھا۔ میں دکان پر پہنچی تو ”دکان سوگ میں تین دن بند رہے گی۔“ لکھا دیکھ کر میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔

”اماں اب کیا ہوگا ہم کیا رات کو بھوکے سوئیں گے؟“ اذان کے سوال نے میری آنکھیں جھلملا دیں۔

”نہیں میرا بیٹا اللہ تعالیٰ کسی کو بھوکا نہیں سلاتا۔“ میں نے اسے پیار کرتے ہوئے آہستہ سے کہا لیکن دل کی جو حالت تھی وہ میں ہی جانتی تھی۔

”ماسٹر صاحب کے والد کی اچانک ڈیتھ ہوگئی ہے اس لیے دکان تین دن بند رہے گی۔“ اچانک ایک آواز کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے مڑ کر دیکھا ایک دراز قد خوش شکل آدمی گاڑی کے پاس کھڑا ستائش بھری نظروں سے اذان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی ملاحت تھی جو دل میں ایک اطمینان کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

”میں اپنی بہن کے کپڑے لینے آیا تھا۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ کے کسی کام آسکوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کی آواز میں خلوص تھا۔ شاید میری مفلوک الحالی چیخ چیخ کر میری ضرورت کا اعلان کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی نرمی اور سکون تھا جیسے میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔

”دراصل ماسٹر صاحب پر میرے کچھ پیسے نکلتے تھے سوچا لے لوں مگر خیر تین دن بعد چکر لگا لوں گی۔“ میں نے دل پر جبر کر کے بے پروائی سے کہا اور آنکھوں میں آئے آنسو اندر ہی اندر اتار لیے کہ اب اذان کو کیا کھلاؤں گی۔

اچانک اذان نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے معصومیت سے کہا۔ ”اماں اگر پیسے نہیں ملے تو ہم رات کھانا کیسے کھائیں گے مجھے تو بڑی بھوک لگی ہے۔“

میں نے چاہا کہ اذان کو بولنے سے روک سکوں مگر تین سالہ بچہ اچانک کچھ کہنے پر تل جائے تو اسے کیسے روکا جاسکتا ہے۔

”میری امی کپڑے سیتی ہیں کیوں کہ میرے ابا اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں لیکن جب میں بڑا ہوجاؤں گا تو امی کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔“ اذان سینہ تان کر بولا۔

”بیٹا چپ ہو جاؤ تم بہت بولتے ہو۔“ میں نے کھسیانی ہو کر اذان کو ڈانٹا۔ اب میری ہمت نہیں تھی کہ اس اجنبی سے نظریں ملا سکوں جس کی آنکھوں میں یقیناً نرمی کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی ہوگی۔ کیوں کہ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ میں بیوہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلائی کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی ہوں۔

”ایک منٹ میری بات سنیں۔“ مجھے روانہ ہوتے دیکھ کر اس اجنبی نے کہا۔

”آپ کے کتنے پیسے ٹیلر ماسٹر پر تھے؟“

”ایک ہزار۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے آپ کا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ مجھے بھی ماسٹر صاحب کو اتنے ہی پیسے دینے تھے، یہ آپ رکھ لیں ماسٹر صاحب کو میں خود بتا دوں گا۔“ اجنبی کا لہجہ جذبات سے بالکل عاری لیکن خوشگوار تھا۔

”نہیں آپ رہنے دیں۔“ میں نے کمزور سا احتجاج کیا کیوں کہ میری ضرورت میری خودداری سے زیادہ بڑی تھی۔

”کمال ہے میں آپ کو کوئی مفت تھوڑی دے رہا

ہوں جو پیسے ماسٹر صاحب کی طرف آپ کے نکلتے ہیں وہ دے رہا ہوں۔ تین دن بعد میں خود آکر انہیں بتا دوں گا بس آپ اپنا نام بتا دیں۔"

"ارے یہ طلال۔" پرس میں پیسے رکھتے ہوئے میرے منہ سے شکریہ کے الفاظ نکل گئے۔ ایک اجنبی کا احسان لینا عجیب ضرور تھا لیکن اس کی نظروں میں ایسی نرمی، پاکیزگی اور وقار تھا کہ مجھے لگا کہ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔

"میرا نام شہروز ہے آیئے میں آپ کو گھر چھوڑ دوں!"

اس نے پیش کش کی مگر میں نے سہولت سے انکار کر دیا۔ جونہی شیڈ سے باہر نکلی گھبرا اٹھی۔ موٹی موٹی بوندوں نے اچانک موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی تھی بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے گھبرا کر اذان میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"میرا خیال ہے آپ کو تکلف نہیں کرنا چاہیے۔" شہروز نرمی سے بولے۔

"دیکھیے شہروز صاحب آپ نہیں جانتے اس معاشرے میں ایک بیوہ عورت کو کس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ دنیا بڑی ظالم ہے، زخموں پر مرہم نہیں رکھتی لفظوں کے تیر چلاتی ہے اور یہ یورپ اور امریکا بھی نہیں جہاں سنگل مرد کو زیادہ احترام اور سہولتیں دی جاتی ہیں۔"

"دیکھیے لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ آپ کا ضمیر صاف ہے تو کیوں دل پر لیتی ہیں۔ بچہ چھوٹا ہے بارش میں بھیگ گیا تو بیمار بھی پڑ سکتا ہے۔ آپ کو اس کی خاطر میری بات مان لینی چاہیے۔" شہروز کے لہجے میں اتنی مضبوطی اور فیصلہ کن کیفیت تھی جو عام مردوں کے لہجے میں نہیں ہوتی ہیں۔ ابھی میں تذبذب میں تھی کہ اتنی دیر میں اذان کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ اب میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

کار چلاتے ہوئے شہروز نے کہا۔ "پیشے کے لحاظ سے میں انجینئر ہوں اور آپ کی طرح سوائے ایک بڑی بہن کے دنیا میں میرا بھی کوئی نہیں۔ میرے خیال میں پہلی ملاقات میں اتنا تعارف کافی ہے۔" اس نے آگے بیٹھے اذان کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

ایک دم اذان نے ایک آئس کریم پارلر کو دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔ "مجھے آئس کریم بہت پسند ہے۔"

"بھئی آئس کریم تو مجھے بھی بہت پسند ہے۔" شہروز نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں ہمارا گھر تو نزدیک ہی تھا۔" میں گھبرا کر بولی۔

"آپ ہی نے تو کہا تھا لوگ باتیں بنائیں گے اس لیے جیسے ہی بارش رکے گی آپ کو گھر سے دور چھوڑ دوں گا۔" آئس کریم پارلر کے آگے گاڑی روکتے ہوئے شہروز نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہم دونوں کی دوستی پکی کیوں کہ میری طرح آپ کو بھی آئس کریم پسند ہے۔" اذان نے خوش ہو کر کہا تو میں حیرت سے اسے تکنے لگی۔ اذان بہت سنجیدہ، کم گو اور بردبار بچہ تھا لیکن آج اس کی سنجیدگی، شوخی اور شرارت میں بدل گئی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کچھ گروسری بھی لے لیں تا کہ آپ کو بارش میں باہر نہ نکلنا پڑے اتنی دیر میں ہم دونوں آئس کریم کھالیں گے اور آپ کو بارش میں باہر نہیں نکلنا پڑے گا۔"

"انکل آئس کریم تو اماں کو بھی بہت پسند ہے۔ آپ ان کو بھی اپنا دوست بنا لیں ناں۔"

اذان کی بات پر شہروز کا قہقہہ بے ساختہ تھا اور مجھے لگا پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد میرے اندر جذباتی اتھل پتھل ہوئی اور...... اور میں زندہ بھی ہوں۔

پھر اکثر شہروز کے اصرار پر نہ چاہتے ہوئے بھی اذان کی وجہ سے مجھے گھومنے پھرنے جانا پڑا۔ کبھی کسی ریسٹورنٹ، کبھی پارک اور کبھی پلے لینڈ۔ اذان، شہروز سے بے حد مانوس ہو گیا تھا اور شہروز بھی صرف اسی کے اشاروں پر چلتا تھا مگر آخر کب تک اس سے پہلے کہ لوگوں کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر اٹھنے لگیں مجھے شہروز کو روکنا پڑا۔

"دیکھیے شہروز صاحب میں نے آج تک کوئی کام چوری چھپے نہیں کیا۔ پورا محلہ میری عزت کرتا ہے۔ طلال کی بیوہ کی حیثیت سے۔ لیکن جب میں اذان کی وجہ سے آپ کے ساتھ جاتی ہوں تو میں چور بن جاتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے میں کوئی جرم کر رہی ہوں وہ بھی لوگوں سے چھپ کر۔ اس لیے پلیز آپ یہاں آنا چھوڑ دیں یوں بھی میں اپنے بچے کو ان آسائشوں کا عادی نہیں بنانا چاہتی جو میں افورڈ نہیں کر سکتی اس لیے پلیز برا نہ مانیں لیکن......"

میرا ادھورا جملہ شہروز نے بیچ سے اچک لیا اور جلدی سے بولا۔ "اگر مگر لیکن چونکہ چنانچہ کی باتیں چھوڑ کر میں

اصل مدعا کی طرف آتا ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو بات میں تم سے کہنے میں جھجک رہا تھا آج اس کو تمہاری وجہ سے زبان مل گئی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میرے جذبات میں ہلچل مچ گئی تھی۔ میں جوان تھی، کم عمر تھی اور شادی کے صرف دو سال بعد بیوہ ہوگئی تھی۔ مجھے احساس ہو چکا تھا۔ محبت میری زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو چکی ہے لیکن میرے سامنے اذان تھا۔ اس کی زندگی اس کا مستقبل اور میں نہیں چاہتی تھی باپ کو تو وہ کھو ہی چکا ہے سوتیلا باپ پا کر کہیں ماں بھی سوتیلی نہ بن جائے۔"

مگر شاید شہروز کو چہرے پر لکھی تحریر پڑھنے میں ملکہ حاصل تھا اس لیے جلدی سے بولا۔ "میں جانتا ہوں تم اذان کی وجہ سے ہچکچاہٹ کا شکار ہو لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں بھی روایتی سوتیلا باپ نہیں بنوں گا کیوں کہ اذان مجھے بھی تم سے کچھ کم عزیز نہیں۔ میں تو خود محبتوں کا ترسا ہوا ایک انسان ہوں مجھے یقین ہے اذان کے لیے میری محبت میں کبھی کمی نہ آئے گی۔"

محبت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر میرے اندر بھی موجزن تھا جس پر اذان کی محبت نے قدغن لگا دی تھی۔ خوشیوں پر میرا بھی حق تھا جو خود چل کر میرے دروازے پر آگئی تھیں۔

☆......☆

شہروز کے ایک دوست کے گھر ہمارا سادگی سے نکاح ہوگیا۔ شادی کی اس سادہ سی تقریب میں اذان ہمارے ساتھ تھا اور بے حد خوش۔ میری تو خواہش تھی کہ شہروز کی بہن عالیہ بھی اس تقریب میں شریک ہوں مگر وہ دوسرے شہر گئی ہوئی تھی اور شہروز انہیں سرپرائز دینا چاہتے تھے۔ ہم ہنی مون پر سری لنکا گئے تو اذان کی موجودگی میں کافی جھجک محسوس کر رہی تھی مگر شہروز نے کسی لمحے بھی اذان کی موجودگی پر پریشانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کی والہانہ محبت اور اذان کے ساتھ وارفتگی پر تو کبھی کبھی مجھے بھی حیرت ہونے لگتی تھی۔

"میں محرومیوں کا شکار بچہ ہوں۔" خود کو بچہ کہنے پر وہ خوب زور سے ہنسا۔ "جب میرے باپ نے اپنی پہلی بیوی کے مرنے پر میری ماں سے دوسری شادی کی تو ان کی ایک بیٹی بھی تھی عالیہ آپی۔ انہی کی پیدائش پر ان کی ماں کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔ پھر جب میری بہن عالیہ 14 سال کی ہوئی تو کافی بگڑ چکی تھی اور انہیں کی خاطر میرے باپ نے میری ماں سے شادی کی تھی۔ میری ماں نے بھی میری بہن کو سوتیلا نہیں سمجھا بلکہ وہ ان کو بے حد چاہتی تھیں لیکن عالیہ آپی ہمیشہ میری ماں سے نفرت کرتی رہیں پھر ایک سال بعد میں پیدا ہوا تو ان کی نفرت کا نشانہ میں بننے لگا کیوں کہ میری ماں بے حد خوب صورت تھیں اور میں ان کا پرتو تھا جب کہ عالیہ آپی کم رو اور بہت موٹی تھیں حالانکہ ان کو گھر میں کبھی کسی نے اس کا احساس نہیں دلایا مگر احساس کمتری نے انہیں اچھے برے کی پہچان بھلا دی تھی۔ میرے ساتھ زیادتی پر امی تو کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن ابو کو برداشت نہیں تھا اس لیے انہوں نے میٹرک کے بعد عالیہ آپی کو بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیا جہاں سے انہوں نے Msc کیا اور جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں امی ابو کی ڈیتھ ہوگئی تو وہ میرے پاس آگئیں۔"

اذان کے سونے کے بعد شہروز نے تفصیل سے جب مجھے بتایا تو میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"یہ تو خیر میرے بچپن کی باتیں تھیں۔ بہرحال اب وہ مجھ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ ممکن ہے میری اچانک شادی سے انہیں شاک لگے لیکن مجھے یقین ہے تم اپنی محبت اور رویے سے ان کا دل جیت لوگی کیوں کہ میرا یہ واحد خون کا رشتہ ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔"

مجھے خود بخود عالیہ آپی سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔

"شہروز آپ فکر نہ کریں میں عالیہ آپی کو پوری طرح خوش رکھنے کی کوشش کروں گی مگر میرا سوال یہ ہے کہ آخر آپ نے ان کی شادی کیوں نہیں کی؟" میں نے خلوص سے پوچھا۔

"امی نے تو بہت چاہا مگر عالیہ آپی پر یہ وہم سوار تھا کہ وہ بدصورت ہیں جب کہ ذہانت میں ان کا کوئی ثانی نہیں مگر ان کی ذہانت غلط سمتوں میں بٹی رہی پہلے ان کا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا اور میڈیکل کالج میں داخلہ بھی ہوگیا تھا مگر پھر ان کا دل اکتا گیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے کر Msc کرلیا۔"

"ان کی شخصیت بکھری بکھری اور تلخ ہے اور ویسے بھی اب تو ان کی شادی کی عمر نکل چکی ہے۔"

☆......☆

عالیہ آپی سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی گو ان کا ظاہری نقشہ شہروز کے بتائے ہوئے نقشے کے عین مطابق تھا لیکن طبعاً وہ بے حد مخلص اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ میں اندر ہی اندر اذان کے لیے ان کے ری ایکشن سے خوف زدہ تھی لیکن جس طرح اور چاہت سے انہوں نے

اذان کو گلے لگایا۔ میری روح اندر تک شانت ہو گئی۔ رشتوں سے محروم اذان تو جیسے ان کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

پھوپو جانی کہہ کر اس کا منہ سوکھتا تھا۔

میری زندگی قابلِ رشک تھی جتنا بھی اپنے رب کا شکر ادا کرتی کم تھا خوب صورت قیمتی اشیاء سے مزین گھر، سر سبز لان، محبت کرنے والے شوہر اور جان چھڑکنے والی نند۔ اللہ نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر دیا تھا اور میں ناشکری نہیں تھی۔ عالیہ آپی اور شہروز کی دل و جان سے خدمت کرتی۔ خاص طور پر اذان کے لیے ان دونوں بہن بھائیوں کی والہانہ محبت دیکھ کر تو میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو جھلملانے لگتے پھر اس دن تو میں نے بے ساختہ اذان کو سینے سے لگا لیا جب میں نے دیکھا وہ ہم دونوں کی تصویر کے آگے کھڑا دعائیں مانگ رہا تھا۔ ''اللہ میاں آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اتنے اچھے ابو دیے ہیں۔ اب انہیں مجھ سے کبھی جدا نہ کرنا۔''

ہم تینوں ایک ہی خاندان کے لگتے تھے اور کوئی بھی اذان کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا نہیں کیوں کہ میرے مرحوم شوہر طلال کی طرح شہروز بھی اونچا لمبا اور بے حد اسمارٹ تھا اور شہروز کا خیال تھا کہ اذان کو دیکھنے کے بعد کوئی ہمیں نیا شادی شدہ جوڑا نہیں سمجھے گا لیکن ہوا یوں کہ ایک دن جب ہم ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے تو شہروز کو ان کا ایک شناسا مل گیا اور اذان کو پیار کرتے ہوئے اس نے حیرت سے کہا۔ ''عجیب گھامڑ انسان ہو شادی کر لی اور مجھے بتایا تک نہیں بلکہ ماشاء اللہ بیٹا بھی اتنا بڑا ہو گیا۔'' شہروز کے بولنے سے پہلے اذان بول اٹھا۔

''انکل میرے امی ابو کی تو ابھی شادی ہوئی ہے اور مجھے تو ابھی ابو ملے ہیں۔''

اذان کی بات پر شہروز کا قہقہہ بے حد جاندار اور بے ساختہ تھا اور اس نے جب اس کو پیار کر کے گلے لگایا تو میرے چہرے سے خجالت غائب ہو گئی اور خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆......☆

ہم سب کی زندگی اذان کے گرد گھوم رہی تھی۔ وہ ایک بے حد مہنگے اسکول میں پڑھ رہا تھا جس کی فیس کے برابر تو میں پورے مہینے میں بھی کما نہ پاتی۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی زندگی خواب کی سی لگتی کہ آنکھ کھلے گی اور پل میں سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔ مجھے تو خیر یاد بھی نہیں تھا کہ یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں لیکن جانے کس طرح شہروز کو میری سالگرہ کا پتا چل گیا اور پھر خاموشی سے دونوں باپ بیٹوں نے عالیہ آپی کے ساتھ مل کر سالگرہ کی تیاری کر لی۔ یہ ون یونٹ گھر تھا۔ تین کمرے اوپر اور ایک نیچے جو عالیہ آپی کے تصرف میں تھا۔ باہر گھومنے جانے کے بہانے سے شہروز نے ہم ماں بیٹے کو اپنی پسند کے کپڑے پہنائے اور جب ہم عالیہ آپی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے نیچے ان کے کمرے میں آئے تو سجا سجایا کیک میرا منتظر تھا۔ اتنی محبت اور اہتمام پر میری آنکھیں بھر آئیں۔ عالیہ آپی نے میری پسندیدہ پرفیوم مجھے دی اور شہروز اذان نے مل کر ایک بے حد مہنگا آٹو میٹک کیمرا دیا جس کی رینج دور تک تھی۔

''بھئی اسے ہم اوپر T.V لاؤنج میں سیٹ کریں گے تاکہ میں آفس سے آ کر تمہاری اور اذان کی سارے دن کی کارکردگی کا جائزہ لے سکوں۔'' شہروز نے شرارت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے آپ ہماری جاسوسی کریں گے۔'' میں نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

''ارے نہیں بھئی جو وقت تمہاری جدائی میں گزرے گا اس سے لطف اندوز ہوں گے۔''

☆......☆

جب انسان خوش ہو تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا، میرا وقت بھی ایک خواب کی سی کیفیت میں گزر رہا تھا۔ اذان اب پانچ سال کا ہو گیا تھا اور میری خواہش تھی کہ ہم دونوں کی محبت کی نشانی بھی کوئی ہو۔ شہروز کو لڑکیاں بے حد پسند تھیں اور وہ اکثر اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ ''بھئی بیٹا تو ایک ہی کافی ہے مجھے ایک بیٹی چاہیے تمہارے جیسی۔''

میری طبیعت کئی دن سے گری گری تھی۔ مجھے شک تو تھا مگر شہروز کو بتائے بغیر میں ٹیسٹ کرانے چلی گئی رپورٹ مثبت تھی۔ میں ماں بننے والی تھی۔ شہروز کو معلوم ہوا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ خوش تو عالیہ آپی بھی بے حد تھیں انہوں نے فوراً میرا صدقہ دیا اور سختی سے کوئی بھی کام کرنے سے منع کر دیا۔

''بھئی سارا دن خالی بیٹھ بیٹھ کر تو میں موٹی ہو جاؤں گی۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''کوئی بات نہیں مجھے موٹی اریبہ بھی پسند ہو گی۔'' شہروز نے شرارت سے میری ناک کھینچتے ہوئے کہا۔

''یار وقت کاٹے نہیں کٹ رہا، پتا نہیں کب پتا چلے گا کہ آنے والا مہمان بیٹی ہے یا بیٹا؟''

''ابو ہمارے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے کیا؟'' اچانک اذان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا اور ہم دونوں ہونق ہو گئے۔ پھر اذان ہی نے بات سنبھالی۔

''یہ بتاؤ بیٹا تمہیں کھیلنے کے لیے بھائی چاہیے یا بہن؟''

''دونوں۔'' اذان نے اطمینان سے جواب دیا اور شہروز کے فلک شگاف قہقہے سے گھر گونج اٹھا۔

''واہ استاد تم نے تو آفریدی کا چھکا لگا دیا اب یہ اللہ میاں پر منحصر ہے، دعا کرو شاید اللہ تمہاری دعا سن لے۔''

''شہروز۔'' میں نے گھور کر دیکھا اور تنبیہ بھی کی۔

''ہاں تو اس میں غلط کیا ہے میرے بیٹے کی خواہش ہے اور پورا کرنا تمہارا کام۔ بھئی اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ہرگز بھی اپنے بیٹے کو مایوس نہیں کرتا۔'' شہروز نے شرارت سے کہا۔

''ابو، امی میری ہر بات مانتی ہیں آپ دیکھ لیجیے گا میرے ساتھ کھیلنے کے لیے دونوں، بہن بھائی آئیں گے میں اللہ میاں سے دعا کروں گا۔'' اذان نے میرے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا اور میں بری طرح جھینپ گئی۔

☆......☆

اللہ تعالیٰ بھی شاید معصوم بچوں کی دعا جلدی سنتا ہے کیوں کہ پانچویں مہینے الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ میں جڑواں بچے ثابت ہو گئے۔ بیٹا اور بیٹی سب بے حد خوش تھے اور اسی دن اذان کی سالگرہ تھی جو میری حالت کے پیشِ نظر شہروز سادگی سے منانا چاہتے تھے مگر عالیہ آپی اس دوہری خوشی کو زیادہ اہتمام سے رکھنا چاہ رہی تھیں اور اس کا انتظام بھی اوپر وہ خود ہی کر رہی تھیں اور مجھے تو انہوں نے ہلنے بھی نہیں دیا۔ اذان بھی بے حد خوش تھا اس نے اپنے ڈھیر سارے دوست بلائے تھے اور ہر بیل کی آواز پر وہ دوڑ کر گیلری میں چلا جاتا اور آنے والے دوستوں کو آوازیں لگا کر اوپر بلانے لگتا۔ اس کا قد لمبا ہو رہا تھا اور گیلری کی گرل چھوٹی تھی اس لیے ہر مرتبہ اس کے دوڑنے پر میں اسے گیلری سے جھکنے پر منع کرتی تھی۔ مجھے واش روم جانا تھا۔ میں شہروز کے سہارے سے جب اپنے کمرے کی طرف بڑھی اسی لمحے گھنٹی کی آواز پر اذان نے گیلری کی طرف دوڑ لگائی۔

''بیٹا جھکنا مت۔'' میں نے چیخ کر کہا کیوں کہ میرے کمرے کے دروازے سے گیلری نظر نہیں آتی تھی مگر دیر ہو چکی تھی اذان کی چیخ سے پورا گھر گونج اٹھا۔ اگر شہروز

انصار ناصری (1912ء۔1997ء)

برصغیر کے ممتاز براڈ کاسٹر اور ریڈیو پاکستان کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، تعلیم سے فراغت کے بعد 1939ء میں آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ ڈراما اور موسیقی میں ملازمت اختیار کی۔ 1947ء میں پاکستان چلے آئے اور ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کر لی اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ انہیں 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہونے والی قائداعظم محمد علی جناح کی تقریر کا اردو ترجمہ کرنے کا اعزاز حاصل تھا جس میں قیام پاکستان کا اعلان کیا گیا تھا اس کے علاوہ انہوں نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔

مرسلہ: ذیشان احمد۔ سکھر

ڈاکٹر مختار احمد انصاری
(1880ء۔1936ء)

برصغیر کی تحریکِ آزادی کے علمبردار اور نامور محب وطن، ضلع غازی پور (یوپی) کے ایک گاؤں یوسف پور میں پیدا ہوئے۔ والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے بنارس سے ایف اے اور ریاستی کالج حیدرآباد دکن سے بی اے کیا۔ پھر لندن سے ایم۔ کے بی اور ایم۔ آر۔ سی۔ پی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں ایک بڑے اسپتال میں ہاؤس سرجن مقرر ہو گئے۔ 1911ء میں انگلستان سے واپس آ کر چاندنی چوک دہلی میں اپنا دواخانہ قائم کیا۔ 1913ء میں برصغیر کا جو طبی وفد ترکی گیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اس کے قائد تھے۔ 1918ء میں ہوم رول لیگ کے نائب صدر بنے اور جب ہوم رول لیگ والنٹیئر کور بنی تو اس کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔ 1919ء میں انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک چلی، اس میں پیش پیش تھے۔ ان دنوں دہلی میں جو زبردست ہڑتالیں ہوئیں ان کی کامیابی کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی ہر ذاتی چیز تحریکِ آزادی پر قربان کر دی۔

مرسلہ: ذیشان احمد۔ سکھر

اور عالیہ آپی مجھے نہ پکڑتے تو شاید میں بھی اپنے بیٹے کے پیچھے گیلری سے چھلانگ لگا دیتی کیوں کہ میرا لختِ جگر خون میں ڈوبا بے حس و حرکت گیلری سے نیچے پڑا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کس طرح نیچے پہنچی۔ مجھے ہوش آیا تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ میں شدید نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو کر تین دن اسپتال میں رہی اور میرا ننھا معصوم اذان منوں مٹی تلے جا سویا۔

اب میری زندگی میں خالی دن اور راتیں تھیں۔ شہروز مجھے گفتگو پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے مگر میری زبان گنگ ہو چکی تھی۔

میں سارا دن صرف یہ سوچتی رہتی تھی کہ اذان مجھ سے کیوں چھین لیا گیا اور اس میں سراسر مجھے اپنا قصور نظر آتا تھا۔ میں ذمہ دار تھی اس کی موت کی۔ میں غریبی میں خوش تھی۔ میں نے بھی اذان کی سالگرہ نہیں منائی اس دولت کی جھنکار نے مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین لی۔

شہروز نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تو میں چیخ پڑی۔

”خدا کے لیے مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کریں۔ آپ میرے دکھ کو سمجھ ہی نہیں سکتے کیوں کہ آپ اس کے سگے باپ نہیں۔“ شہروز کا چہرہ صدمے سے ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس نے ملامت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں نے ان کا دل چکنا چور کر دیا ہے۔ مجھ میں اب ان سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ ذہنی دباؤ کے نتیجے میں ایک مرتبہ پھر میں اسپتال پہنچ گئی۔ ڈاکٹر نے ایک مرتبہ پھر مجھے احساس دلایا کہ میں اپنے ہونے والے بچوں کے بارے میں سوچوں مجھے زندگی میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ خوشگواری کا ایک احساس میری روح میں اتر گیا۔ پھر شہروز اور عالیہ آپی نے جس طرح میرا خیال رکھا اس سے میری روح صحت مند ہو گئی اور اب میں پھر سے اپنے گھر میں تھی۔ نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ۔ دونوں بہن بھائیوں نے میری محبت میں بڑی پریشانی اٹھائی تھی اور اب مجھے اپنے ہونے والے بچوں اور ان دونوں کے لیے خود کو خوش رکھنا تھا۔ میں نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ میں کیبنٹ کھول کر کچھ مصالحہ نکال رہی تھی جب ایک پرچہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔

”ڈی مجھے آپ سے بہت محبت ہے۔“ آپ کا اذان۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں اور میں کرسی پر بیٹھ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا؟“ عالیہ آپی میری حالت دیکھ کر گھبرا کر میری طرف دوڑ پڑیں۔ میں نے خاموشی سے پرچہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

”دیکھیں آپی اذان نے قبر سے مجھے لکھا ہے یہ خط۔ وہ مجھے قبر میں یاد کر رہا ہے۔“ میری کیفیت ہذیانی ہو گئی اور آپی نے کچھ کہے بغیر جوس میں کچھ ملا کر میرے منہ سے لگا دیا۔

”آپی، شہروز کو فون کریں مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔“ میں کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔

اور اذان کی تحریر کو چومتے چومتے کب میں نیند کی آغوش میں چلی گئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی اور شہروز کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

”شہروز دیکھیں اذان کی تحریر۔“ میں نے پرچہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے رونا شروع کر دیا۔

”لیکن یہ تو سادہ ہے۔“ شہروز نے حیرانی سے کہا۔

”شہروز آپی نے بھی تحریر پڑھی تھی اذان کی۔ پوچھ لیں۔“ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اریبہ! کاغذ تو سادہ ہی تھا مگر تمہاری حالت کے پیشِ نظر میں نے تردید نہیں کی۔“ عالیہ آپی نرمی سے بولیں۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں شہروز میں نے خود پڑھا تھا۔“ میں کانپتی ہوئی آواز میں بولی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”لیکن اریبہ میری زندگی ذرا سوچو اذان کو لکھنا کب آتا تھا اور اردو تو بالکل بھی نہیں۔“ میرا سر سہلاتے ہوئے شہروز پیار سے بولے اور صدمے سے میرا رنگ فق ہو گیا۔

”کیا میں پاگل ہو گئی ہوں؟“ مگر مجھے اچھی طرح یاد تھا میں نے تحریر پڑھی تھی اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اذان کو اردو لکھنا بالکل نہیں آتا تھا تو پھر یہ سب کیا تھا؟ میں اس طرح کیسے زندہ رہ سکتی ہوں؟ میں نے شہروز کی نظر بچا کر نیند کی گولیاں ڈھیر ساری منہ میں ڈالنے کی کوشش کی جو شہروز نے چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے ناکام بنا دیں۔

”کیوں کر رہی ہو تم میرے ساتھ ایسا۔ کیوں اس جرم کی سزا مجھے دے رہی ہو جو میں نے کیا ہی نہیں۔ اذان مجھے بھی تم سے کم عزیز نہیں تھا مگر جس کی امانت تھی اس نے لے لی اب تم ان دو جانوں کی فکر کرو جو اللہ تعالیٰ تمہیں دے رہا ہے۔ تم کیوں ناشکری بن رہی ہو۔ بے شک اذان کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکتا مگر یہ بھی تو سوچو یہ حادثہ تو ہونا ہی تھا لیکن ہمارے رب نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ تم کیوں میرا

امتحان لے رہی ہو خدا کے لیے اریہ خود کو سنبھالو کچھ نہیں تو میری محبت کا ہی خیال کرلو۔''

شہروز کی حالت رونے جیسی ہو رہی تھی اور اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں کیا کرنے جا رہی تھی مجھے خود کو سنبھالنا تھا۔ شہروز کے لیے، اپنے ہونے والے بچوں کے لیے۔ میں نے شہروز سے وعدہ کیا کہ اب میں ایسا کچھ نہیں کروں گی بلکہ پہلے سے زیادہ اپنا خیال رکھوں گی۔

☆......☆

عالیہ آپی ہمیشہ سے زیادہ میرا خیال رکھنے لگی تھیں اور مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ میں کمرے میں پڑے پڑے اکتا گئی تھی۔ اس لیے باہر نکلی تو ایک بڑا سرخ غبارہ ریلنگ سے بندھا ہوا تھا جس پر ہم نے اذان کا نام لکھوایا تھا۔

''شہروز جلدی آئیں۔'' میں کمرے کی طرف بھاگی۔

''وہ غبارہ جس پر ہم نے اذان کا نام لکھا تھا ریلنگ سے بندھا ہے۔''

شہروز بھاگتے ہوئے میرے ساتھ آئے لیکن گیلری سنسان تھی۔ ''تمہیں وہم ہوا ہوگا یہاں تو کچھ بھی نہیں۔'' شہروز نے مجھے سمجھایا۔ ''تمہیں یاد ہے وہ غبارہ میں نے اسی دن پھینک دیا تھا۔''

میں نے بے بسی سے شہروز کی طرف دیکھا۔

''اچھا تم پریشان نہ ہو میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں پھر باہر چلیں گے۔'' میں شہروز کے انتظار میں کھڑی تھی کہ اچانک ایک آواز نے میرے بڑھتے ہوئے قدم جکڑ لیے۔

''امی تم کہاں ہو؟'' یہ آواز کسی بچے کی تھی، نہیں یہ آواز میرے اذان کی تھی۔ میں بری طرح سیڑھیوں کی طرف بھاگی لیکن اس سے پہلے شہروز نے مجھے بانہوں میں جکڑ لیا ورنہ اس حالت میں شاید میں سیڑھیوں سے گر ہی جاتی۔

''شہروز آپ نے بھی سنا اذان مجھے بلا رہا ہے اس کی روح یہیں کہیں بھٹک رہی ہے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا تو شہروز عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ''آج انہوں نے مجھ سے کوئی بحث نہیں کی نہ مجھے سمجھانے کی کوشش۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ شہروز بھی مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ انہیں یہ سب میرا وہم لگ رہا ہے۔ شاید میں اپنے حواسوں میں نہیں رہی ہوں۔''

''دیکھو اریہ تمہاری ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے اور تم یہ بات بھی ذہن سے نکال دو کہ میں تمہیں غلط سمجھ رہا ہوں۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا تھا لیکن اس نے بھی یہی کہا کہ جو ہم چاہتے ہیں جو سوچتے ہیں ہمارا شعور ہمیں وہی دکھاتا ہے۔ تم ابھی تک اذان کی یادوں سے باہر نہیں نکلی ہو، تم ماں ہو میں تمہاری حالت سمجھ سکتا ہوں میں ابھی تو تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا کیوں کہ آفس ضروری کام سے جانا ہے واپس آ کر ہم باہر چلیں گے کھانا کھائیں گے اچھی سی مووی دیکھیں گے اور پھر لانگ ڈرائیو پر چلیں گے میں ابھی جاتے ہوئے آپی سے کہہ جاؤں گا کہ تم نیند کی دوا کھا کر سو رہی ہو تمہیں ڈسٹرب نہ کریں تم تھوڑا آرام کر لینا۔''

شہروز کے جانے کے بعد مجھے اذان کے کمرے میں جانے کی شدید خواہش ہونے لگی۔ دونوں بہن بھائی میری حالت کی وجہ سے اس کا کمرا لاکڈ رکھتے تھے لیکن میرے پاس ڈپلیکیٹ چابی تھی۔ آپی یقیناً سمجھ رہی ہوں گی کہ میں نیند کی دوا کھا کر سو رہی ہوں۔ کمرا جوں کا توں تھا۔ اس کے کھلونے، اس کی کتابیں، اس کا آئی پیڈ میرا دل بھر آیا۔ یہ قیمتی تحفہ اس کی چوتھی سالگرہ پر شہروز نے دیا تھا جس پر وہ بڑے شوق سے کارٹون دیکھا کرتا تھا۔ پھر میری نظر اس سرخ غبارے پر پڑی جو میں نے گیلری میں دیکھا تھا اور جسے بقول شہروز ''اس نے پھاڑ دیا تھا'' میں خوف سے کانپنے لگی۔ ''یااللہ! یہ سب کیا ہے میرا وہم یا میرا تصور۔'' غبارے کو چھو کر دیکھا تو اس میں تازہ گیس بھری ہوئی تھی پھر اچانک میری نگاہ سی ڈی پلیئر پر پڑی جس میں ایک سی ڈی بھی لگی تھی۔ لیکن اذان کے پاس تو کوئی سی ڈی پلیئر نہیں تھا یہ یہاں کہاں سے آیا؟'' میں نے بے دھیانی میں اسے آن کیا تو کمرا ایک معصوم اور نرم آواز سے گونج اٹھا۔ ''امی تم کہاں ہو؟''

ایک زوردار چیخ میرے منہ سے نکلی اور دوسرے ہی لمحے آپی کمرے میں تھیں۔ ''تم یہاں کیا کر رہی ہو تمہیں تو اس وقت سونا چاہیے تھا۔''

آپی کے لہجے میں عجیب سی کرختگی اور بے چینی تھی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور خوف کی ایک ٹھنڈی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی ان کی آنکھوں میں شدید نفرت، حسد اور دشمنی نظر آ رہی تھی ان کا چہرہ کرخت اور مسخ لگ رہا تھا۔

''تم نے میرے گھر پر قبضہ جمالیا اس سے پہلے شہروز کی ماں نے میرے باپ پر قبضہ جمالیا تھا۔'' وہ سانپ کی

طرح بھنکار رہیں۔ ”14 برس تک میں اپنے باپ کی آنکھ کا تارہ اور ہتھیلی کا چھالا بنی رہی۔ ساری جائیداد کی تنہا وارث۔ پھر حصہ بنانے تمہارا شوہر آ گیا جس سے مجھے شدید نفرت تھی اور نفرت تو مجھے اس کی ماں سے بھی کچھ کم نہیں تھی اور میں نے چاہا بھی یہی تھا کہ ایکسیڈنٹ میں صرف وہ ہی مرے مگر پتا نہیں کب ابا بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور بریک فیل ہوئے تو دونوں ہی مر گئے۔“

”اب تک میں بے فکر تھی کہ شہروز نے شادی نہیں کی حادثاتی موڑ پر اسے بھی مار دیتی مگر اچانک تم اس کی زندگی میں آ گئیں۔ اپنے بچے کے ساتھ اور اس بچے کے لیے اس کی دیوانگی؟“ میں نے دیکھا تو آپی کا پورا وجود نفرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ نفرت نے انہیں زہریلا بنا دیا تھا۔ مجھے اب کافی کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور میں خوف زدہ تھی کیوں کہ میں تنہا تھی پریگننٹ اور کمزور۔

”شہروز تو آفس چلا گیا ہے اور جب وہ آئے گا تو میں کہہ دوں گی تم نیند کی دوا کھا کر سو رہی ہو اور تم سو جاؤ... گی گہری ابدی نیند ہمیشہ کے لیے زندگی بھر کے لیے۔ اب چپ چاپ اپنے کمرے میں چلو اور جیسا میں کہتی ہوں ویسا کرتی جاؤ۔“

اب میں نے دیکھا ان کے ہاتھ میں بڑا سا چاقو تھا۔

”فوراً چلو۔“ وہ چاقو میری پسلیوں میں لگاتے ہوئے زور سے چیخیں۔ میں شاک کی سی کیفیت میں تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی آپی ہیں۔ خلوص و محبت کا پیکر، جان چھڑکنے والی اور چاہتوں سے بھرپور۔ انہوں نے نیند کی گولیوں سے بھری شیشی اور پانی کا گلاس میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم پہلے بھی ایک مرتبہ کوشش کر چکی ہو جو میرے بے وقوف بھائی نے ناکام بنا دی تھی۔ سب سمجھیں گے اس مرتبہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ اس طرح نہ صرف تم سے بلکہ آنے والے دو سنپولوں سے بھی چھٹکارا مل جائے گا اور شہروز کو تو میں دیکھ لوں گی۔“

”منہ کھولو۔“ وہ زور سے چیخیں اور میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ ”جانتی ہو وہ غبارہ میں نے ہی لگایا تھا اور تمہارے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر لے کر سادہ کاغذ میں نے ہی پکڑوایا تھا کیوں کہ تم تو نیند کی دوا کے زیرِ اثر تھیں اور ری ڈی پلیئر بھی تم سن چکی ہو اب یہ بھی جان لو کہ ریلنگ سے اذان کو دھکا بھی میں نے ہی دیا تھا کیوں کہ برابر والے کمرے کا دروازہ بھی گیلری میں کھلتا ہے۔“

پھر میرے دل سے ہر ڈر اور خوف نکل گیا یاد رہا تو یہ کہ یہ میرے معصوم بچے کی قاتل ہے۔ اس نے اذان کی جان لی ہے۔ میں نے پوری طاقت سے انہیں دھکا دیا اور اچھل کر دروازے کی طرف دوڑی مگر وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور اور پھرتیلی تھیں۔ انہوں نے چھلانگ مار کر مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور چاقو ہوا میں لہرایا اب بچنے کا کوئی چانس نہیں تھا شاید میں خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو شہروز کو خود پر جھکا پایا۔ اگر عین وقت شہروز اپنی وہ فائل جو گھر بھول گئے تھے لینے نہ آتے تو آج میری جگہ میری لاش ہوتی۔

اب جب کہ یہ قصہ ختم ہو چکا ہے اور میں اور شہروز اپنے دونوں جڑواں بچوں بانیہ اور اذان (یہ نام شہروز نے رکھا ہے) کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں تو ماضی کی ہر چیز بالکل صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ شہروز نے ہی بتایا کہ عالیہ کی ماں ذہنی مریضہ تھی اور یہ مرض عالیہ میں بھی پیدائشی تھا مگر میرے باپ نے محبت سے مجبور ہو کر سب سے یہ بات چھپائی تھی میرے پیدا ہونے پر باپ کی توجہ میری طرف مبذول ہوئی تو اس کی نفرت کا گراف ایک دم بڑھ گیا پھر ابو کے بعد میرے ساتھ تنہا رہنے میں اسے مطلق العنانی اور خود مختاری کا احساس ہوا جو تمہارے اور اذان کے آنے سے درہم برہم ہو گیا۔ انہوں نے پہلے معصوم اذان کو راستے سے ہٹایا اور اب ان کا ٹارگٹ تم تھیں۔ وہ غبارہ، وہ سی ڈی پلیئر اور وہ تحریر سب اس سازش کا حصہ تھی کہ کسی طرح تمہیں ذہنی مریضہ بنا دیا جائے اگر آپی اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب ہو جاتیں تو قتل کو با آسانی خودکشی قرار دے دیا جاتا کیوں کہ میں ایک مرتبہ پہلے بھی نیند کی دوا کھا کر خودکشی کی کوشش کر چکی تھی اور اگر چاقو کا حملہ کامیاب ہو جاتا تو خود حفاظتی کا کہہ کر وہ جان بچا لیتیں۔“

شہروز نے تفصیل سے بتایا۔ ”تم جانتی ہو وہ کیمرا جو میں نے لگایا تھا اس نے دو جگہ آپی کا جرم Capture کیا۔ ایک جب وہ کمرے سے نکل کر اذان کو دھکا دے رہی تھیں اور دوسرا چاقو دکھا کر تمہیں دھکیلتی ہوئی کمرے کی طرف لے جا رہی تھیں۔“ اب وہ پاگلوں کے اسپتال میں داخل ہیں اور ان کے ٹھیک ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کاش میں پہلے ہی کیمرا دیکھ لیتا تو خطرہ مزید کم ہو جاتا۔ آپی کا جرم اسی وقت ظاہر ہو جاتا۔

سیاست

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
دفتروں میں کس طرح لوگ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اسی کو میں نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اس لیے میں نے اتنی تفصیل سے لکھا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ روداد آپ کو بھی پسند آئے گی
ہمایوں وحید
(کراچی)



میں جلدی جلدی تیاری کر رہا تھا کیونکہ آج مجھے جاب کے لیے انٹرویو دینا تھا اور یہ اہم انٹرویو تھا جس میں مجھے دوسری بار طلب کیا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع بھی تھا جب مجھے دوسری بار بلایا گیا تھا۔ لازمی بات ہے کہ لسٹ شارٹ ہوگئی ہوگی اور آج صرف ان اُمیدواروں کو بلایا جائے گا جن میں سے کسی ایک کو ملازمت کے لیے چنا جائے گا۔ میں تیار ہو کر آیا تو امی نے ناشتا میرے سامنے رکھا۔ میں نے کہا۔ ''امی آج دل سے دعا کرنا کہ مجھے

جاب مل جائے۔"

"ان شاء اللہ۔" امی نے کہا۔ "تو بھی راستے میں اور انٹرویو سے کچھ پہلے درود شریف ضرور پڑھنا۔"

"جی امی۔" میں نے کہا اور ناشتا شروع کر دیا۔ انٹرویو کے لیے گیارہ بجے بلایا تھا مگر میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے ذرا پہلے پہنچ جاؤں اس لیے پہلے نکل گیا۔ میٹرک کے بعد میں نے ایک آرکی ٹیکٹ اور سول انجینئرنگ فرم میں چھ مہینے بہ طور اپرنٹس کام کیا تھا۔ وہاں سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا مگر میں نے اتنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ مجھے کہیں جاب مل جاتی۔ میں بہ طور ڈرافٹس مین کام سیکھ رہا تھا۔ چھ مہینے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے سیکھنے کا اتنا موقع نہیں مل رہا ہے اس لیے میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ جہاں مجھے اپنے مطلب کی ویکنسی نظر آتی میں سی وی ڈال دیتا تھا۔ کئی جگہ انٹرویو کے لیے بلایا گیا مگر جب انہیں پتا چلتا کہ میرے پاس نہ تو ڈگری ہے اور نہ ہی جاب کا تجربہ تو پھر مجھے کال نہیں آتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے ایس ایس اے نامی فرم سے انٹرویو کے بعد کال آئی۔

دفتر شاہراہ فیصل کی ایک پرانی عمارت میں تھا اور زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی مگر دفتر اچھی طرح ڈیکوریٹ کیا ہوا تھا۔ عملہ بھی خاصا تھا۔ بہ ظاہر کمپنی دیکھنے میں خاص نہیں تھی۔ مگر اس وقت میرے پاس چوائس نہیں تھی مجھے تو جاب چاہیے تھی، چاہے وہ کسی ایک کمرے میں کام کرنے والی کمپنی میں بھی مل جاتی جہاں تین افراد کا عملہ ہو۔ ہاں اگر پانچ سال بعد میں اس جگہ آتا تو شاید اس بارے میں سوچتا۔ میں دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ انٹرویو شروع ہو گئے تھے۔ میں پہلے تو بیٹھ گیا کیونکہ میرا پہلے بھی انٹرویو ہو چکا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ ریسپشن پر بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں میرا نام رہ نہ جائے اس لیے میں ریسپشن والی لڑکی کے پاس آیا۔ "میں انٹرویو دینے آیا ہوں۔"

لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "آپ انٹرویو دینے آئے ہیں تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں پہلے بھی آیا تھا اور میرا خیال تھا کہ آپ نے یاد رکھا ہوگا۔"

"یہاں صبح سے شام تک پتا نہیں کتنے آتے ہیں میں سب کو تو یاد نہیں رکھ سکتی۔" اس نے ترش لہجے میں کہا۔ اس کی عمر پچیس کے آس پاس تھی جب کہ میں ابھی اٹھارہ کا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ مجھ سے سینئر تھی اور میں اس کی سننے پر مجبور تھا۔ "آپ کو آتے ہی بتانا چاہیے تھا۔"

"سوری مجھے خیال نہیں رہا۔" میں نے شرافت سے معافی مانگی تو اس کا دل پسیج گیا اور اس نے کاغذات میں میری سی وی دیکھی۔

"آپ کا نمبر ہو گیا ہے لیکن اب جو لڑکا باہر آئے اس کے بعد آپ جائیں گے۔"

اس وقت مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ انٹرویو کون لے رہا ہے؟ میں نے جھجکتے ہوئے لڑکی سے پوچھا۔ "انٹرویو کون لے رہا ہے۔"

"صفدر صاحب خود لے رہے ہیں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "وہ کمپنی کے مالک ہیں۔"

میں جا کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گزری تھی کہ ریسپشنسٹ نے آواز دی۔ "ہمایوں وحید اب آپ کا نمبر ہے۔"

میری فکر مزید بڑھ گئی۔ مالک خود انٹرویو لے رہا تھا حالانکہ یہ جاب کوئی اونچے درجے کی نہیں تھی بلکہ کام کے لحاظ سے شاید چپڑاسی کے بعد اسی کا نمبر آتا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اگر چپڑاسی بھی رکھنا ہو تو ایس ایس اے کے مالک سید صفدر علی صاحب خود انٹرویو کرتے تھے۔ ان کی فرم زیادہ تر سول انجینئرنگ کا کام کرتی تھی۔ یہاں اسٹرکچر اور کنسلٹنسی اسٹرکچر پر زیادہ کام ہوتا تھا۔ فرم کو آرکی ٹیکٹ فرمز کام دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ سول انجینئرنگ کے ہول سیل ٹھیکے لینے والی بڑی فرمز بھی یہاں سے کام کراتی تھیں۔ صفدر علی صاحب کا اس فیلڈ میں کوئی چالیس سال کا تجربہ تھا اور اتنا ہی عرصہ ہوا جب انہوں نے یہ فرم قائم کی تھی۔ وہ خود سول ڈرافٹس مین تھے اور اس شعبے میں وسیع تجربہ رکھتے تھے مگر ان کی اصل صلاحیت بزنس حاصل کرنا تھا۔ انہوں نے ملک میں بننے والے بڑے بڑے قومی نوعیت کے پروجیکٹس میں کام حاصل کیا اور اسے اچھے انداز میں اسے مکمل کیا کہ ان کی ساکھ بن گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لکھ پتی، کروڑ پتی، ارب پتی بن گئے۔ مگر ان کی سیٹھ والی ذہنیت وہیں کی وہیں رہی تھی۔

یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا اس وقت تو مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ اپنی باری پر میں ان کے کمرے میں آیا۔ شیشے کی دیوار والے اس کمرے میں اندر اے سی کی خنکی تھی جب کہ باقی دفتر میں اے سی نہیں تھا۔ دبلے اور چھوٹے قد کے صفدر

صاحب نے نظر کی عینک کے اوپر سے مجھے دیکھا اور سر کے اشارے سے سلام کا جواب دے کر سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں سامنے بیٹھ گیا۔ وہ میری سی وی دیکھ چکے تھے اور اس میں کچھ نہیں تھا اس لیے انہوں نے انٹرویو کا آغاز کیا۔ مجھ سے ڈرائنگ کے بارے میں پوچھتے رہے اور میں حسبِ توفیق یعنی مجھے جتنا آتا تھا ان کو بتاتا رہا۔ پھر انہوں نے کچھ ڈرائنگ مجھے دکھائیں اور ان کے بارے میں پوچھا۔ یہاں بھی مجھے کچھ آرہا تھا اور کچھ نہیں معلوم تھا۔ پندرہ منٹ میں انہوں نے انٹرویو کرلیا اور پھر پوچھا۔ ''تم منیر صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے ہو؟''

''نہیں سر میں وہاں سیکھنے گیا تھا۔''

''تب چھوڑ کیوں دیا؟''

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''سر میں نے محسوس کیا کہ اب وہاں مجھے مزید سیکھنے کا موقع نہیں ملے گا اس لیے میں نے منیر صاحب کے پاس جانا چھوڑ دیا۔''

''تمہاری کوالی فیکیشن معمولی ہے۔ سرف میٹرک پاس ہو اور متعلقہ ڈگری بھی نہیں ہے۔''

''سر میرا آگے پڑھنے کا ارادہ ہے لیکن میرے گھر کے مالی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لیے میں اب خود کما کر اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہوں۔''

وہ سر ہلانے لگے۔ ایک لمحے کو مجھے لگا انٹرویو ختم ہو گیا ہے اور وہ مجھے جانے کو کہیں گے۔ مگر چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''ہمیں ایک عملی ڈرافٹس مین کی ضرورت ہے یعنی ڈپلومہ ہولڈر جسے سارا کام آتا ہو اور تم...''

وہ بولتے بولتے رک گئے اور میں [illegible] بیٹھا ہوا تھا۔ امی نے درود شریف پڑھنے کو کہا تھا [illegible] بھول گیا تھا مگر اس وقت مجھے یاد آگیا اور میں دل ہی دل میں پڑھنے لگا۔ اچانک صفدر صاحب نے کہا۔ ''اگر تمہیں جاب دی جائے تو تم سیلری کیا لو گے؟''

میں نے ایک بار پھر صاف گوئی [illegible]۔ ''سر مجھے اس سے پہلے کہیں جاب کا تجربہ نہیں ہے اس لیے میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

''اگر میں تمہیں چھ ہزار کی آفر کروں۔''

''تب میں اپنے ابو سے پوچھ کر [illegible]۔'' میں نے جواب دیا۔ وہ بے ساختہ مسکرائے۔

''ابھی تم بڑے نہیں ہوئے ہو کہ [illegible] فیصلے خود کر سکو۔''

''جی سر اور پھر ماں باپ سے بہتر مشورہ دینے والا کون ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے تم مجھے کل تک بتا دو۔'' وہ بولے اور اپنا کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ ''مجھے ڈائریکٹ کال کرنا۔''

میں خوش ہو گیا۔ جاب آفر کے ساتھ میرے لیے یہ بڑی بات تھی کہ کمپنی کا مالک اپنا کارڈ دے کر براہِ راست بات کرنے کو کہہ رہا تھا۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے باہر آیا اور آفس کے ہال سے گزرنے لگا تھا کہ آگے سے نیم گنجے ہو جانے والے آدمی نے مجھے روک لیا۔ اس کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ اچھا گورا رنگ اور مناسب نقوش تھے لیکن چہرے پر ایک طرح کی سختی اور آنکھوں میں بے چینی سی کیفیت تھی۔ ''بڑی دیر لگا دی اندر کیا باتیں ہو رہی تھیں صفدر صاحب سے۔'' اس نے یوں بے تکلفی سے کہا جیسے برسوں سے ہماری جان پہچان ہو۔ میں چند لمحے کے لیے کنفیوز ہوا مگر پھر سنبھل کر پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟''

''لڑکے میں یہاں چیف ڈرافٹس مین ہوں۔'' اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ ''میرا نام ساجد سرفراز ہے۔''

''ہمایوں وحید۔'' میں نے یوں اپنا تعارف کرایا جیسے اس کا نام سن کر مجھے اچھا نہ لگا ہو اور جانے لگا تو اس نے پھر روک لیا۔

''اصل بات تو بتاتے جاؤ اندر کیا ہوا؟''

وہاں موجود تمام ہی افراد ہماری طرف متوجہ تھے۔ میں نے کہا۔ ''یہ آپ صفدر صاحب سے پوچھ لیں۔ مناسب نہیں ہوگا کہ میں اندر کی بات یہاں کہوں۔''

اس سے پہلے وہ جھنجھلا کر پوچھتا میں اس کے پاس سے نکل کر تیزی سے باہر آگیا۔ دیکھا جائے تو میں نے عقلمندی نہیں کی تھی۔ اگر وہ ہی یہاں کا چیف ڈرافٹس مین تھا تو مجھے اسی کے ساتھ کام کرنا تھا اور وہ میرا باس ہوتا اور اپنے باس سے میں نے پہلے ہی دن بگاڑ لی تھی۔ بعد میں میرا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ اس نے آتے ہی میرا پیچھا لے لیا تھا۔ مگر اس کی وجہ پہلے دن ہونے والی گفتگو نہیں تھی۔ میں نے رات ابو سے بات کی۔ مجھے ایسی آفر ہوئی ہے۔ ابو نے کہا۔

''اس سے ایک سوال کرنا کہ کیا وہ کچھ عرصے بعد

تنخواہ بڑھا دے گا اور پھر وہ جو بھی جواب دے تم ہاں کر دینا۔"

میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے جسے سفید پوش بھی کہتے ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ مجھ سے ایک چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی ہے اور مجھ سے بڑا بھائی جو سب سے بڑا بھی ہے مستقل مزاجی سے کوئی کام نہیں کرتا ہے اور جب کچھ کماتا ہے تو وہ سب اسی پر خرچ ہو جاتا تھا یعنی اس کی ذات سے گھر کو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں جو ابھی پڑھ رہی تھیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پورا گھر ابو پر تھا۔ میں بچپن سے دیکھتا آیا ہوں کہ ابو ہمارے لیے کس طرح محنت کرتے ہیں اور اپنی ذات کی قربانی دے کر ہمارے لیے چیزیں لاتے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھنے والی مہنگائی نے ان کی مشکلات بہت زیادہ کر دی ہیں۔ اس لیے میں میٹرک کے بعد اپنی تعلیم کا بوجھ ان پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر میٹرک پاس کو ملازمت بھی کہاں ملتی ہے اور جو ملتی ہے وہ محنت مزدوری کی ملتی ہے اور ہماری پرورش اس طرح ہوئی تھی کہ ہم محنت مزدوری کر نہیں سکتے تھے۔

میں سوچتا رہا کہ ایسا کون سا کام اختیار کروں جس میں آگے بڑھنے کا امکان ہو۔ ان دنوں میں گھر میں ہی آٹو کیڈ سوفٹ ویئر پر کام کر کے دیکھ رہا تھا۔ اس سوفٹ ویئر میں ڈیزائننگ کا کام ہوتا ہے اور اس کی مدد سے ایک گھر سے لے کر ایک خلائی جہاز تک ڈیزائن کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ڈیزائننگ کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والا فرد اس سوفٹ ویئر سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ میں نے اس میں سول انجینئرنگ اور ڈرافٹس مین کا شعبہ دیکھا تو مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے ابو سے کہا کہ مجھے سول ڈرافٹس مین کا کام سکھانے کے لیے کہیں داخل کرا دیں۔ منیر صاحب ابو کے جاننے والوں میں سے تھے۔ ان کی سول انجینئرنگ اینڈ آرکیٹیکٹ فرم تھی۔ ابو نے مجھے ان کے پاس بہ طور اپرنٹس رکھوا دیا۔ چھ مہینے بعد میں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور جاب تلاش کرنے لگا۔ ابو خود ملازم پیشہ آدمی تھے اور انہیں دفتروں میں ہونے والی سیاست کا اچھی طرح علم تھا۔ انہیں بھی حیرت تھی کہ مجھے یہ جاب کیسے آفر ہوئی جب کہ میں اس کے معیار پر بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹا تم جہاں جا رہے ہو ہو سکتا ہے وہاں شروع کے دو تین سال تمہارے لیے بہت مشکل ہوں لیکن اگر تم نے یہ مشکل وقت گزار لیا تو اس کے بعد زندگی میں آرام ہوگا۔ اس لیے کسی بھی مرحلے سے گھبرانا مت۔ یہ سوچ کر جانا کہ تم نے اپنی کشتیاں جلا دی ہیں اور واپسی کی کوئی راہ نہیں ہے۔"

میں نے دل میں عزم کیا کہ ایسا ہی کروں گا۔ اگلے دن میں نے صفدر صاحب کو کال کی اور ان سے کہا۔ "سر کیا آگے میری تنخواہ میں اضافہ ہوگا کیونکہ چھ ہزار تو آنے جانے میں خرچ ہو جائیں گے۔ جو بچے گا وہ میرے لیے بھی ناکافی ہوگا۔"

"تین مہینے کے بعد اگر تم نے بہتر کارکردگی دکھائی تو یقیناً اضافہ ہوگا۔" انہوں نے واضح جواب نہیں دیا تھا مگر یہی بہت تھا۔ میں نے کہا۔

"سر مجھے منظور ہے، میں کب سے آجاؤں؟"

"کل سے جوائن کر لو۔ کام زیادہ ہے اور آدمی کم ہیں۔" انہوں نے کہا۔ میں خوش ہو گیا۔ سچی بات ہے مجھے اُمید نہیں تھی کہ مجھے جاب مل جائے گی اور جب میں نے کام شروع کیا اور مجھے پتا چلا کہ انیس ایس اے کے پاس تو سارے ملک اور بیرون ملک سے بھی کام آتا ہے تو میں مزید حیران ہوا تھا۔ یہ میری قسمت تھی کہ میں نے آغاز ہی ایک کمپنی سے کیا تھا جس کے پاس ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طرف سے کام آتا تھا اور مجھے خود بھی یقین نہیں آیا جب میں نے پہلا کام ہی ایک فائیو اسٹار ہوٹل سے اسٹارٹ کیا تھا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ مجھے چھوٹی موٹی کوٹھی گھروندے اور کسی معمولی پروجیکٹ کی ڈرائنگ پر کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔ مگر پہلی ڈرائنگ فائیو اسٹار ہوٹل کی ملی۔

پہلے دن میں جوائننگ دینے پہنچا تو ریسپشن پر میرا تقرر نامہ موجود تھا مگر یہ اپائنٹ منٹ لیٹر نہیں تھا۔ مجھے ڈیلی ویجز پر رکھا گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ٹاپ کے چند افراد کو چھوڑ کر باقی سب ڈیلی ویجز پر تھے۔ یوں صفدر صاحب نے بونس اور گریجویٹی کے چکر سے جان بچائی ہوئی تھی۔ دفتر کا وقت صبح نو بجے سے شام چھ تک تھا مگر ساجد نے پہلے دن مجھے جتا دیا کہ صرف آنے کے وقت کی پابندی کروں جانے کا وقت کام ختم ہونے پر ہوگا۔ مجھے پہلے سے علم تھا مگر ریسپشن پر کام کرنے والی لڑکی شائلہ نے تصدیق کر دی کہ مجھے ساجد کے ساتھ کام کرنا تھا۔ میں لیٹر لے کر اس کے پاس آیا اور اس نے دیکھ کر منہ بنایا اور زیر

لب بولا۔ ”پتا نہیں سید صاحب کو کیا ہو گیا، ہر ایک کو بھرتی کر رہے ہیں۔ آفس کو اصطبل بنا کر رکھ دیا ہے۔“

دوسرے لفظوں میں وہ مجھے گھوڑا گدھا قرار دے رہا تھا۔ صفدر صاحب میرا انٹرویو لے چکے تھے مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب ساجد بھی انٹرویو لے گا۔ اس نے پوچھنا شروع کر دیا کہ مجھے کیا آتا ہے اور کیا نہیں آتا۔ جلد اس نے کہہ دیا۔ ”تمہیں تو کچھ نہیں آتا سب سیکھنا پڑے گا۔“

”سب سیکھ لوں گا سر میں کام کرنے سے نہیں گھبراتا۔“

”دیکھتے ہیں۔“ اس نے حسب عادت منہ بنایا۔ جب وہ منہ بناتا تو دونوں ہونٹ آگے نکال کر عجیب سی تھوتھنی بناتا تھا۔ اس کا یہ پوز کچھ واہیات بھی لگتا تھا۔ چند دن بعد مجھے پتا چل گیا کہ لڑکے پیٹھ پیچھے اس کے اس طرح منہ بنانے کو کس چیز سے تشبیہ دیتے ہیں۔ تشبیہ ناقابلِ بیان ہے۔ مگر جب یہ جاننے کے بعد میں نے غور سے اس کے بنے منہ کو دیکھا تو مجھے ان لڑکوں سے اتفاق کرنا پڑا۔ اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقریباً تمام ہی لڑکے اور دوسرا اسٹاف ساجد سے بیزار تھے۔ نہ صرف لوئر اسٹاف بلکہ اس کے لیول کے لوگ بھی اس سے چڑتے تھے۔ البتہ صفدر صاحب کی آنکھوں کا تارا تھا کیونکہ وہ نہ صرف خود کام میں چیتا تھا بلکہ دوسروں سے کام لینا بھی جانتا تھا۔ تیار ہونے والی ڈرائنگ فائنل کرنا اور اسے ای میل کرنا اسی کی ذمے داری تھی۔

یہاں سارا کام آٹو کیڈ پر ہوتا تھا اور میں اس پر کسی حد تک عبور حاصل کر چکا تھا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ صفدر صاحب نے مجھے جاب دے کر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ اول تو انہیں یہ فائدہ نظر آیا کہ میں آٹو کیڈ جانتا تھا اور پھر ڈرافٹس مین کا کام بھی جانتا تھا۔ اکثر اس کام میں آٹو کیڈ ماہر جسے کیڈ آپریٹر بھی کہتے ہیں الگ ہوتا ہے اور ڈرافٹس مین الگ ہوتا ہے۔ ڈرافٹس مین کاغذ پر اپنا کام کر کے دیتا ہے اور کیڈ آپریٹر اسے کمپیوٹر میں منتقل کرتا ہے۔ یہ لمبا کام ہے کیونکہ ڈرافٹس مین کیڈ آپریٹر کو ایک ایک لائن سمجھاتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک ہی کام دو بار ہوتا ہے۔ جب میں ایس ایس اے میں آیا تو اکثر کمپنیوں میں اسی طرح سے کام ہوتا تھا۔ یہ تو اب جا کر ایسا ہوا کہ تمام ڈرافٹس مین آٹو کیڈ کے بھی ماہر ہوتے ہیں اور کام پنسل اور کاغذ سے کمپیوٹر پر منتقل ہو گیا ہے۔ میں پانچ سال پہلے بھی آٹو کیڈ پر کام کرتا تھا بلکہ میں نے پہلے سوفٹ ویئر سیکھا تھا۔ ڈرافٹس مین تو میں بعد میں بنا۔

دوسرا فائدہ صفدر صاحب کو یہ نظر آیا کہ اگر وہ کسی ڈپلومہ ہولڈر ڈرافٹس مین کو رکھتے تو اسے آغاز میں ہی بارہ تیرہ ہزار دینا ہوتے۔ پھر انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مجھ میں کام سیکھنے کی صلاحیت ہے اس لیے انہوں نے انٹرویو کے لیے آنے والے تجربے کار امیدواروں پر مجھے ترجیح دی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے ہمارے ہاں اب بزنس مین کا رویہ ایسا ہی ہو گیا ہے وہ اعلیٰ ڈگری ہولڈرز کی بجائے دوسرے درجے میں آنے والے افراد کو بھرتی کرتے ہیں۔ جہاں انجینئر کی ضرورت ہو وہاں ایسوسی ایٹ انجینئر لیتے ہیں۔ یوں وہ انجینئر کی تنخواہ بچا لیتے ہیں اور کام وہ وہی کرتے ہیں جو اعلیٰ ڈگری والے کرتے ہیں۔ صفدر صاحب نے بھی نصف تنخواہ پر مجھے رکھ لیا۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھا کہ مجھے پوری طرح کام نہیں آتا ہے اور ساجد مجھ سے کیسے کام لے گا؟ دوسری طرف ساجد کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مجھے پوری طرح کام نہیں آتا ہے۔ اسے تو پوری طرح تجربے کار آدمی چاہیے تھا۔ اس لیے اس نے آتے ہی مجھے فائیو اسٹار ہوٹل کی ڈرائنگ تھما دی۔ ”اسے تین دن میں کرنا ہے۔“

”سر ڈرائنگ کہاں کی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ تو وہ مجھ پر چڑھ دوڑا۔

”تمہیں اس سے کیا کہ ڈرائنگ کہاں کی ہے۔ اپنے کام سے کام رکھو اور کوئی غلطی نہیں ہونا چاہیے۔“

ڈرائنگ یہاں کمپیوٹر میں دی جاتی تھی۔ ساجد آئی ٹی کے شعبے کو ہدایت کرتا تھا اور وہ مطلوبہ ڈرائنگ اس ڈرافٹس مین کو بھیج دیتے جس کو جاوید بھیجنے کو کہتا تھا۔ کام کا طریقہ کار یہ تھا کہ ڈرافٹس مین جو کام کرتا تھا وہ ہر پندرہ منٹ بعد خود بہ خود آئی ٹی کے شعبے میں چلا جاتا تھا اور وہیں محفوظ ہوتا تھا۔ البتہ کچھ ڈرائنگ ایسی ہوتی تھیں جن کا پرنٹ نکالا جاتا اور ان پر ہاتھ سے کام ہوتا تھا۔ ہمیں ایسے کمپیوٹر دیے ہوئے تھے جن میں نہ تو کوئی چیز محفوظ کی جا سکتی تھی اور نہ ہی اس میں سے کوئی چیز نکال سکتے تھے۔ کیونکہ سسٹم میں نہ تو سی ڈی تھی اور اس کی یو ایس بی بھی ڈس ایبل کر دی گئی تھی۔ ہم سسٹم میں نہ تو کچھ ڈال سکتے تھے اور نہ نکال سکتے تھے۔ صرف اس پر کام کر سکتے تھے۔ یہ بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ترتیب دیا ہوا سسٹم تھا۔ اس کا ایک مقصد تو پروجیکٹس کی ڈرائنگ کو

خفیہ رکھنا تھا ورنہ کوئی ان کو نکال کر کسی کو دے سکتا تھا یا فروخت کر سکتا تھا۔ دوسرے اس تدبیر سے انہوں نے ڈرافٹس مین کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا کوئی کام یہاں لا کر نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے کمپیوٹر انٹرنیٹ سے بھی منسلک نہیں تھے۔

مجھے پہلی ڈرائنگ ہی فائیو اسٹار ہوٹل کے سیکنڈ لیول کی ملی اور یہ بہت مشکل اور پیچیدہ چیز تھی۔ سچی بات ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور ڈرائنگ کی لائنیں میرے سامنے ناچنے لگی تھیں۔ دوپہر تک میں ان پر مغز ماری کرتا رہا جو سمجھ میں آیا وہ تو کر دیا مگر جو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس پر کیا کرتا اور اگر کرتا تو غلط ہی کرتا۔ میری صبح ہی بے عزتی سے ہوئی تھی اس لیے لنچ کے بعد میں ڈرتے ڈرتے ساجد کے پاس دوبارہ گیا اور اس سے کہا۔ ”سر ڈرائنگ کے کچھ پورشن میری سمجھ میں نہیں آ رہے آپ گائیڈ ...“

وہ پھر بگڑ گیا۔ ”یہاں کام کرنے آئے ہو یا سیکھنے۔ سیکھنا ہے تو کسی انسٹی ٹیوٹ میں جاؤ یہاں رہنا ہے تو کام کرو۔ تنخواہ کس بات کی لو گے۔ یہاں کوئی سکھانے کے لیے نہیں بیٹھا ہے۔ جا کر کام کرو ورنہ استعفا دے دو۔ آ جاتے ہیں دماغ خراب کرنے کے لیے۔“

اس نے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ میں دفع ہو جاؤں۔ میری بے عزتی سب نے سنی تھی اور اکثر زیر لب مسکرا رہے تھے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر اپنے کیبن میں آ گیا۔ ایک درمیانے سائز کے ہال میں ہمیں چھوٹے چھوٹے کارڈ بورڈ سے بنے کیبن دیئے گئے تھے جن میں ایک کمپیوٹر اور ایک کرسی کی گنجائش تھی۔ میں آ کر اپنے کیبن میں بیٹھ گیا۔ یہاں تو سر منڈاتے ہی اولے پڑے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ ساجد نے تو صاف جھنڈی دکھا دی تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ کس سے مدد لوں۔ میرے ساتھ ایک لڑکا فراز خان کام کرتا تھا۔ وہ پرانا ڈرافٹس مین تھا اور کئی سال سے یہاں کام کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ضیا تھا دونوں ایک جتنے عرصے سے یہاں کام کر رہے تھے۔ مجھے دونوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ شام تک میں ہمت کرتا رہا مگر اٹھ کر کسی کے پاس نہ جا سکا۔ شام کے وقت جب ہم چھٹی کر کے جانے لگے تو باہر نکلنے پر فراز خان نے مجھ سے کہا۔

”فکر مت کرو ساجد صاحب کسی کو نہیں بخشتا ہے۔ اصل میں وہ تمہاری جگہ جس لڑکے کو لانا چاہ رہا تھا اسے صفدر صاحب نے لیا نہیں اور تمہیں لے لیا۔ مگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی ساجد کسی کے کام آنے والا آدمی نہیں ہے۔ پرانا کیکر ہے کاٹنے والا۔“

”یار میں نے ایک چیز پوچھی تھی مگر کس طرح جھاڑ دیا۔“

”صحیح تو کہہ رہے تھے۔“ ضیا بولا۔ ”یہاں سیکھنے کے لیے تھوڑی آفس کھولا ہے کام کے لیے کھولا ہے۔“

اس مختصری گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر مجھے کوئی کچھ بتا سکتا ہے تو وہ فراز خان ہے۔ وہ پشاور سے آیا تھا۔ اس نے کراچی میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور سول ڈرافٹس مین کا کورس کر کے ایس ایس اے میں آ گیا تھا۔ اپنے کام میں بہت تیز مگر اس میں مخصوص اکھڑ پن تھا۔ اپنی غلطی تسلیم کر لیتا تھا مگر کسی کی غلط بات نہیں سنتا تھا۔ پہلا دن ایسا خراب گزرا تھا کہ میرا موڈ ہی خراب تھا اور گھر آ کر کسی سے بات کیے بغیر پڑا رہا۔ پھر مجھے ابو کی بات یاد آئی کہ میرا شروع کا وقت بہت مشکل گزرے گا اور اگر میں نے یہ وقت گزار لیا تو آگے آسانی سے گی۔ دنیا کے کسی بھی شعبے میں کامیابی آسانی سے نہیں ملتی ہے۔ مگر یہاں سے مشکلیں ہی مشکلیں تھیں۔ اگلے دن میں نے فراز خان سے باہر بات کر لی اور اس کی کچھ منت سماجت بھی کر لی کہ وہ مجھے کام کے بارے میں بتا دیا کرے۔ خلاف توقع وہ مان گیا۔

اب ڈرائنگ میں مجھے کوئی مسئلہ ہوتا تو میں اس کے پاس چلا جاتا اور وہ مجھے بتاتا تھا کہ کام کیسے ہونا ہے اور میں کہاں کہاں غلطی کر رہا تھا۔ یوں میرے کام کا آغاز ہوا۔ اگرچہ سناتا وہ بھی تھا مگر ساتھ ہی بتاتا بھی تھا اور ظاہر ہے اپنا کام چھوڑ کر بتاتا تھا۔ یوں مجھ پر احسان ہو جاتا تھا۔ ساجد نے کام تین دن میں دینے کو کہا تھا مگر مجھے ایک دن اوپر لگ گیا اور اس میں بھی کچھ غلطیاں رہ گئیں۔ جب فائنل ڈرائنگ اس کے پاس گئیں تو اس نے مجھے طلب کر لیا۔ حسب معمول بے عزتی کے بعد اس نے بتایا کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی تھی اور اس نے انہیں ٹھیک کر کے لانے کا حکم دیا۔ مزید ایک دن لگا کر میں نے غلطیاں درست کیں۔

ایک مہینا گزرا تو کام کی کچھ کچھ سمجھ آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی آفس کلچر بھی سمجھ میں آ گیا۔ ہمارے ہاں اچھے ماحول والے دفتر بہت کم ہوتے ہیں جہاں تک میں نے جانا ہے عام طور سے ہمارے ہاں دفاتر میں کام کم اور ایک

دوسرے کے خلاف سازشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہر شخص دوسرے کی کاٹ کرتا ہے۔ جنہیں آدمی اپنا بہت اچھا دوست سمجھتا ہے عام طور سے وہی پشت میں چھرا گھونپتے ہیں۔ انسان جنہیں اپنا ہمدرد سمجھ کر اگر کوئی دکھ سکھ کہہ دے تو وہ بی جمالو کا کردار ادا کرتے ہوئے اسے فوراً آگے کرتے ہیں اور آدمی کی مزید کم بختی آجاتی ہے۔ مجھ سے ایسی کئی غلطیاں ہوئیں۔ ضیا، ساجد سے خار کھاتا تھا کیونکہ کام انتہائی سست کرتا تھا اور آئے دن اس کی بے عزتی ہوتی تھی۔ اس لیے جب اسے موقع ملتا تو ساجد کے بارے میں دل کے پھپھولے پھوڑتا تھا۔ ایک دن لنچ کے وقفے میں وہ لگا ہوا تھا اور ساجد کے بارے میں میرا دماغ کھا رہا تھا۔ میرے منہ سے بھی کچھ باتیں نکل گئیں۔ اگلے ہی دن ساجد نے مجھے بلا لیا۔ اس نے کاٹ کھانے والے انداز میں پوچھا۔

"تم میرے بارے میں کیا بکواس کرتے ہو۔"

اس سے پہلے بھی بے عزتی ہوتی رہی تھی لیکن جاوید یا کسی نے بھی... ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ میرا خون چہرے پر آگیا۔ "کیا مطلب سر؟"

"تم ضیا سے کہہ رہے تھے کہ میں تمہیں جان کر تنگ کرتا ہوں، بار بار کام کا پوچھتا ہوں۔"

میں نے سوچا اور صفائی پیش کرنے کی بجائے کہا۔ "میں نے غلط نہیں کہا۔ آپ مجھے دو دن میں کام دینے کو کہتے ہیں اور ہر آدھے گھنٹے بعد پوچھتے ہیں۔"

میرے دوٹوک جواب پر اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا پھر اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تمہارے بھی پر پرزے نکل آئے ہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں تمہیں یہاں آئے ہوئے۔"

"آپ جو سمجھیں لیکن میں اس لہجے کا عادی نہیں ہوں اور ضیا نے آپ کو نہیں بتایا کہ وہ آپ کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔" میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر آگیا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ضیا ایسی گھٹیا حرکت کرے گا۔ اتفاق سے وہ اس وقت آفس میں نہیں تھا۔ صفدر صاحب نے کسی کام سے باہر بھیجا تھا۔ ورنہ میں اس سے بھی لڑ جاتا۔ اس وقت مجھے غصہ آرہا تھا اور ساتھ ہی ڈر بھی لگ رہا تھا کہ میں نے اپنے باس سے بدتمیزی کی ہے ایسا نہ ہو کہ مجھے جاب سے ہی نکال دیا جائے اس وقت مجھے یہاں کام کرتے ہوئے چوتھا مہینا تھا۔ اس عرصے میں یوں سمجھ لیں کہ میں نے صرف بیس فیصد کام سیکھا تھا اور ابھی بہت کچھ سیکھنا باقی تھا۔ میں تو اسٹرکچر میں پھنسا ہوا تھا اور یہاں تو اسٹیل اسٹرکچر پر بھی کام ہوتا تھا۔ مجھے آگے جانے کے لیے اس پر بھی کام سیکھنا تھا اس کے بعد سروئیرز کی باری آتی تھی۔ مختلف طرح کے سروے سیکھنا تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں سے نکالا گیا تو مجھے آگے کہیں جاب مشکل سے ملے گی۔ اتنے عرصے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ میں بالکل نو مبتدی ہوں اور مجھے بہت زیادہ سیکھنا ہے اور یہ جگہ سیکھنے کے لحاظ سے بہت اچھی ہے۔

میں منتظر تھا کہ ابھی صفدر صاحب کی طرف سے طلبی ہو گی اور میری شامت آئے گی۔ اگر مجھے جاب سے نہ بھی نکالا گیا تب بھی ٹھیک ٹھاک بے عزتی تو ہوگی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ دو گھنٹے بعد ساجد نے ہی بلایا اور مجھے نارمل انداز میں ایک کام کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں حیران رہ گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ساجد اتنی جلدی مجھ سے نارمل انداز میں بات کرے گا یہی نہیں بلکہ اس نے میری صفدر صاحب سے شکایت بھی نہیں کی تھی۔ جب کہ وہ معمولی سی غلطی معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں نے تو اچھی خاصی بدتمیزی کردی تھی۔ جب ساجد کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو میں نے ضیا سے بات کرنے کا سوچا۔ وہ چھٹی سے کچھ پہلے آیا اور میں نے دفتر سے نکلتے ہوئے اس سے راستے میں پوچھا کہ اس نے ساجد سے میری بات کیوں کی۔ اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔ "میں نے جان کر تھوڑی کہا وہ تو غلطی سے منہ سے نکل گیا۔"

"ٹھیک ہے اب تم بھی انتظار کرو کہ میرے منہ سے غلطی سے کیا کیا نکلتا ہے۔"

یہ دھمکی سن کر اس کے منہ پر بارہ بج گئے تھے کیونکہ وہ صرف ساجد کے خلاف نہیں بلکہ دفتر کے تمام ہی بڑوں کے خلاف کچھ نہ کچھ کہتا رہتا تھا۔ اس کی صورت دیکھ کر فراز خان کی ہنسی چھوٹ گئی۔ نیچے آنے پر جب ضیا مجھ سے بات اور سلام دعا کیے بغیر رخصت ہوا تو اس نے کہا۔ "تم نے بالکل ٹھیک علاج کیا ہے اس کا، اب دیکھنا کتنے دن یہ خوفزدہ رہے گا۔"

میں نے فراز خان کو ساجد کے رویے کے بارے میں بتایا تو وہ اور ہنسا تھا۔ "یہاں بھی تم نے ٹھیک کیا، یہ باتوں کا بھوت ہے، شرافت سے نہیں مانتا۔ جب تک اسے سامنے والے سے چار پانچ کراری کراری سننے کو نہ مل جائیں اس کی

تسلی نہیں ہوتی ہے۔ تم نے ڈوز دے دیا ہے دو تین دن ٹھیک رہے گا۔"

"میں اب تک ساجد صاحب کو نہیں سمجھ سکا۔"

"یہ فطری گھٹیا آدمی ہے اور گھٹیا پن کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" فراز خان نے کہا۔ "کئی بار میرے ہاتھوں بھی بے عزتی کروا چکا ہے۔"

فراز خان کی بات جلد عملی طور پر بھی میرے سامنے آ گئی۔ دو دن بعد ہی فراز نے اسے کام دیا اور اس نے اس میں غلطی پکڑ لی۔ غلطی اس نے یہ کی کہ فراز کو گالی دے دی۔ فراز آپے سے باہر ہو گیا اس نے بہت سخت لہجے میں ساجد سے کہا۔ "باس ہو گا تو کہیں کا، غلطی کی ہے تو اس پر بات کرو، اب گالی دی نا تو منہ ناک سب برابر کر دوں گا۔"

شاید وہ ایسا ہی کرتا لیکن دفتر کے دوسرے لوگ درمیان میں آ گئے تھے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرایا تھا۔ فراز خان نے اگلے ہی دن صفدر صاحب سے کہہ دیا کہ وہ ساجد کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ اسے الگ کیا جائے ساجد کو۔ فراز سب سے سینئر ڈرافٹس مین تھا مگر ساجد بہر حال باس تھا اور وہ ہر قسم کے اسٹرکچر میں مہارت رکھتا تھا۔ اس لیے صفدر صاحب نے ساجد کو نکالنے سے انکار کر دیا اور فراز خان استعفا دے کر چلا گیا۔ اس جھگڑے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ساجد بہت ہی بزدل آدمی ہے اس کے سامنے کوئی ذرا بھی ڈٹ کر کھڑا ہو تو وہ فوراً دب جاتا ہے۔ میں کسی حد تک اس کی فطرت سمجھ رہا تھا۔ مگر فراز کے جانے سے مجھے نقصان ہوا اور اب مجھے سکھانے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ دو لڑکے اور تھے جو کام جانتے تھے مگر ایک تو وہ زیادہ بتاتے نہیں تھے کیونکہ انہیں اپنا کام بھی کرنا ہوتا تھا دوسرے وہ میری کیبن سے ذرا دور ہوتے تھے۔ فراز تو برابر میں ہوتا تھا اس سے میں ایک سیکنڈ میں پوچھ لیتا تھا۔

جن دنوں فراز مجھے سکھا رہا تھا ان دنوں وہ باہر سے اپنا کام بھی لاتا تھا اور اس نے آئی ٹی والے سے سیٹنگ کی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ای میل کھول کر چپکے سے اس کی فائلیں اتار کر اس کے کمپیوٹر میں بھیج دیتا اور فراز اپنا کام میرے حوالے کر دیتا۔ جب میں فارغ ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ تھما دیتا۔ میں بھی انکار نہیں کرتا تھا کہ ایک تو وہ مجھے سکھا رہا تھا اور دوسرا میرے کام میں خلل نہیں پڑتا تھا۔ میں کام کر کے اسے دیتا تو شکریہ تو ادا کرتا مگر ساتھ ہی کچھ دیر بعد کہہ دیتا کہ میں نے غلطیاں کی تھیں اسے ٹھیک کرنا پڑ گئیں۔ حالانکہ میں غلطیاں بہت کم کرتا تھا۔ شاید وہ اس طرح معاوضے کی ادائگی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگرچہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں اس سے معاوضہ طلب کروں۔ مگر شاید اس کے ذہن میں تھا کہ کہیں میں معاوضہ نہ مانگ لوں۔ وہ بھی باہر سے کام پکڑتا تھا تو اس کا معاوضہ لیتا تھا۔

فراز کے جانے کے بعد میرا جن لڑکوں پر انحصار تھا ایک مہینے کے وقفے سے وہ بھی آفس چھوڑ گئے۔ ایک کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی تھی اور دوسرے کو ایک اچھی کمپنی میں زیادہ تنخواہ پر جاب مل گئی تھی۔ اب میرے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا کہ میں اس طرح کام کروں جب کہ کوئی میری رہنمائی کرنے والا نہ ہو۔ میں نے ابو سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں آگے پڑھوں کیونکہ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہے۔ لوگ مجھے ایک حد تک سکھا سکتے ہیں۔ سب کچھ سیکھنے کے لیے مجھے کسی انسٹی ٹیوٹ میں جانا ہوگا۔ ابو کی بات میرے دل کو لگی اور میں نے صفدر صاحب سے بات کی کہ میں آگے پڑھنا چاہتا ہوں مگر ساتھ ہی نوکری بھی کرنا چاہتا ہوں۔ خلافِ توقع وہ مان گئے کہ میں اب پارٹ ٹائم جاب کروں اور ساتھ ہی میری تنخواہ بھی آدھی کر دی۔ اس وقت مجھے آٹھ ہزار مل رہے تھے۔ پارٹ ٹائم کی صورت میں مجھے چار ہزار ملتے۔

میں نے ایک ٹیکنیکل کالج میں تین سالہ ڈپلومہ میں داخلہ لیا۔ اب صبح میں کالج جاتا اور وہاں سے بارہ بجے چھٹی کے بعد دفتر چلا جاتا۔ دفتر اصل میں صبح نو سے شام چھ بجے تک تھا اور میں ساڑھے بارہ بجے تک وہاں پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو میں آدھے دن سے زیادہ کام کر رہا تھا مگر مجھے تنخواہ آدھی مل رہی تھی۔ میں نے صفدر صاحب سے احتجاج کیا کہ میں صرف ساڑھے تین گھنٹے کم کام کر رہا ہوں بلکہ اکثر دفتر سے نکلتے نکلتے آدھا پون گھنٹا اوپر ہو جاتا تھا۔ اس لیے میری تنخواہ بھی اسی حساب سے کی جائے۔ دیکھا جائے تو میں پہلے ہی ڈیلی ویجز پر تھا اور مجھے گھنٹے کے حساب سے ادائگی ہوتی تھی اور یہاں مجھے ڈیڑھ گھنٹے کی تنخواہ نہیں مل رہی تھی۔ پہلے تو صفدر صاحب نے صاف انکار کر دیا کہ مجھے اسی طرح کام کرنا ہوگا ورنہ میری مرضی ہے۔ لیکن جب میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر پھر میں دو بجے آیا کروں گا۔"

تب وہ فکرمند ہو گئے۔ شاید انہیں خطرہ یہ تھا کہ میں چھوڑ کر نہ چلا جاؤں۔ بادل ناخواستہ انہوں نے میری تنخواہ

میں ہزار کا اضافہ کیا۔ یوں مجھے پانچ ہزار ملنے لگے۔ اس میں کالج کی فیس اور دوسرے اخراجات بھرنا تو ایک طرف رہا میرے لیے اپنا خرچ نکالنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اب مجھے ابو سے رقم لینی پڑتی تھی۔ پتا نہیں وہ کیسے کر رہے تھے۔ مگر کسی نہ کسی طرح میری فیسیں اور دوسرے اخراجات ادا کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آدھے دن کی نوکری کے باوجود میں کام تقریباً اتنا ہی کر رہا تھا۔ مجھے کام کرنے پر اعتراض نہیں تھا بلکہ مجھے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ کبھی فارغ بیٹھتا تو بے چینی سی ہوتی تھی مگر مجھے معاوضہ تو کام کے حساب سے ملتا۔ دیکھا جائے تو آج کے دور میں آٹھ ہزار بھی ناکافی ہیں۔ اس میں بھی تین ہزار کی کمی ہو گئی تھی۔ مگر میں مجبور تھا۔ مجھے ڈپلومہ کرنا تھا اور اس میں وقت بھی تین سال کا تھا۔

اگرچہ میری عمر اتنی نہیں تھی۔ اس وقت میں بیس کا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ہے آج کل لڑکے چوبیس پچیس کے ہو کر بھی فارغ گھوم رہے ہوتے ہیں۔ انہیں کمانے کی اتنی پروا نہیں ہوتی ہے مگر مجھے اس کا احساس تھا کہ اب گھر اکیلے آدمی پر نہیں چلتے ہیں اس لیے میں اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے کمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کالج اور جاب سے آتا تو کمپیوٹر کھول کر بیٹھ جاتا اور انٹرنیٹ پر اپنے کام سے متعلق فائلیں اور ان کو بنانے کی وڈیوز دیکھتا تھا۔ کیونکہ کالج میں بھی بس خانہ پوری کی حد تک پڑھایا اور سکھایا جاتا تھا۔ اس لیے جو کام سیکھنا چاہتے تھے وہ خود سے جان مارتے اور دوسروں سے پوچھتے تھے۔ مجھے بھی یہ سب کرنا پڑتا تھا۔ پارٹ ٹائم کام کرنے سے دفتر میں میری وقعت مزید کم ہو گئی اور اب مجھے پہلے سے بھی کم اہمیت ملتی تھی حالانکہ کام میں پہلے سے زیادہ اور بہتر کر رہا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔

اگر کام میں غلطی نکل آتی تو ساجد سمیت سب چڑھ دوڑتے تھے۔ ہاں ٹھیک کر کے دیتا تو شاباشی اور تعریف کا ایک لفظ نہیں کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ رویہ تقریباً تمام ہی کام کرنے والے لڑکوں کے ساتھ تھا مگر میں اس چیز کو زیادہ ہی محسوس کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈپلومے کے دوسرے سال میں نے دوسری ملازمت تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ اوّل تو زیرِ تعلیم آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور دوسرے سب کو فل ٹائم ورکر درکار تھے۔ پارٹ ٹائم رکھنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے سوچا کہ بھاڑ میں گیا ڈپلومہ میں اب فل ٹائم جاب ہی کروں گا تو اس وقت ڈگری کی کمی آڑے آئی جہاں جاتا اور پتا چلتا کہ میں ابھی ڈپلومہ کر رہا ہوں وہیں سے میرا پتا کٹ جاتا۔ کوئی نصف درجن ناکام کوششوں کے بعد میں نے تسلیم کر لیا کہ فی الحال میرا دانہ پانی اسی کمپنی میں ہے۔

جاب چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا حالانکہ مجھے ساجد اور بعض دوسرے لوگوں نے آخری حد تک زچ کیا تھا۔ خاص طور سے ساجد کی کوشش تھی کہ میں جاب چھوڑ دوں اور وہ میری جگہ اپنے کسی خاص چمچے کو لا سکے۔ جب میں نے دوسری جاب کی تلاش شروع کی تو اسی وقت سوچ لیا تھا کہ جب تک دوسری جاب کہیں مل جاتی اسے نہیں چھوڑوں گا۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہی ہوتا ہے۔ کم سے کم میں اپنا خرچ تو نکال رہا تھا اور پھر کالج میں اور دوسروں سے جو سیکھتا تھا وہ دفتر میں عملی طور پر استعمال کرتا تھا اور اس سے میں جو سیکھتا وہ بھولتا نہیں تھا۔ گھر بیٹھنے کی صورت میں مجھے بہت سی چیزیں بھول جاتیں۔ ان سب وجوہات کی بنا پر میرا جاب جاری رکھنا ضروری تھا۔ دوسرا سال مکمل ہوا تو کام آسان ہونے لگا۔ بہت کچھ میں سیکھ چکا تھا اور جو رہ گیا تھا وہ اتنا مشکل نہیں رہا تھا۔ اگر کوئی مسئلہ پیش آتا تو ذرا سی کوشش سے خود حل کر لیتا تھا۔

دفتر میں جب میں نے دوسروں سے پوچھنا چھوڑا اور دیا جانے والا کام از خود کرنے لگا تو اب دوسرے بھی میرا نوٹس لینے لگے۔ ساجد کے ساتھ تین بڑے اور تھے۔ ایک رحمان بھائی جو ساجد کے تقریباً برابر تھے مگر وہ زیادہ تر اسٹیل اسٹرکچر کرتے تھے۔ پھر دو خواتین تھیں۔ ایک میڈم شازیہ اور دوسری میڈم ریحانہ۔ میڈم شازیہ ڈیزائننگ کرتی تھیں اور میڈم ریحانہ آرکی ٹیکٹ سے متعلق تھیں اور زیادہ تر بزنس دیکھتی تھیں۔ انہیں بھی مجھ سے کام پڑتے رہتے تھے اور اس صورت میں وہ مجھے یا ضیا کو ساجد سے مانگ لیتی تھیں۔ شروع میں ضیا کو زیادہ بلایا جاتا تھا کیونکہ وہ سینئر تھا اور کام جانتا تھا۔ اس میں خامی تھی کہ سست بہت تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد میں آگے نکل گیا اور اب میڈم مجھے بلاتی تھیں۔ جب میں کام کر کے دیتا تو اسے بعض اوقات بنا چیک کیے بھی آگے بھیج دیتی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں صرف کام نہیں کرتا بلکہ اسے چیک بھی کرتا ہوں۔ پھر میری عادت تھی کہ میں بہت صفائی سے کام کرتا تھا۔ میری ڈرائنگ شیٹ

ہمیشہ صاف ستھری اور بنا کسی کاٹ پیٹ کے ہوتی تھی۔

کمپیوٹر کے ساتھ ہم عملی طور پر شیٹ ورک بھی کرتے تھے۔ مگر بنیادی کام کمپیوٹر پر ہی ہوتا تھا۔ بعض شیٹس خاصی بڑی ہوتی تھیں اور اسکرین پر پوری نہیں آتی تھیں پھر صفدر صاحب کو دکھانے کے لیے تمام ہی ڈرائنگ پرنٹر سے بھی نکالی جاتی تھیں۔ ہم ان پر فائنل ورک کرتے اور پھر ان کو دوبارہ اسکین کر کے کمپیوٹر میں ڈال دیا جاتا اور پھر اسے ہی متعلقہ گاہک یا کمپنی کو ای میل کیا جاتا تھا۔ پھر بہت سی جگہوں پر ڈرائنگ میٹنگ یا کسی کو دکھائی بھی جاتی تھیں اور جب ان کو ہارڈ کاپی پر بنایا جاتا۔ اس لیے جب ہارڈ کاپی کا مرحلہ آتا تو میڈم یا دوسرے ڈرافس مین کے طور پر مجھے طلب کرتی تھیں اور میں کام کر کے دیتا تو وہ مطمئن ہوتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے تیسرے سال صفدر صاحب نے تنخواہ میں اضافہ کیا اور مجھے دوبارہ سے آٹھ ہزار ملنے لگے۔ اس دوران میں مہنگائی میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور تنخواہ میں ہونے والا اضافہ اس کی مناسبت سے نہیں تھا۔ مگر یہ اضافہ میرے لیے پھر بھی اہم تھا۔ اس کا فائدہ اس وقت ہوا جب میں آخری سمسٹر میں فل ٹائم جاب پر واپس آ گیا اور مجھے سولہ ہزار ملنے لگے۔

میں فل ٹائم واپس آیا تو میری اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب ضیا سمیت کئی لڑکے جو مجھ سے زیادہ سینئر تھے اور یہاں بھی کئی سالوں سے مسلسل کام کر رہے تھے انہیں میری مثال دی جانے لگی۔ میں کام صفائی سے، تیزی سے اور خود چیک کر کے آگے کرتا تھا۔ دوسرے ایسا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ سب مجھ سے جلنے لگے تھے خاص طور سے ضیا مجھ سے خار کھانے لگا۔ بات بات پر مجھ سے الجھتا اور پھر میں اس کی بے عزتی کرتا تھا۔ میں بلاوجہ کسی کو نہیں چھیڑتا تھا لیکن اگر کوئی مجھے چھیڑتا تو میں اسے چھوڑتا نہیں تھا۔ ضیا نے دو تین بار بلاوجہ مجھ سے چھیڑ خانی کی تو میں نے اس سے کہا۔

”اب تم دیکھنا میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔“

اس پر وہ ڈر گیا اور مجھے یقین دلانے لگا کہ وہ مذاق کر رہا تھا۔ ضیا نفسیاتی تھا۔ دفتر میں گلاس سے پانی نہیں پیتا تھا بلکہ اپنی ایک بوتل رکھتا تھا اس میں پانی پیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دوسروں کے گلاس میں پانی پینے سے جراثیم لگ جاتے ہیں، اس بارے میں بہت حساس تھا کسی کو بوتل پر ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔ اب میں نے یہ کرنا شروع کیا کہ صبح جلدی آتا تو اس کی بوتل زمین پر ڈال دیتا اور اسے ذرا رگڑ کر مٹی زدہ کر دیتا۔ وہ آتا اور اپنی بوتل نیچے پڑے دیکھ کر بھن بھن کرتا اور پھر بوتل پھینک کر دوسری لاتا۔ اس کی کسی چیز کو کوئی دوسرا چھو لے تو پھر اسے استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس لیے میں جان بوجھ کر اس کے پین، پنسل اور دوسری چیزوں کو اٹھا لیتا اور اس کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ لنچ کے بعد ہاتھ دھوئے بغیر اس کے کی بورڈ اور ماؤس کو ہاتھ لگاتا۔ اس کی عادت تھی جو خود کرتا اس کا الزام مجھ پر لگا دیتا۔ واش روم میں جاتا تو صفائی کے خبط میں دیر تک صابن ہاتھوں پر ملتا رہتا اور پھر صابن کو جھاگ بنا کر ایسے ہی چھوڑ آتا اور جب دوسرے شکایت کرتے تو کہتا کہ ہمایوں نے کیا ہے۔ جب کہ سب جانتے تھے کہ وہی جھاگ بنانے کا شوقین تھا۔ صابن لگانے پر آتا تو مسلسل لگاتا رہتا تھا۔

ضیا کی سوچ منفی تھی۔ دوسروں کے بارے میں غلط سوچنا اس کی عادت تھی اس لیے وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ غلط ہی کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں اسے سمجھاتا کہ وہ اپنے کام پر دھیان دے تو اس کے لیے اور دوسروں کے لیے بہتر ہو گا۔ مگر اس کے خیال میں وہ سب سے تیز اور اچھا کام کرنے والا تھا اس لیے اسے میری نصیحت کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے شہ دینے میں اب ساجد سب سے آگے تھا کیونکہ وہ مجھ سے چڑتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈپلومہ کر کے میں کہیں اور چلا جاؤں گا مگر اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ سچی بات ہے کہ میری بھی یہی خواہش تھی کہ میں کہیں اور چلا جاؤں مگر میری ... یہ خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ مجھے پھر اسی دفتر میں آنا پڑا تھا اور ساجد کے ساتھ کام کرنا پڑا تھا۔

ڈپلومہ کے فائنل سمسٹر کے پیپرز ہوئے تو میں نے چند دن کی چھٹی لی اور صفدر صاحب سے اجازت لے لی تھی۔ مگر جب اگلے مہینے کی تنخواہ ملی تو اس میں سے ان دنوں کی تنخواہ کاٹ لی گئی تھی۔ تنخواہ دینے اور دوسرے کاموں کے لیے قدیر بھائی تھے۔ ایک نمبر کے کنجوس اور چڑچڑے آدمی تھے۔ دفتر کی ساری انوینٹری ان کے پاس رہتی تھی اور ان سے ایک پنسل حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا تھا۔ جب پنسل یا پین ختم ہو جاتا اور میں ان سے دوسرا لینے جاتا تو چیز ملنے سے پہلے دس سوالوں کے جواب دینے ہوتے تھے۔ تنگ آ کر میں نے یہ کیا کہ اپنے کام کی چیز میں خود ہی خرید لیتا مگر بہت سی چیزیں ان سے لینا پڑتی تھیں اور وہ دینے سے پہلے دماغ کی دہی بنا دیتے تھے۔ کنجوسی کا یہ عالم

تھا کہ عقل استعمال کرنے میں بھی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ گھڑی کے لیے سیل کا کہا تو گھڑی ہی اتروا دی کہ جب تم لوگوں کے پاس موبائل اور کلائیوں میں گھڑی ہے تو اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ان سے کہا۔

''میں نے صفدر صاحب سے اجازت لے کر چھٹیاں کی ہیں۔''

''ٹھیک ہے پر تنخواہ تو کٹے گی۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

میں بھنا کر صفدر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ان سے کہا اور انہوں نے قدیر بھائی کو باقاعدہ ہدایت کی تب انہوں نے تنخواہ دی۔ وہ بھی فوراً نہیں ملی بلکہ اگلے مہینے کی تنخواہ کے ساتھ دی گئی۔ اس مثال سے بھی آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں کیسے لوگوں میں کام کر رہا تھا اور مجھے روزانہ کن حالات سے گزرنا پڑتا تھا۔ واپس آنے کے بعد ساجد کا رویہ تو انتہائی خراب ہو گیا تھا۔ بات بات پر سناتا تھا مگر اب اس نے انداز بدل لیا تھا براہِ راست سنانے کی بجائے ان ڈائریکٹ سناتا تھا۔ ایک بار میری طبیعت خراب ہوئی اور میں نے چھٹی کر لی۔ اگلے دن دفتر پہنچا تو اس نے آتے ہی دوسروں سے کہنا شروع کر دیا۔ ''یار ہم تو اتنی بیماری میں بھی چھٹی نہیں کرتے تھے۔ آج کل کے لونڈوں میں نہ دم خم ہے اور نہ کام آتا ہے۔ ذرا نزلہ زکام ہوا بس جی چھٹی۔ بیماری کا تو بہانہ ہے اصل میں کام سے بھاگنا ہے.....''

سارا دن اسی طرح سنتا رہا۔ ضیا اور دوسرے چمچے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ میرا خون کھولتا رہا مگر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ بس اپنے کام میں لگا رہا۔ دو دن اس نے صرف اسی بات کو لے کر میرا جینا حرام کر رکھا۔ شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں سالانہ رپورٹ دینا اس کی ذمے داری تھی اور اسی کی بنیاد پر ہماری تنخواہوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ساجد میرے بارے میں کیا رپورٹ دیتا ہے۔ لیکن میرا سالانہ انکریمنٹ ویسا نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہونا چاہیے اور مجھے ملنے والے بونس بھی میری تنخواہ کے مساوی نہیں ہوتے تھے۔ کبھی پونا بونس ملتا تھا اور کبھی آدھا۔ میرے مقابلے میں ضیا اور دوسرے لڑکوں کو مکمل بونس ملتا تھا۔ ان کی تنخواہ بھی میرے مقابلے میں زیادہ تھی۔ شروع میں یہ بہانہ تھا کہ میں جونیئر ہوں۔ پھر یہ بہانہ ہوا کہ میں پارٹ ٹائم کام کر رہا ہوں۔ اس بار سالانہ انکریمنٹ کا وقت آیا تو میں منتظر تھا کہ اس بار کیا کیا جاتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ میری تنخواہ میں کم سے کم تین ہزار کا اضافہ ہوگا۔ مگر جب اضافہ ہوا تو صرف دو ہزار کا ہوا۔ اس بار مجھے یقین ہو گیا کہ ساجد میرے بارے میں اچھی رپورٹ نہیں دے رہا ہے۔ صفدر صاحب سے بات کرنے کا فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ ساجد کی بات سنتے اور مانتے تھے۔ فراز خان کے معاملے میں دیکھ چکا تھا کہ انہوں نے فراز خان کا ساتھ نہیں دیا اور وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے ساجد سے بات کی کہ میری تنخواہ میں کم اضافہ ہوا ہے تو اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ٹھیک ہوا ہے۔''

''وہ کیسے سر، اب میرے پاس تقریباً پانچ سال کام کا تجربہ ہے اور میں نے ڈپلومہ بھی کر لیا ہے تو تنخواہ میں اسی حساب سے اضافہ ہونا چاہیے تھا۔''

''سمجھ لو کہ اب تمہارا کیریئر شروع ہوا ہے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ڈھائی سال پارٹ ٹائم آفس آ کر تم ان لوگوں کے برابر نہیں ہو جاؤ گے۔''

''سر بات پارٹ ٹائم یا وقت کی نہیں کام کی ہے، آپ کام کرا کے دیکھیں کہ کون جلدی اور بہتر کرتا ہے۔''

''میں دیکھتا رہتا ہوں۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تمہیں جو کام دیا تھا اس کا کیا ہوا؟''

''سر کام سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، شاید میں نیا ہوں اور ناتجربے کار ہوں اس لیے۔'' میں نے بھی طنزیہ انداز میں کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

اب میں پھر سوچ رہا تھا کہ کہیں اور کوشش شروع کروں۔ میرے پاس تجربہ بھی تھا اور ڈگری بھی، اب جاب میرے لیے اتنی مشکل نہیں ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ ابھی میں نے یہ سوچا تھا کہ صفدر صاحب نے مجھے بلا لیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''کیا تم اپنی تنخواہ سے مطمئن نہیں ہو؟''

پہلے تو میں حیران ہوا کہ ان تک بات کیسے پہنچی، یقیناً ساجد نے تو نہیں پہنچائی تھی یا کسی اور کا کام تھا پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ ”یس سر۔“

”کیوں؟“

”سر میں دعویٰ نہیں کر رہا مگر آپ میڈم ریحانہ اور شازیہ سے پوچھ لیں۔ رحمان بھائی سے پوچھ لیں۔ کون سب سے تیز اور صفائی سے کام کر کے دیتا ہے۔ اگر دوسرے سینئر ہیں تو مجھے اس سے کیا، میں کام تو ان جیسا یا ان سے بہتر کر رہا ہوں۔ پھر تنخواہ ان سے کم کیوں لوں؟“

اس وقت ضیا بائیس ہزار لے رہا تھا اور دوسرے لڑکے بھی تقریباً اتنی تنخواہ لے رہے تھے۔ جب کہ مجھے اٹھارہ مل رہی تھی۔ صفدر صاحب نے میرے لہجے سے سمجھ لیا کہ میں شاید نہیں مانوں گا اور اگر میری تنخواہ میں اضافہ نہ کیا گیا تو شاید میں جاب چھوڑ دوں۔ انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں تنخواہ میں اضافہ کر رہا ہوں۔ لیکن میں فی الحال صرف دو ہزار تک اضافہ کر سکتا ہوں کیونکہ۔۔“ وہ بولتے بولتے رکے پھر کہا۔ ”دیکھو یہ بات زیادہ لوگ نہیں جانتے ہیں تم سے کم تمہارے لیول کا کوئی آدمی نہیں جانتا، شاید میں کمپنی بند کر دوں یا سیل کر دوں۔“

”کب تک سر؟“

”چند مہینے میں فیصلہ کر لوں گا۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس فیلڈ میں پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب میں تھک گیا ہوں، بچے چاہتے ہیں آرام کروں اور میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“

میں سن کر حیران ہوا تھا کیونکہ یہ ایسی بات تھی صفدر صاحب مجھ سے شاید ہی کرتے مگر میری تنخواہ کے مسئلے کی وجہ سے انہوں نے کہہ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ”تو سر میں دوسری جاب تلاش کرنا شروع کر دوں۔“

”مرضی ہے تمہاری لیکن حتمی طور پر چند مہینے بعد ہی بتا سکوں گا۔ ویسے تم فکر مت کرو سب کو خاصا وقت ملے گا اگلا سیٹ اپ کرنے میں۔ اچانک کچھ نہیں ہوگا۔“

میری حیرانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ کمپنی کے پاس خاصا کام تھا اور نئے کام کی پیشکش بھی آ رہی تھی۔ ابھی چند دن پہلے ہی ایک خلیجی ملک کی طرف سے خاصا بڑا کام آیا تھا مگر صفدر صاحب نے اس کا جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر انہوں نے یہ کام لے لیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ کمپنی جاری رکھنا چاہتے ہیں اور اگر انکار کر دیا تو یہ کمپنی بند کرنے یا فروخت کرنے کا اشارہ ہوگا۔ مجھے اس کام کے بارے میں اتفاق سے رحمان صاحب سے پتا چل گیا تھا وہ ساجد سے کہہ رہے تھے کہ یہ کام مل گیا تو چھ مہینے تک تو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی اور پروجیکٹ اتنا بڑا ہے کہ اس کی تکمیل پر صفدر صاحب لازمی سب کو بونس دیں گے۔ اس وقت وہ بہت پُرجوش تھے۔ مگر چند دن بعد ان کا جوش ختم ہو گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ صفدر صاحب نے انہیں کمپنی بند یا فروخت کرنے کے فیصلے سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔

اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ دفتری کاموں میں وہ تیزی اور زندگی نہیں تھی جو پہلے پائی جاتی تھی۔ کام سب کر رہے تھے مگر بے دلی سے اور یوں جیسے بس جان چھڑا رہے ہوں۔ یقیناً اس کی وجہ صفدر صاحب کا فیصلہ تھا۔ اس کے چند دن بعد ہی مجھے علم ہوا کہ صفدر صاحب نے خلیجی ملک سے آیا ہوا پروجیکٹ مسترد کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے سوچ لیا کہ اب مجھے کہیں اور جاب تلاش کرنی ہے۔ میں نے جاب کے لیے سی وی دینا شروع کر دی۔ جو لڑکے پہلے کام کرتے تھے اور یہاں سے چھوڑ کر جا چکے تھے میں نے ان سے بھی کونٹیکٹ کیا اس طرح دفتر میں بھی جہاں جہاں پتا چل رہا تھا سی وی بھیج رہا تھا۔ صفدر صاحب نے کچھ دن بعد اعلان کر دیا کہ وہ کمپنی وائنڈ اپ کر رہے ہیں۔ اب بالکل ختم کرنے یا سیل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا مگر تمام ملازمین کو نئی جاب تلاش کرنے کا کہہ دیا۔ اس کے بعد تو سب ہی لگ گئے تھے، اور بہت سے نکل بھی گئے تھے۔

ان دنوں ہم ایک اہم پروجیکٹ کو آخری مراحل میں پہنچا رہے تھے اور صفدر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ اس پر کام جلد از جلد مکمل کیا جائے مگر ساجد اتنی ہی تاخیر کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس پروجیکٹ کی زیادہ تر ڈرائنگ ہاتھ سے کام والی تھیں اور رازداری کے نقطہ نظر سے ان کی کاپیاں بھی نہیں بنائی گئی تھیں۔ حد یہ کہ آئی ٹی والوں کے پاس کمپیوٹر میں بھی اس کی نقول نہیں تھیں۔ کام ایک غیر ملکی سفارت خانے میں توسیع کا تھا اور اسی وجہ سے اتنی رازداری برتی جا رہی تھی۔ مجھے اس کا یوں پتا چلا کہ جب ساجد نے مجھے کام کے لیے ڈرائنگ دیں تو اس نے خبردار کیا۔ ”بہت حفاظت اور احتیاط سے کام کرنا ان کی کوئی نقل نہیں ہے یہی اصل ہیں۔“

میں حیران ہوا۔ ”وہ کیوں سر؟“

”سمجھا کرو غیر ملکی سفارت خانے کا معاملہ ہے، یہ

ڈرائنگ بہت خفیہ ہیں اور اگر غلطی سے کہیں لیک ہو گئیں تو ہماری شامت آجائے گی۔''

میں کئی سال سے یہاں کام کر رہا تھا اور اب تک میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی تھی۔ بہر حال کام کے دوران نئی نئی چیزیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ مجھے دو ڈرائنگ ملی تھیں اور دونوں خاصی مشکل نوعیت کی تھیں۔ ساجد نے مجھ سے کہا کہ اسے دو دن میں چاہئیں۔ جب میں نے ڈرائنگ دیکھیں تو اس سے کہا۔ ''سر یہ دو دن کا کام نہیں ہے۔''

اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''پھر کتنے دن کا کام ہے؟''

''دو دن سے زیادہ لگ سکتے ہیں لیکن تیسرے دن لازمی ہو جائے گا۔''

میرا خیال تھا کہ وہ اس پر بحث کرے گا اور اصرار کرے گا کہ میں دو ہی دن میں دوں لیکن خلاف توقع وہ مان گیا۔ ''ٹھیک ہے تیسرے دن لیکن لنچ تک دے دینا۔''

''میری پوری کوشش ہوگی سر۔'' میں نے خوش ہو کر کہا اور فوری کام میں لگ گیا۔ اسٹرکچر میں اسٹیل اور دبیز کنکریٹ کا استعمال بتا رہا تھا کہ اسے بہت محفوظ جگہ کے طور پر بنایا جا رہا ہے۔ اس وقت دفتر میں صرف ضیا اور ساجد کے ساتھ چند دوسرے لوگ رہ گئے تھے۔ یہ میرے شعبے کا حال تھا جب کہ دوسرے شعبے بھی تقریباً خالی ہو گئے تھے۔ رحمان صاحب کی جاب بھی ایک اچھی کمپنی میں لگ گئی تھی اور وہ دو دن بعد جانے والے تھے۔ ابھی ڈیڈ لائن میں آدھے مہینے کا وقت تھا اور میں خوش تھا کہ یہ کام نمٹ جائے گا اس کے بعد میں فارغ ہوں گا اور سکون سے دوسری جگہ انٹرویو دے سکوں گا۔ اس لیے میں دل جمعی سے کام کر رہا تھا۔ شام کچھ دیر اور رکا تھا اور اس کے بعد میں نکلا۔ ڈرائنگ میں نے اپنی دراز میں لاک کر دی تھیں۔ جب تک یہ میرے پاس تھیں میری ذمے داری تھیں اور کسی قسم کی اونچ نیچ کی صورت میں مجھے جواب دینا پڑتا۔ دوسرے دن بھی دیر تک کام کر کے میں نے انہیں تقریباً آخری مرحلے تک پہنچا دیا تھا اور اب اتنا کام باقی رہ گیا تھا جو میں لنچ سے پہلے مکمل کر لیتا۔ اگلے دن میں دفتر پہنچا تو ساجد نے پوچھا۔

''آج کام کب تک مکمل ہوگا؟''

''لنچ تک آپ کو مل جائے گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''بس تو جیسے ہی مکمل ہو مجھے دے دینا، پھر چیک کر کے آگے بھی بھیجنا ہے۔''

میں نے سامان رکھا اور فوری کام میں لگ گیا۔ رحمان صاحب نے آج سے دفتر چھوڑ دیا تھا۔ اب اپر لیول کے چند افراد رہ گئے تھے ان میں قدیر بھائی بھی تھے۔ وہ پورا آفس فارغ ہونے کے بعد بھی رہتے کیونکہ صفدر صاحب کے جانے کے بعد ادائیگیوں اور وصولیوں کے معاملات ان کو ہی دیکھنے تھے۔ فرم کی ادائیگیاں تو نہیں تھیں لیکن وصولیاں خاصی تھیں اور ان کی وجہ سے قدیر بھائی

یہاں موجود رہے۔ ان ہی دنوں مجھے پتا چلا کہ ساجد، میڈم شازیہ اور میڈم ریحانہ مل کر فرم کو لوٹنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور وہ صفدر صاحب سے پرسنٹیج پر کام لینا چاہتے تھے یعنی صفدر صاحب انہیں کام لا کر دیں اور اس کے بدلے ایک طے شدہ رقم دیں باقی ان کی مرضی کہ وہ کام دینے والی پارٹی سے کیا وصول کرتے ہیں۔ صفدر صاحب کے لیے مسئلہ نہیں تھا وہ گھر بیٹھے ایک فون کال پر کام دلوا سکتے تھے۔

میڈم شازیہ مجھ سے پوچھتی رہتی تھیں کہ میں کہاں جاب تلاش کر رہا ہوں۔ انہوں نے مدد کی پیشکش بھی کی تھی کہ وہ مجھے ریفر کر سکتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر چند دن پہلے انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اپنا سیٹ اپ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اس صورت میں وہ مجھے یہاں سے جانے نہیں دیں گی۔ مگر میں نے ابھی اپنا ذہن نہیں بنایا تھا۔ البتہ ضیا کو پتا چلا تو وہ سلگ گیا اس نے لنچ میں مجھ سے کہا۔ ''مزے ہیں تمہارے میڈم روک رہی ہیں۔''

''میڈم جانتی ہیں کہ میں کام کرتا ہوں۔'' میں نے اسے مزید سلگایا۔ ''ورنہ وہ میری کوئی رشتے دار تو نہیں ہیں کہ روکنے پر اصرار کریں۔''

''تب تم نے کیا سوچا تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے؟'' وہ حسد سے بولا۔ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''لاٹری کیوں نکلنے لگی میں نے کئی اچھی کمپنیوں میں اپلائی کیا ہے شاید ان میں سے کسی میں بات بن جائے۔''

اتفاق سے ایک کمپنی میں، میں نے اور ضیا دونوں نے سی وی دی ہوئی تھی۔ مگر ابھی تک وہاں سے کال نہیں آئی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کسی بڑی کمپنی میں مجھے اتنی ہی یا اس سے کچھ اوپر تنخواہ کی آفر آئی تو میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ کیونکہ یہاں ساجد جیسے عذاب کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ میں لنچ تک کام نمٹانے کے نقطہ نظر سے کام کر رہا تھا کہ اچانک صفدر صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ انکار کر نہیں سکتا تھا مجبوراً اٹھ کر ان کے کمرے میں آیا وہ ایک فائل پر جھکے ہوئے تھے اور مجھے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا اور وہ فائل پر جھکے رہے۔ خاصی دیر گزر گئی تو میں نے پہلو بدلنا شروع کیا۔ مگر انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مجبوراً میں نے کہا۔

''سر آپ نے مجھے بلایا ہے۔''

''ہاں تو چند منٹ بیٹھو۔'' وہ خفگی سے بولے تو میں دوبارہ دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ کوئی مزید دس منٹ بعد انہوں نے فائل بند کی اور اپنی عینک اتاری۔ ''یہ بتاؤ تمہاری کہیں جاب ہوئی؟''

''نہیں سر ابھی تو کوشش کر رہا ہوں۔''

''تب اپنی سی وی مجھے دے دو میں کوشش کرتا ہوں۔''

''جی سر میں دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا ہوا واپس آیا۔ فضول میں مجھے اتنی دیر بٹھا کر رکھا اور اب لنچ تک کام مکمل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مزید بدقسمتی کہ ساجد بھی سیٹ پر نہیں تھا۔ اس لیے بارہ بجے اس نے پوچھا اور میں نے بتایا کہ لنچ کے بعد دوں گا تو اس کا موڈ آف ہو گیا۔

''تم نے لنچ تک کہا تھا۔''

''صفدر صاحب نے بلا لیا تھا اور بہت دیر بٹھا کر رکھا۔''

''کتنی دیر بٹھا لیا ہوگا کیا میٹنگ کر رہے تھے۔'' ساجد غرایا۔ ''جب کام نہیں ہوتا تھا تو کہا کیوں؟''

میں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر سیٹ پر آ گیا۔ میں نے بے دلی سے کام شروع کیا۔ اب کام نہیں تھا اور اس کام میں بھی خاصا وقت تھا مگر ساجد یوں پیچھے پڑا ہوا تھا جیسے آج ہی اس کی ڈیڈ لائن ہو۔ لنچ تک جتنا نمٹا سکتا تھا نمٹا دیا اور پھر لنچ کرنے آ گیا۔ آج صفدر صاحب کی طرف سے لنچ تھا اور باہر سے بریانی اور تکہ منگوایا گیا تھا۔ جب صفدر صاحب کی طرف سے لنچ ہوتا تھا تو سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھاتے تھے۔ میں واش روم سے ہاتھ دھو کر آیا تو ضیا سب سے پہلے پہنچا ہوا تھا اور ساجد ابھی تک نہیں آیا تھا وہ چند منٹ بعد آیا۔ لنچ تقریباً آدھے گھنٹے چلا اور پھر سب اٹھ گئے۔ میں واش روم سے ہاتھ دھو کر واپس آیا تو یہ دیکھ کر چونک گیا کہ میز پر سے ڈرائنگ غائب ہے۔ میں نے جلدی سے دراز کھول کر دیکھی کہ کہیں اس میں تو نہیں رکھ دی تھی مگر مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں میز کے اوپر ہی چھوڑ گیا تھا۔ ہم عام طور سے ایسا ہی کرتے تھے کسی کام سے اٹھ کر جاتے تب ڈرائنگ یا کمپیوٹر کھلا چھوڑ جاتے تھے۔ دراز میں ڈرائنگ نہیں تھی۔ میں نے بوکھلا کر میز کے نیچے اور اپنے کیبن کے آس پاس دیکھ لیا۔ اتفاق سے اسی وقت ساجد نے اپنے کیبن سے جھانکا اور طنزیہ انداز میں کہا۔

''آج کام کر کے دینے کا ارادہ نہیں ہے جو یوں پھر رہے ہو؟''

''سر وہ ڈرائنگ میز پر نہیں ہے۔''

وہ چونکا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ ''کیا مطلب میز پر نہیں

ہے۔"

"سر میں یہاں رکھ کر لنچ کے لیے گیا تھا۔"

وہ پھر چونکا۔ "تم لاک کر کے نہیں گئے تھے؟"

"نہیں سر کبھی لاک نہیں کیا تو آج بھی......"

"وہ بہت اہم ڈرائنگ ہے۔" ساجد نے دانت پیسے۔ "تلاش کرو اسے ورنہ تم بہت بڑی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

مگر ڈرائنگ وہاں ہوتی تو ملتی۔ اتنی بڑی جگہ بھی نہیں تھی میں نے دس منٹ میں چار بار دیکھ لی۔ پھر آس پاس کے خالی کیبن بھی دیکھ لیے۔ دوسری جگہوں پر تلاش شروع کی تو سب کو پتا چل گیا اور ہوتے ہوتے بات صفدر صاحب تک پہنچ گئی اور انہوں نے مجھے طلب کر لیا۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں نے ڈرائنگ میز پر چھوڑی تھی اور لنچ کرنے گیا تھا وہاں سے واپس آیا تو ڈرائنگ غائب تھی۔ صفدر صاحب نے بھی وہی بات کی۔ "اسے تلاش کرو ورنہ تم اور ہم سب مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

مگر ڈرائنگ ہوتی تو ملتی۔ یہ واضح تھا کہ کسی نے اسے غائب کر دیا اور جب میں یہ بات کہنے صفدر صاحب کے پاس پہنچا تو وہاں ساجد پہلے سے موجود تھا اور اس نے صفدر صاحب سے کچھ کہا تھا کیونکہ انہوں نے غضب ناک نظروں سے دیکھا۔ "تم آج کل دفتر میں دیر تک رک رہے تھے؟"

"جی سر کام زیادہ تھا اس لیے۔"

"جھوٹ مت بولو تم نے کسی کو ڈرائنگ دی ہے۔"

میرے ہوش اڑ گئے۔ "یہ غلط ہے سر کسی نے میرے خلاف سازش کی ہے اور جان بوجھ کر ڈرائنگ غائب کی ہے۔" میں نے کہا۔ "سر اس طرح تو ساجد صاحب پر شبہ ہو سکتا ہے یہ لنچ پر سب سے دیر سے پہنچے تھے۔"

ساجد اچھل پڑا۔ "تمہاری یہ جرأت تم مجھے الزام دو۔"

"جب آپ مجھے الزام دیں گے تو کیا میں نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا اور صفدر صاحب کی طرف دیکھا۔ "سر آپ خود بتائیں کون اس قسم کا کام آسانی سے کر سکتا ہے۔ ساجد صاحب کو ڈرائنگ کی اہمیت کا پتا ہے اور یہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

اس وقت میرے منہ میں جو آ رہا تھا میں کہہ رہا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کو تیار تھا۔ صفدر صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ساجد نے بات اپنے اوپر پلٹتے دیکھی تو گھبرا گیا۔ "سر اس کی باتوں میں نہ آئیں۔ اسی نے ڈرائنگ غائب کی ہے۔"

"اگر میں نے غائب کی ہوتی تو اسی دفتر میں ہوتی میں تو کہیں باہر نہیں گیا اور نہ ہی اس دوران میں کوئی باہر سے آیا۔"

"تم لنچ پر دیر سے کیوں آئے تھے؟" صفدر صاحب نے پوچھ لیا۔ ساجد کا چہرہ زرد پڑ گیا اس نے ہکلا کر کہا۔

"وہ سر میری گاڑی کا شیشہ کھلا رہ گیا تھا اسے بند کرنے گیا تھا۔"

"تمہیں یہاں بیٹھے بیٹھے یاد آیا کہ گاڑی کا شیشہ کھلا ہوا ہے۔" صفدر صاحب نے سرد لہجے میں کہا اور پھر مجھ سے کہا۔ "تم جاؤ۔"

میں آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ ڈرائنگ مل جائے ورنہ میں پھنس جاتا۔ مجھے نااہلی کا الزام لگا کر جاب سے نکالا جاتا اور سرٹیفکیٹ بھی نہیں ملتا تو آگے جاب کیسے ملتی۔ ساجد کچھ دیر بعد سر جھکائے صفدر صاحب کے کمرے سے نکلا اور اپنے کیبن کی طرف جاتے ہوئے اس نے مجھ پر ایک قہرناک نگاہ ڈالی تھی مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر بعد صفدر صاحب اپنے کمرے سے نکلے اور تمام اسٹاف کو جمع کر کے کہا۔ "آج ایک اہم ترین ڈرائنگ غائب ہوئی ہے اور اگر وہ نہ ملی تو معاملہ مجبوراً پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔"

پولیس کا سن کر سب ہی گھبرا گئے تھے کیونکہ ہمارے ہاں پولیس سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتی ہے چاہے وہ بے گناہ ہو یا گناہ گار ہو۔ میں نے کہا۔ "سر میری غلطی ہے کہ میں نے ڈرائنگ لاک نہیں کی لیکن اللہ گواہ ہے میں نہیں جانتا کہ اسے کس نے چرایا ہے۔"

ساجد نے بھی فوراً حلف اٹھا لیا۔ "سر میں بھی اللہ کی قرآن کی اور اللہ کے رسول ﷺ کی قسم کھا کر کہتا ہوں ڈرائنگ میں نے نہیں اٹھائی اور نہ مجھے علم ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"یہ سب پولیس معلوم کر لے گی تم لوگوں کے پاس صرف آج شام تک کا وقت ہے۔" صفدر صاحب کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سب اپنے اپنے کیبنوں اور کمروں میں آ گئے۔ کام رک گیا تھا اور سب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ معاً مجھے لگا جیسے ساجد کے کیبن سے کاغذ کھڑکھڑانے کی آواز آئی ہو۔ ڈرائنگ کا کاغذ بہت موٹا اور مضبوط ہوتا ہے۔ اسے کھولو یا رول کرو تو یہ کھڑکھڑاتا ہے۔ اس وقت بھی ایسی آواز آئی تھی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ساجد کیا

کر رہا تھا۔ کیا وہ کام کر رہا تھا۔ میں بہانے سے اٹھ کر پانی پینے کولر تک گیا تو دیکھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے۔ یعنی وہ کام نہیں کر رہا تھا پھر کاغذ کھڑکھڑانے کی آواز کہاں سے آئی؟ میں نے سوچا کہ اگر ساجد اٹھ کر ادھر اُدھر ہوتا ہے تو میں اس کے کیبن میں جا کر دیکھوں گا شاید اس نے ڈرائنگ کہیں چھپائی ہو۔

میں انتظار کرنے لگا اور تقریباً ایک گھنٹے بعد صفدر صاحب نے اسے انٹرکام پر طلب کیا۔ جیسے ہی وہ صفدر صاحب کے کمرے میں داخل ہوا میں اٹھ کر دبے قدموں اور جھک کر چلتا ہوا ساجد کے کیبن کے پاس آیا مگر اندر داخل ہونے سے پہلے ٹھٹک گیا۔ وہاں ضیا میز کے نیچے سر کیے کچھ کر رہا تھا اور مجھے وہی کھڑکھڑانے جیسی آواز آرہی تھی۔ تو کیا ڈرائنگ اصل میں ضیا کے پاس تھی اس نے میری میز سے اٹھائی تھی اور اب اسے ساجد کی میز کے نیچے کہیں چھپا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اوپر ہونے لگا میں تیزی سے اور دبے قدموں اسی طرح واپس آگیا۔ ساجد کچھ دیر بعد آیا تو وہ بہت پریشان لگ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ ساجد میرا دشمن ہو رہا تھا کیونکہ میں نے اس پر جوابی الزام لگایا تھا اور ضیا تو ویسے ہی دشمن تھا۔ میں نے ان کی بجائے صفدر صاحب سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ صفدر صاحب نے میری بات سنی اور فوری ایکشن لیا۔ چند منٹ میں ڈرائنگ رول کی صورت میں ساجد کی میز کے اندر موجود دراز کے پچھلے خلا سے مل گئی اور جب میں نے بتایا کہ یہ وہاں کیسے پہنچی تو ضیا اور ساجد دونوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔

''یہ اس نے خود چھپائی ہے۔'' ساجد نے حقارت سے کہا۔ ''تاکہ الزام مجھ پر یا ضیا پر لگا سکے۔''

''میں نے اس ڈرائنگ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔'' ضیا جلدی سے بولا۔ ''ہمایوں جھوٹا ہے خود چوری کر کے مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم نے اس ڈرائنگ کو دیکھا بھی نہیں ہے؟'' میں نے اسے چیلنج کیا۔ ''جب کہ میں نے خود تمہیں ساجد صاحب کی میز کے نیچے گھسے دیکھا ہے۔''

''ہاں میں نے اسے چھوا بھی نہیں ہے۔'' ضیا نے پوری ڈھٹائی سے کہا۔ میں نے صفدر صاحب سے کہا۔

''اب آپ پولیس بلا لیں اور سب سے پہلے ڈرائنگ پر فنگر پرنٹ چیک کرائیں۔ اس پر میرے اور ساجد صاحب کے فنگر پرنٹ ہونے چاہئیں کسی بھی تیسرے فرد کے فنگر پرنٹ نہیں ہونے چاہئیں ورنہ وہی اصل چور ہوگا۔''

ضیا کا چہرہ سفید ہو گیا تھا اور کچھ ہی دیر میں اس نے اقرار کر لیا کہ یہ کام اسی نے کیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس نے اسے مذاق قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کچھ دیر مجھے تنگ کر کے ڈرائنگ واپس کر دیتا مگر جب بات صفدر صاحب تک چلی گئی تو اسے لگا کہ اب کوئی اسے مذاق نہیں مانے گا اور پولیس کا سن کر وہ خوفزدہ ہو گیا اور اس نے ڈرائنگ ساجد کی میز کے نیچے چھپا دی تاکہ اس کا نام نہ آئے۔ ڈرائنگ مل گئی تھی اس لیے اب صفدر صاحب نے پولیس بلانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور جب ضیا نے زیادہ ہی رونا دھونا کیا تو انہوں نے اسے سزا دینے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا۔ ورنہ وہ مستحق تھا کہ اسے فوری طور پر دفتر سے نکال دیا جاتا۔ مجھے مایوسی ہوئی تھی کیونکہ اگر اس کی سازش جسے وہ مذاق کا نام دے رہا تھا کامیاب ہو جاتی تو میں ملازمت سے جاتا اور مجھے کہیں اور اچھی ملازمت بھی نہ ملتی۔ میں نے ڈرائنگ لے کر باقی کام مکمل کیا اور ساجد کو تھمائی جواب کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا اس نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن جب چھٹی کے بعد باہر نکلنے لگا تو اس نے مجھ سے کہا۔

''معاف کرنا میری غلطی تھی جو میں تمہیں قصوروار سمجھا۔''

مجھے اس کے معذرت طلب کرنے پر شرمندگی ہوئی کیونکہ بہرحال وہ بڑا تھا۔ ''سوری نہ کریں سر یہی بہت ہے کہ اللہ نے مجھے بے قصور ثابت کر دیا۔''

''اب میں بھی چاہوں گا کہ تم اس دفتر سے نہ جاؤ۔''

''ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے میں کہیں اور ملازمت کر لوں۔''

ساجد اور صفدر صاحب کا رویہ بدل گیا تھا مگر میں اب یہاں جاب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اللہ نے مدد کی اور مجھے ایک اور بڑی کمپنی میں جاب مل گئی۔ یہاں تنخواہ بھی اچھی ہے اور ماحول بھی اچھا ہے۔ مزے کی بات ہے کہ ضیا نے میرے ساتھ ہی یہاں سی وی دی تھی اور اسے انٹرویو کے بعد مسترد کر دیا گیا اور مجھے رکھ لیا گیا۔ یوں اس نے جو کیا تھا اس کی سزا بھگت لی اور میری معلومات کے مطابق اسے ابھی تک کہیں جاب نہیں ملی ہے۔